خطباتِ حکیم الامت

بسلسلہ خطبات حکیم الامت جلد-۲۸

اصلاحِ ظاہر

حکیم الامت مجدد الملت

حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ

ترتیب وتزئین

صوفی محمد اقبال قریشی مدظلہٗ

تحقیق وتخریج

مولانا زاہد محمود قاسمی

(فاضل جامعہ قاسم العلوم ملتان)

اِدارۂ تالیفاتِ اشرفیہ

چوک فوارہ ملتان پاکستان فون: 4540513-4519240

نام کتاب

اصلاحِ ظاہر

تاریخ اشاعت..................صفر المظفر ۱۴۲۷ھ

ناشر.........................ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان

طباعت.....................سلامت اقبال پریس ملتان

قارئین سے گذارش

ادارہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمدللہ اس کام کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاک اللہ

ادارہ تالیفات اشرفیہ... چوک فوارہ... ملتان — مکتبہ رشیدیہ........راجہ بازار........راولپنڈی

ادارہ اسلامیات.........انارکلی.........لاہور — یونیورسٹی بک ایجنسی....خیبر بازار......پشاور

مکتبہ سید احمد شہید.......اردو بازار.......لاہور — ادارۃ الانور........نیوٹاؤن.......کراچی نمبر 5

مکتبہ رحمانیہ........اردو بازار .... لاہور — مکتبہ المنظور الاسلامیہ... جامعہ حسینیہ...علی پور

مکتبہ المنظور الاسلامیہ............بلاک زیڈ........مدینہ ٹاؤن........بنک موڑ........فیصل آباد

ISL.ᴬMIC EDUCATIONAL TRUST U.K — 119-121- HALLIWELL ROAD

(ISLAMIC BOOKS CENTERE — BOLTON BLI 3NE. (U.K.)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض ناشر

''خطبات بنام ''اصلاح ظاہر'' جدید اشاعت کے بعد آپ کے سامنے ہے۔

حضرت کے یہ خطبات کیا ہیں؟ اس بارہ میں ہمارے قلم میں یہ سکت کہاں کہ ان کے بارہ میں کچھ کہا یا لکھا جا سکے۔ لیکن وقت کے بڑے بڑے شیوخ اور اکابر کی متفقہ رائے تا حال یہی ہے کہ حضرت کے یہ خطبات ''الہامی خطبات'' ہیں کہ صاحب خطبات مجدد وقت اور اکثر خطبات کو قلمبند کرنے والی شخصیت شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ جیسے متبحر عالم کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے اکابر انہی خطبات کے خوشہ چیں اور دوسروں کو بھی ان کے پڑھنے کی ترغیب دیتے نظر آتے ہیں۔

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے یہ مواعظ پہلے ''الابقاء'' کے نام سے قدیم انداز سے مقبول عام ہوئے۔ پھر منشی عبدالرحمن خان رحمہ اللہ و دیگر حضرات نے ان پر عنوانات لگائے اور انہیں موضوع کے اعتبار سے علیحدہ علیحدہ جلدوں میں مرتب کیا۔ ان خطبات کو موجودہ شکل میں مکمل شائع کرنے کا شرف اللہ پاک نے محض اپنے فضل و کرم اور اکابر کی دعاؤں سے ''ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان'' کو بخشا

ایں سعادت بزور بازو نیست

عصر حاضر کے تقاضوں کے پیش نظر ضرورت تھی کہ ان مواعظ پر نظر ثانی کی جائے یعنی قرآنی آیات' احادیث مبارکہ اور عربی فارسی اشعار کا اردو ترجمہ کر دیا جائے تو عوام الناس بھی ان ''الہامی خطبات'' سے بآسانی مستفید ہو سکیں۔ اس کیلئے ادارہ نے حضرت صوفی محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہ اور دیگر علماء کرام سے باقاعدہ زر کثیر خرچ کر کے ان خطبات کی تصحیح' عربی عبارات' فارسی اشعار کا ترجمہ اور احادیث کی تخریج وغیرہ کا کام کرایا ہے۔ احادیث کی تخریج و تحقیق کا کام مولانا زاہد محمود قاسمی صاحب نے سرانجام دیا ہے۔ جو کتاب کے آخر میں ملحق کر دیا گیا ہے۔ اللہ پاک ادارہ کی ان کوششوں کو شرف قبولیت سے نوازیں اور اپنے اکابر کے مسلک اعتدال پر کاربند رہتے ہوئے اخلاص کے ساتھ خدمت دین کی توفیق سے نوازیں۔ آمین

والسلام محمد اسحٰق عفی عنہ

اجمالی فہرست

غض البصر ۱۸۷-۲۱۵

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ

مطاهر الاقوال ۲۱۷-۲۶۴

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَیْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَیِّنًا ۖ وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِیْمٌ

ازالة الغين عن آلة العين ۲۶۲-۳۲۶

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝ وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ۝ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ ۝ اَیَحْسَبُ اَنْ لَّنْ یَّقْدِرَ عَلَیْهِ اَحَدٌ ۝ یَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ۝ اَیَحْسَبُ اَنْ لَّمْ یَرَهٗۤ اَحَدٌ ۝ اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَیْنَیْنِ ۝ وَلِسَانًا وَّشَفَتَیْنِ ۝ وَهَدَیْنٰهُ النَّجْدَیْنِ ۝

الظاهر ۳۲۷-۴۱۵

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قَالَ عَلَیْهِ السَّلَامُ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَجِیْبُ الدُّعَآءَ عَنْ قَلْبٍ لَاهٍ

ادب الاعلام ۴۱۷-۴۳۱

ادب العشير ۴۳۳-۴۴۷

فہرست مضامین

النعم المرغوبة في النعم المركوبة

ترجیح المفسدہ علی المصلحہ

مطاہر الاقوال

ازالۃ الغین عن آلۃ العین

ادب الاعلام

اسباب الفتنہ

۲۷۔ ربیع الثانی ۱۳۳۱ ہجری کو موضع سیولی ضلع گڑگانواں میں اہل محلّہ کی درخواست پر ۳۔ گھنٹے ۵۰ منٹ تک بیان فرمایا۔ محبت اموال واولاد میں اعتدال کی تعلیم اور تجاوز حدود سے ممانعت کی۔ مولانا سعید احمد صاحب تھانویؒ نے مسودہ اجمالی لکھا اور ان کے برادر خورد مولانا ظفر احمدؒ نے تفصیل لکھی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدلله نحمده و نستعينه و نستغفره ونومن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له ونشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له ونشهدان سيدنا ومولانا محمداً عبده ورسوله صلى الله تعالىٰ عليه وعلىٰ اله واصحابه وبارك وسلم.

اما بعد فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّ جِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّ حِيْمِ. اِنَّمَا اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَا دُكُمْ فِتْنَةٌ ط. وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ اَجْرٌ عَظِيْمٌ فَاتَّقُوااللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَ اسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْراً لِاَنْفُسِكُمْ ط. وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ٥ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضاً حَسَناً يُّضَاعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْلَكُمْ ط. وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ٥ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ٥

(التغابن آیت نمبر ۱۵ تا نمبر ۱۸)

(تمہارے اموال اور اولاد بس تمہارے لئے ایک آزمائش کی چیز ہے اور اللہ کے پاس بڑا اجر ہے تو جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو اور سنو اور مانو اور خرچ کیا کرو، یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا اور جو شخص نفسانی حرص سے محفوظ رہا ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں اگر تم اللہ کو اچھی طرح قرض دو گے تو وہ اس کو تمہارے لئے بڑھاتا چلا جاوے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اور اللہ بڑا قدردان ہے بڑا بردبار ہے پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے زبردست حکمت والا ہے)

حق سبحانہ وتعالیٰ کی بے انتہاء شفقت

یہ چند آیات ہیں سورۂ تغابن کے اخیر کی جن میں حق تعالیٰ شانہ نے اپنے ایمان والے بندوں کو دو چیزوں کے نقصان پر اطلاع دی ہے اور یہ حق تعالیٰ کی نہایت شفقت ہے کہ وہ اپنے بندوں کو ایسا چاہتے ہیں جیسے ماں باپ اولاد کو چاہتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ چنانچہ حدیث میں ہے کہ ماں باپ کو بھی اپنے بچہ کے ساتھ اتنی محبت نہیں ہوتی جتنی حق تعالیٰ کو اپنے بندوں

کے ساتھ ہے کیونکہ ماں باپ کو اولاد کے ساتھ جو کچھ محبت ہے وہ بھی خدا ہی کی دی ہوئی ہے اور جب وہ بھی خدا کی دی ہوئی ہے تو اس سے سمجھ لیجئے کہ خود خدا تعالیٰ کے پاس کتنی محبت ہوگی کیونکہ جو کوئی ایک چیز کو بانٹا کرتا ہے اس کے پاس وہ چیز دوسروں سے زیادہ ہوا کرتی ہے اور اگر وہ چیز صفت کمال ہو تو ایک درجہ میں اتصاف بھی ہوگا اور دوسروں کی تو یہ حالت ہے کہ کسی چیز کے بانٹنے اور دینے دلانے سے ان کے پاس وہ چیز کم ہو جاتی ہے مگر خدا تعالیٰ کے ہاں کمی نہیں ہوتی وہاں کمی کا احتمال ہی نہیں کیونکہ ان کے پاس ہر چیز کا غیر متناہی خزانہ ہے اور غیر متناہی میں کمی نہیں ہو سکتی تو خدا تعالیٰ نے جو اپنے بندوں میں ماں باپ کو محبت دی ہے اس سے خدا کے یہاں یہ صفت کچھ کم نہیں ہوئی کیونکہ اول تو صفت میں کمی کا احتمال نہیں (دنیا میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کے اخلاق کا دوسرے پر اثر ہوتا ہے مثلاً شاگرد میں استاد کی صفت کا اثر پہنچتا ہے نیز دوسرے اخلاق حمیدہ بھی صحبت کے اثر سے اس میں پیدا ہو جاتے ہیں مگر اس سے استاد کی صفت میں کمی نہیں ہوتی حالانکہ استاد کی صفات حادث اور ممکن ہیں جب صفت حادثہ ممکنہ میں بھی دوسرے کے افادہ سے کمی نہیں آتی تو حق تعالیٰ کی صفات میں جو کہ قدیمہ اور واجبہ ہیں یہ احتمال کیونکر ہو سکتا ہے ۱۲) دوسرے میں ابھی کہہ چکا کہ حق تعالیٰ کے یہاں ہر چیز کے خزانے بے انتہاء اور غیر متناہی ہیں پس اگر بفرض محال صفت میں افادہ سے کمی کا احتمال بھی ہوتا تو لا متناہی کی وجہ سے وہ احتمال مرتفع ہے بہر حال خدا تعالیٰ کی محبت جتنی بندوں کے ساتھ تھی دوسروں کو اس میں سے کچھ حصہ دینے سے اس میں کمی نہیں آئی اور جب ماں باپ کی محبت کا یہ حال ہے جو رات دن مشاہد ہے اور وہ خدا ہی کی دی ہوئی ہے تو خود خدا تعالیٰ کو اپنے بندوں کے ساتھ کیسی کچھ محبت ہوگی اس کا تو اندازہ بھی نہیں ہو سکتا۔ بہر حال اسی محبت کا مقتضا یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ہم کو ہر قسم کے نفع و ضرر پر مطلع فرما دیا جو کام کی بات تھی وہ بھی بتلا دی اور جو نقصان کی چیز تھی اس پر بھی مطلع فرما دیا۔

خلاصہ آیت

چنانچہ اس آیت میں دو چیزوں کا بیان ہے جو انسان کو پیاری تھیں اور ان میں انسان کا کچھ نقصان بھی ہے مگر نقصان کے ساتھ ان میں کچھ نفع بھی ہے۔ اس لئے یہاں ایسا لفظ استعمال فرمایا ہے جو لغۃً نفع کے لئے بھی بولا جا سکتا ہے اور نقصان کے لئے بھی گو عرفاً اس کا

استعمال ضرر میں زیادہ ہے پس یا تو یہ کہیے کہ اس جگہ دو محبوب چیزوں کے نفع وضرر دونوں پر مطلع کیا ہے یا عرف کے اعتبار سے یوں کہیے کہ صرف ان کے ضرر پر مطلع کیا ہے اور ایسی چیزوں کے نقصان پر مطلع کرنے کی ضرورت بھی زیادہ تھی جو محبوب ہیں کیونکہ مکروہ اور ناگوار چیزوں کے نقصانات سے تو انسان خود ہی بچا کرتا ہے اور گو کبھی مکروہات میں بھی ابتلا ہو جاتا ہے مگر محبوب چیزوں میں ابتلا زیادہ ہوتا ہے۔ اسی لئے طبیب بیمار کو ایسی چیزوں سے زیادہ روکتا ہے جو مرغوب ہیں اور ان میں مریض کا نقصان ہے اب سمجھئے کہ وہ چیزیں کیا ہیں جن کا بیان اس آیت میں ہے سو وہ دو چیزیں ہیں ایک مال اور ایک اولاد اور ان میں دو باتیں ہیں۔ ایک تو ان کا مرغوب ومحبوب ہونا یہ تو بہت ظاہر ہے ہر شخص جانتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں مرغوب ہیں انسان مال واولاد کے واسطے کیا کیا کرتا ہے اور ان کے لئے کیسی کوشش کرتا ہے سب کو معلوم ہے جس سے ان دونوں کا محبوب ہونا ایسا ظاہر ہو گیا ہے کہ اس میں کچھ بھی خفا نہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دنیا میں جتنے محبوب مشاغل اور جس قدر دھندے ہیں سب انہی دو کے واسطے ہیں (درمیان وعظ میں حضرت نے بعض لوگوں کو دیکھا کہ وہ روشنی کا زیادہ اہتمام کرنے میں مشغول ہیں تو اس سے منع کرتے ہوئے فرمایا کہ) بقدر ضرورت روشنی کافی ہے زیادہ کی کیا ضرورت ہے اس میں علاوہ اسراف کے ایک کھلا ہوا نقصان یہ ہے کہ سامعین کا دل وعظ میں پوری طرح نہیں لگتا ہر ایک کی نظر اس پر رہتی ہے کہ اب وہ چراغ گل ہوا اور وہ بھڑکا اسی لئے تراویح کے ختم قرآن میں ہم لوگ زیادہ روشنی سے منع کرتے ہیں اس میں بھی علاوہ اسراف کے اتنا حرج تو کھلا ہوا ہے کہ کسی کا دل نماز میں اور قرآن میں نہیں رہتا خصوصاً ان لوگوں کا جو روشنی کے مہتمم ہوتے ہیں وہ تو بس یہی دیکھتے رہتے ہیں کہ اب فلاں فانوس بھڑک اٹھا اس کم کرنا چاہیے۔ اب دوسرا گل ہو گیا اسے جلانا چاہیے اور جو چیز اصل مقصود ہیں یعنی قرآن سننے میں حارج ہو جس پر ختم قرآن موقوف ہے تو بتلایئے وہ قابل ترک ہے یا نہیں یقیناً یہ سب چیزیں قابل ترک ہیں مگر آج کل رسم پرستی کا طبائع پر اتنا اثر غالب ہے کہ باوجود ان کے کھلے نقصانات کے پھر بھی ان کو کیا جاتا ہے اور جو شخص منع کرے اس سے خفا ہوتے ہیں کہ اس سے اصل کام میں حرج ہوتا ہے یعنی عقائد کا قصہ تو الگ رہا (کہ لوگوں نے اس کو لازم اور ضروری سمجھ رکھا ہے چنانچہ بدوں مٹھائی کے ختم قرآن ان کے نزدیک معیوب ہو گیا ہے اور مباح کا اتنا التزام جو فساد عقیدہ کو

مستلزم ہوجائے ناجائز و بدعت ہے مگر) اس سے قطع نظر کر کے میں یہ کہتا ہوں کہ اس سے اصل کام میں بھی حرج ہوتا ہے (چنانچہ بارہا دیکھا ہوگا کہ کسی مسجد میں نمازیوں کی تعداد کے موافق مٹھائی گئی مگر درمیان میں نمازی بڑھ گئے اور مٹھائی تھوڑی معلوم ہوئی تو اس وقت ایک دو آدمیوں کو بازار بھیجا جاتا ہے کہ ایک دو روپوں کی مٹھائی اور لے آؤ پھر یہ آدمی تو جماعت سے بالکل محروم رہے اور جو جماعت میں شریک رہے وہ بھی ہر دو رکعت پر سلام پھیر کر دیکھتے رہتے ہیں کہ وہ آ گئے یا نہیں اگر ان کو کسی وجہ سے دیر ہوگئی تو اب امام صاحب سے کہا جاتا ہے کہ ذرا نماز ٹھہر ٹھہر کر سکون سے پڑھیں جلدی نہ کریں تا کہ ختم تک مٹھائی لانے والے پہنچ جاویں ان کی نماز بھی ساری مٹھائی کے مراقبہ میں ختم ہوتی ہے آخر یہ حرکت خرافات ہے یا نہیں۔

بدعات کا اثر

ایک دفعہ کانپور میں میرے وعظ کے بعد بعض لوگوں نے مٹھائی تقسیم کرنے کا ارادہ کیا وعظ مغرب کے بعد سے عشاء تک ہوا تھا۔ تجویز یہ ہوئی کہ نماز عشاء کے بعد تقسیم کی جائے پھر یہ فکر ہوئی کہ مٹھائی تو ہے تھوڑی سی اگر عشاء کے بعد تقسیم کی گئی تو آدمی زیادہ ہو جائیں گے (کیونکہ مٹھائی کی خبر سن کر دوسری مسجدوں کے نمازی بھی یہاں آ کر نماز میں شریک ہو جائیں گے) تو اس کی یہ تدبیر کی کہ کنڈی تو بند کر دی اور ایک آدمی کو پہرہ پر کھڑا کیا کہ جو شخص آوے اس سے پوچھ لو اگر وہ پرانا نمازی ہے تو کھول دو ورنہ بند رکھو وہ پہرہ دار تو جماعت سے محروم رہا (اور کنڈی بند کرنے کی وجہ نہ معلوم کتنے آدمی جماعت سے محروم رہے ہوں گے) نماز کے بعد مجھے اطلاع ہوئی میں نے کہا کہ تم لوگ بدعات سے روکنے پر ہم لوگوں کو برا بھلا کہتے ہو مگر تم نے ان کا نتیجہ دیکھ لیا کہ محض مٹھائی کے انتظام کی وجہ سے ایک مسلمان کو تم نے جماعت سے محروم کیا جس کی حالت یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میرا جی چاہتا ہے کہ تارکین جماعت کے گھر جلادوں اسی وعید کی بناء پر اکثر محققین نے جماعت کو واجب کہا ہے گو بعض نے سنت مؤکدہ بھی کہا ہے اور وہ بھی کوئی تھوڑی بات نہیں۔ سنت مؤکدہ بھی ایسی چیز ہے جس کی بابت بعض کتب فقہ میں ایک حدیث لکھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اس کے تارک کو میری شفاعت

نصیب نہ ہوئی اور صحیحین میں گو یہ لفظ نہیں مگر ایسی ہی سخت وعید وارد ہے فمنؑ رغب عن سنتي فليس مني (جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ میرے طریق سے نہیں ہے) غرض ان تکلفات میں وہ اصلی کام رہ جاتا ہے جس کے شکریہ میں یہ تکلفات برتے جاتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ جو لوگ بہت آراستگی کرتے ہیں کہ کہیں قندیل لگاتے ہیں کہیں جھاڑ فانوس کہیں کچھ کہیں کچھ وہ اکثر بیان سننے سے محروم رہتے ہیں جیسا کہ یہاں بھی اسی قسم کا کچھ سامان ہوا ہے چنانچہ نظر آ رہا ہے مگر خیر جو حد سے زائد تھا اس کو موقوف کر دیا گیا اور لڑکوں کے خیال سے کچھ تھوڑا بہت رہنے دیا گیا (غالباً یہ تکلفات نوجوان لڑکوں نے کئے تھے اس لئے ان کی خاطر سے کسی قدر رہنے دیا گیا اور جو حد سے زائد تھے وہ حذف کر دیئے گئے ۱۲) گو یہ سب کچھ محبت سے کیا گیا ہے مگر یہ محبت ماں کی سی ہے جس کے ساتھ کچھ نادانی بھی ہے (باپ کو تو اولاد کے ساتھ عاقلانہ محبت ہوتی ہے جس پر کوئی برا نتیجہ مرتب نہیں ہوتا بلکہ اس سے اولاد کی اصلاح ہوتی رہتی ہے اور ماں کی محبت نادانی کے ساتھ ہوتی ہے جس سے اولاد کے اخلاق بگڑ جاتے ہیں تو یہاں پر جو محبت ان تکلفات کا سبب ہوئی ہے وہ ماں کی محبت سے مشابہ ہے اس لئے اس میں کچھ نادانی بھی شامل تھی ۱۲) اس میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ زیب و زینت کرنے والے یاد کر لیں کہ اس انتظام کے درمیان میں اگر جماعت ہونے لگی ہوگی تو بعض نے جماعت کو ترک کر دیا ہوگا اور بعض نے نماز ہی نہ پڑھی ہوگی اور جس نے تنہا پڑھی بھی ہوگی اس کا بھی ترک جماعت سے جی تو برا نہ ہوا ہوگا۔ یہ ہے اصلی بات جس کی وجہ سے ان امور کو ہم منع کرتے ہیں اور ہم کیا منع کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے منع فرمایا ہے تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی زندگی کو دیکھو کہ وہاں کیسی سادگی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرت کی یہ حالت تھی کہ وضع میں لباس میں مکان میں اٹھنے بیٹھنے میں غرض ہر چیز میں سادگی تھی مجلس میں کسی بات سے یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ ان میں بزرگ اور سردار کون ہے حتیٰ کہ اجنبی آدمی کو مجلس نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں آ کر پوچھنا پڑتا تھا من محمد فيكم کہ تم میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کون سے ہیں کیونکہ آپ کے سر پر کوئی بڑا بھاری عمامہ نہ ہوتا تھا نہ لباس دوسروں سے ممتاز

ؑ سنن ابن ماجة: ۱۸۴۶، المغني عن حمل الأسفار ۳: ۲۱ بلفظ: فمن لم يعمل بسنتي الخ)

ہوتا تھا نہ کوئی بڑا تخت تھا جس پر آپ بیٹھتے ہوں سب کی وضع اور نشست یکساں ہوتی تھی
ہاں وعظ کے لئے البتہ آپ ممبر پر بیٹھتے تھے وہ بھی امتیاز کے لئے نہیں بلکہ دینی مصلحت کی
وجہ سے۔ کیونکہ زمین پر بیٹھ کر تقریر کرنے سے مجمع کثیر کو برابر آواز نہیں پہنچ سکتی (اور آواز
بھی پہنچ جائے جیسا کہ آپ کی آواز میں یہ معجزہ تھا کہ قریب وبعید سب کو یکساں پہنچتی تھی تو
تمام سامعین آپ کے چہرہ مبارک پر تو یکساں نظر نہ کر سکتے تھے اور تقریر کے وقت متکلم کے
لب ولہجہ کے مشاہدہ سے سامعین پر ایک خاص اثر ہوتا ہے ۱۲) اور کھڑے ہو کر تقریر کرنا
بعض دفعہ تعب ومشقت کا سبب ہوتا ہے خصوصاً جبکہ دیر تک بیان کرنا ہوان وجوہ سے وعظ
کے وقت آپ ممبر پر بیٹھتے تھے باقی عام مجالس میں آپ سب کے ساتھ ملے جلے رہتے تھے
کہ کسی وضع سے امتیاز ظاہر نہ ہوتا تھا اس لئے لوگ آکر پوچھتے تھے کہ تم میں محمد صلی اللہ علیہ
وسلم کون ہیں جس کا جوب یہ ملتا تھا کہ ھذا المتکی الابیض یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ
ہیں گورے چٹے جو (ہاتھ یا دیوار کا) سہارا لگائے بیٹھے ہیں۔

حسن وجمال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

آپ کا حسن تو عجیب وغریب تھا جو ہزاروں لاکھوں میں نہ چھپتا تھا اگر یہاں کسی کو
یہ شبہ ہو کہ جب آپ کا حسن ایسا تھا تو پھر نو واردوں کو پوچھنے کی کیوں نوبت آتی تھی حسن تو
سب کو معلوم ہو جاتا ہے تو بات یہ ہے کہ (حسن بے شک چھپ نہیں سکتا مگر اس سے اتنا ہی
تو معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ شخص سب سے زیادہ خوبصورت اور جمال میں بے نظیر ہے لیکن جو
نو وارد آپ کو سلطان سمجھ کر آتا تھا اسے سامان سلطنت واسباب امتیاز نہ دیکھ کر بلکہ آپ کو
سب کے ساتھ ملا جلا دیکھ کر حیرت ہوتی ہی تھی کہ میں ان میں سے کس کو بادشاہ سمجھوں
کیونکہ حسن وجمال بدوں سامان سلطنت کے کسی کو سلطان سمجھنے کے لئے کافی نہیں ہو سکتا
دوسرے یہ کہ) آپ کا حسن ایسا لطیف تھا کہ دیکھنے والے کو فوراً اس کے تمام کمالات کا
احاطہ نہ ہوتا تھا بلکہ آپ کے حسن کی یہ شان تھی۔

یزیدک وجھہ حسناً اذا ما زدتہ نظراً

(تیرے چہرہ میں حسن زیادہ ہی ہوتا ہے جس قدر اس پر نظر زیادہ ڈالتا ہوں)

اہل کمال کو تصنع کی ضرورت نہیں

یہ تو نشست و برخاست کی کیفیت تھی۔ چلنے پھرنے میں آپ کی یہ عادت تھی کہ نہ سب سے آگے چلتے تھے نہ سب کے پیچھے بلکہ ملے جلے بیچ میں چلتے تھے اور بیچ میں اس طرح کہ کبھی دائیں کبھی بائیں غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سادگی تھی حالانکہ آپ کی شان یہ ہے کہ

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

(قصہ مختصر آپ کا رتبہ خدا کے بعد بزرگ تر ہے)

اور یہ بزرگی ہی تو وجہ تھی اس حالت کی کیونکہ اہل کمال کو تصنع کی ضرورت نہیں ہوتی تصنع اور تکلف وہ کرتا ہے جس میں ذاتی کمال نہ ہو اور جس میں ذاتی کمال ہوتا ہے وہ اسباب کمال سے مستغنی ہو جاتا ہے آپ کا ذاتی کمال خدا کی معرفت و محبت ہے اس کے ہوتے ہوئے کسی تصنع کی آپ کو ضرورت نہ تھی اور یہ کمال آپ کی برکت سے بحمد اللہ ہر مسلمان کو حاصل ہے اور جس پر اس کی عظمت منکشف ہوگئی ہے وہ بھی آپ کی طرح سب چیزوں سے مستغنی ہو جاتا ہے چنانچہ ایک کابلی کہا کرتا تھا کہ ہم بڑے امیر ہیں ہم سے بڑھ کر دولت کسی کے پاس بھی نہیں ہے ہمارے پاس **لا الہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ** کی دولت ہے مگر ہم نے اس دولت کی حقیقت کو نہیں سمجھا اس کے اثر کو دیکھا نہیں اس کی قدر کو جانا نہیں اس لئے ہم تکلف اور تصنع میں مبتلا ہیں واللہ یہ وہ دولت ہے کہ جس کے پاس یہ ہے اس کو کسی سامان کی ضرورت نہیں مگر ہماری وہ حالت ہے۔

جوئی لب ناں دربدر یک سبد پرناں ترا بر فرق سر تو ہمی
تا بزانوئی میاں قعر آب وز عطش وز جوع گشتستی خراب

(تمہارے سر پر ایک ٹوکرا روٹیوں کا دھرا ہوا ہے اور تم روٹی کے ٹکڑے کو در بدر مارے پھرتے ہو تم دریا میں زانو تک پانی میں کھڑے اور بھوک اور پیاس سے مر رہے ہو)۔

سر پر روٹیوں کا ٹوکرا بھرا ہوا رکھا ہے اور تم بھیک مانگتے پھرتے ہو۔ دوسری قوموں کے طرز اختیار کر کے دولت کے متمنی ہو حالانکہ خود تمہارے پاس اتنی بڑی دولت ہے جس کی قیمت

تمام دنیا بھی نہیں ہو سکتی ہمارے پاس واللہ سب کچھ ہے مگر خبر نہیں اور اسی بے خبری کا یہ نتیجہ ہے کہ اگر کوئی اس دولت کو جو ہمارے پاس ہے چھیننا چاہے تو بعض نادان اس سے بھی دریغ نہیں کرتے اور دنیا کے چار ٹھیکروں کے بدلے اسے دے دینا ناگوار کر لیتے ہیں اور جو کوئی ان سے چار پیسے چھین لے تو لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے ہیں ان کی ایسی مثال ہے جیسے ایک نادان بچہ کے جیب میں پندرہ روپیہ کی گنی پڑی ہو اور کوئی ایک لڈو کے بدلے میں اسے نکال لے تو وہ اس پر نہ لڑے گا لیکن ایک کانچ کے شیشہ پر لڑے گا اور روئے گا جس کی قیمت ایک پیسہ بھی نہیں تو راز کیا ہے راز یہ ہے کہ اس نادان کو گنی کی قدر و حقیقت معلوم نہیں اور کانچ کے شیشہ کی ظاہری بھڑک اس کو محبوب ہے یہی حال آج کل کے مسلمانوں کا ہے کہ ان کو ایمان کی قدر نہیں اس لئے ان کاموں سے باک نہیں جو ایمان کو زائل یا ضعیف کرنے والے ہیں ہاں روپے پیسے کی قدر ہے اس لئے نقصان مال کے ذرائع سے ڈرتے ہیں اگر ان کو متاع ایمان کی قدر معلوم ہو جائے تو پھر ان کا بھی وہی حال ہو جو اس کابلی کا حال تھا کہ اپنے کو سب سے زیادہ امیر سمجھنے لگیں غرض ہر مسلمان حقیقت میں صاحب کمال ہے اور کمال کے لئے بے تکلفی و سادگی لازم ہے بناوٹ تو وہ کرے جس میں عیب ہو اسی واسطے گنجا آدمی اپنا سر چھپایا کرتا ہے کبھی سر کھولنا پسند نہیں کرتا اور طرح طرح سے اپنا عیب ڈھانپتا ہے کہیں عمدہ ٹوپی پہنتا ہے کبھی بھڑک دار عمامہ باندھتا ہے اور جو تندرست ہو وہ تو ننگا سر ہونا زیادہ پسند کرتا ہے تاکہ اس کے بالوں کی خوبصورتی ظاہر ہو اس کو بناوٹ کی کیا ضرورت ہے۔

بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبارا

(خوبصورت چہرہ کے لئے آب و رنگ خط و خال کی حاجت نہیں ہے)

غرض صاحب کمال زیادہ زیب و زینت نہیں کیا کرتا ہاں جس میں خود کوئی کمال نہ ہو وہ زوائد سے اپنا عیب چھپایا کرتا ہے۔

نظافت تو شریعت میں مطلوب ہے

اسی لئے آپ علماء محققین کو ہمیشہ سادہ لباس میں دیکھیں گے ہاں ناقص علماء کو جبہ و دستار کے اہتمام میں مشغول پائیں گے کیونکہ ان میں خود کمال نہیں ہے وہ لباس ہی سے بڑا

بننا چاہتے ہیں۱۲) میں یہ نہیں کہتا کہ میلے کچیلے رہا کرو سادگی سے میرا یہ مطلب نہیں میں نظافت اور صفائی سے نہیں منع کرتا بلکہ تکلف اور تصنع سے منع کرتا ہوں اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے نظافت اور چیز ہے بناوٹ اور چیز ہے نظافت تو شریعت میں مطلوب ہے اور اس کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنا اہتمام فرمایا ہے کہ ارشاد فرماتے ہیں نظفوا[۱] افنیتکم ولا تشبھوا بالیھود (او کماقال) اپنے گھروں کے سامنے کا میدان بھی صاف رکھا کرو اور یہود کی مشابہت مت کرو کیونکہ یہود صفائی نہیں رکھتے تھے تو جب گھر کے سامنے میدان کی بھی صفائی کا حکم ہے تو خود گھر کی صفائی کا کتنا حکم ہوگا پھر لباس اور بدن کی صفائی کا کس درجہ کا حکم ہوگا اور جب ظاہر کی بھی صفائی مطلوب ہے تو دل کی صفائی تو کیا کچھ مطلوب ہوگی (جس کی صفائی پر آدمی کا آدمی بننا موقوف ہے کیونکہ انسان تو دل ہی سے انسان ہے۱۲)

غرض صفائی تو بڑی اچھی چیز ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا بہت اہتمام تھا آپ بہت صاف رہتے تھے اور مسلمانوں کو بھی صفائی کی تاکید فرماتے تھے۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ جمعہ کے دن کپڑے بدل کر آیا کرو مگر حکم نظافت کے ساتھ آپ کا یہ بھی ارشاد ہے البذاذة[۲] من الایمان کہ سادگی ایمان میں سے ہے اس سے معلوم ہوا کہ سادگی اور نظافت دونوں جمع ہو سکتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ کہ تصنع اور تکلف شان ایمان کے خلاف ہے مگر آج کل دونوں طرف افراط و تفریط سے کام لیا جا رہا ہے بعض لوگ جو صفائی پسند ہیں وہ تو حد تکلف تک پہنچ جاتے ہیں کہ ہر وقت بناؤ سنگار ہی میں رہتے ہیں کپڑا بھی ان کے واسطے قیمتی بھڑکدار ہونا چاہئے سرمہ کنگھی کا بھی ناغہ نہ ہونا چاہیے۔ کپڑوں پر استری کلف بھی دوسرے تیسرے دن ضرور ہونا چاہئے اور جو سادگی پسند ہیں وہ میلے کچیلے رہتے ہیں غرض اعتدال نہیں ہے۔ سادگی اور صفائی یہ ہے کہ لباس چاہے گھٹیا ہی ہو مگر داغ و دھبہ سے منزہ ہو اگر دھبہ لگ جائے فوراً اس کو چھڑا دو اگر کپڑا میلا ہو جائے اس کو صابن سے

---

[۱] سنن الترمذی: ۲۷۹۹' کشف الخفاء للعجلونی ۱: ۳۴۲' الدر المنثرہ للسیوطی: ۱۰

[۲] سنن ابن ماجة: ۴۱۱۸' المستدرک للحاکم ۱: ۹' المعجم الکبیر للطبرانی ۱: ۲۴۲' کنز العمال: ۵۶۱۹' ۵۶۲۳' مشکل الآثار للطحاوی ۱: ۴۸۷، ۴: ۱۵۱

دھوڈالو کلف اور استری کے انتظار میں نہ رہو اور اس کا انتظار تکلف ہے اسی طرح قیمتی بھڑکدار کپڑے کا اہتمام بھی تکلف ہے اور کپڑے پر داغ و دھبہ لگا رہنا یا ویسا ہی میلا کچیلا پہنے رہنا بھی برا ہے کہ یہ صفائی اور نظافت کے خلاف ہے اس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ سادگی اور صفائی کس طرح جمع ہو سکتے ہیں۔ پس سادگی کے ساتھ صفائی کا اہتمام بھی کرنا اعتدال ہے۔

نقش ونگار کی ممانعت کا سبب

ہمارے بزرگان دین نے کبھی کسی قسم کا تکلف نہیں کیا ہمیشہ سادگی اور اعتدال کو ملحوظ رکھا ہم کو بھی اپنی معاشرت ایسی ہی سادہ رکھنا چاہیے حتیٰ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو مسجد میں بھی تکلف کو گوارا نہیں فرمایا چنانچہ نقش ونگار کی ممانعت فرمائی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بناء مسجد کے وقت معمار سے فرمایا **اکن الناس من الحر والبر دو ایاک ان تحمر او تصفر فتفتن الناس** (لوگوں کو گرمی سردی سے بچا سرخ اور زرد رنگ کرنے سے بچ لوگوں کو اس سے فتنہ میں مت ڈال) نقش ونگار کی اس واسطے ممانعت ہے کہ یہ فتنہ ہیں اس تکلف و بناوٹ سے آدمی اصل کام سے رہ جاتا ہے۔ بس انہی کے دیکھنے بھالنے میں مشغول ہو جاتا ہے۔ نماز میں یکسوئی نصیب نہیں ہوتی۔ دیکھئے تاج بی بی کے روضہ پر جا کر فاتحہ اور **قل ھو اللہ** تو شاید ہی کسی کو یاد رہتی ہو بس یہی ہوتا ہے کہ یہ بیل کیا عمدہ ہے یہ پھول پتیاں کیسے خوبصورت ہیں کاری گر نے تراش میں کیسی خوبی رکھی ہے اور ایک جامع مسجد دہلی ہے کہ اس میں خوبصورتی کے ساتھ سادگی بھی ہے دیکھنے میں سیدھی سادی عمارت ہے ہاں اس کی خوبیاں غور کرنے سے معلوم ہوتی ہیں اور تاج بی بی کے روضہ میں خوبیاں کھلی ہوئی ہیں اس کا حسن بہت کھلم کھلا ہے جو اصل مقصود سے مانع ہو جاتا ہے اسی لئے ہمارے فقہا نے مساجد میں ایسے نقش ونگار اور ظاہری بھڑک کو مکروہ قرار دیا ہے۔ جس سے نمازیوں کا دل بٹنے لگے حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ایک وہ وقت آوے گا کہ لوگ مسجد بنانے پر باہم فخر کریں گے ایک اپنی مسجد کو اچھا کہے گا تو دوسرا اس سے اچھی بنانے کی کوشش کرے گا چنانچہ آج کل اس کا ظہور ہو رہا ہے کہ مسجدیں بھی نام کے واسطے بنائی جاتی ہیں حتیٰ

کہ جب کوئی مسجد بناتا ہے تو نئی بناتا ہے گونئی مسجد کی ضرورت نہ ہو پرانی مسجد کی تعمیر میں رقم لگانے کو پسند نہیں کرتے کیونکہ نام نہ ہوگا یوں سمجھتے ہیں کہ پرانی مسجد میں عمارت سے نام تو اصل بانی کا ہوگا پھر ہم کیوں اس میں رقم لگا ئیں۔ مگر خوب سمجھ لو کہ شہرت کی طلب سے شہرت نہیں ہوتی شہرت بھی اپنے کو مٹانے ہی سے ہوتی ہے کسی نے خوب کہا ہے۔

اگر شہرت ہوس داری اسیر دام عزلت شو　　　که در پرواز دارد گوشہ گیری نام عنقارا

(اگر شہرت کی ہوس ہے گوشہ نشینی اختیار کرو گوشہ گیری سے عنقا کا نام مشہور ہے)

دیکھو عنقا پوشیدہ ہو گیا تو اس کا کس قدر نام ہوا کہ ہر شخص کی زبان پر اس کا نام ہے ہر غائب ہونے والے کو عنقا ہی سے تشبیہ دیتے ہیں ایسے ہی حضرات اہل اللہ کو دیکھو کہ وہ اپنے کو مٹاتے ہیں تو ان کا کتنا نام ہوتا ہے حتیٰ کہ مرنے کے بعد ان کی جوتیاں بھی تبرکات میں رکھی جاتی ہیں اور بادشاہوں کے عمدہ عمدہ تخت کی بھی کسی کو خبر نہیں غرض اول تو نام کی طلب ہی فضول ہے نام تو خدا ہی کا ہے اگر ہمارا نام مٹ ہی گیا تو کیا ہوا مٹنے کے لئے تو پیدا ہوئے ہیں اور اگر کسی کو طلب ہی ہو تو اس کا طریقہ یہ نہیں کہ شہرت کے سامان جمع کرے بلکہ اس کا طریقہ بھی اپنے کو مٹانا ہی ہے افسوس تو یہ ہے کہ آج کل لوگوں نے موت کو بھی تفاخر کا موقع بنا رکھا ہے چنانچہ کہیں تیجہ ہوتا ہے کہیں دسواں کہیں چالیسواں اور ان میں بڑا سامان اور تکلف کیا جاتا ہے یہ مسئلہ تو الگ رہا کہ یہ رسوم سنت کے خلاف ہے یا موافق مگر میں اس وقت ایک موٹی سی بات بتلاتا ہوں جس سے ان کا قبح بہت سے سہولت سے واضح ہو جائے گا وہ یہ کہ حدیث میں ہے انما[1] الاعمال بالنیات و انما لکل امری مانوی یعنی اعمال کا اعتبار نیت سے ہے (ہر آدمی کے لئے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی ہے) تو اب یہ دیکھئے کہ تیجہ، دسواں کرنے والوں کی نیت کیا ہوتی ہے اس کا اندازہ اور امتحان اس طرح ہوسکتا ہے کہ اگر کسی نے اپنی ماں کے ایصال ثواب کے لئے پچاس روپے تجویز کئے ہوں اور ان کی پلاؤ پکوا کر مسجدوں میں یا غریبوں کے گھر بھیجنا چاہتا ہو تو ہم یا آپ اس کو یہ

---

[1] الصحیح للبخاری ۱:۲، ۸:۱۷۵، ۹:۲۹ ، سنن ابی داؤد: ۲۲۰۱ ، سنن الترمذی: ۱۶۴۷ ، سنن النسائی کتاب الطهارة باب: ۵۹، کتاب الایمان و النذور باب: ۱۹ ، سنن ابن ماجة: ۴۲۲۷ ، تفسیر ابن کثیر ۲: ۳۴۵ ، شرح السنة للبغوی ۱: ۴۰۱

مشورہ دیں کہ کیا اس کو اسلامی مہینوں کی بھی خبر ہے یا نہیں (بس انگلستان سے پاس کیا ہوئے تھے کہ اسلام سے دور ہو گئے ۱۲)

حسن تعلیم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حسن تعلیم کو ملاحظہ فرمایئے کہ آپ فرماتے ہیں لَا یغلبنکم[1] الاعراب علیٰ اسم العشا الاخرۃ وکانو ایسمونہا العتمۃ (او کما قال) مطلب یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عشاء کے وقت کو عتمہ کہا کرتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جہلا عرب اس لفظ میں تم پر غلبہ نہ کرنے پائیں کہ تم بھی ان کی طرح عشاء کو عتمہ کہنے لگو۔ اس میں اس بات کی تعلیم ہے کہ شریعت نے جن الفاظ میں اپنی کوئی خاص اصطلاح مقرر کی ہے مسلمانوں کو اسی کا استعمال کرنا چاہیے اس کو چھوڑ کر کفار کی اصطلاح نہ برتنی چاہیے ظاہر میں تو یہ معمولی بات ہے کہ بول چال میں اپنے اسلامی الفاظ بولے جائیں مگر اس کے چھوڑنے میں جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ان کو دیکھ کر اس تعلیم کی قدر معلوم ہوتی ہے واقعی اگر سب مسلمان الفاظ کو معمولی چیز سمجھ کر دوسری زبان کے مہینے استعمال کرنے لگیں تو رمضان اور عید اور حج وغیرہ کا کسی کو پتہ بھی نہ چلے کہ یہ کب آئے تھے اور کب چلے گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رعایت الفاظ کی تعلیم فرما کر حقیقت میں محض الفاظ کو نہیں سنبھالا بلکہ دین کو سنبھالا ہے مگر آج کل لوگ ان کو معمولی بات سمجھتے ہیں چنانچہ اسی کا اثر یہ ہے کہ وہ گنوار حکیم صاحب سے کہنے لگا کہ اب کے تو میرے باپ کو بچا ہی لو کیونکہ چاول بہت گراں ہیں اگر یہ مر گیا تو برادری کو تیجہ دسویں میں کھانا کھلانا پڑے گا جس کی مجھ میں ہمت نہیں اس غریب کو باپ کے مرنے کا اس قدر فکر نہ تھا جس قدر کہ اس بات کا فکر تھا کہ اب کے مر گیا تو خرچ بہت ہوگا۔ یہ قصہ تو قصبہ کیرانہ کا ہے اور خود ہمارے قصبہ میں بھی ایک قصہ یہ ہوا کہ ایک دن کوئی بڑھیا عورت ہمارے گھر میں آ کر کہنے لگی کہ میں فلانی کے گھر گئی تھی اس کی ساس مر گئی ہے وہ بہت رو رہی تھی اور یوں کہتی تھی کہ مجھے اس کے کفن و دفن کا تو زیادہ فکر نہیں مجھے تو زیادہ غم اس بات کا ہے کہ اس وقت گھر میں کچھ بھی نہیں ہے اور مرنے کی خبر سن کر ساری برادری جمع ہو جاوے گی ان کے کھلانے پلانے کا سامان تو بھلا کس سے ہو مگر

---

[1] مسند الإمام أحمد ۲: ۱۰، ۱۹، السنن الکبری للبیھقی ۱: ۳۷۲، مجمع الزوائد للھیثمی ۱: ۳۱۴، صحیح ابن خزیمہ: ۳۴۱، حلیۃ الأولیاء لأبی نعیم ۸: ۳۸۵.

کہیں سے آٹھ آنہ پیدا ہو جاتے تو میں پان چھالیا منگا لیتی آنے والیوں کے سامنے پان ہی رکھے جاتے اور کفن تو ہو ہی رہے گا۔ اس کا انتظام تو برادری کے مرد خود کر لیں گے۔

پیرانی صاحبہ کی عملی تبلیغ

یہ سن کر میں نے اپنے گھر میں کہا کہ یہ کام تمہارے کرنے کا ہے کیونکہ وعظ کہاں تک اثر کرے گا تم اس رسم کو توڑو اور عورتوں کو سمجھاؤ کہ میت کے گھر جا کر کھانا پینا بہت بری بات ہے۔ ایک تو ان غریبوں پر موت کا صدمہ ہوا اور دوسرا صدمہ ان پر یہ ڈالا جاوے کہ وہ آنے والیوں کے کھانے پینے اور پان چھالیہ کا انتظام کریں بہت شرم کی بات ہے میرے گھر میں اس سے پہلے کسی شادی غمی میں نہیں جاتی تھیں کیونکہ اکثر جگہ منکرات ہوتے ہیں مگر میں نے اس ضرورت سے ان کو غمی کے مواقع میں جانے کی اجازت دے دی اور یہ کہا کہ دین کا کام ہے اس لئے تم کو شرکت کرنی چاہئیے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا کرنا شروع کیا اور عورتوں کو میت کے گھر جا کر کھانے پینے حتیٰ کہ پان کھانے سے بھی روکا زیادہ اثر اس کا ہوا کہ انہوں نے خود اس پر عمل کیا کہ جس کے گھر گئیں اس کے یہاں پان تک نہ کھایا اول اول تو بہنوں نے ناک منہ چڑھایا کہ کیا ہم ایسے گرے پڑے اور مفلس غریب ہیں جو آنے والیوں کے پان چھالیہ کی بھی ہمیں مقدور نہ ہو لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں سب مستورات نے اس پر عمل شروع کر دیا اور اب کوئی میت کے گھر پر پان تک نہیں کھاتی مرد تو بعض دفعہ چوک بھی جاتے ہیں مگر عورتیں بالکل پختہ ہیں غرض رسوم کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ ان سے تفاخر کے سوا کچھ مقصود نہیں حتیٰ کہ موت کو بھی مایہ فخر بنا رکھا ہے اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ شریعت میں اعمال کا اعتبار نیت پر ہے۔ جب ان میں لوگوں کی یہ نیتیں ہیں تو بتلایئے ان کو کس طرح جائز کہا جاوے میں نے بعض شہروں میں دیکھا ہے کہ میت کے اوپر دو شالہ ڈالتے ہیں مگر وہ غریبوں کو نہیں دیا جاتا بلکہ تھوڑی دیر کے بعد اتار کر گھر میں دھر لیا جاتا ہے اور مزا یہ کہ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ مردہ کی ہر چیز منحوس ہو جاتی ہے مگر ہمارا نفس بڑا شریر ہے کہ اپنا نفع کہیں جانے نہیں دیتا چنانچہ گاڑھے اور لٹھے کے کپڑے تو منحوس ہو جاتے ہیں مگر دوشالہ اور روپیہ اور مردہ کا گھر اور جائیداد وغیرہ قیمتی اشیاء منحوس نہیں ہوتیں وہ تو ایسا مبارک ہے کہ بے مانگ

نہ ملے تو اس کا غصب بھی عوام کے نزدیک جائز ہے چنانچہ میت کے روپے میں اکثر غبن ہوتا ہے جس کے جو ہاتھ لگا لے لیا دوسروں کو پتہ ہی نہیں دیتے علیٰ ہذا مکان اور جائیداد میں ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اکیلا میں ہی سب کا مالک بن بیٹھوں کاش! اگر یہ گاؤں بھی منحوس ہو جاتے تو آج ہمیں ترکوں کے چندے ہی میں مل جاتے مگر نفس بڑا عقلمند ہے یہ انہی چیزوں کو منحوس بتاتا ہے جو گھٹیا قیمت کی ہوں (اگر کسی عورت نے اطلس و کمخواب کے کپڑے چھوڑے ہوں تو انہیں کوئی منحوس نہیں سمجھتا گو وہ اس کے ایک دو دفعہ استعمال کئے ہوئے بھی ہوں ۱۲) غرض مردہ پر دوشالہ ڈالنا محض تفاخر کے لئے ہوتا ہے تو کیا ٹھکانا ہے ہماری غفلت کا کہ ہم نے موت کو بھی مایہ فخر بنالیا ہے۔ سچ ہے۔

کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری

مرنے والا تو بیچارہ جان سے گیا اور آپ کو ایک مشغلہ ہاتھ آ گیا کہ اس وقت بھی دل کے حوصلے نکالے جاتے اور فخر و نمود کے سامان کئے جاتے ہیں ۱۲) حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ پسند خصوصاً میت کے لئے سفید کپڑا تھا مگر ہم لوگ خلاف سنت رنگ برنگ کے دوشالے ڈالتے ہیں جو محض فخر کے لئے ڈالے جاتے ہیں غریبوں کو دینے کو نہیں ڈالتے اور اگر کسی نے غریبوں ہی کو دے دیا تو یہ دینا بھی فخر ہی کے لئے ہے تاکہ لوگ یہ کہیں کہ فلاں شخص بڑا عالی حوصلہ ہے جس نے اپنے باپ کے اوپر پچاس روپیہ کا دوشالہ ڈالا تھا اور اتار کر اللہ واسطے دے دیا بلکہ غور کر کے دیکھا جائے تو سفید کپڑا بھی جو کفن کے علاوہ مردہ کے اوپر ڈالا جاتا ہے وہ بھی فخر ہی کے لئے ہوتا ہے کیونکہ اوپر کی چادر کفن سے خارج ہے بس کفن تو اسی قدر ہے جس میں مردہ لپٹا ہوا ہوتا ہے۔ یہ زائد چادرہ کفن میں داخل نہیں (اس کا منشا کہیں تو اکرام میت ہے اور اکثر محض فخر ہے ۱۲)

اور یہاں سے یہ بات سمجھنے کے قابل ہے کہ اکثر لوگ اس کی پروا نہیں کرتے کہ اوپر کا چادرہ ترکہ میں سے نہ ہو حالانکہ یہ بہت ضروری بات ہے مگر عام دستور یہ ہے کہ چادر بھی ترکہ ہی میں سے منگائی جاتی ہے کیونکہ یہ بات ٹھہری ہوئی ہے کہ تجہیز و تکفین کا خرچ ترکہ میں سب سے مقدم ہے یہ مقدمہ تو صحیح ہے مگر غلطی یہ ہے کہ اوپر کے کپڑے کو کفن میں داخل سمجھ کر اس کو بھی سب سے مقدم کرتے ہیں حالانکہ وہ کفن میں داخل نہیں اور اس کی قیمت

ترکہ سے دینا بدوں تمام وارثوں کی اجازت کے حلال نہیں اور زیادہ تر یہی ہوتا ہے کہ ورثاء متعدد ہوتے ہیں اور سب سے اس کی اجازت نہیں لی جاتی اور جو ایک دو سے لے بھی لی تو بعض کی اجازت معتبر نہیں سب کی اجازت ہونی چاہیئے بشرط بلوغ (اس لئے اول تو اس چادرہ کی مردے کے لئے ضرورت ہی نہیں اور اگر کسی کا ایسا ہی دل چاہے تو اس کی قیمت اپنے پاس سے دینا چاہیئے ترکہ میں سے نہ دینا چاہیے ۱۲)

ترکہ کے مال میں ضرورت احتیاط

ترکہ کے مال میں لوگ بالکل احتیاط نہیں کرتے جو لوگ میت کے گھر جاتے ہیں وہ بے تکلف اس کی چیزیں استعمال کرتے رہتے ہیں حالانکہ مرنے کے بعد فوراً وہ تمام چیزیں میت کی ملکیت سے نکل کر ورثاء کی ملک میں داخل ہوگئی ہیں اب ان کا استعمال بدوں تمام ورثاء کی اجازت کے جائز نہیں۔ اہل تقویٰ نے یہاں تک احتیاط کی ہے کہ ایک بزرگ رات کے وقت اپنے دوست کی عیادت کو گئے اور ان کے سامنے اس کا انتقال ہوگیا تو آپ نے فوراً چراغ گل کر دیا اور ایک شخص کو اپنے پاس سے پیسے دیئے کہ بازار سے تیل لے آؤ کیونکہ اس چراغ کا تیل میت کے مرتے ہی ورثاء کی ملک ہوگیا ہے جن میں بعض حاضر اور بعض غائب ہیں (اور ممکن ہے کوئی نابالغ بھی ہو) اس سے انتفاع اب درست نہیں ،حضرت یہ بات آپ کو عجیب معلوم ہوتی ہوگی مگر تعجب کا منشا یہ ہے کہ آپ کو ان امور کا اہتمام نہیں اگر آپ کو بھی حلال وحرام کا خیال ہو جائے تو پھر آپ کا بھی یہی معمول ہوگا۔

بیت المال میں ضرورت احتیاط

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ رات کے وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ ان سے ملنے کو آئے۔ حضرت عمرؓ نے ان کو اندر بلا لیا اور ان کے آتے ہی چراغ گل کر دیا۔ حضرت علیؓ نے پوچھا کہ میرے آتے ہی آپ نے چراغ کیوں گل کر دیا فرمایا کہ اس میں بیت المال کا تیل ہے اور میں اس وقت بیت المال ہی کا کام کر رہا تھا اب چونکہ ہم اور آپ باتیں کریں گے اور یہ کام بیت المال کا نہیں ہے اس لئے اس تیل سے بات چیت میں انتفاع نہیں کر سکتے حضرت آپ کو اس پر بھی تعجب ہوگا مگر اس کی وجہ وہی ہے کہ آپ کو شریعت کے اصول وقواعد معلوم نہیں اور

3 جو معلوم بھی ہیں تو ان پر عمل کا اہتمام نہیں ہے، شاید یہاں کسی کو یہ خیال پیدا ہوا ہو کہ اتنی احتیاط کس سے ہو سکتی ہے یہ تو قدرت سے باہر ہے تو سن لیجئے کہ قدرت سے باہر تو نہیں ہاں دشوار ضرور ہے مگر دشواری اسی وقت تک ہے جب تک آپ نے ہمت نہیں کی ذرا ہمت کر کے عمل شروع کیجئے ان شاء اللہ قدم قدم پر غیب سے اعانت ہوگی۔

ہمت وارادہ کے سبب نصرت خداوندی

چنانچہ میں اپنا ایک واقعہ بیان کرتا ہوں جس سے معلوم ہوگا کہ ہمت وارادہ کے بعد حق تعالیٰ کیسی امداد فرماتے ہیں۔

بارہ اکبر پور ایک مقام ہے اس کے قریب ایک چھوٹا سا اسٹیشن لالپور ہے ایک دفعہ میں بارہ سے وہاں پہنچا اور بارش کے سبب وقت سے بہت پہلے پہنچا اتفاق سے جس وقت میں پہنچا بارش ہونے لگی اور اسٹیشن کا سائبان بوچھار سے نہ بچا سکتا تھا۔ اکبر پور میں ایک منصف صاحب میرے جاننے والے تھے ان کو اطلاع ہوگئی تو انہوں نے اسٹیشن ماسٹر کو لکھ دیا کہ یہ ہمارے دوست ہیں ان کی راحت کا کافی انتظام کیا جائے۔ اس غریب نے ہمارے واسطے ایک بڑا کمرہ کھلوا دیا شام ہوئی تو چوکیدار سے کہا کہ کمرہ میں روشنی کر دو اس وقت میرے دل میں یہ خیال آیا کہ غالباً اس وقت ہمارے واسطے سرکاری تیل جلا کر روشنی کی جاوے گی جو شرعاً جائز نہیں کیونکہ سرکاری تیل سرکاری کاموں کے واسطے دیا جاتا ہے نہ کہ مسافروں کی خاطر رات بھر جلانے کے واسطے اب اگر اسٹیشن ماسٹر مسلمان ہوتا تو میں بے تکلف اس سے کہہ دیتا کہ ہمارے واسطے سرکاری تیل کا جلانا جائز نہیں مگر وہ ہندو تھا میں نے سوچا کہ اس کے سامنے شرعی مسئلہ بیان کروں تو یہ کیا سمجھے گا بلکہ عجب نہیں کہ تمسخر کرنے لگے غرض جب کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی تو میں نے خدا تعالیٰ سے دعا کی کہ اس وقت آپ ہی مجھ کو گناہ سے بچائیے میری کوشش تو بے کار ہے۔ میں دل دل میں دعا ہی کر رہا تھا کہ دفعۃً اسٹیشن ماسٹر نے ملازم سے کہا کہ دیکھو سرکاری تیل نہ جلانا ہماری ذاتی لالٹین رکھ دینا۔ اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اگر انسان ہمت وارادہ کرے تو خدا تعالیٰ مدد کرتے ہیں اس لئے آپ گھبرائیں نہیں بلکہ ہمت سے کام لینا چاہئے۔ دنیا کے کاموں میں تو آپ کبھی ہمت نہیں ہارتے بڑے سے بڑا اور مشکل سے مشکل کام شروع کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ السعی

منی و الا تمام من اللہ (میرا کام کوشش کرنا ہے پورا کرنا اللہ کا کام ہے) چنانچہ اس نیت کی برکت سے کامیاب بھی ہوتے ہیں مگر دین کے کاموں میں ہمت نہیں کرتے۔

ہمت کی فضیلت

صاحبو! ہمت وہ چیز ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو جب زلیخا نے اپنی طرف مائل کرنا چاہا تو اس مکان کے ساتوں دروازوں پر قفل ڈال رکھے تھے جب حضرت یوسف علیہ السلام نے زلیخا کا ارادہ معلوم کیا اور وہاں سے اٹھ کر بھاگنا چاہا تو یہ دیکھ کر سخت گھبرائے کہ میرے سامنے سات دروازے ہیں اور ہر ایک پر مضبوط قفل لگا ہوا ہے اب دیکھئے اس وقت ہماری ہمت کہاں تک بڑھ سکتی تھی اگر ہم ہوتے تو بھاگنے کا کبھی خیال ہی نہ کر سکتے مگر نبی کی ہمت ہمت ہی ہے یوسف علیہ السلام نے یہ سوچا کہ مجھے قفل تک تو بھاگنا چاہئے اس کے بعد جو چاہے سو ہو مجھے اپنی ہمت کے موافق کام کرنا چاہئے آگے خدا کا کام ہے چنانچہ وہ زلیخا کے پاس سے بھاگے اور زلیخا ان کے پیچھے پیچھے پکڑنے کو دوڑی پھر اس ہمت کا نتیجہ یہ ہوا کہ حق تعالیٰ نے امداد فرمائی اور جس دروازہ پر یوسف علیہ السلام پہنچتے تھے اس کا قفل خود بخود گر جاتا اور کواڑ چوپٹ کھلتے جاتے تھے۔ لوگ یوسف علیہ السلام کے اس فعل کو (ابتداء میں) خلاف عقل کہتے ہوں گے کہ بھلا جب دروازے مقفل تھے اور کنجی اپنے پاس نہ تھی تو بھاگنا فضول حرکت تھی اس وقت بھاگنے سے کہیں دروازے کھل سکتے تھے مگر صاحبو!

عقل در اسباب می دارد نظر   عشق میگوید مسبب رانگر

(عقل اسباب کو دیکھتی ہے عشق مسبب کی طرف دیکھتا ہے)

عارف کی نظر مسبب الاسباب پر ہوتی ہے

عارف کی نظر اسباب پر نہیں ہوتی وہ مسبب الاسباب کو دیکھتا ہے اور اس پر بھروسہ کر کے وہ کام شروع کر دیتا ہے جو بظاہر قدرت سے باہر ہوتا ہے مگر حق تعالیٰ کی امداد سے ان کو کامیابی ہوتی ہے ہماری اور اہل عرفان کی ایسی مثال ہے جیسے ایک گنوار نے کبھی یہ دیکھا تھا کہ لال جھنڈی کے ہلنے سے ریل رک گئی تھی وہ یہ سمجھا کہ اس لال جھنڈی میں کچھ خاصیت ہے اس نے ڈرائیور کو نہیں دیکھا مگر اس وقت ایک عاقل بھی کھڑا تھا اس نے لال

جھنڈی کے دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ اس میں تو ریل کے روکنے کی طاقت نہیں اب یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ جھنڈی دکھائی کس کو گئی ہے۔ چنانچہ ڈرائیور پر اس کی نظر پہنچی اور اس نے تاڑ لیا کہ لال جھنڈی کو دیکھ کر یہ شخص ریل کو روک دیتا ہے اب وہ اس گنوار سے کہتا ہے کہ لال جھنڈی ریل کو نہیں روکتی بلکہ اس کو دیکھ کر ڈرائیور روک دیتا ہے تو وہ اس کو خلاف عقل سمجھے گا اور یہ کہے گا کہ اگر ڈرائیور روکتا تو ہم کو بھی تو نظر آتا اس سے معلوم ہوتا ہے جھنڈی ہی روکنے والی ہے یہی حالت ہماری ہے کہ ہم نے آگ سے بہت سی چیزوں کو جلتے ہوئے دیکھا ہے پانی سے ٹھنڈک پہنچنے کا احساس کیا تو بس انہی کو فاعل سمجھنے لگے مگر عارف کی نظر مسبب پر ہے وہ دیکھ رہا ہے کہ ان اسباب کے اختیار کرنے پر جب حق تعالیٰ کا حکم بھی ہوتا ہے اس وقت اثر ہوتا ہے ورنہ کچھ نہیں ہوتا اس لئے وہ حق تعالیٰ کو فاعل سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ آب و آتش میں کچھ نہیں رکھا بلکہ سب کچھ خدا ہی کرتا ہے مگر

عشق من پیدا و معشوقم نہاں یار بیروں فتنہ او در جہاں

(یار تو جہاں سے باہر ہے مگر اس کا تصرف جہاں کے اندر ہے اور وہ خود نظر نہیں آتا) وہ نظر نہیں آتے اس لئے تم نے ظاہری اسباب کو مؤثر سمجھ لیا ہے (اور گو آنکھوں سے تو عارف کو بھی نظر نہیں آتے مگر وہ دل کی نگاہ سے ان کو دیکھتا ہے) پس ہمارا یہ کہنا کہ بدوں کنجی کے خود بخود قفل نہیں کھل سکتا ایسا ہی ہے جیسے وہ گنوار کہتا تھا کہ بدوں لال جھنڈی کے ریل کبھی نہیں رک سکتی مگر یہاں ہر شخص اس کو بیوقوف بناتا ہے اور کہتا ہے کہ روکنے والا تو ڈرائیور ہے وہ بدوں جھنڈی کے بھی روک سکتا ہے اسی طرح عارفین اس بات میں ہم کو بیوقوف کہتے ہیں کہ قفل خود بخود نہیں کھل سکتا وہ فرماتے ہیں کہ کنجی کے بعد بھی کھولنے والے حق تعالیٰ ہی ہیں وہ اگر چاہیں تو بدوں کنجی کے بھی کھول سکتے ہیں اسی خیال سے یوسف علیہ السلام قفل کی طرف دوڑے گو آپ اس کو خلاف عقل کہیں مگر ان کی نظر خدا پر تھی وہ جانتے تھے کہ لوہے کی نرمی اور آگ کی گرمی سب خدا کے اختیار میں ہے اگر وہ چاہیں تو آگ سے بھی لوہے کو نرم نہ کریں اور اگر چاہیں تو بدوں آگ کے نرم کر دیں باقی یہ اس کا فضل ہے کہ اس نے ایک خاصیت کو معتاد غالب کر دیا ہے کہ لوہے میں سختی غالب ہے اور آگ میں گرمی غالب ہے۔

خرق عادت کو معجزہ کہتے ہیں

چنانچہ اکثر یہی ہوتا ہے کہ بدوں آگ پر گرم کئے لوہا نرم نہیں ہوتا تاکہ آپ دنیا کے کام کر سکیں اگر ہمیشہ خود بخود لوہا نرم ہو جایا کرتا تو سارے اوزار اور تمام تالے بے کار ہو جاتے مگر اس سے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا اگر حق تعالیٰ چاہیں تو اس کے خلاف بھی کر سکتے ہیں مگر وہ ایسا کبھی کبھی کیا کرتے ہیں ہمیشہ نہیں کرتے اس لئے خرق عادت کو معجزہ کہا جاتا ہے اور اسی واسطے یوسف علیہ السلام کے دوڑنے سے تالوں کا گر جانا ان کا معجزہ شمار کیا جاتا ہے اور اگر کسی مسلمان کے لئے ایسا واقعہ ہو جائے تو اس کو کرامت کہا جائے گا جب حق تعالیٰ اسباب کے خلاف بھی کام کر سکتے ہیں تو پھر آپ ہمت کیوں ہارتے ہیں جو کام آپ کو مشکل نظر آتا ہے وہ خدا کو تو مشکل نہیں آپ خدا پر نظر کر کے کام شروع کیجئے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید　　　خیر یوسف وار می باید دوید

یعنی گو اس جہان میں خدا تک پہنچنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا مگر تم (یوسف علیہ السلام کی طرح) دوڑ تو سہی ان شاء اللہ تمہارے دوڑتے ہی راستہ نکل آئے گا جیسے یوسف علیہ السلام کے دوڑنے سے پہلے راستہ بند تھا اور ان کے دوڑتے ہی فوراً راستہ کھل گیا اور اگر بالفرض تمہاری کوشش کے بعد بھی راستہ نہ ملا تو تم پر ملامت تو نہ ہوگی یہ نفع کیا کچھ کم ہے کہ تم الزام سے سبکدوش ہو جاؤ گے۔

کم ہمتی کے بہانے

باقی کام شروع کرنے سے پہلے ہی باتیں بنانا اور یہ کہنا کہ یہ تو بڑا مشکل ہے کیونکر کریں یہ سب کم ہمتی کے بہانے ہیں مجھے اس مقام پر ایک حکایت خوب یاد آئی جب حضرت شاہ غلام رسول صاحب کانپوریؒ اپنے شیخ کی خدمت میں بیعت کے لئے حاضر ہوئے تو انہوں نے استخارہ کے لئے فرمایا تھوڑی دیر مسجد میں بیٹھ کر پھر حاضر ہو گئے پوچھا استخارہ کر لیا کہا جی ہاں کر لیا فرمایا تم تو بہت جلدی آ گئے تم نے کیونکر استخارہ کیا تھا۔ عرض کیا حضرت میں نے اپنے

نفس سے کہا تھا کہ تو جو بیعت ہوتا ہے یہ غلامی ہے تو خواہ مخواہ آزادی کو چھوڑ کر غلامی کی قید میں کیوں پھنستا ہے میرے نفس نے جواب دیا کہ اس قید سے مجھے خدا مل جائے گا۔ میں نے کہا تیرا کیا اجارہ کہ تجھے خدا مل ہی جائے گا۔ اگر نہ ملا تو اس نے جواب دیا کہ اگر خدا نہ بھی ملا تو ان کو یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ اس نے مجھ کو طلب کیا تھا بس مجھے یہی کافی ہے۔

ہمینم بس اگرکاسد قماشم کہ من نیز از خریدارانش باشم
ہمینم بس کہ داند ماہرویم کہ من نیز از خریداران اویم

(مجھ کو یہی کافی ہے اگر چہ میرے پاس کھوٹی پونجی ہے کہ میں بھی اس کے خریداروں میں ہوں یہی مجھ کو کافی ہے کہ میرے محبوب کو علم ہو جائے کہ میں بھی اس کے خریداروں میں سے ہوں)
سبحان اللہ! یہ وہ مقصود ہے جس میں وسوسہ کا احتمال ہی نہیں کیونکہ حق تعالیٰ کو طلب کی اطلاع تو یقیناً ہوتی ہے اس میں کچھ شبہ ہی نہیں ہو سکتا اور یہی مقصود ہے تو اب شیطان کو وسوسہ ڈالنے کا کوئی راستہ نہیں مل سکتا بس ہم کو بھی ذکر و طاعات سے اسی ثمرہ کا قصد کرنا چاہیے کہ حق تعالیٰ کو ہماری طلب کی خبر ہو جاوے اب آگے ملنے نہ ملنے کا انہیں اختیار ہے۔ خوب فرماتے ہیں۔

کار خود کن کار بیگانہ مکن

(اپنا کام کرو دوسرے کے کام کی فکر میں نہ پڑو)
تم اپنا کام کرو یعنی طلب ظاہر کرو آگے وصال و عدم وصال یہ خدا کا کام ہے تم اس کے پیچھے نہ پڑو۔ شیخ نے یہ عجیب استخارہ سن کر فرمایا کہ بھائی تمہارا استخارہ سب سے بڑھا ہوا ہے۔ آؤ بیعت ہو جاؤ (واقعی جس کو طلب ہوتی ہے اسے حق تعالیٰ خود ہی بڑھا دیتے ہیں ۱۲) مجھے اس استخارہ پر ایک اور حکایت یاد آئی۔ ہمارے اطراف میں ایک بزرگ تھے مولانا مظفر حسین صاحبؒ ورع اور تقویٰ میں بے مثل تھے ان کے سامنے ایک صاحب باطل نے اہل حق کی جماعت پر ایک خاص مقصود کے متعلق کوشش کرنے پر جس میں ناکامی ہوئی تھی اعتراض کیا کہ آپ لوگوں کو بھلا کیا ملا مولانا مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ کچھ نہیں ملا مگر۔

سودا قمار عشق میں شیریں سے کوہ کن بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپکو کہتا ہے عشق باز اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

خلاصہ یہ کہ مقصود کے لئے ہمت اور سعی کو صرف کر دینا ہی بڑی کامیابی ہے تو میں کہتا ہوں کہ جو احکام آپ کو دشوار معلوم ہوتے ہیں ان کے بجالانے میں آپ کو ہمت تو کرنا چاہئے اگر اس کے بعد بھی آپ کامیاب نہ ہوں تو آپ پر ملامت نہ ہوگی۔

صاحبو! دنیا کے کاموں میں آپ کا یہی طرزِ عمل ہے کہ ہمت وسعی کا صرف کر دینا ہی بڑی کامیابی شمار ہوتی ہے دیکھئے بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی کا کوئی عزیز بیمار ہوا اور طبیب کے کہنے سے اس کی صحت سے مایوسی ہوگئی لیکن باوجود اس مایوسی کے کیا آپ نے کبھی علاج معالجہ کو ترک کیا ہے کبھی نہیں گو بعضے بخیل ایسے بھی ہیں چنانچہ ہمارے قصبہ میں ایک شخص بیمار ہوئے ان کے سالے صاحب ان کے مال پر قابض ہونے والے تھے اس لئے ان کا معالجہ نہ کرتے تھے کہ ان کا جلدی خاتمہ ہو تو ہم رئیس بنیں۔

مگر ایسی نظیریں بہت کم ہیں اور جو ایسے ہیں بھی ان کو سب برا بھلا بھی کہتے ہیں عام دستور یہی ہے کہ باوجود مایوسی کے بھی سعی کو موقوف نہیں کیا جاتا، آپ خود غور کرلیں کہ ایسے وقت طبیعت نے یہ کبھی گوارا نہ کیا ہوگا کہ کچھ نہ کرو بلکہ جی میں یہ آیا ہوگا کہ علاج معالجہ سے اس کے تندرست ہونے کی امید نہیں مگر کچھ نہ کرنے سے بعد میں ارمان آئے گا کہ شاید ہم ایسا کرتے تو اچھا ہو ہی جاتا اور علاج میں پوری سعی کرنے کے بعد کچھ ارمان نہ رہے گا تو جب دوسروں کے لئے باوجود مقصود سے مایوسی کے آپ محض اس لئے سعی کرتے ہیں کہ دل میں ارمان نہ رہے تو کیا اپنے واسطے آپ کو اتنا بھی نہ کرنا چاہئے تو چلئے میں آپ کے کہنے کو تسلیم کئے لیتا ہوں کہ بعض احکام پر عمل میں کامیابی نہیں ہو سکتی مگر آپ محض ارمان نکالنے کے واسطے ہی ان پر عمل کرنے کی ہمت کر لیجئے ان شاء اللہ ہمت کرنے کے بعد معلوم ہوگا کہ سب باتیں آسان ہیں کیونکہ اس وقت آپ کو خدا تعالیٰ کی امداد کھلی آنکھوں نظر آئے گی وہ قدم قدم پر آپ کا ساتھ دیں گے۔

ہمت کے بعد نصرت خداوندی کا کھلی آنکھوں مشاہدہ

اسی پر مجھے اپنا وہ قصہ یاد آیا تھا کہ اس وقت جو مجھ میں ہمت کا ایک چھوٹا سا شبہ پیدا ہوا کہ میرے دل میں یہ اضطراب ہوا کہ اس وقت میرے واسطے ایک امر خلاف شریعت کیا جائے گا اور بابو ہندو ہے اس سے شرعی مسئلہ بیان کرنا بے کار ہے اس لئے میں نے حق تعالیٰ سے دعا کی اس ہمت کا یہ اثر ہوا کہ حق تعالیٰ نے فوراً امداد فرمائی اور اس ہندو کے منہ سے یہ

بات نکلوادی کہ سرکاری تیل نہ جلانا۔ تو صاحبو! کوئی عمل کرکے دیکھو اور یہ قصہ میں نے اس پر کہا تھا کہ شاید لوگوں کو ان بزرگ کے واقعہ پر جنھوں نے اپنے دوست کے مرتے ہی چراغ گل کردیا تھا یہ خیال ہوا ہو کہ ایسا تقویٰ کس سے ہوسکتا ہے یہ تو بہت مشکل ہے میں نے اس کا جواب دیا تھا کہ یہ مشکل عمل سے پہلے ہی ہے عمل کے بعد سب آسان ہوجاتا ہے۔

بہر کارے کہ ہمت بستہ گردد اگر خارے بود گلدستہ گردد

(جس کام کیلئے ہمت باندھ لی جائے اگر کانٹا بھی ہو گلدستہ ہوجائے گا)

اموال میت میں سلف کی احتیاط

غرض اموال میت میں سلف نے بڑی احتیاط کی ہے جب ایک پیسہ کے تیل میں اتنی احتیاط کی گئی تو یہ چادر کفن کے اوپر ڈالنا اور وہ بھی رسم کے طور پر ڈالنا ترکہ میں سے کیونکر جائز ہوگی۔ (بس یا تو ان کو موقوف کردیا سب ورثا سے اجازت لے کر ڈالو بشرطیکہ ان میں کوئی نابالغ نہ ہو یا اپنے پاس سے ڈالو ۱۲) اور یہی حکم جنازہ کی جانماز کا ہے کہ وہ بھی کفن سے خارج ہے وہ بھی ترکہ میں سے نہ ہونی چاہئے۔

آج کل ترکہ میں سخت بے احتیاطی

ان رسوم کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ ان سے اموال میت میں بہت بے احتیاطی ہوجاتی ہے جس کا گناہ بہت سخت ہے اور تفاخر کا گناہ الگ رہا جو ان سب کا منشا ہے۔ ایک برا نتیجہ ان کا یہ بھی ہوا جو قوم کو بھگتنا پڑا کہ جن لوگوں کو یہ کفن کی چادر اور جانماز دی جاتی ہے اور جن کو تیجہ دسویں کا کھانا کھلایا جاتا ہے ان کی ہمت پست ہوگئی اور ان میں ذلت اور دنائت پیدا ہوگئی یعنی ان کا یہی پیشہ ہوگیا کہ وہ دن رات اسی خیال میں رہتے ہیں کہ دیکھئے آج کون مرتا ہے جو ہمیں کھانا کپڑا ملے۔ ان رسوم کا قدم نامبارک ونامسعود ایسا آیا جس نے دینے والوں کا بھی پیڑا کردیا اور لینے والوں کو بھی تباہ کردیا۔ دینے والوں کا ضرر تو اوپر معلوم ہوچکا، لینے والوں کا یہ ضرر ہوا کہ وہ بالکل کم حوصلہ پست ہمت ہوگئے۔ اب یہ لوگ بجائے اس کے کہ کسی کے اچھے ہونے سے خوش ہوں مرنے سے خوش ہوتے ہیں۔ جیسے ایک طبیب نے مجھ سے دعا کی درخواست کی تھی کہ دعا کردیجئے میرا کام چل جائے۔ میں نے کہا بھائی تمہارے کام چلنے کی دعا کروں تو مخلوق کے واسطے بددعا کروں کہ لوگ خوب بیمار ہوں تاکہ تمہاری پوچھ ہو وہ کہنے لگے کہ بیماروں سے تو دنیا کبھی خالی نہیں رہتی

میرا کام چلنے کے لئے وبا پھیلنے کی ضرورت نہیں بلکہ یہ دعا کر دیجئے کہ لوگوں کو میری طرف توجہ ہو جائے۔ میں نے کہا بہت اچھا دعا کروں گا۔ خیر یہ تو ایک لطیفہ تھا مگر میں کہتا ہوں کہ جن کا یہی پیشہ ہے مردہ کی چادر لینا جانماز لینا تیجہ دسویں کی دعوت کھانا ان کی تو یہ حالت ہے کہ جب کوئی مؤذن سے کہتا ہے کہ میاں جی فلانا بیمار ہے اس کے اچھے ہونے کی نمازیوں سے دعا کرانا تو وہ ظاہر میں تو کہہ دیتا ہے کہ ہاں دعا کراؤں گا مگر دل میں خدا جانے کیا کہتا ہوگا۔

قوم چارج کا حال

ہمارے یہاں ایک قوم چارج ہے وہ ہندوؤں کے مردے اٹھایا کرتے ہیں ایک دفعہ طاعون کے زمانہ میں ہمارے ایک ملازم نے اس قوم کے ایک آدمی سے پوچھا کہ کہو جی آج کل کیا حالت ہے، کہا خوب موج آرہی ہے۔ دنیا تو تباہ ہورہی تھی مگر اس کمبخت کے یہاں موج آرہی تھی۔ اسی قوم کے ایک شخص کا قصہ ہے اس سے کسی نے اپنا قرض مانگا اس نے وعدہ کیا کہ پرسوں ادا کردوں گا۔ اس نے پوچھا کہ پرسوں کو تیرے پاس روپیہ کہاں سے آجائے گا تو کہنے لگا کہ فلانا مہاجن سخت بیمار ہے، بس آج ہی کل کا مہمان ہے، پرسوں تک تو ضرور مرجائے گا اس وقت میری آمدنی ہوگی تجھے لاکر روپیہ دے دوں گا تو بھلا ایسا شخص جو کسی کے مرنے پر ادھار کھائے بیٹھا ہو وہ اس کے اچھے ہونے کی کیا خاک دعا کرے گا۔ مردوں کا مال کھا کھا کر ان لوگوں کی طبیعتیں بے حس اور لالچی ہوگئی ہیں۔ اسی لئے تو مولویوں کو یہ مسجد کے مؤذن وغیرہ برا بھلا کہتے ہیں کیونکہ مولوی رسموں سے منع کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے ہماری روزی ماردی حالانکہ مولوی دینے دلانے اور ثواب پہنچانے سے نہیں روکتے بلکہ وہ تو یہ کہتے ہیں کہ ایصال ثواب کے لئے جمعرات کی تخصیص نہ کرو بلکہ بدھ کو بھی دو اور تیجہ دسویں کی تخصیص نہ کرو بلکہ جب ہمت ہو کھلا دو۔ (اب یہ لوگوں کا قصور ہے کہ انہوں نے تخصیص کو چھوڑ کر ایصال ثواب ہی کو بند کردیا ۱۲)

ان لوگوں کی یہاں تک نیت بگڑ جاتی ہے کہ کیرانہ کا قصہ ہے کہ وہاں ایک مردہ کی چادر تکیہ دار کے سوا کسی دوسرے کو دینے لگے تکیہ دار نے کہا یہ تو میرا حق ہے لوگوں نے کہا ہاں بھائی حق تو تمہارا ہی ہے مگر اب کے تم ان کو لینے دو تم تو ہمیشہ ہی لیتے ہو تو وہ بے ساختہ

کہتا ہے کہ واہ جی خدا خدا کر کے تو یہ دن آتا ہے اسی میں دوسرے کو میں اپنا حق دے دوں لوگوں نے اس کو برا بھلا کہا کہ کمبخت تو اس دن کی تمنا میں رہتا ہے کہ کوئی مرے تو مجھے چادرہ ملے وہ عذر و معذرت کرنے لگا مگر جو بات دل میں تھی وہ بے ساختہ اس کے منہ سے نکل ہی گئی میں کہتا ہوں کہ اس میں اس کی خطا نہیں بلکہ خطا ان کی ہے جنہوں نے اس کو حریص بنایا لوگوں کو چاہیئے کہ اماموں اور مؤذنوں کی معقول تنخواہیں مقرر کیا کریں اور ان کو عزت کے ساتھ رکھا کریں تاکہ مردوں کے کپڑے کھانے کا ان کو انتظار نہ رہے (بلکہ مردوں کے ثواب کا کھانا کپڑا کسی خاص جماعت کے لئے مخصوص نہ کرنا چاہیے بس کیف ما اتفق جو غریب سامنے آ جائے اس کو دے دیا جائے۔ اس طرح کسی کو اس موقعہ کا انتظار نہ ہوگا۔ افسوس یہ ہے کہ عوام نے علماء کو بھی ملانوں میں داخل کر لیا ہے اور وہ ان کو بھی مسجدوں کے ملانوں کی طرح پست ہمت اور لالچی حریص سمجھتے ہیں۔ صاحبو! واللہ آپ نے علماء کو دیکھا نہیں ہے۔ کیونکہ آپ کو دین کی ضرورت نہیں رہی اور ان کو آپ کی دنیا کی ضرورت نہیں پھر ملاقات کیسے ہو۔ بس آپ نے مسجدوں کے ملانوں کو دیکھ لیا ہے، چند سیاح واعظوں کو دیکھ لیا ہے جن کو اپنی روٹیوں سے کام ہے اور آپ نے انہی کو علماء سمجھ لیا تحقیق علماء کو انہی پر قیاس کر لیا۔ یاد رکھو جو سچ مچ عالم ہے وہ تمہارے در پر روٹیوں کے واسطے کبھی نہ آئے گا (اور ویسے بھی کسی کام کے لئے بے بلائے نہ آئے گا ہاں محض اصلاح اور تبلیغ کے لئے بے بلائے آ سکتا ہے مگر اس صورت میں وہ آپ سے روٹی نہ مانگے گا ۱۲)

علمی کمال کا خاصہ

دیکھئے میں ایک موٹی سی بات کہتا ہوں کہ علم ایک کمال ہے اور ہر کمال کا خاصہ ہے کہ اس سے غیرت و استغناء کی شان پیدا ہوتی ہے چنانچہ بڑھئی اور معمار کو ایک ادنیٰ سا کمال حاصل ہے گو ان کا کمال خسیس درجہ میں ہے لیکن وہ بھی کچھ غیرت اور استغناء رکھتے ہیں وہ کبھی خیرات کا مال نہ لیں گے نہ مردوں کی چادر اور جانماز پر نظر کریں گے ان کی غیرت ہرگز اس کو گوارا نہ کرے گی تو کیوں صاحب کیا علمی کمال میں جو سب سے اعلیٰ کمال ہے کچھ غیرت نہ ہوگی ضرور ہوگی بلکہ تمام اہل کمال سے زیادہ ہوگی یہ ایک ایسی موٹی بات ہے جس کو ادنیٰ سمجھنے والا بھی سمجھ سکتا ہے

بس خوب سمجھ لو کہ علمی کمال جس میں ہوگا وہ ایسے ذلیل کام کبھی نہ کرے گا اس کی تو یہ حالت ہوگی کہ اگر وہ صاحب احتیاج بھی ہو تب بھی سوال پر اپنی غیرت وعزت کو ترجیح دے گا اور ہرگز کسی سے اپنی احتیاج ظاہر نہ کرے گا۔ اہل کمال فقر وفاقہ کی حالت میں بھی مستغنی رہا کرتے ہیں۔

شرافت خاندانی کا کمال

چنانچہ ایران کا ایک شہزادہ کسی پریشانی میں مبتلا ہو کر ہندوستان میں آ گیا۔ اتفاق سے لکھنؤ میں وارد ہوا وہاں اتفاق سے علاقہ پنجاب کے ایک نواب بھی وارد تھے۔ شہزادہ نے ان کی دعوت کی انہوں نے مکافات کی نیت سے کہا کہ آپ بھی کبھی میری ریاست میں ضرور آویں اتفاق سے ان اطراف میں بھی اس کا جانا ہو گیا مگر ایسی حالت میں کہ کچھ نہ رہا تھا وہ دعوت یاد آئی اور اسی ریاست کی طرف رخ کیا اور باحال خستہ ایک ٹٹو پر سوار وہاں پہنچا نواب صاحب نے شہزادہ کو اس حال سے آتا ہوا دیکھ کر براہ تاسف یہ شعر پڑھا۔

آنکہ شیراں را کند روبہ مزاج　　　احتیاج ست احتیاج است احتیاج

(جو چیز شیروں کو لومڑی مزاج بنا دیتی ہے وہ احتیاج ہے)

شہزادہ آگ بگولہ ہو گیا اور فی البدیہہ جواب دیا۔

شیر نر کے میشود روبہ مزاج　　　می زند برکفش خود صد احتیاج

(بہادر شیر کب لومڑی مزاج ہو سکتا ہے سینکڑوں احتیاج کو اپنے جوتے پر مارتا ہے)

اور فوراً لوٹ گیا۔ رئیس نے ہر چند معذرت کی مگر ہرگز نہ ٹھہرا اور کہا تم اس قابل نہیں ہو کہ کوئی شریف آدمی تمہارے یہاں آئے۔ تو حضرت غیرت وہ چیز ہے کہ شریف آدمی مرنا گوارا کرتا ہے مگر احتیاج کسی کے سامنے پیش نہیں کرتا۔ اس شہزادہ میں صرف شرافت خاندانی کا کمال تھا اس کا یہ اثر تھا کہ اس میں اس درجہ غیرت تھی، تو جن میں علمی کمال ہوگا ان کی غیرت کو سمجھ لینا چاہئے کہ کس درجہ ہوگی۔

ائمہ مساجد کی خستہ حالی

پس علماء کو ملانوں کے عموم میں داخل کرنا زیبا نہیں۔ ہاں جن کا یہ پیشہ ہے وہ البتہ اس کے مصداق ہیں مگر میں ان کی طرف سے بھی کہتا ہوں کہ ان کی زیادہ خطا نہیں ہے

بلکہ قوم کی بھی اس میں کچھ خطا ہے مثلاً دیکھئے امام کا اصل رتبہ کیا ہے وہ حقیقت میں سب نمازیوں کی طرف سے باری تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض معروض کرنے کے لئے نائب ہے سوچاہئے تھا کہ اس کام کے لئے ایسے شخص کو تجویز کیا جاتا جو علم وفضل وعزت میں سب سے بڑھا ہوا ہوتا اور اس کی تعظیم وتکریم سب سے زیادہ کرتے اور اس کی خدمت ایسی معقول کرتے جس سے وہ بے فکری کے ساتھ گذر کر لیتا مگر اب اس خدمت کے لئے اس شخص کو تجویز کیا جاتا ہے جو اندھا ہوا پاہج ہو اور تنخواہ اتنی دی جاتی ہے کہ جس میں ایک آدمی کا بھی گذر نہ ہو سکے اور کام اتنا لیا جاتا ہے کہ امام صاحب کے ذمہ امامت کے علاوہ یہ کام بھی ہے کہ مسجد کی ہر چیز کی حفاظت کریں، صفائی کریں، روشنی کریں، اور جو کوئی مرجاوے تو تین رات تک اس کی قبر پر سویا کریں اور دن میں قرآن پڑھ کر بخشا کریں اور محلہ والوں کا گوشت ترکاری بھی لادیا کریں اور پانی کے گھڑے بھی بھرا کریں۔غرض سارا کام امام صاحب کے ذمہ ہوتا ہے البتہ اگر کوئی تنخواہ دار امام نہ ہو بلکہ متوکل ہو تو وہ تو شاہی ملازم ہے وہ شاہی تعلق کی وجہ سے معزز ہوگا مگر اس میں آپ کا کیا دخل ہے میں تو اس کو دکھلانا چاہتا ہوں کہ جن اماموں کو آپ تنخواہ پر مقرر کرتے ہیں ان کی آپ کیا گت بناتے ہیں۔

افسوس اگر انگریزی کا ماسٹر رکھا جائے تو اس کے لئے تو کم از کم چالیس پچاس روپے تجویز کئے جاتے ہیں اور قرآن پڑھانے کے لئے کسی کو رکھا جائے تو اس کے لئے روپیہ آٹھ آنہ ماہوار تجویز ہوتا ہے مگر خیر سے وہ معلم بھی روپے آٹھ آنے ہی کے ہوتے ہیں چنانچہ ایسے ہی ایک میاں جی من الجنة و الناس کو من الجنات و النس پڑھتے تھے حالانکہ قرآن غلط پڑھنے پر سخت وعید ہے میرا یہ مطلب نہیں کہ وعید کے خوف سے قرآن پڑھنا ہی چھوڑ دو بلکہ یہ مطلب ہے کہ درست کرکے پڑھنا روپیہ آٹھ آنہ کے معلموں سے نہیں آسکتا بلکہ اس کے لئے کسی مجوّد اور قاری کو تجویز کرنا چاہئے۔اور ایسا شخص تو کچھ رقم خرچ کرنے سے ہی ملے گا اور جو لوگ انگریزی ماسٹروں کو معقول تنخواہیں دے سکتے ہیں وہ مجوّد اور قاری کی تنخواہ بھی ضرور دے سکتے ہیں اس لئے عدم وسعت کا عذر ہر جگہ نہیں چل سکتا۔

دین سے بے پروائی

مگر آج کل دین سے ایسی بے پروائی ہے کہ امام ہمیشہ ایسا ڈھونڈا جاتا ہے جو سستا ہو چاہے وہ سب کی نمازیں غارت کرتا ہو کیونکہ یہ جاہل میاں جی بعض جگہ ایسی غلطیاں کر جاتے ہیں جن سے نماز باطل ہو جاتی ہے اور تجویز کی غلطیاں تو بکثرت ہوتی ہیں اور تجوید کی یہاں تک ضرورت ہے کہ بعض دفعہ اس کی مخالفت سے عربیت جاتی رہتی ہے اور جب لفظ عربیت ہی سے نکل گیا تو قرآن ہی نہ رہا جب نماز میں قرآن نہ پڑھا گیا تو نماز کیسے صحیح ہوئی شاید آپ کو یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہو کہ تجوید کے نہ ہونے سے عربیت نہیں رہتی مگر میں دلیل سے اس کو ثابت کرتا ہوں سب کو معلوم ہے کہ عربی فارسی اردو جدا جدا زبانیں ہیں اور ہر ایک کے خواص الگ الگ ہیں پس جس طرح کسی لفظ کے فارسی یا اردو ہونے کے لئے تلفظ کی صحت شرط ہے اسی طرح لفظ کے عربی ہونے کے لئے بھی تلفظ کا صحیح ہونا شرط ہے (مثلاً آپ ایک کپڑے کو گاڑھا کہتے ہیں اس میں ڑے کا ہونا اور ہائے مخفی کا ہونا ضروری ہے اگر کوئی شخص اس کے بجائے گارا کہے تو آپ اس کو غلط کہیں گے کیونکہ گارا تو مٹی کا ہوا کرتا ہے کپڑے کی کوئی قسم گارا نہیں ہے۔ اسی طرح سمجھئے کہ عربی میں جو لفظ ثا سے مرکب ہے وہاں سین یا صاد پڑھ دینے سے یا حاء کی جگہ ہا پڑھنے سے تلفظ غلط اور معنی بدل جائیں گے اس سے تو صحت الفاظ کی ضرورت معلوم ہوئی ۱۲)

تجوید کی ضرورت واہمیت

اب صفات کی بابت میں کہتا ہوں کہ اردو میں ایک لفظ پنکھا ہے جس میں نون کو اخفاء کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ اسی طرح رنگ اور سنگ اور جنگ میں جو فارسی الفاظ ہیں نون کو ظاہر کر کے نہیں پڑھا جاتا۔ اب اگر کوئی شخص پنکھا کو باظہار نون پن کھا یا رنگ کو رن گ کہے تو آپ کہیں گے کہ یہ اردو فارسی نہیں رہی مہمل لفظ ہو گیا لیکن اس کہنے سے آپ بندھ گئے اس طرح کہ جب اس لفظ میں اظہار نون سے آپ نے اس کا غلط ہونا اور اردو زبان سے نکل جانا مان لیا تو جن لفظوں میں عربی زبان میں اخفاء ہے وہاں بھی ماننا پڑے گا کہ اظہار نون سے وہ لفظ عربی نہیں رہتا تو کیا اب بھی تجوید کی ضرورت میں کسی کو کلام ہو سکتا ہے۔

میں تو کہتا ہوں کہ تجوید کا سیکھنا فرض ہے کیونکہ قرآن عربی زبان میں ہے جس کا عربی میں پڑھنا فرض ہے اور عربیت کے موافق صحیح تلفظ بدوں تجویز کے نہیں آ سکتا تو تجویز کا سیکھنا فرض ہوا۔ صاحبو! چاہے آپ اپنی کم ہمتی کی وجہ سے ادھر متوجہ نہ ہوں مگر تجویز کی فی نفسہ بہت ضرورت ہے اور افسوس یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس طرف اس لئے توجہ نہیں کہ اس میں دنیا کا بظاہر کوئی نفع نہیں۔ اگر آج ملازمت کے لئے یہ قانون ہو جائے کہ جس کا قرآن باقاعدہ صحیح ہوگا اس کو ملازمت دی جائے گی تو آج یہ سارے بی۔ اے قاری ہو جاویں۔ ہم لوگ متاع دنیا کے لئے سب کچھ کر لیتے ہیں۔ اس لئے یہ سارے عذر جو بیان کئے جاتے ہیں محض بہانے ہیں اور تجوید کی ضرورت تو بھلا کیا ہی مانی جاوے گی۔ آج کل تو بہت سے لوگ خود قرآن پڑھانے ہی کو فضول سمجھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ جب معنی نہ سمجھے تو محض الفاظ پڑھنے سے کیا فائدہ۔ میں کہتا ہوں کہ بہت لوگ اقلیدس میں امتحان دیتے ہیں حالانکہ سمجھتے خاک بھی نہیں مگر امتحان دینے کے لئے الفاظ کو رٹ لیتے ہیں اور پرچے صحیح لکھ کر پاس ہو جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض دفعہ نرے الفاظ کا یاد ہونا بھی کام آ جاتا ہے جیسے یہاں اقلیدس کے الفاظ رٹ لینے سے ملازمت مل جاتی ہے اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ قرآن کے الفاظ یاد کر لینے سے جنت کے درجے ملتے ہیں تو بے کار کیونکر ہوئے مگر دنیا کی وقعت ہے اس لئے اقلیدس کے الفاظ رٹنے کو بے کار نہیں سمجھا جاتا اور دین کی وقعت نہ ہونے ہی کا یہ اثر ہے کہ معلموں اور مؤذنوں کی تنخواہ بھی کم تجویز کی جاتی ہے مگر یاد رکھئے وہ آپ کو قرآن کا علم بھی ایسا ہی دیں گے جیسی آپ تنخواہ دیں گے۔

ارزاں بعلت گراں بحکمت

(ارزاں کی علت ہے اور گراں حکمت سے ہوتا ہے)

اور زیادہ تنخواہ دینے میں بھی وہ قرآن کے دام نہ ہوں گے بلکہ یہ تو ان معلموں کے عمل کے دام ہیں ورنہ قرآن کے دام کون دے سکتا ہے۔ قرآن کی تو یہ شان ہے۔

قیمت خود ہر دو عالم گفتۂ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

(اپنی قیمت دونوں جہان بتلائی ہے۔ نرخ بڑھاؤ ابھی ارزانی ہے)

قرآن کی قیمت تو دو جہان بھی نہیں ہو سکتے اور کیوں نہ ہو قرآن ہے کیا چیز۔

چیست قرآن اے کلام حق شناس   رونمائے رب ناس آمد بہ ناس
(اے کلام حق کو پہچاننے والے قرآن پاک کیا ہے وہ لوگوں کے رب کی طرف سے رب کا رونما ہے)
وہ بندوں کو خدا تعالیٰ کا جمال دکھانے والا ہے یہ تو الفاظ کا رتبہ ہے اور معانی کا رتبہ یہ ہے۔
حرف حرفش راست در بر معنے   معنے در معنے در معنے
(اس کا حرف حرف معنی میں درست ہے، معنی در معنی اندر معنی کے ہے)

قرآن مجید کی شان

قرآن مجید وہ چیز ہے کہ جب کوئی مسلمان اس کی تلاوت کرتا ہے تو خداوند عالم اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور یہ بھی خداوند عالم کی طرف متوجہ ہوتا ہے دنیا میں اتنا ہی مشاہدہ بس ہے کیونکہ اس سے زیادہ کا تحمل نہیں ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے آدمی کے آفتاب پر نظر کرنے سے تو نظر چکا چوند ہو جاتی ہے مگر اس کی شعاعوں کو دیکھ سکتا ہے اسی طرح ذات حق تعالیٰ کو تو ہم دنیا میں بوجہ ضعف قوی کے نہیں دیکھ سکتے۔ ہاں اس کی طرف متوجہ ہو کر انوار و تجلیات کا مشاہدہ کر سکتے ہیں تو قرآن مجید مظہر صفات الٰہی ہے جس کی تلاوت سے انوار و تجلیات صفات کا مشاہدہ ہوتا ہے اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا میں حق تعالیٰ غائب ہیں اور وہ خود نظر نہیں آسکتے بلکہ حق تعالیٰ یہاں بھی ہم سے قریب ہیں اور نظر آسکتے ہیں ان کی طرف سے کوئی مانع نہیں ہے مانع ہماری طرف سے ہے کہ ہم میں یہاں دیکھنے کی طاقت نہیں ہے اسی واسطے حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے لن ترانی (مجھ کو ہرگز نہیں دیکھ سکتا) فرمایا لن اریٰ (میں ہرگز دیکھا نہیں جاتا) نہیں فرمایا چنانچہ جتنے مشاہدہ کی ہم میں یہاں طاقت ہے وہ قرآن کے ذریعہ سے ہوسکتا ہے جب قرآن مجید کی یہ شان ہے تو اس کی کیا قیمت ہوسکتی ہے اور معلموں کو جو کچھ دیا جاتا ہے یہ خود ان کی محنت کی قیمت ہے قرآن کی قیمت نہیں ہے مگر یہ ضرور ہے کہ اگر ہمارے اندر دین کی عظمت و وقعت ہوتی تو حاملان قرآن کی مشقت کی قیمت بھی بڑی ہی تجویز کرتے لیکن ہم نے دین کی بے وقعتی کر رکھی ہے اس کے معلموں اور موذنوں اور اماموں کی یہ بے قدری کر رکھی ہے کہ ان کی تنخواہیں بہت قلیل مقرر کی جاتی ہیں اور مردوں کے کھانے کپڑے سے ان کی امداد کرتے

ہیں ان کے واسطے کفن کی چادر اور جانماز اور تیجہ دسویں کا کھانا مقرر کرلیا ہے اس لئے ان کی نیتیں بگڑ گئیں لالچ اور حرص پیدا ہوگئی اب وہ کسی کے اچھا ہونے سے اتنا خوش نہیں ہوتے جتنا کسی کے مرنے سے خوش ہوتے ہیں گو زبان سے وہ کسی کو نہ کوستے ہوں مگر دل سے ضرور تمنا کرتے ہوں گے کہ کوئی مرے تو ہماری آمدنی ہو پس اس میں جس طرح ان کا قصور ہے خود قوم کا بھی قصور ہے کہ ان کو ایسا تنگ کیوں رکھا جس سے ان کی نیت بگڑ گئی۔ پس دیکھ لیجئے کہ ان رسموں سے دینے والوں کو بھی ضرر پہنچا اور لینے والوں کو بھی نقصان پہنچا اور دونوں کو یہ ضرر اس لئے پہنچا کہ یہ طریقہ غیر مشروع تھا اور محض تفاخر کے لئے تھا خلاف شریعت کاموں میں ظلمت ضرور ہوتی ہے گناہ کے علاوہ ان سے دنیا کا بھی نقصان ہوتا ہے۔ یہ ساری گفتگو اس پر چلی تھی کہ آج کل لوگوں نے موت کو بھی آلہ فخر بنا رکھا ہے یہ تو اوپر والوں کا حال تھا غضب یہ ہے کہ بعض دفعہ خود مرنے والا بھی فخر و مباہات کی وصیت کرتا اور یہ فرمائش کرتا ہے کہ ہماری قبر ایسی پختہ ہو جو کبھی شکستہ نہ ہوسکے شاید اس سے یہ مقصود ہو کہ قیامت میں بھی یہ قبر محفوظ رہے اور وہ حساب کتاب سے بچا رہے مگر قیامت میں تو پہاڑ بھی اڑ جائیں گے بے چاری قبر کی تو کیا ہستی ہے اس روز تو ہر شخص خود ہی گھبرا کر نکل آئے گا۔

قبروں کی پختگی پر فخر قابل افسوس ہے

شیخ سعدیؒ نے لکھا ہے، نا گہ ایک رئیس زادے اور غریب زادے میں گفتگو ہوئی رئیس زادے نے کہا کہ دیکھو ہمارے باپ کی قبر کیسی عمدہ اور مضبوط ہے جس پر شان و شوکت برستی ہے اور تمہارے باپ کی قبر کچی اور شکستہ ہے جس پر بے کسی برستی ہے۔ غریب زادہ نے کہا بے شک یہ فرق تو ہے لیکن قیامت کے دن میرا باپ تو قبر میں سے آسانی سے نکل آئے گا اور تمہارا باپ پتھر ہی ہٹانے میں رہے گا وہ اتنے چٹانوں اور پتھروں کو ہی ہٹاتا رہے گا میرا باپ جنت میں جا پہنچے گا کچھ ٹھکانا ہے اس تفاخر کا کہ قبروں کی پختگی پر بھی فخر کیا جاتا ہے۔ اسی کو تو حق تعالیٰ نے فرمایا اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (اے لوگو تم کو تفاخر نے غافل کر دیا یہاں تک کہ تم قبرستانوں میں پہنچ گئے) زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ کے یا تو یہ معنے ہیں کہ تم اس تفاخر ہی کی حالت میں قبروں میں پہنچ گئے یعنی مر گئے یا یہ کہ تم تفاخر کے لئے قبروں کو دیکھنے گئے۔ جاہلیت میں عرب کی عجیب حالت تھی بعض دفعہ جب دو قبیلے باہم فخر کرتے ایک کہتا کہ ہماری قوم زیادہ

ہے دوسرا کہتا کہ ہمارا جتھا زیادہ ہے اور اس کے بعد مردم شماری ہوتی اور ان میں سے کوئی ایک قبیلہ شمار میں کم ہو جاتا تو وہ کہتا کہ ہمارے آدمی لڑائی میں زیادہ کام آئے ہیں اس لئے ہم کم ہو گئے ورنہ ہماری شمار زیادہ تھی دوسرا قبیلہ کہتا کہ یہ بھی غلط ہے تمہارے مردے ہمارے مردوں سے زیادہ نہیں ہیں اس کے فیصلے کے لئے قبریں شمار کی جاتی تھیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ تو کفار کی حالت تھی مگر افسوس آج کل مسلمانوں میں بھی یہ مرض پیدا ہو گیا ہے تو وہ قبروں کو شمار تو نہیں کرتے مگر ان کی پختگی اور خوبصورتی پر فخر کرتے ہیں چنانچہ اس لئے بعض لوگ خود اپنی قبر کے پختہ کرنے کی وصیت کر جاتے ہیں۔ اس تفاخر ہی کی وجہ سے یہ تمام تکلفات پیدا ہوئے ہیں کہیں زیادہ روشنی کا اہتمام کیا جاتا ہے کہیں جھاڑ فانوس اور قندیل لٹکائے جاتے ہیں۔

اسلاف کی سادگی

مسلمانو! ان تکلفات کو چھوڑ دو اور اپنے سلف کی طرح سادگی اختیار کرو۔ ہمارے سلف کی زندگی ایسی سادہ تھی کہ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیت المقدس تشریف لے گئے ہیں تو پہلی سادگی تو یہ تھی کہ آپ کے ساتھ کوئی لاؤ لشکر نہ تھا بس ایک اونٹنی تھی اور ساتھ میں ایک غلام اور سواری کا طریقہ یہ تھا کہ کچھ دور تک آپ سوار ہوتے اور غلام مہار پکڑ کر چلتا تھا اور کچھ دور تک غلام سوار ہوتا تھا اور خلیفہ اپنے ہاتھ سے مہار پکڑ کر پیدل چلتے تھے کیا اس مساوات اور سادگی کی نظیر کوئی قوم دکھلا سکتی ہے ہرگز نہیں۔ اور دوسری سادگی یہ تھی کہ جب آپ بیت المقدس کے قریب اس شان سے پہنچے ہیں تو حضرات صحابہ و امراء لشکر استقبال کے لئے حاضر ہوئے اور سب نے عرض کیا کہ آپ غیر قوموں کے سامنے پیش ہونے والے ہیں مناسب یہ ہے کہ سفر کا لباس اتار کر کوئی عمدہ لباس پہن لیا جائے کیونکہ اس لباس میں جا بجا پیوند لگے ہوئے تھے اور پیوند بھی کہیں کپڑے کا تھا کہیں چمڑے کا۔ اور یہ بھی عرض کیا کہ اس وقت اونٹنی کے بجائے گھوڑے پر سوار ہونا مناسب ہے۔

مسلمان کا بڑا کمال

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اول تو اس سے انکار کیا اور فرمایا نحن قوم اعزنا الله بالاسلام ہم وہ لوگ ہیں کہ خدا نے ہم کو اسلام سے عزت دی ہے۔ ہماری عزت لباس یا سواری سے نہیں ہے۔ یہاں سے ہم لوگوں کو اپنے خیالات کی اصلاح کرنا چاہئے ہم نے

4 عزت وشوکت کی حقیقت نہیں سمجھی ہم لباس کے عمدہ ہونے اور سواری کے قیمتی ہونے کو عزت وشوکت سمجھتے ہیں یہ بالکل غلط ہے بلکہ اصلی عزت کمال سے ہوتی ہے یہ کیا عزت ہے جو تھوڑی دیر میں اتر جائے کہ اتنے کپڑے بدن پر رہے معزز ہیں اور جہاں کپڑے اتار دیئے ذلیل ہوگئے عزت وہ ہے جو ہر دم انسان کے ساتھ رہے اور وہ کمال سے ہوتی ہے اور مسلمان کا بڑا کمال اسلام ہے آپ اسلام کامل حاصل کیجئے ان شاء اللہ تعالیٰ بدوں کسی سامان کے معزز ہو جاؤ گے۔ دیکھئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا لباس کیسا تھا مگر عزت و شوکت کی یہ حالت تھی کہ جب آپ مدینہ منورہ سے بیت المقدس کو روانہ ہوئے ہیں تو تمام دنیا کے اندر زلزلہ پڑ گیا کہ خلیفہ اسلام پائے تخت سے شام کی طرف روانہ ہوئے ہیں، تمام سلاطین کانپتے (کہ دیکھئے اب کس طرف کو لشکر روانہ فرماتے ہیں سب کو یہ بھی اندیشہ تھا کہ کہیں خود ہی لشکر کی کمان نہ کریں ۱۲)

حضرات صحابہؓ کی حالت

آخر یہ شوکت ورعب کس چیز کا تھا کیا لباس کا رعب تھا ہرگز نہیں، لباس کی کیفیت تو یہ تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے طواف میں حضرت عمر کو دیکھا اس وقت جو کرتہ آپ کے بدن پر تھا اس میں اکیس پیوند تھے۔ آج لوگ شکایت کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں افلاس زیادہ ہے اس لئے ذلیل ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں میں اس وقت افلاس کا ہونا سچ بھی ہے اور غلط بھی۔ سچ تو اس معنی کے ہے کہ کفار سے ان کے پاس دولت کم ہے اور غلط اس لئے ہے کہ سلف کے اعتبار سے ان کے پاس دولت کم نہیں جس زمانہ میں مسلمانوں نے ترقی کی ہے اس وقت وہ آج کل کے مسلمانوں سے زیادہ صاحب افلاس تھے اگر افلاس ہی ذلت کا سبب ہے تو ان حضرات نے عین افلاس کی حالت میں کیونکر عزت وشوکت حاصل کر لی۔ خوب سمجھ لو کہ عزت لباس یا دولت سے نہیں ہے مسلمان کی عزت اسلام سے ہے پہلے مسلمان پورے مسلمان ہوتے تھے اس لئے معزز تھے اور ہم برائے نام مسلمان ہیں اس لئے ذلیل ہیں ورنہ آج کل کچھ پہلے سے زیادہ افلاس نہیں حضرات صحابہؓ کی یہ حالت تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب ملک شام میں پہنچے تو حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے خیمہ میں اترے کیونکہ وہ عساکر اسلامیہ کے افسر تھے اور ان سے پوچھا

اصلاح ظاہر-4

کہ اے ابوعبیدہؓ تمہارے پاس کچھ کھانے کو بھی ہے انہوں نے روٹی کے سوکھے ٹکڑے سامنے رکھ دیئے اور پانی لا کر رکھ دیا۔ اس وقت حضرت سرمدؒ کا کلام یاد آ گیا فرماتے ہیں۔

منعم کہ کباب میخورد میگذرد در بادہ ناب میخورد میگذرد
سرمد کہ بکاسہ گدائی نان را تر کردہ بآب میخورد میگذرد

(منعم کہ کباب کھاتا ہے گذر جاتا ہے خالص شراب پیتا ہے گذر جاتا ہے سرمد پیالہ گدائی میں پانی میں سوکھی روٹی تر کر کے کھاتا ہے وہ گذر جاتا ہے)

یہ حال دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رونے لگے اور فرمایا اے ابوعبیدہؓ اب تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر فتوحات سے وسعت کر دی ہے پھر تم ملک شام میں ہو اب تم اتنی تنگی کیوں کرتے ہو انہوں نے عرض کیا اے امیر المؤمنین دنیا تو محض زاد ہے۔ آخرت میں پہنچنے کے لئے جس کے لئے یہ بھی کافی ہے تو زیادہ کو لے کر کیا کریں گے۔

ہمارے سلف کا فقر اختیاری تھا

خود حضرت عمرؓ سے عرض کیا گیا تھا کہ اب فتوحات میں وسعت ہوگئی ہے آپ اتنی تنگی کیوں فرماتے ہیں انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے زمانہ میں ہمارے بہت سے بھائی اس فقر کی حالت میں شہید ہوگئے انہوں نے خدا کے راستہ میں عمل زیادہ کیا اور دنیا سے تمتع حاصل نہیں کیا ان کا سارا ثواب آخرت میں ذخیرہ رہا اور ہم لوگوں نے فتوحات حاصل کر کے بہت کچھ مال و دولت حاصل کر لی ہے اور ہماری محنت کا کچھ ثمرہ یہاں مل گیا ہے۔ اب مجھے اس مال و دولت سے متمتع ہوتے ہوئے یہ ڈر لگتا ہے کہ قیامت میں کہیں یہ نہ کہہ دیا جائے اَذۡهَبۡتُمۡ طَيِّبَاتِكُمۡ فِىۡ حَيٰوتِكُمُ الدُّنۡيَا وَاسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِهَا فَالۡيَوۡمَ تُجۡزَوۡنَ عَذَابَ الۡهُوۡنِ بِمَا كُنۡتُمۡ تَسۡتَكۡبِرُوۡنَ ۝ کہ تم نے حیات دنیا میں مزے اڑا لئے ہیں اور طیبات سے تمتع حاصل کر لیا ہے اب یہاں (تمہارے واسطے کچھ نہیں بس) تم کو عذاب ذلت کی سزا دی جائے گی اس لئے کہ تم بڑا بننا چاہتے تھے اور یہاں سے معلوم ہوا کہ ہمارے سلف کا فقر اختیاری تھا اضطراری نہ تھا۔

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہ کا فقر

ان کے افلاس کا سبب یہ نہ تھا کہ ان کو کچھ ملتا نہ تھا حق تعالیٰ نے حضرات صحابہؓ کو بہت کچھ مال و دولت دیا تھا مگر وہ اپنے پاس رکھتے نہ تھے بلکہ غرباء کو دے دیتے تھے اور خود فقر کی حالت میں رہتے تھے تو کیا اس فقر سے کچھ ان کی عزت کم ہوگئی تھی خدا نے ان کو وہ عزت دی تھی کہ آج مسلمان اس کی تمنا کرتے ہیں پس فقر کو ذلت سمجھنا بڑی غلطی ہے یہ تو بڑی عزت کی چیز ہے اگر کمال کے ساتھ ہو۔ چنانچہ جب میں کانپور میں درس دیتا تھا عین حالت درس میں ایک شخص جامع مسجد میں آئے حالت یہ تھی۔

لنگکے زیر و لنگکے بالا نے غم وزد و نے غم کالا

(ایک لنگی اوپر ایک لنگی نیچے، نہ اسباب کا غم نہ چور کا کھٹکا)

طالب علموں نے اول اول ان کو معمولی آدمی سمجھا اور حقارت سے دیکھا انہوں نے مسجد کی جانماز پر اعتراض کیا کہ یہ منقش کیوں ہے نماز کی جگہ نقش و نگار نہ ہونا چاہئے اس سے نماز میں یکسوئی کامل نہیں ہوتی بار بار پھول بوٹوں پر نظر جاتی ہے طلبہ نے اس مسئلہ پر گفتگو کرنا شروع کردی تب معلوم ہوا کہ وہ بہت بڑے عالم ہیں اب ان کی سادگی وضع اور خستہ لباس کی بھی قدر ہوئی۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اگر لباس معمولی ہو اور کمال زیادہ ہو تو اس کی قدر بڑھ جاتی ہے اور اگر کپڑے عمدہ ہیں اور لیاقت کچھ نہیں تو علی حزین کا سا قصہ ہو جاوے گا کہ اس کے پاس ایک شخص نہایت شان و تکلف کا لباس پہنے ہوئے آیا اس نے ادب سے اپنا پاؤں سمیٹ لیا اور نام پوچھا تو آپ نام بتلاتے ہیں ایسف (یوسف) علی حزین نے پاؤں بدستور پھیلا دیئے اور کہا بابا اگر تو ایسف ہستی پس چرا من پائے خود را کشم (اگر تو ایسف ہے تو پھر میں اپنا پاؤں کیوں سمیٹوں) میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جو انگریزی بالکل نہ جانتے تھے اور وضع بالکل انگریزوں جیسی تھی ایسے لوگ اکثر ذلیل ہو جاتے ہیں جب کوئی شخص ان کو انگریزی داں سمجھ کر انگریزی کا خط یا تار ان کے پاس لاتا ہے اور پڑھوانا چاہتا ہے تو اس وقت وہ بہت ہلکے ہوتے ہیں۔ اب کیسے پڑھیں اور انکار کریں تو اپنی

حماقت ظاہر ہوتی ہے اور جہالت کا اقرار ہوتا ہے۔ بعض دفعہ کوئی انگریز ان کو تعلیم یافتہ سمجھ کر انگریزی میں ان سے باتیں کرنے لگتا ہے اس وقت یہ لوگ بغلیں جھانکتے ہیں۔ ایک انگریز نے ایسے ہی ایک شخص کو بہت ٹھونکا جو وضع انگریزوں کی بنائے ہوئے تھا اور انگریزی بالکل نہ جانتا تھا، بات یہ ہے کہ ہر وضع کے لئے اس کی قابلیت بھی ضروری ہے۔

ناز را روئے بباید ہمچو ورد   چوں نہ داری گرد بد خوئی مگرد

(ناز کے لئے گلاب جیسے چہرہ کی ضرورت ہے جب ایسا چہرہ نہیں رکھتے تو بدخوئی مت اختیار کرو)

انسانیت کی بات

اور انسانیت کی بات تو یہ ہے کہ آدمی انگریزی پڑھ کر بھی اپنی ہی وضع پر قائم رہے واللہ ایسے شخص کی زیادہ عزت ہوتی ہے مگر آج کل مسلمانوں کی ایسی حالت ہوگئی ہے کہ سب کے سب وضع اور فیشن کے پیچھے پڑ گئے ہیں اور اس کو سرمایہ عزت سمجھتے ہیں حالانکہ اس سے خاک بھی عزت نہیں ہوتی یہ لوگ خود ان کی نگاہوں میں بھی ذلیل ہو جاتے ہیں جن کی وضع اختیار کرتے ہیں اور اگر مان بھی لیا جائے کہ اس سے عزت ہوتی ہے تو یہ برائے نام عارضی عزت ہے اصلی عزت کمال اسلام سے ہے مسلمانوں کو اس کی کوشش کرنی چاہئے میں یہ نہیں کہتا کہ تم ایسے خراب خستہ رہو کہ بدن پر چیتھڑے لگا لو نہیں لباس صحیح سالم پہنو مگر یہ کیا ضروری ہے کہ قیمتی بھی ہو وضع اور فیشن بھی ہو یہ سب تکلفات ہیں۔

دیکھئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو صحابہؓ نے یہ رائے دی تھی کہ عمدہ کپڑے پہن لیجئے تاکہ ظاہری شان وشوکت بھی ہو جاوے تو انہوں نے اس سے صاف انکار فرمادیا کہ ہمارے لئے اسلامی عزت کافی ہے اور کسی عزت کی ضرورت نہیں شاید آپ یہ کہیں کہ حضرات صحابہؓ کی تو بات ہی اور ہے ان جیسا کون ہوسکتا ہے تو لیجئے میں آپ کو اسی زمانہ کی نظیر دکھاتا ہوں۔

حکایت حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی

ابھی کا ذکر ہے کہ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ زندہ تھے آپ کو جن لوگوں نے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ مولانا کی وضع کس درجہ سادہ تھی مگر اس سادگی

ہی میں ان کی وہ عزت تھی کہ بڑے بڑے نواب اور روساوزراء مولانا سے ملنے آتے تھے اور مولانا جس کو جو جی میں آیا کہہ ڈالتے تھے مگر ان کی باتوں سے برا کوئی نہ مانتا تھا بلکہ ان کی وہ غصہ کی باتیں بھی بھلی معلوم ہوتی تھیں جس کی وجہ وہی سادگی تھی ان کی طبیعت بالکل سادہ بچوں کی سی تھی اس لئے کسی کو کوئی بات ان کی ناگوار نہ ہوتی تھی جیسے بچوں کی حرکات ناگوار نہیں ہوتیں کیونکہ وہ بھی جو کچھ کرتے ہیں سادگی سے کرتے ہیں بناوٹ سے نہیں کرتے۔

ایک گالی دینے والے کی حکایت

تھانہ بھون میں ایک شخص گالیاں بہت دیا کرتے تھے ایک تقریب کے موقعہ پر انہوں نے برادری کو جمع کرنا چاہا لوگوں نے جانے سے انکار کر دیا کہ یہ ہم کو گالیاں دیتا تھا ہم اس کے یہاں نہ جائیں گے۔ جب معلوم ہوا کہ برادری والے اس وجہ سے نہیں آتے تو انہوں نے معذرت کی کہ آئندہ ایسا نہ کروں گا۔ اب تو خطا معاف کرو لوگوں نے کہا کہ شاہ ولایت صاحب کے مزار پر چل کر عہد کرو وہ راضی ہو گئے اور عہد کو چلے وہاں جا کر کہتے ہیں کہ شاہ ولایت صاحب یہ برادری کے ایسے ویسے لوگ (گالی دے کر ۱۲) مجھ سے عہد کراتے ہیں کہ کسی کو گالی مت دینا میں آپ کے سامنے عہد کرتا ہوں کہ اب سے کسی ان ایسے ویسے لوگوں کو (گالی دے کر ۱۲) گالی نہ دوں گا سب لوگ ہنس پڑے کہ ظالم سے عہد کرتے ہوئے تو گالیاں چھوٹی نہیں آئندہ کیا چھوڑے گا یہ بے چارہ معذور ہے آخر برادری کے سب آدمی ان کے یہاں آ گئے اور پھر کسی نے ان کی گالی سے برا نہ مانا کیونکہ سمجھ گئے کہ یہ سادگی سے گالی دیتا ہے قصداً بناوٹ کر کے نہیں دیتا۔ اس حکایت سے میرا یہ مطلب نہیں کہ میں ان کے اس فعل کا اچھا ہونا ثابت کرتا ہوں۔

حکایت حضرت بایزید بسطامیؒ

بلکہ میں اس سے ایک نتیجہ نکالنا چاہتا ہوں اور کبھی برے فعل سے بھی اچھا نتیجہ نکال لیا جاتا ہے جیسے حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک چور کو پھانسی پر لٹکا ہوا دیکھا پوچھا کہ اس کو پھانسی کیوں دی گئی۔ لوگوں نے عرض کیا کہ یہ بڑا پکا چور تھا ایک بار گرفتار ہوا تو اس کا داہنا

ہاتھ کاٹا گیا پھر بایاں پیر کاٹا گیا پھر بھی چوری سے باز نہ آیا تو خلیفہ نے پھانسی کا حکم دیا حضرت جنیدؒ نے یہ سن کر اس کے پیر چوم لئے لوگوں نے عرض کیا حضرت آپ چور کے پیر چومتے ہیں فرمایا میں نے چوری کی وجہ سے اس کے پیر نہیں چومے بلکہ اس کے استقلال کے قدم چومے ہیں کہ یہ اپنے محبوب پر گو وہ مذموم ہی تھا ایسے استقلال کے ساتھ جما رہا کہ اسی میں جان دے دی، افسوس ہم اپنے محبوب محمود کے ساتھ بھی یہ معاملہ نہیں کرتے تو جیسے حضرت جنیدؒ نے برے فعل سے نتیجہ اچھا نکال لیا۔ اسی طرح میں کہتا ہوں کہ گو اس شخص کا گالیاں دینا برا فعل تھا مگر سادگی کے ساتھ یہ اس میں خوبی تھی جس کا یہ اثر ہوا کہ لوگ اس کی باتوں کا برا نہ مانتے تھے اس سے معلوم ہوا کہ سادگی اور بے تصنعی عجب چیز ہے جو تلخ کو شیریں کر دیتی ہے۔

حضرت گنج مرادآبادیؒ کی سادگی

یہی بات مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب میں تھی کہ ان کا غصہ اور تیزی سادگی کے ساتھ تھی اس لئے کسی کو ناگواری نہ ہوتی تھی بعض دفعہ وہ بڑے بڑے عہدہ داروں کو ایسی تیز تیز باتیں فرمادیا کرتے تھے کہ ہم ویسی باتیں کہیں تو ایک دن میں بدنام ہو جائیں۔

ایک مرتبہ وزیر حیدرآباد مولانا کے یہاں حاضر ہوئے تو آپ فرماتے ہیں ارے نکالو ارے نکالو، صاحبزادے نے عرض کیا حضرت حیدرآباد کے وزیر ہیں فرمایا ارے تو میں کیا کروں میں کیا ان سے تنخواہ پاتا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد فرمایا اچھا رات کے دو بجے تک رہنے کی اجازت ہے اس کے بعد چلے جائیں، بے چارے وزیر نے اسی کو غنیمت سمجھا اور اس کی تہذیب دیکھئے کہ رات کے ۲ بجے فوراً چلا گیا خدام نے کہا بھی کہ صبح کو چلے جایئے گا۔ اب تو مولانا سو رہے ہیں انہیں کیا خبر ہوگی کہا نہیں یہ بے ادبی ہے بزرگوں کے ساتھ ایسا معاملہ نہ کرنا چاہئے، اب حضرت کی اجازت نہیں ہے میں نہ ٹھہروں گا تو مولانا بڑے سے بڑے کو ایسی تیز تیز کہہ دیتے تھے اور کچھ ناگوار نہ ہوتا تھا۔

ایک دفعہ لیفٹیننٹ گورنر نے آپ کی زیارت کو آنا چاہا اور اپنے سیکرٹری کے ذریعہ سے باقاعدہ اجازت حاصل کی مولانا نے اجازت دے دی اور لوگوں سے فرمایا وہ ہم کو کیا

جائیں لوگوں نے عرض کیا حضرت آپ کو تو سارا زمانہ جانتا ہے پھر فرمایا کہ وہ بیٹھیں گے کہاں ہمارے یہاں تو سونے کی کرسی بھی نہیں۔ خدام نے عرض کیا کہ حضرت وہ لکڑی کی کرسی پر بھی بیٹھ جاویں گے فرمایا اچھا۔ پھر فرمایا کہ کیا ہم لیفٹیننٹ گورنر کو دروازہ تک لینے جاویں، عرض کیا گیا کہ اگر مزاج چاہے تو مضائقہ بھی نہیں، یہ باتیں ان کے آنے سے پہلے ہورہی تھیں، مگر کچھ دیر کے بعد مولانا بھول بھال گئے اور جب وہ تاریخ آئی جس میں لیفٹیننٹ گورنر آنے والے تھے تو حضرت نہ کچھ سامان کیا نہ استقبال کیا بلکہ اپنی جگہ سے اٹھے تک نہیں جیسے بیٹھے تھے ویسے ہی بیٹھے رہے لیفٹیننٹ گورنر تو بیٹھ گئے باقی سب انگریز جوان کے ساتھ تھے کھڑے رہے ایک میم بھی کھڑی رہ گئی تو مولانا نے ایک الٹے گھڑے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا بی تو اس پر بیٹھ جا وہ اس پر بیٹھ گئی پھر لیفٹیننٹ گورنر نے عرض کیا کہ حضرت ہمیں کچھ وصیت فرمایئے فرمایا تم کو اللہ تعالیٰ نے حکومت دی ہے دیکھو ظلم مت کرنا ورنہ تم سے حکومت چھن جائے گی۔ پھر اس نے کہا کہ حضرت ہمیں کچھ تبرک عطا فرمایا جائے، آپ نے فرمایا مجھ غریب کے پاس تمہارے دینے کو کیا رکھا ہے، پھر خادم سے پکار کر فرمایا ارے مٹھائی کی ہنڈیا میں کچھ چورا پڑا ہو تو ان کو دیدے یہ مانگ رہے ہیں چنانچہ وہ چورا تھوڑا تھوڑا سب کو بانٹا گیا اور سب نے نہایت ادب سے اس کو لیا میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ لیفٹیننٹ گورنر کو مولانا کے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی کیا مولانا حاکم تھے یا نواب اور رئیس تھے کچھ بھی نہیں پھر آخر یہ دل کشی کس چیز کی تھی کہ مسلم اور غیر مسلم ان کے دروازے پر آتے تھے۔

صاحبو! یہ سادگی ہی کی دل کشی تھی تکلف اور تصنع سے یہ بات پیدا نہیں ہوا کرتی اسی کو فرماتے ہیں۔

دل فریبان نباتی ہمہ زیور بستند — دلبر ماست کہ باحسن خدا داد آمد
زیر بارند درختاں کہ ثمر ہا دارند — اے خوشا سرو کہ از بند غم آزاد آمد

(دل فریبان نباتی زیور متعارف سے مزین ہیں ہمارے محبوب میں حسن خداداد ہے جو درخت پھلدار ہیں وہ زیر بار ہیں سرو بہت اچھا ہے کہ ہر غم سے آزاد ہے)

حقیقی آزادی

حضرت بس آزادی یہ ہے جوان حضرات میں تھی یہ آزادی نہیں ہے کہ ایسا لباس پہنیں کہ بدوں کرسی کے بیٹھ ہی نہ سکیں یہ تو پوری قید ہے بعض وضع ایسی ہوتی ہے کہ اگر وہ مکمل ہی ہو تو اچھی معلوم ہوتی ہے اور ادھوری ہو تو بری معلوم ہوتی ہے (مثلاً کوٹ پتلون کے ساتھ دہلی کا جوتہ برا معلوم ہوتا ہے نیز دو پلی ٹوپی بھی اس پر بھدی لگتی ہے اب کوٹ پتلون ہو تو اس کے ساتھ جوتہ اور ٹوپی بھی اس کے مناسب ہونا چاہئے) تو بتلایئے یہ قید ہوئی یا نہیں اور ایک لباس ہی میں کیا میں تو ہر تکلف کو قید سمجھتا ہوں۔ بس آزادی یہ ہے کہ انسان ایک شریعت کی قید کے سوا کسی قید کا پابند نہ ہو۔ یہ قید تو ضروری ہے اس کا باقی رہنا تو مطلوب ہے مگر میں اطمینان دلاتا ہوں کہ یہ قید گراں نہیں ہے واللہ اس میں وہ لذت ہے کہ جو اس کا پابند ہے وہ کبھی اس سے خلاصی نہیں چاہتا کیونکہ

اسیرت نخواہد رہائی زبند   شکارت نجوید خلاص از کمند

(تیرا قیدی قید سے رہائی نہیں چاہتا ہے تیرا شکار کمند سے خلاصی نہیں ڈھونڈتا) یہ تو زلف یار کی قید ہے اور زلف یار کی قید سے کون رہائی چاہتا ہے ہاں جو اس قید کا پابند ہے وہ باقی تمام قیود سے آزاد ہو جاتا ہے ان کے متعلق تو وہ یوں کہتا ہے

گردد صد زنجیر آری بگسلم   غیر زلف آں نگار مقبلم

(اگر دو سو زنجیر بھی لاؤ میں توڑ ڈالوں گا سوائے اپنے محبوب کی زلف کی زنجیر کے)

وہ ہر حال میں خوش رہتا ہے خواہ لباس میں پیوند لگے ہوں یا جوتا ٹوٹا ہوا ہو کیونکہ وہ ان سب کو محبوب کی طرف سے سمجھتا ہے اور ہر چہ از دوست میرسد نیکوست (جو کچھ محبوب کی طرف سے پہنچے وہی بہتر ہے) پس آپ اس قید زلف سے نہ گھبرائیں کیونکہ واللہ یہی عزت کا ذریعہ ہے باقی سب قیدیں توڑنے کے قابل ہیں (اس قید سے آدمی خدا کا غلام بنتا ہے اور باقی قیود سے نفس و شیطان کا غلام بنتا ہے اور خدا کا غلام سب کا بادشاہ ہوتا ہے اور نفس و شیطان کا غلام سب کا غلام ہے وہ ہر جگہ ذلیل ہی ہوتا ہے ۱۲) تو ہماری زندگی ایسی سادہ ہونی چاہئے جیسی سلف کی زندگی تھی۔

دلجوئی شرعاً مطلوب ہے

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جب لباس تبدیل کرنے کے لئے عرض کیا گیا تو اول آپ نے اپنے مذاق کے موافق انکار کیا اور فرمایا کہ ہم کو خدا نے اسلام سے عزت دی ہے بس یہی عزت ہمارے واسطے کافی ہے۔ لباس کی عزت ہم کو نہیں چاہیے۔ بعض صحابہؓ نے عرض کیا کہ حضرت مسلمانوں کی دلجوئی ہی کے لئے لباس بدل لیجئے یہ بھی اسلام کا عجیب مسئلہ ہے کہ اگر کوئی بات اپنی وضع اور مذاق کے خلاف ہو اور شریعت سے ممنوع نہ ہو تو احباب کے اصرار پر ان کی دلجوئی کے لئے کر لینا چاہیے دلجوئی شرعاً مطلوب ہے بشرطیکہ حد جواز تک ہو افسوس آج ہم میں یہ بات نہیں رہی حالانکہ یہ خاص مسلمانوں کا وصف ہے اور اشاعت اسلام زیادہ تر اسی دلجوئی سے ہوئی ہے لوگ کہتے ہیں کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا۔ مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کا جواب دیا کرتے تھے کہ شمشیر کے لئے شمشیر زن بھی تو چاہئیں تو وہ شمشیر زن کہاں سے جمع ہو گئے تھے۔

اشاعت اسلام اخلاق اسلامیہ سے ہوئی

ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق ہی نے جمع کیا تھا پس ثابت ہوا کہ دراصل اشاعت اسلام اخلاق اسلامیہ سے ہوئی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت و رحمت کا یہ عالم تھا کہ جب آپ ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ سے طائف تشریف لے گئے ہیں تو وہاں کے رؤسا نے آپ کو سخت جواب دیا اور قبول اسلام سے انکار کر دیا، اسی پر بس نہیں کیا بلکہ بستی کے شریروں کو بھڑکا دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ڈھیلے پتھر پھینکیں اس وقت غیرت خداوندی کو جوش ہوا اور بحکم الٰہی حضرت جبرئیل علیہ السلام ملک الجبال (پہاڑوں کا فرشتہ) کو ساتھ لے کر آئے اور عرض کیا حق تعالیٰ نے سلام کے بعد فرمایا ہے کہ ہم نے آپ کی قوم کا برتاؤ آپ کے ساتھ دیکھا اور ملک الجبال کو حکم دے دیا ہے کہ آپ جو کچھ اس سے فرمائیں اس کی تعمیل کرے۔ اگر آپ حکم دیں تو یہ اسی وقت طائف کے دونوں پہاڑوں کو باہم ملا دے۔ جس سے ساری آبادی پس کر رہ جائے گی مگر آپ کی رحمت آپ نے فرمایا کہ چھوڑ دو مجھ کو اور میری قوم کو میں ان کی تباہی نہیں چاہتا میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ان کی آنکھیں کھل جائیں اور اگر یہ اسلام نہ لائیں تو مجھے

امید ہے کہ شاید ان کی اولاد میں سے کوئی شخص خدا کی توحید کا اقرار کرلے۔ آپ کی دلجوئی کی یہ حالت تھی کہ جب بنو ثقیف کے کفار آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان کو مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اتارا کہ پاس کے پاس ان کی خاطر مدارات اچھی طرح ہو سکے (اور یہ بھی مصلحت تھی کہ وہ مسلمانوں کی عبادات اور نماز وغیرہ کو اچھی طرح دیکھ لیں۔ چنانچہ ان پر اس کا اثر ہوا اور وہ اسلام لانے پر آمادہ ہو گئے) پھر یہ بھی دلجوئی کی کہ بعض نے اسلام لانے کے لئے یہ شرط پیش کی تھی کہ ہم زکوٰۃ نہ دیں گے بعض نے کہا کہ ہم جہاد نہ کریں گے آپ نے فرمایا اچھا بہتر ہے تم زکوٰۃ نہ دینا نہ جہاد کرنا۔ صحابہؓ کو اس شرط کی منظوری پر حیرت ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ جب یہ اسلام لے آئیں گے تو سب کچھ کریں گے کیونکہ جب اسلام دل میں آجاتا ہے تو یہ حالت ہو جاتی ہے۔

آنکس کہ ترا شناخت جاں راچہ کند فرزند و عیال و خانماں راچہ کند

(جس شخص نے تجھ کو پہچان لیا وہ جان کو کیا کرے گا اہل و عیال مال واسباب کو لے کر کیا کرے گا)

اسلام کے بعد نہ مال کی محبت رہتی ہے نہ جان کی، اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی حسین کسی سے کہے کہ مجھے دیکھو اور دیکھنے والا کہے کہ اس شرط سے دیکھتا ہوں کہ بیوی کو نہ چھوڑوں گا اور وہ اس شرط کو منظور کرلے تو حقیقت میں یہ منظوری محض ظاہری ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مجھ کو دیکھنے کے بعد یہ خود ہی سب کو چھوڑ دے گا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی منظوری بھی محض ظاہری تھی جو حقیقت میں نامنظوری تھی آپ جانتے تھے کہ یہ سب شرطیں اسلام لانے سے پہلے ہی ہیں اسلام کے بعد یہ خود ہی سب کچھ کریں گے چنانچہ یہی ہوا کہ اسلام کے بعد ان لوگوں نے جہاد بھی کیا اور زکوٰۃ بھی دی۔ اس دلجوئی ہی سے لوگ کھنچے چلے آتے ہیں اس لئے ہمارے اکثر بزرگوں نے نرمی اور دلجوئی سے بہت کام لیا ہے۔

حضرت حاتم اصمؒ کی حکایت

مجھے حضرت حاتم اصمؒ کی حکایت یاد آئی کہ ایک شخص نے مجمع میں ان کے سامنے ہدیہ پیش کیا اول تو انہوں نے قبول سے انکار کیا اس نے اصرار کیا تو آپ نے لے لیا۔ لوگوں نے بعد

میں پوچھا کہ حضرت اگر آپ کو لینا ہی تھا تو پہلے انکار کیوں کیا اور جو نہ لینا مقصود تھا تو بعد میں کیوں لے لیا۔ آپ نے فرمایا کہ اصل میں تو مجھ کو لینا مقصود نہ تھا اس لئے انکار کر دیا تھا مگر پھر میں نے دیکھا کہ اس وقت مجمع میں ہدیہ رد کر دینے سے اس شخص کی ذلت ہوگی اور میری عزت اور لے لینے سے میری ذلت ہوگی کہ انکار کے بعد لے لیا اور اس کی عزت ہوگی تو میں نے اپنے بھائی کی عزت کو اپنی عزت پر ترجیح دی اب ہماری یہ حالت ہے کہ دلجوئی کریں گے تو ایسی کہ حرص میں مبتلا ہو جائیں گے پس جو آیا لے لیا چاہے حرام ہو یا حلال واپس کرنا جانتے ہی نہیں یا استغناء برتتے ہیں تو ایسا جو کبر تک پہنچ جاتا ہے استغناء میں چونکہ اپنی عزت ہوتی ہے اور ایک قسم کا حظ حاصل ہوتا ہے اس لئے اس میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں کہ پھر کسی کا دل توڑنے کی بھی پروانہیں کرتے غرض ہماری کوئی بات اعتدال کی نہیں بس یہ حالت ہے۔

چوں گرسنہ میشوی سگ میشوی   چونکہ خوردی تند و بدرگ میشوی

(جب بھوکا ہوتا ہے تو کتا جیسا ہو جاتا ہے اور جب شکم سیر ہوتا ہے تو مغرور و متکبر بن جاتا ہے)

سید الطائفہ حضرت حاجی صاحبؒ کی شان استغناء

مجھے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت یاد آئی، بلکہ دو حکایتیں یاد آئیں، ایک سے حضرت کی شان استغناء کا پتہ چلے گا، دوسری سے تواضع کا۔ تواضع تو اس سے ظاہر ہے کہ حضرت جب ہجرت کر کے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو اول اول ایک رباط میں قیام فرمایا ایک دن کوئی شخص رباط میں رہنے والوں کو ایک ایک دونی تقسیم کرتا پھر رہا تھا جب وہ حضرت کے حجرہ پر پہنچا تو یہاں شاہانہ دربار تھا۔ حق تعالیٰ نے حضرت کو لطیف طبیعت عطا فرمائی تھی اس لئے سب صاف ستھرا سامان رہتا تھا، وہ یہ دیکھ کر رکا اور حضرت کو دونی نہ دی تو آپ خود فرماتے ہیں کہ بھائی تم نے ہمارا حصہ نہ دیا وہ کہنے لگا حضرت آپ کی خدمت میں ایسی حقیر چیز پیش کرنا خلاف ادب ہے۔ فرمایا سبحان اللہ اگر ہر شخص یہی سمجھتا تو پھر یہ سامان کہاں سے ہوتا کیا تم مجھے زمرہ فقراء سے خارج سمجھتے ہو بھائی میں تو فقیر ہی ہوں اور فقیر سمجھ کر ہی لوگ کچھ دے دلا جاتے ہیں اسی سے یہ سامان

اکٹھا ہو گیا جو تم دیکھ رہے ہو لاؤ تم میرا حصہ لاؤ یہ سن کر تو وہ شخص باغ باغ ہو گیا کہ اللہ اکبر میرے ایسے کہاں نصیب کہ حضرت خود مانگیں اور خوشی خوشی ایک دونی پیش کر دی یہ تو شان تواضع تھی کہ ایک دونی کے لئے بھی اپنی احتیاج ظاہر فرمائی اور شان استغناء یہ تھی کہ ایک دفعہ حضرت پر کئی دن کا فاقہ تھا، ایک میمن نے صورت سے پہچان لیا کہ حضرت فاقہ سے ہیں وہ حضرت کی لنگی مانگ کر لے گیا اور اس میں دوسو ریال باندھ کر لا یا۔ اس وقت حضرت نماز یا ذکر میں مشغول تھے وہ پاس رکھ کر چلا گیا۔ اب استغناء کی یہ کیفیت دیکھئے کہ حضرت نے جب لنگی اٹھائی تو اس کا وہم بھی نہ ہوا کہ یہ ریال اس نے مجھے دیئے ہیں بلکہ یہ سمجھے کہ امانت رکھ گیا ہے، اٹھا کر احتیاط سے امانت کی جگہ رکھ دیا اور دوسرے وقت پھر فاقہ سے رہے۔ اس میمن نے جب دوسرے وقت بھی اسی حال سے دیکھا تو آ کر عرض کیا کہ آپ نے وہ ریال خرچ کیوں نہ کر لئے۔ آپ نے فرمایا کہ بھائی امانت کو کیسے خرچ کر لوں کہا حضرت وہ امانت نہ تھی بلکہ وہ تو میں ہدیہ دے گیا تھا فرمایا ہدیہ اس طرح دیا کرتے ہیں کہ پاس رکھ کر چلے گئے کچھ کہا نہ سنا، اس نے غلطی کی معافی چاہی تب آپ نے ان کو خرچ کیا تو شان استغناء یہ تھی کہ دوسو ریال پر (جو کہ دوسو روپے سے زیادہ ہوتے ہیں) ضرورت وحاجت کے وقت بھی ہدیہ کا گمان نہ ہوا بلکہ امانت ہی سمجھتے رہے ہم سوال ہوتے تو یہ نہ معلوم کتنی تاویلیں کر کے اس کو ہدیہ بنا لیتے اور کوئی دونی لا کر ہم کو دیتا تو اس کو سو سناتے کہ ہم کیا غریب محتاج ہیں تجھ کو آنکھوں سے نظر نہیں آتا۔ بس دوانیاں بانٹتے چلے تو جو سامنے آیا اس کو غریب سمجھ کر ایک دونی دے دی یہ کوئی آدمیت ہے۔ ان حضرات میں استغناء بھی تواضع کے ساتھ تھا اس لئے اگر کسی وقت استغناء سے دوسرے کی ذلت ہوتی تو وہاں یہ حضرات صورت استغناء کو چھوڑ کر تواضع کی صورت اختیار کر لیتے تھے جیسا حضرت حاتم اصمؒ نے کیا کہ اپنی عزت کو مسلمان کی عزت پر نثار کر کے انکار کے بعد بھی اس کا ہدیہ قبول کر لیا۔ صاحبو! یہ برتاؤ تھا ہمارے بزرگوں کا وہ استغناء اور دلجوئی دونوں کو جمع کرتے تھے ہمارے حضرات عاقل عالم شیریں دلجو خلیق اور مستغنی سب کچھ ہوتے تھے ان کی یہ شان تھی۔

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری　　　آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

(حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا رکھتے ہو جو تمام محبوب رکھتے ہیں وہ تنہا تمہارے اندر ہیں)

دورِ حاضر کا اختلاف مذاق

مگر اب یہ حالت ہے کہ ایک طبقہ نے ایک بات لے لی دوسرے نے دوسری بات لے لی کوئی حد سے زیادہ خلیق بن گیا کوئی مستغنی بن گیا اور افسوس ہے کہ باہم اہل حق کے اندر الگ الگ پارٹیاں ہوگئیں۔ جدا جدا طبقے ہوگئے ہماری یہ حالت افسوسناک ہے میں کہتا ہوں کہ اگر یہ اختلاف حد شرع سے متجاوز ہے تو جس نے تجاوز کیا ہو وہ اپنی اصلاح کرے اور اگر حدود شرعیہ کے اندر ہے تو یہ پارٹی بندی کیسی سب کو یہ تفریق قطع کر کے ایک حدود شرعیہ کے ایک ہو جانا چاہئیے۔ آخر اختلاف مذاق حد شریعت کے اندر اندر تو سلف میں بھی ہوا ہے مگر وہاں یہ تفریق نہ تھی کوئی ایک دوسرے پر اعتراض نہ کرتا تھا مگر اب یہ حالت ہے کہ ہر ایک دوسرے پر اعتراض کرتا ہے نہ ادھر تہذیب رہی نہ ادھر۔ ہم کو اپنے سلف کے حالات میں غور کرنا چاہئیے۔

مطالعہ حکایات کو بھی اصلاح میں دخل ہے

ہمارے بزرگان دین کی حکایتیں بھی ایسی ہیں کہ ان سے اصلاح ہو جاتی ہے۔ سلف کی حکایات کو اصلاح میں بڑا دخل ہے اس لئے حکایات سلف کا مطالعہ کرنا چاہئیے کہ وہ کس طرح نرمی اور دلجوئی کرتے تھے۔ مولانا شاہ عبدالقادرؒ صاحب کے وعظ میں ایک شخص آیا جس کا پائجامہ ٹخنوں سے نیچا تھا جب وعظ ختم ہو چکا تو آپ نے اس شخص کو ٹھہرالیا وہ ڈرا کہ اب میری خبر لی جاوے گی مگر مولانا تو ایسے پردہ پوش تھے کہ ایک بار آپ کے درس حدیث میں ایک معمولی طالب علم جنابت کی حالت میں بدوں نہائے چلا آیا آپ کو کشف سے معلوم ہو گیا کہ یہ جنبی ہے فوراً آپ نے درس بند کر کے اس سے فرمایا کہ بھائی وہاں ہی ٹھہرو آج تو جمنا کی سیر کو دل چاہتا ہے آپ اور سب طلبہ تیار ہوگئے اور وہاں جا کر غسل کیا اس نے بھی غسل کیا۔ پھر فرمایا لاؤ کچھ پڑھ لو ناغہ کیوں کیا جائے۔ تو مولانا کسی کی کیا خبر لیتے۔ چنانچہ اس شخص کو ٹھہرا کر فرمایا کہ بھائی مجھ میں ایک عیب ہے کہ میرا پائجامہ ٹخنوں سے نیچا لٹک جاتا ہے اور حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص ٹخنوں

سے نیچا پائجامہ پہنے وہ جہنم میں جائے گا تو میں ڈرتا ہوں کہ کہیں میں اس عذاب میں گرفتار نہ ہوں ذرا دیکھنا میرا پائجامہ ٹخنوں سے نیچے تو نہیں۔ وہ شخص قدموں میں گر پڑا کہ حضرت خدانخواستہ آپ میں یہ عیب کیوں ہوتا یہ عیب تو میرے اندر ہے میں آج سے توبہ کرتا ہوں پھر ایسا کبھی نہ کروں گا یہ تھی ہمارے بزرگوں کی نرمی اور دلجوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کو کیوں چھوڑتے۔ چنانچہ آپ نے احباب کی دلجوئی کے لئے لباس کا بدلنا منظور فرمایا۔ اب دوسرے جوڑے کی تلاش ہوئی اور امیر المؤمنین کی گٹھڑی دیکھی گئی تو اس میں دوسرا جوڑا کہاں تھا وہ تو نہ پیسہ روپیہ جمع کرتے تھے نہ جوڑے اور کپڑے بس آپ کے پاس تو وہی ایک جوڑا تھا جو تن پر تھا۔

امیر المؤمنین سیدنا حضرت عمرؓ کا زہد

سید احمد دحلان نے غالباً فتوحات اسلامیہ میں آپ کے زہد کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب انتقال کے وقت عزرائیل علیہ السلام آئے تو حضرت عمرؓ کے گھر کو دیکھ کر بولے سبحان اللہ یہ امیر المؤمنین کا گھر ہے جہاں کچھ بھی نہیں۔ آپ نے فرمایا جس گھر میں تم آنے والے ہو اس کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔ غرض کسی مسلمان سے ایک جوڑا مانگا دے دیا، جس کو پہن کر آپ گھوڑے پر سوار ہوئے مگر دو چار ہی قدم چلے تھے کہ فوراً اتر پڑے اور فرمایا کہ تم نے تو اپنے بھائی عمر کو ہلاک ہی کر دیا تھا یہ کپڑے پہن کر اور اس سواری پر سوار ہو کر تو میری حالت بدل گئی لاؤ میرے وہی کپڑے اور وہی اونٹنی (واقعی حضرت عمرؓ سے شیطان بالکل عاجز تھا اور عاجز کیا معنے ڈر کر دور بھاگتا تھا ان پر شیطان کا کبھی قابو نہیں چلا ۱۲) چنانچہ اس حالت سے نصاریٰ کے سامنے پیش ہوئے اور یہی ہیئت سبب ہوئی فتح بیت المقدس کی کیونکہ ان کی کتابوں میں آپ کی یہی شان لکھی گئی تھی۔ غرض ہمارے بزرگان دین کا یہ طرز تھا کہ وہ تکلف اور تصنع سے بہت احتراز کرتے تھے سادگی اور بے تکلفی ان کا شعار تھا مسلمانوں کو اپنی معاشرت ایسی ہی رکھنا چاہئے۔

علماء کو غلطی کے اعتراف میں عار نہیں کرنا چاہئے

اور میں بالخصوص اہل علم کو بھی ایک بات کہتا ہوں گو ان کو کسی کے کہنے سننے کی ضرورت نہیں مگر خیر بے ضرورت بھی تو بعضی باتیں کر لی جاتی ہیں وہ یہ کہ علماء کی سادگی صرف اسی

بات میں نہیں کہ وہ کسی خاص موقعہ پر جوڑا نہ بدلیں بلکہ ہماری اصل سادگی اور بے تکلفی یہ ہے کہ اگر کوئی بات ہم کو معلوم نہ ہو یا کوئی مسئلہ سمجھ میں نہ آوے تو پچاس آدمیوں کے سامنے کہہ دیں کہ ہم کو معلوم نہیں یا ہماری سمجھ میں نہیں آیا مدرس کی بے تکلفی یہ ہے کہ اگر اس سے کسی مقام کی تقریر میں غلطی ہو جائے اور شاگرد متنبہ کرے تو فوراً اپنی غلطی کا اقرار کرلے۔

آج ہم اس صفت کو مفقود پاتے ہیں۔ مگر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دس مرتبہ کی حکایت ہے کہ جہاں آپ سے تقریر میں کچھ فروگذاشت ہوا اور کسی طالب علم نے عرض کر دیا تو فوراً فرمادیتے کہ واقعی مجھ سے غلطی ہوئی اور صحیح تقریر یہی ہے جو تم نے کی اور مولانا کا اس حالت کا ایسا غلبہ ہوتا تھا کہ اس کو ایک ہی مجلس میں بار بار فرمایا کرتے تھے کہ مجھ سے غلطی ہوئی تم ٹھیک کہتے ہو۔ اور ہم میں یہ مرض ہے کہ طلبہ کے سامنے اپنی غلطی کا اقرار کبھی نہیں کریں گے اگر وہ صحیح بھی کہتا ہوگا تو گھونٹ گھانٹ کر اسے بند کر دیں گے پھر یہ مرض متعدی ہوا کہ ان طالب علموں نے بھی اپنے شاگردوں کو گھونٹنا شروع کیا نتیجہ یہ ہوا کہ سب میں تکلف اور تصنع کا مرض اچھی طرح سرایت کر گیا اور جہل مرکب میں مبتلا رہے سو الگ۔ میں نے حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت اپنے دو بزرگوں سے سنی ہے کہ مکہ معظمہ میں ایک بزرگ عالم قرآن کی تفسیر بیان کیا کرتے تھے اس طرح کہ پہلے آیت پڑھتے اس کے متعلقات ہر فن کے مسائل بیان کرتے۔ حضرت شاہ صاحب بھی ان کے حلقہ میں کبھی کبھی جا بیٹھتے تھے۔ ایک دن شیخ نے کسی مقام پر ایک فقہی مسئلہ میں غلطی کی اس وقت تو شاہ صاحب خاموش رہے جب درس ختم ہو چکا اس وقت پاس جا کر چپکے سے متنبہ کیا کہ یہ مسئلہ مجھ کو اس طرح یاد ہے۔ ان بزرگ نے فوراً تمام طلبہ کو واپس بلایا سب جمع ہو گئے تو کہا **اقد غلطنا في هذه المسئلة ونبهنا عليه هذا الشيخ والصحيح هكذا** یعنی ہم نے اس مسئلہ میں غلطی کی جس پر ہم کو اس شیخ (ہندی یعنی شاہ صاحب) نے متنبہ کیا اور صحیح تقریر اس کی یوں ہے پھر شاہ صاحب کی بیان کردہ تقریر کا اعادہ کیا دیکھئے علماء یہ حضرات ہیں کہ ان کو یہ کہتے ہوئے ذرا بھی رکاوٹ نہیں ہوئی کہ ہم سے یہاں غلطی ہوگئی ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ یوں بھی کہہ دیا کہ اس شیخ نے ہم کو متنبہ کیا حالانکہ حضرت شاہ صاحب نے خفیہ اسی لئے متنبہ کیا تھا کہ اگلے دن یہ اس مقام کی صحیح تقریر

اپنی طرف سے کردیں مگر ان کو اتنا صبر کہاں تھا اسی وقت سب کو بلا کر صاف اپنی غلطی کا اقرار کیا اور اپنے محسن کو بھی ظاہر کر دیا جس نے غلطی پر متنبہ کیا تھا اگر ہم سوال ہوتے تو اول تو اپنی غلطی ہی کو تسلیم نہ کرتے اسی میں بحث شروع کر دیتے اور جو تسلیم بھی کرتے تو اس طرح صاف صاف اقرار نہ کرتے اور جو کرتے بھی تو یہ ظاہر نہ کرتے کہ اس غلطی پر ہم کو کسی دوسرے نے متنبہ کیا ہے بلکہ اگلے دن اس طرح تقریر کرتے کہ طلبہ پر یہ ظاہر ہوتا کہ شیخ کو خود ہی تنبہ ہوا ہے۔ آخر یہ تکبر اور تصنع نہیں ہے تو پھر کیا ہے۔

اظہار لاعلمی کوئی نقص نہیں

صاحبو! کسی بات کے متعلق لاعلمی ظاہر کر دینا کوئی نقص نہیں نہ کوئی عیب ہے ہم اور آپ تو کیا چیز ہیں بعض دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سوال پر لا ادری (میں نہیں جانتا) فرمایا چنانچہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ سب سے اچھی جگہ کونسی ہے اور سب سے بری جگہ کونسی ہے۔ آپ نے فرمایا مجھے معلوم نہیں۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھ کر بتلاؤں گا۔ چنانچہ حضرت جبرئیل سے پوچھا انہوں نے کہا مجھے بھی معلوم نہیں، حق تعالیٰ سے پوچھ کر بتاؤں گا حق تعالیٰ سے پوچھا تو ارشاد ہوا خیر[1] البقاع المسجد و شر البقاع السوق سب سے اچھی جگہ مسجد ہے اور سب سے بدتر بازار ہے۔ دیکھئے بعض دفعہ انبیاء اور ملائکہ نے بھی لا ادری (مجھے معلوم نہیں) فرمایا ہے تو پھر آپ کی اس میں کیا شان گھٹتی ہے مگر افسوس ہم سے کبھی یہ نہیں ہو سکا۔ پس اگر کسی عالم میں یہ وصف موجود ہو تو بیشک فخر کی بات ہے اور واقعی اس میں تصنع و تکلف نہیں ہے اور اگر یہ بات نہیں ہے تو اس کو اپنے اندر پیدا کرنا چاہئے باقی یہ کوئی فخر نہیں کہ ہم نے عمامہ نہیں باندھا جبہ نہیں پہنا ننگے پیر چل لئے کیونکہ ان باتوں سے تو تعریف ہوتی ہے لوگ کہتے ہیں کہ فلانا بہت بے نفس اور متواضع ہے اور جس بات سے تعریف ہوتی ہو اس کا اختیار کرنا بڑا کمال نہیں اور اگر یہ کہو کہ لا ادری (مجھے معلوم نہیں) کہنے میں بھی تو تعریف ہوتی ہے۔ تو یہ سچ ہے مگر اس وقت تو ذلت ہی ہوتی ہے گو بعد میں تعریف ہو۔ یہ ساری گفتگو اس پر چلی تھی کہ میں نے بعض صاحبوں کو روشنی زیادہ کرنے کے اہتمام میں دیکھا تھا اس پر میں نے یہ سب

---

[1] مجمع الزوائد للهيثمي ۲: ۶، موارد الظمآن للهيثمي: ۲۹۹، کنز العمال: ۲۰۷۲۰، ۲۰۷۴۸

5 باتیں عرض کی ہیں کہ ہم میں بے تکلفی اور سادگی ہونا چاہیئے گو اس مضمون کا آیت سے کوئی تعلق نہ تھا ویسے ہی درمیان میں ایک ضروری بات پر متنبہ کرنا چاہا تھا۔ اور دیر تک اس کو ممتد کرنے کا قصد نہ تھا یہ خدا ساز بات ہے کہ اس پر گفتگو بڑھ گئی ممکن ہے کہ اس میں کوئی مصلحت ہو اپنی طرف سے تو میں بیان میں ارتباط کا لحاظ رکھتا ہوں لیکن جب حق تعالیٰ کسی خاص مضمون کو بیان کرانا چاہتے ہیں تو پھر ربط وغیرہ کا خیال نہیں رہتا اس وقت وہی کہنا پڑتا ہے جو وہ کہلواتے ہیں جیسا کہ مولانا رومی نے بیان فرمایا ہے۔

قافیہ اندیشم و دلدار من گویدم مندیش جز دیدار من

(میں قافیہ سوچتا ہوں اور میرا محبوب مجھ سے کہتا ہے کہ میرے دیدار کے سوا کچھ مت سوچ)

بلاغت کی حقیقت

مثنوی پر بعض لوگوں نے اعتراض کیا تھا کہ اس میں بعض مقامات پر قافیہ کی رعایت نہیں ہے کوئی کوئی شعر بے قافیہ ہو گیا ہے تو مولانا نے اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ میں تو قافیہ کی رعایت کرنا چاہتا ہوں مگر دلدار کا یہ اشارہ ہے کہ میرے دیدار کے سوا کسی چیز کی طرف توجہ مت کرو اس لئے جہاں بے تکلف قافیہ بن جاتا ہے بنا دیا جاتا ہے اور جہاں سوچنا پڑتا ہے وہاں سوچتا نہیں ہوں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ شعر میں قافیہ کی ضرورت نہیں۔ شاعری میں قافیہ ہونا چاہیئے مگر یہ بھی نہیں کہ اس کا ایسا پابند ہو کہ مضمون کو قافیہ کے تابع کیا جائے جیسا کہ اکثر شعراء کی عادت ہے کہ وہ بعض اشعار محض قافیہ کی رعایت سے تصنیف کرتے ہیں بلکہ بلاغت اس کا نام ہے کہ قافیہ کو مضمون کے تابع کیا جائے اور جہاں مضمون کے موافق قافیہ نہ ملے وہاں مضمون کی رعایت کرنا چاہیئے نہ کہ قافیہ کی کیونکہ یہ بھی تکلف میں داخل ہے مگر ایسا بھی بے تکلف نہ ہو۔

مثنوی رومی کی بلاغت

جیسا ہمارے ایک دوست نے جو خورجہ کے رہنے والے ہیں ظرافت میں ایسا کیا وہ ایک عربی خواں بددماغ نیچری سے ملے جن کو انہوں نے ایک دیوان کسی استاد کا پیش کیا تھا اس نے غایت بددماغی سے یہ بھی نہ دیکھا کہ کس کا دیوان ہے۔ پوچھتے ہیں یہ کس کا دیوان ہے انہوں

---

۱ ملاحظ ظاہر-5

نے کہا میرا وہ بولے آپ شاعر بھی ہیں انہوں نے کہا جی جہاں ، بولے آپ کوئی شعر فی البدیہہ کہہ سکتے ہیں انہوں نے کہا ہاں بولے کہ اچھا کوئی شعر کہئے انہوں نے یہ شعر پڑھا۔

گر مصور تیری تصویر اینچے   اس کے اس کام کو دو مہینے چاہئیں

انہوں نے کہا یہ شعر کیسا جس میں نہ وزن نہ قافیہ تو کہنے لگے حضور میں نے آپ کی ایک تحریر میں پرانے فیشن کی مذمت دیکھی تھی جب سے سب پرانی چیزیں چھوڑ دیں اور یہ بھی پرانا فیشن ہے کہ وزن بھی ہو بحر بھی ہو قافیہ بھی ہو اس لئے میں نے اس کو بھی حذف کر دیا۔ ہمارے قصبہ میں ایک شاعر تھے وہ ناپ کر شعر کہا کرتے تھے۔ یعنی شعر کہہ کر ہر مصرعہ کو تاگے یا تنکے سے ناپ لیا۔ اگر دونوں برابر ہو گئے تو بس شعر بن گیا اور اگر کوئی مصرعہ بڑھنے لگا تو اس کو باریک قلم سے لکھ کر برابر کر دیا۔ جب ان کا دیوان چھپنے لگا تو لوگوں نے کہا اس میں ردیف ضاد تو ہے ہی نہیں آپ نے پوچھا کہ کسی ردیف میں کئی غزلیں بھی ہیں لوگوں نے بتلایا کہ ہاں فلاں ردیف میں کئی غزلیں ہیں تو آپ نے کہا کہ ان میں سے ایک غزل کے ہر شعر کے اخیر میں مقراض بڑھا دو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور ضاد کی ردیف تیار ہو گئی جس میں ہر شعر کے ختم پر مقراض ہے واہیات چاہے تک ہو یا نہ ہو مگر مقراض موجود ہے (واقعی وہ سارا دیوان ہی مقراض سے کترنے کے قابل ہے ۱۲) تو میں ایسی بے تکلفی کا نہیں کہتا۔ اس پر مجھے غالب کی حکایت یاد آئی کہ اس نے اپنے ایک دوست کی دعوت کرنا چاہی تو اس نے انکار کیا اور کہا تم تکلف بہت کرتے ہو، غالب نے کہا اس مرتبہ تکلف نہ کروں گا، اس نے اس وعدہ پر دعوت قبول کی اب آپ نے بے تکلفی کا یہ ڈھنگ اختیار کیا کہ بھنگی سے کہہ دیا کہ محلّہ بھر کا کوڑا ہمارے گھر میں جمع کر دینا وہ کمبخت ایک ٹیلہ سا ہو گیا اس پر آپ ایک لنگوٹہ باندھ کر اور حقہ سامنے رکھ کر بیٹھ گئے جب وہ دوست کھانے کو آئے تو غالب کو اس حلیہ سے دیکھ کر حیرت میں رہ گئے پوچھا یہ کیا معاملہ ہے، کہا کچھ نہیں آج میں نے تکلف نہیں کیا۔

تو مولانا کے کلام میں بے تکلفی ضرور ہے مگر خدا نہ کرے وہ ایسی نہیں ہے مولانا کا کلام شاعری کے اعتبار سے بھی بہت بلند پایہ ہے ہاں کہیں کہیں تسامحات بھی ہیں اور اتنے طویل کلام میں اگر دو چار جگہ تسامحات ہو جائیں تو یہ کوئی نقص نہیں آخر چھ دفتر کچھ تھوڑے نہیں

ہیں ۱۲) پھران کی وجہ بھی مولانا نے بیان فرمادی ہے کہ۔

قافیہ اندیشم و دلدار من　　　گویدم مندیش جز دیدار من

(میں قافیہ کوسوچتا ہوں اور میرا محبوب مجھ سے کہتا ہے کہ میرے دیدار کے علاوہ اور کچھ مت سوچ)

بے ربطی میں ربط

اسی طرح گو بیان میں بھی ربط کا ہونا ضروری ہے مگر درمیان میں جب کوئی دوسرا ضروری مضمون ذہن میں آجاتا ہے تو میں اس کو چھوڑتا نہیں ربط کی ایسی پابندی بھی نہ چاہئے کہ ضرورت کا بھی لحاظ نہ کیا جائے اس لئے درمیان میں تکلف اور بے تکلفی پر یہ مضمون ایک ضرورت سے بیان ہوگیا گو ظاہر میں یہ اجنبی کلام تھا مگر بحمد اللہ یہاں تو بے ربطی میں بھی ربط باقی ہے کہ درمیان میں ایک ضرورت سے دوسری بات آگئی تھی اس کو ختم کرکے پھر اپنے اصل مقام کی طرف عود کر آیا ہوں تو میں اس کو بیان کر رہا تھا کہ اس مقام پر حق تعالیٰ نے ہماری دو محبوب چیزوں کا ذکر فرمایا ہے اور ان کے بعض مفاسد پر ہم کو مطلع فرمایا ہے جن میں اکثر لوگ مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور یہ مضمون اس وجہ سے بھی قابل ذکر ہے کہ ہماری بدحالیوں کا زیادہ سبب انہی دو چیزوں کی محبت ہے چنانچہ محبت مال کی بدولت باہم بغض وعداوت ہو جاتی ہے مسلمانوں میں جو آئے دن مقدمہ بازی ہوتی ہے اس کا منشا یہی محبت مال ہے نیز محبت مال ہی کی وجہ سے دوسروں کا حق دبایا جاتا ہے۔

بہنوں کا حصہ

صاحبو! آپ اپنے امراض کو اچھی طرح جانتے ہیں میں کوئی دقیق بات نہیں بیان کر رہا ہوں یہ تو کھلی ہوئی باتیں ہیں جن کو ہر شخص اپنے اندر غور کرکے جان سکتا ہے۔ صاحبو! کیا آپ اس کا انکار کر سکتے ہیں کہ ہم لوگ اکثر بیٹیوں کو حصہ نہیں دیتے زیادہ تو یہ ہے کہ خود باپ ہی ایسا کرتے ہیں کہ وہ اپنے سامنے ہی سب جائیداد لڑکوں کو دے جاتے ہیں اور اگر باپ نے ایسا نہ کیا تو بعد کو بھائی ایسا کرتے ہیں کہ بہنوں کو حصہ نہیں دیتے۔ دنیادار تو ان کا حق ہی نہیں سمجھتے مگر

وہ اس میں یہ تاویل کر لیتے ہیں کہ بہنوں نے ہم کو معاف کر دیا۔ میں کہتا ہوں اول معافی کی حقیقت تو سمجھ لیجئے پھر میں پوچھوں گا کہ کیا بہنیں اسی طرح معاف کرتی ہیں۔

معافی کی حقیقت

معافی کی حقیقت یہ ہے جو اس آیت میں مذکور ہے **فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْئًا مَّرِيْئًا**۔ حق تعالیٰ مردوں کو خطاب فرماتے ہیں کہ اگر عورتیں اپنے مہر میں سے کچھ حصہ دل کی خوشی سے تم کو دے دیں تو اسے کھاؤ خوش گواری اور لذت کے ساتھ اس سے معلوم ہوا کہ معافی یا عطا کے لئے خوش دلی ضروری ہے مگر یہاں اس کی ذرا پروانہیں کی جاتی کہ بہن نے خوشی سے دیا ہے یا اوپرے دل سے۔ بس جہاں اس کی زبان سے اتنا نکلا کہ میں نہیں لیتی اور بھائی جان نے اس کو معافی سمجھ لیا۔ پھر الٹ کر اس سے کوئی یہ نہیں کہتا کہ تو یہ بات دل سے کہہ رہی ہے یا محض زبان سے۔ اور یہیں سے میں اس پر بھی متنبہ کرتا ہوں کہ آج کل جو چندہ لیا جاتا ہے اس میں بھی اکثر خوش دلی کا اہتمام نہیں کیا جاتا گو اس میں دینے والوں پر بھی ملامت ہے کہ وہ دین کے کاموں میں خوشی سے کیوں نہیں خرچ کرتے لیکن اگر وہ یہ کوتاہی کرتے ہیں تو اس سے لینے والوں کو وہ چندہ حلال نہ ہو جائے گا۔ حدیث میں صاف حکم موجود ہے[1] **الا لا يحل مال امرأ مسلم الا بطيب نفس منه** (یاد رکھو کسی مسلمان آدمی کا مال بدوں اس کی خوش دلی کے حلال نہیں ہوتا) اگر کسی نے محض شرم ولحاظ سے چندہ دیا ہو تو اس کا لینا ہرگز جائز نہیں اگر یہ کہا جائے کہ صاحب اتنی احتیاط کی جائے تو چندہ بہت کم آئے گا جس سے کام نہیں چل سکتا تو اول تو مجھے اسی میں کلام ہے کہ کام نہیں چل سکتا آپ تجربہ کر کے دیکھ لیجئے کہ ضروری کام میں تو اتنا ہی روپیہ صرف ہوتا ہے جو حدود شریعت کے موافق آتا ہو اور جو ایسا ویسا چندہ ہوتا ہے وہ کام میں صرف نہیں ہوتا بلکہ بے تکا خرچ ہوتا ہے کہیں بے ضرورت عمارات میں کہیں مہمانوں کی فضول خاطر مدارت میں وغیرہ وغیرہ اور اگر تسلیم کر لیا جائے کہ قلیل چندہ سے کام نہیں چل سکتا تو میں پوچھتا ہوں کہ کام چلانے سے غرض کیا ہے ظاہر ہے کہ یہی غرض ہے کہ حق تعالیٰ راضی ہوں تو اگر وہ

---

[1] السنن الکبری للبیہقی ۶: ۱۰۰، ۸: ۱۸۲، مجمع الزوائد للهيثمي ۴: ۱۴۲، کنز العمال: ۷ ۳۹

راضی نہ ہوئے تو بتلایئے کام چلا کر کیا کیجئے گا بس سہل صورت یہ ہے کہ حدود شریعت کے موافق چندہ لو اور جتنا کام اس میں چل سکے اتنا چلاؤ زیادہ کا قصد ہی نہ کرو اگر کسی وقت زیادہ چندہ آجاوے اس وقت اور کام بڑھا دو اور اگر پھر کم ہو جائے تو تم کام کو بھی کم کردو کیونکہ آپ اتنے ہی کام کے مکلف ہیں جتنا کرسکتے ہیں اس سے زیادہ کے مکلف نہیں تو جتنا کام حلال چندہ میں آپ کرسکیں اس سے زیادہ ہرگز نہ کریں تاکہ حرام چندہ کی ضرورت ہی نہ ہو مگر اب تو یہ حالت ہے کہ ابتداء ہی سے بڑے پیمانہ پر کام شروع کیا جاتا ہے اور اس کے لئے حلال چندہ کافی نہیں ہوتا تو پھر حدود سے آگے بڑھتے ہیں اور اس کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ کہ کون خوشی سے دے رہا ہے اور کون دباؤ یا لحاظ سے۔

بہنوں کا حق

یہی معاملہ بہنوں کے حق میں ہورہا ہے کہ اہل علم نے تاویل کرلی ہے کہ اس نے تو اپنا حق معاف کردیا میں پوچھتا ہوں کہ ذرا انصاف سے کہنا کیا بہنوں نے خوشی سے اپنا حق چھوڑا ہے ہرگز نہیں بلکہ محض بدنامی کے خوف سے کیونکہ بہنوں کے لئے یہ بات عیب شمار کی جاتی ہے کہ وہ باپ کی جائیداد سے حصہ لیں۔ نیز وہ اس خیال سے بھی نہیں لیتیں کہ اگر ہم حصہ لے لیں گے تو پھر شادی بیاہ کے موقعہ پر بھائی ہمیں پوچھیں گے نہیں اور چھوٹ چھٹاؤ ہو جائے گا تو یہ دینا کچھ خوشی کا دینا نہ ہوا۔ دوسرے دینا اس شخص کا معتبر ہوتا ہے جسے شئے موہوب کی حقیقت بھی معلوم ہو یعنی جس چیز کو دے رہا ہے وہ اس کی حقیقت بھی سمجھتا ہو اور جسے اپنے فعل کی حقیقت بھی معلوم نہ ہو اس کا دینا معتبر نہیں یہی وجہ ہے کہ نابالغ اور معتوہ پر حجر کیا جاتا ہے یعنی اس کو تصرفات سے روک دیا جاتا ہے اور اس کی جائیداد کورٹ ہو جاتی ہے کہ اس میں وہ کچھ بیع وشرا نہیں کرسکتا کیونکہ وہ اپنے تصرفات کی حقیقت سے بے خبر اور نفع وضرر سے ناواقف ہے۔ اب دیکھئے کہ بہنیں جو اپنا حق چھوڑ دیتی ہیں کیا ان کو اپنے اس فعل کی حقیقت معلوم ہوتی ہے، ہرگز نہیں لڑکیوں کو یہ معلوم ہی نہیں کہ جائیداد کیا چیز ہوتی ہے اور وہ کیسی قیمتی چیز کو چھوڑ رہی ہیں اس لئے بدوں تجربہ کے ان کی معافی معتبر نہ ہوگی بلکہ اس بارہ میں وہ مثل معتوہ کے شمار ہوں گی سچی معافی کی صورت یہ ہے کہ وہ تین چار برس تک اپنی جائیداد پر قابض رہیں، ہر فصل کی پوری

آمدنی وصول کرتی رہیں جب اس عرصہ میں ان کی جائیداد کی حقیقت اور اس کا نفع اور لذت خوب معلوم ہو جائے اس کے بعد بھی اگر وہ نہ لیں تو بے شک یہ دینا کچھ شمار کے قابل ہوگا، بعض لوگ یہ کہہ دیتے ہیں کہ صاحب ہم نے بیاہ شادی اور بلانے رکھنے میں بہنوں کو اتنا دے دیا ہے جس سے ان کا حق ان کے پاس پہنچ گیا سو یہ دینا بالکل قابل اعتبار نہیں کیونکہ اس کو جائیداد کی قیمت کہہ کر نہیں دیا جاتا اور نہ بہنیں اس کو قیمت سمجھ کر لیتی ہیں بلکہ یہ تو محبت کا برتاؤ سمجھ کر دیا جاتا ہے عقد بیع کے لئے ایجاب وقبول اور بدل کی تعیین اور اس پر تراضی طرفین ضروری ہے، یہاں ان میں سے ایک بات بھی نہیں ہوتی۔

بہن کا اپنا حق معاف کرنے کا طریقہ

پھر تمہاری ان سب باتوں کے مان لینے کے بعد بھی یہ بات ہے کہ بہن جو بھی کہہ دیتی ہے میں نے اپنا حق معاف کر دیا اس سے تو کسی طرح بھی بھائی کے لئے بہن کا حق حلال نہیں ہو سکتا چاہے وہ خوشی ہی سے معاف کرتی ہو کیونکہ معافی کی حقیقت ابراء ہے اور ابراء دیون سے ہوتا ہے نہ کہ اعیان سے اور اگر اس کو ہبہ کہا جائے تو اول تو اس لفظ کے یہ معنی نہیں اور اگر ہوں بھی تو ہبہ کے لئے موہوب کا مقسوم ومفرز ہونا شرط ہے مشاع کا ہبہ درست نہیں اور عموماً بہنوں کی یہ معافی تقسیم وقبضہ سے پہلے ہوتی ہے۔ اس لئے کسی حال میں اس لفظ سے بہن کا حق ساقط نہیں ہوتا۔ اگر کسی بہن کو اپنا حق خوشی سے دینا ہی منظور ہو تو اس کی بے خلجان صورت یہ ہے کہ معافی کا لفظ نہ کہے بلکہ بھائی سے یوں کہے کہ میں نے اپنا حصہ تمہارے ہاتھ اتنے روپیہ میں بیع کیا اور وہ کہے میں نے قبول کیا اب زمین بہن کی ملک سے نکل گئی اور بھائی کے ذمہ زرثمن واجب ہو گیا۔ اس زرثمن کو یہ بہن اگر چاہے معاف کر دے۔ اب بتلایئے اس طرح کون کرتا ہے اور افسوس یہ ہے کہ طریقہ معلوم ہونے کے بعد بھی کسی کو یہ توفیق نہیں ہوتی کہ بہن کی گذشتہ معافی معتبر نہ تھی لاؤ اب اس سے دو بول پھر کہہ لیں ذرا سی سستی اور غفلت میں عمر بھر حرام کھاتے ہیں بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ زبان ہلانے میں کیا خرچ ہوتا ہے۔ مجھے نہایت افسوس ہوتا ہے مسلمانوں کی یہ حالت دیکھ کر کہ وہ معاملات میں قانونی رعایات تو بہت جلدی کر لیتے ہیں مگر شرعی رعایات نہیں کرتے اس کی پرواہ نہیں کہ اس

معاملہ میں شرعاً سقم ہے لاؤ اس کی اصلاح کرلیں اگر کوئی یہ عذر کرے کہ بہن سے زبانی کہتے ہوئے شرم آتی ہے تو خط میں لکھ بھیجو اور اگر اتنا بھی نہیں ہوسکتا تو آپ کی وہی مثال ہوگی جو واجد علی شاہ کے احدیوں کی تھی کہ دو احدی ایک جگہ جمع تھے ایک لیٹا ہوا ایک بیٹھا ہوا سامنے سے ایک سوار گذرا تو لیٹے ہوئے احدی نے اس کو پکارا بھائی سوار بھائی سوار ذرا یہاں آنا وہ آیا پوچھا کیا کہتا ہے کہا یہ بیر جو میرے سینہ پر رکھا ہے اٹھا کر میرے منہ میں ڈال دے، اس نے کہا کمبخت تو نے اتنے ذرا سے کام کے واسطے میرا راستہ کھوٹا کیا اتنا کام تو خود نہیں کرسکتا، کہنے لگا اللہ کے واسطے تو ہی منہ میں ڈال دے، اب میں کہاں ہاتھ ہلاؤں پھر سینہ پر لاؤں پھر منہ تک لے جاؤں، سوار نے اس کے دوسرے ساتھی سے کہا ابے تو اس کے پاس بیٹھا ہے تو نے ہی ڈال دیا ہوتا، اس نے کہا بس جناب ایسی بات نہ کہئے گا میں کھلاؤں گا اسے بیر۔ سنو کل میں لیٹا تھا اور یہ بیٹھا تھا میں نے جمائی لی تو اس وقت کتا میرے منہ کے اندر موتنے لگا تو اس سے اتنا نہ ہوا کہ اس کو ہٹا دیتا تو میں اسے بیر ضرور کھلاؤں گا۔

طلباء کا احدی پن

مجھے اس پر اپنے طبقہ کی بھی ایک حکایت یاد آئی کہ ہماری جماعت میں بھی ایک طبقہ اس قسم کا ہوتا ہے یعنی طالب علموں کا طبقہ چنانچہ ہمارے مدرسہ میں ایک طالب علم کے حجرے میں چوہوں نے بہت سی مٹی نکال کر ایک ڈھیر جمع کر دیا اور وہ حضرت روز اس کو دیکھتے تھے مگر اتنی توفیق نہ ہوئی کہ باہر اٹھا کر پھینک دیتے یا سوراخ بند کر کے وہیں دبا دیتے، بس جیسی چوہے نے نکالی تھی اسی طرح ڈھیر لگا رہا۔ ایک دن ہمارے بھائی صاحب کے کارندے جو حاجی بھی ہیں ان کے حجرہ میں آ گئے تو ان کو ڈھیر لگا ہوا برا معلوم ہوا انہوں نے مٹی سوراخ میں بھر کر درست کر دیا اور حجرہ کی صفائی کر دی اس کے بعد پھر چوہے نے مٹی نکال دی کسی نے کہا میاں اس کو درست کر دیا ہوتا تو آپ فرماتے ہیں کہ حاجی جی آ کر کریں گے۔ بس حاجی جی نے ایک دن صفائی کر کے ایسا خطا کر دی تھی کہ عمر بھر کے لئے وہی اس کام کے ملازم ہو گئے۔ خیر طلبہ کی اس کاہلی سے کوئی دینی ضرر تو ہوتا نہیں مگر نظافت کے خلاف ضرور ہے اور اس میں ان کو کچھ عذر بھی ہے کہ وہ پڑھنے میں ایسے مشغول ہوتے ہیں کہ دوسرے کاموں پر توجہ نہیں

ہوتی اور اسی وجہ سے اکثر مولویوں کا خط بھی صاف نہیں ہوتا کیونکہ وہ مقصود میں ایسے منہمک ہوتے ہیں کہ زوائد پر توجہ نہیں ہوتی۔ ملاجیون کے طالب علموں کا قصہ مشہور ہے کہ ایک دن ان کی بیوی نے کہا کہ طالب علم بڑے کاہل ہوتے ہیں۔ ملا جی نے کہا نہیں تم غلط کہتی ہو اس کا ثبوت دو تو اس نے شوربے کے پیالہ میں ایک تنکا ڈال دیا اور کہا کہ دو طالب علموں کو اس میں شریک کردینا۔ چنانچہ دو طالب علموں نے کھانا شروع کیا اور جس کے سامنے وہ تنکا جاتا تھا وہ اپنے سامنے سے دوسرے کی طرف کھسکا دیتا تھا بالآخر کھانے سے فراغت ہوگئی اور تنکا پیالہ میں ہی رہا، تب ملا جی کی بیوی نے ان کو دکھایا کہ دیکھو تمہارے طالب علم ایسے کاہل ہیں کہ ایک تنکے کو نکال کر نہ پھینکا گیا، سالن کھالیا اور تنکا پیالہ ہی میں رہا۔ ممکن ہے کہ یہ قصہ گھڑا ہوا ہو مگر ایسی نظیریں اب بھی موجود ہیں گو طالب علم کسی درجہ میں معذور بھی ہوں مگر مجھے یہ طریقہ پسند نہیں۔ انسان کو اتنا اپاہج بھی نہ ہونا چاہئے بلکہ ایسا ہونا چاہئے۔

چو باز باش کہ صیدے کنی و لقمہ دہی   طفیل خوارہ مشو چوں کلاغ بے پروبال

(باز کی مانند ہو کہ شکار کر کے خود بھی کھاؤ اور دوسرے کو بھی کھلاؤ، جنگلی کوے کی طرح بے پروبال کے طفیلی خورہ مت ہو)

پھلوں کی بیع کا جائز طریقہ

خیر یہ تو احدیوں کی حکایت پر ایک تفریع تھی آپ نے طالب علموں کے اپاہج پنا تو سن لیا اب دنیاداروں کا سنئے مگر دونوں میں اتنا فرق ہے کہ طالب علم دنیا کے کاموں میں اپاہج ہیں دین میں سست نہیں ہوتے اور دنیا کے کاموں میں اپاہج ہونا گناہ یا عذاب کا سبب نہیں اور دنیادار دین کے کاموں میں اپاہج ہیں جس سے گناہ اور عذاب کو اپنے سر مول لیتے ہیں چنانچہ ان سے اتنا نہیں ہوسکتا کہ بہنوں سے شریعت کے موافق زبانی بیع وشراء کے الفاظ کہہ لیں یا خط ہی میں لکھ بھیجیں۔ اور آج کل کے مناسب میں ایک نظیر بتلاتا ہوں وہ یہ کہ اب آم کی فصل آوے گی اور اکثر مسلمان پھل آنے سے پہلے ان کی بیع کر دیتے ہیں شرعاً یہ بیع حرام ہے اور پھل کا کھانا دوسروں کو بھی حرام ہے۔ باغ والوں کی ذرا سی کاہلی سے ساری دنیا حرام کھاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے قلوب میں نور نہیں پیدا ہوتا اور جو کچھ نماز وغیرہ سے

پیدا ہوتا ہے وہ اس حرام غذا کی ظلمت سے زائل ہو جاتا ہے میں نے اس کی اصلاح کا ایک آسان طریقہ بتلایا تھا۔ اصل طریقہ تو وہی ہے کہ ایسے وقت میں پھل فروخت ہی نہ کیا جائے بلکہ جب اچھی طرح پھل نمودار ہو جائے اس وقت بیع کی جائے اس میں باغ والے یہ عذر نکالتے ہیں کہ صاحب اس وقت تک کون حفاظت کرے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر کسی وجہ سے گورنمنٹ کا یہ قانون ہو جائے کہ پھول خوب نمودار ہونے سے پہلے کوئی بیع نہ کرے تو اس وقت کوئی عذر نہ کرے گا بلکہ سب کو حفاظت کے طریقے خود بخود سوجھ جائیں گے اور اس وقت اگر کوئی کہے بھی کہ تم میرے ہاتھ پھل آنے سے پہلے باغ کی بیع کر دو تو مالک کہے گا کیا تم مجھے مجرم بنانا چاہتے ہو یہاں کے مجرم بننے کا تو اتنا ڈر ہے لیکن آخرت کے مجرم بننے کو سب کے سب تیار ہوئے بیٹھے ہیں۔ خیر یہ طریقہ تو لوگ کیا ہی اختیار کرتے مگر ایک آسان ترکیب بتلائی گئی تھی جس سے دنیا حرام کھانے سے محفوظ ہو جاتی مگر افسوس وہ بھی نہ ہو سکی۔ میں نے کہا تھا کہ جو لوگ پھل آنے سے پہلے بیع کر چکے ہوں وہ پھل آنے کے بعد دوبارہ بیع کر لیا کریں۔ بائع خریدار سے یہ کہے کہ بھائی ہم نے جو پہلے بیع کی تھی وہ شرعاً درست نہ تھی اب ہم اسی قیمت پر اس پھل کی بیع تمہارے ہاتھ دوبارہ کرتے ہیں۔ خریدار کہہ دے میں قبول کرتا ہوں اب اس پھل کا کھانا سب کو حلال ہو جائے گا۔ بتلایئے اس میں کیا مشکل تھی صرف زبان ہلتی تھی مگر بات یہ ہے کہ اس کی کوئی قانونی ضرورت نہ تھی قانون سے ایسی بیع جرم نہ تھی صرف خدا نے منع کیا تھا اس لئے پرواہ نہیں اور اس کے لئے ذرا سی آسان بات بھی گوارا نہیں بعبارت دیگر یوں کہئے کہ نعوذ باللہ ہم کو خدا ہی کی ضرورت نہیں۔ تو اے صاحبو! خدا تو بڑی چیز ہے ہم کو تو بیوی بچوں کی بھی ضرورت ہے۔ بیوی بچوں کے بدوں تو صبر نہیں آتا خدا کو چھوڑ کر کیسے صبر آ گیا۔

اے کہ صبرت نیست از فرزند وزن | صبر چوں داری زرب ذوالمنن
اے کہ صبرت نیست از دنیائے دوں | صبر چوں داری زنعم الماہدون

(اے شخص تجھ کو بیوی سے صبر نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ سے کیونکر تجھ کو صبر آ گیا اور تجھ کو ذلیل دنیا سے صبر نہیں ہے تو خدا تعالیٰ سے کیونکر صبر رکھتا ہے)

دورِ آزادی

اے صاحبو! ہمارا کیسا مذاق بگڑا ہے کہ جو چیز قانوناً ضروری نہیں بس اس کی فکر ہی نہیں تو میں کہتا ہوں گو میرے منہ سے یہ کہنا اچھا نہیں لگتا۔ لیکن جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ (ڈالو جو کچھ ڈالنا چاہتے ہو) اور امر مقصود نہ تھا بلکہ جانتے تھے کہ القاء تو ہو ہی گا اسی طرح میں بھی کہتا ہوں عدم مبالاۃ سے نہیں کہتا کہ اگر آپ کو پھل آنے سے پہلے ہی بیع کرنا ہے تو خیر ایسا کرلیا کرو مگر بعد میں پھل آنے پر تو عقد دوبارہ کرلیا کرو، اور زبان ہلا کر ایجاب وقبول کا اعادہ کرلیا کرو مگر مجھے اس کی بھی اُمید نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ احکام شرعیہ کی وقعت ہی دل میں بسی ہوئی نہیں اور دل میں بسی ہوئی نہ ہونے کی وجہ یہ نہیں کہ ایمان نہیں ہے ایمان تو ہے مگر دل پر پردے پڑے ہوئے ہیں وہ پردے اٹھ جائیں تو ہر حکم کی وقعت ہونے لگے۔ اس لئے سب سے پہلے ان پردوں کو اٹھانا چاہئے جس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنا دستور العمل یہ رکھئے کہ اول تو بقدر ضرورت احکام کا علم حاصل کیجئے جس کی آسان صورت یہ ہے کہ جو دینی رسائل محققین کی تصنیف سے ہیں ان کو مطالعہ میں رکھئے مگر ہر زید وعمر کی تصنیف کا مطالعہ نہ کیجئے کیونکہ آج کل آزادی کا زمانہ ہے ہر شخص کا جو جی چاہتا ہے لکھ مارتا ہے آج کل ایسے ایسے مصنف بھی ہیں کہ میں نے ایک رسالہ میں یہ مضمون لکھا ہوا دیکھا کہ ربوا حرام نہیں ہے۔ مسلمانوں کو سود کے ذریعہ سے ترقی حاصل کرنا چاہئے اور قرآن میں جو آیا ہے وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (ربوا حرام ہے) تو وہ ربا (بضم راء) ربودن سے مطلب یہ ہے کہ خدا نے غضب کو حرام کیا ہے اور راء کو جو کسرہ پڑھا جاتا ہے یہ اعراب بعد میں مولویوں نے لگائے ہیں جو حجت نہیں ہیں۔ اس احمق نے یہ بھی نہ دیکھا کہ قرآن عربی زبان میں ہے اور ربودن فارسی مصدر ہے اس سے کوئی لفظ مشتق ہو کر قرآن میں کیونکر آسکتا ہے پھر یہ لفظ ربا مفرداً بو فارسی میں بھی مہمل ہے کسی نے اس کو استعمال نہیں کیا۔ تو صاحبو آج کل یہ بھی تحقیقات ہیں بس میں تو ایسے مجددوں کی نسبت یہ شعر پڑھا کرتا ہوں۔

گر بہ میر وسگ وزیر و موش را دیوان کنند
ایں چنیں ارکان دولت ملک را ویراں کنند

(بلی امیر کتا وزیر چوہے کو دیوان جی بنادیں یہ ارکین سلطنت ملک کو برباد ہی کردیں گے)

اگر یہی تحقیقات ہیں اور ایسے ہی محقق ہیں اور یوں ہی اسلام کے پرتوڑے جائیں گے تو پھر اسلام کی خیر نہیں بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہر کتاب کے دیکھنے میں کیا حرج ہے اگر ہم اپنے مسلک پر جمے رہے تو کسی کی کتاب کے دیکھنے کا کیا مضائقہ ہے۔ سو بات یہ ہے کہ میں ہر شخص کی تصنیف کے مطالعہ سے نہ روکتا اگر اس کا برا اثر نہ دیکھتا مگر جب میں لوگوں کو متاثر ہوتا ہوا دیکھتا ہوں تو منع کرتا ہوں۔ بس آپ کی خیر اسی میں ہے کہ صرف محققین کے رسالے دیکھئے اور نئے نئے خودرو مصنفوں کے رسالے ہرگز نہ دیکھئے اور میں عنقریب محققین کو بھی بتلا دوں گا کہ وہ کون لوگ ہیں غرض جو پڑھے لکھے ہیں وہ تو یہ رسائل دیکھیں اور پورا نصاب دیکھیں ایک دو رسالہ کا مطالعہ کافی نہیں اور وہ نصاب بھی کوئی محقق ہی بتلا دے گا اور اثناء مطالعہ میں جہاں شبہ رہے اس پر وہاں نشان بناتے رہیں اور بعد میں ان مشتبہ مقامات کو کسی محقق سے زبانی حل کرلیں اور جو ان پڑھ ہیں وہ ان رسالوں کو سن لیا کریں اگر تم کو طلب ہوگی تو ان شاء اللہ کوئی بنانے والا بھی مل جائے گا۔ ایک تو اس کا التزام کرلیں دوسری بات یہ کرو کہ جو کام کرنا ہو خواہ نوکری یا ملازمت یا تجارت یا شادی یا غمی سب کے متعلق پہلے کسی محقق سے حکم شرعی دریافت کرلو اگر چہ عمل کی بھی توفیق نہ ہو دریافت کرلینے میں کم از کم یہ فائدہ ہوگا کہ اس کے جائز و ناجائز ہونے کا تو علم ہو جائے گا ممکن ہے کہ یہ علم کسی وقت اس سے بچنے کی ہمت پیدا کردے اور جو مبتلا ہی رہے تو حرام کو حلال سمجھ کر تو نہ کرو گے اب آج کل یہ حالت ہے کہ لوگ ضروری باتیں تو دریافت کرتے نہیں وہ مسائل پوچھتے ہیں جن سے کبھی واسطہ نہ پڑے یا وہ مسائل پوچھتے ہیں جو پہلے سے معلوم ہیں تاکہ مولوی صاحب کا امتحان ہو سکے چنانچہ رامپور میں ایک صاحب نے مجھ سے اختلافی مسائل پوچھے جن میں میرا مسلک ان کو معلوم بھی تھا میں سمجھ گیا کہ اس سوال سے میرا امتحان مقصود ہے میں نے کہا کہ آپ امتحان کے لئے پوچھتے ہیں یا عمل کے لئے اگر عمل کے لئے پوچھتے ہیں تو اس کے لئے مسئول سے اعتقاد کا ہونا شرط ہے اور آپ مجھے جانتے بھی نہیں تو میرے معتقد کیسے ہوگئے اور محض نام سننا کافی نہیں نام تو نہ معلوم کتنوں کا سنا ہوگا اور جو امتحان کے لئے پوچھتے ہیں تو آپ کو میرے امتحان کا کیا حق ہے بس وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

سوال کا جواب مرض کے مطابق

میں ایسا روگ نہیں پالتا کہ ہر شخص کے سوال کا اس کی مرضی کے موافق جواب دیا کروں جہاں میں دیکھتا ہوں کہ سوال سے مقصود عمل نہیں وہاں کبھی جواب نہیں دیتا غرض آج کل لوگ اس قسم کے مسائل دریافت کرتے ہیں حالانکہ اس طرح کام نہیں چل سکتا ہر کام قاعدے سے ہوا کرتا ہے پس سب سے پہلے کسی کی حالت کو جانچ لو خوب امتحان کرلو جب اس کے علم وعمل پر کافی اطمینان ہو جائے اب اس سے پوچھ پوچھ کر عمل کرو اور فضول باتیں نہ پوچھو یہ یاد رکھو کہ بدوں اچھی طرح جانچے ہوئے کسی کو اپنا بڑا نہ بناؤ کیونکہ دین بڑی قدر کے قابل چیز ہے۔ اس لئے ہر کس وناکس کو رہنما نہ بناؤ لیکن جب کسی کا محقق ہونا ثابت ہو جائے تو پھر اس سے حجت نہ کرو جو بتلائے تو اس پر عمل کرو اور ایک اس کا التزام کرو کہ جب کبھی فرصت ومہلت ہوا کرے تو ایسے بزرگوں سے ملتے رہا کرو اور ان سے ڈرو نہیں کہ ہمارے افعال پر لتاڑیں گے۔ ہر گز نہیں وہ تمہارے سامنے منہ توڑ کر کوئی بات نہ کہیں گے (مگر ہاتھ جوڑ کر بھی نہ کہیں گے ۱۲) ایسے بزرگوں کی برکت صحبت سے تمہاری حالت ان شاء اللہ تعالیٰ خود بخود درست ہوتی چلی جائے گی۔

دل سے پردے اٹھانے والا دستور العمل

یہ ہے وہ دستور العمل جو دل سے پردے اٹھاتا ہے جس کے چند اجزاء ہیں۔ ایک تو کتابیں دیکھنا یا سننا۔ دوسرے مسائل دریافت کرتے رہنا۔ تیسرے اہل اللہ کے پاس آنا جانا اور اگر ان کی خدمت میں آمدورفت نہ ہو سکے تو بجائے ان کی صحبت کے ایسے بزرگوں کی حکایات وملفوظات ہی کا مطالعہ کرو یا سن لیا کرو اور اگر کچھ تھوڑی دیر ذکر اللہ بھی کرلیا کرو تو یہ تو اصلاح قلب میں بہت ہی معین ہے اور اسی ذکر کے وقت میں سے کچھ وقت محاسبہ کے لئے نکال لو جس میں اپنے نفس سے اس طرح باتیں کرو کہ اے نفس ایک دن دنیا سے جانا ہے موت بھی آنے والی ہے اس وقت یہ سب مال ودولت یہیں رہ جائے گا۔ بیوی بچے سب تجھے چھوڑ دیں گے اور خدا تعالیٰ سے واسطہ پڑے گا اگر تیرے پاس نیک اعمال زیادہ

ہوئے تو بخشا جائے گا اور گناہ زیادہ ہوئے تو جہنم کا عذاب بھگتنا پڑے گا جو برداشت کے قابل نہیں ہے اس لئے تو اپنے انجام کو سوچ اور آخرت کے لئے کچھ سامان کر یہ عمر بڑی قیمتی دولت ہے اس کو فضول رائیگاں مت برباد کر مرنے کے بعد تو اس کی تمنا کرے گا کہ کاش میں کچھ نیک عمل کرلوں جس سے مغفرت ہو جائے مگر اس وقت تجھے یہ حسرت مفید نہ ہوگی پس زندگی کو غنیمت سمجھ کر اس وقت اپنی مغفرت کا سامان کرلے۔

محاسبہ نفس

اگر ذکر بھی نہ ہو سکے تو دستور العمل سابق کے ساتھ یہ محاسبہ تو روزانہ ضرور کرلیا کرو۔ نہ میں آپ سے نوکری چھڑاتا ہوں نہ بیوی بچوں کو چھڑاتا ہوں آپ دنیا کے سارے دھندے کیجئے اور مبتلا گناہ در گناہ رہیئے مگر یہ کام بھی ساتھ کئے جایئے ان شاء اللہ تعالیٰ ایک دن وہ ہوگا کہ یہ عمل آپ کی دنیا اور دین دونوں کو سنوار دیگا۔ دنیا کو تو اس طرح کہ دنیا سے جو مقصود ہے یعنی راحت قلب بخدائے لایزال وہ بڑھ جائے گی اس وقت تو آپ کی یہ حالت ہے کہ آپ روٹی کو نہیں کھاتے بلکہ روٹی آپ کو کھاتی ہے۔ دنیا کی حالت یہ ہے کہ یہ کسی کے پاس سے جاتی ہے تب بھی پریشان کرتی ہے اور آتی ہے تب بھی پریشان کرتی ہے۔ اگر روپیہ پاس نہیں تب تو فکر ظاہر ہے کہ ہر وقت اسی کے ادھیڑ بن رہتی ہے آج کہاں سے کھاؤں گا کہاں سے پہنوں گا اور جو روپیہ پاس ہے تو اس کی حفاظت کی فکر ہے کہ اسے کہاں رکھوں کہاں دابوں کہیں چور نہ لے جائیں کسی کو خبر نہ ہو جائے۔ بعض دفعہ اس پریشانی میں بہت لوگوں کو نیند نہیں آتی۔ سچ کہا ہے۔

ومن یحمد الدنیا لعیش یسرہ	فسوف لعمری عن قلیل یلومھا
اذا ادبرت کانت علی المرأ حسرۃ	وان اقبلت کانت کثیراً ھمومھا

(جو شخص تھوڑے سے عیش کی وجہ سے دنیا کی تعریف کرتا ہے مجھے قسم ہے اپنی جان کی کہ وہ تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی ملامت کرے گا جب دنیا پیٹھ پھیرتی ہے تو آدمی کو حسرت ہوتی ہے اور جب آتی ہے تو بہت غموں کو لاتی ہے)

یعنی جب دنیا نہ ہو تو حسرت ہوتی ہے اور جب آتی ہے تو ہزاروں غموں کو ساتھ لاتی ہے۔ تو اس وقت دنیا آپ کے لئے باعث راحت نہیں بلکہ آلہ تعذیب ہے جیسا کہ ارشاد ہے۔ وَلَا تُعْجِبْکَ اَمْوَالُهُمْ وَلَا اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا یُرِیْدُاللّٰهُ اَنْ یُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا۔ (تم کو ان کے اموال واولاد تعجب میں نہ ڈالے اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے ان کو دنیا کی زندگی ہی میں ان کو عذاب دیں) واقعی دنیاداروں کے لئے دنیا کا جمع ہونا عذاب ہی ہے ان کو تو چین کی نیند بھی میسر نہیں ہوتی۔ صاحبو! خدا کی طرف متوجہ ہو کر دیکھو اس وقت یہ دنیا آپ کے لئے راحت کا ذریعہ ہو گی۔ اب آپ کو قورمہ میں وہ مزہ نہیں آتا جو اس وقت خالی چٹنی میں آئے گا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر آپ کسی پر عاشق ہو جاویں اور وہ اپنے ہاتھ سے کوئی ایسی چیز کھانے کو دے جو آپ کو مرغوب نہیں تو ذرا سوچ کر بتلایئے کہ آپ کو اس میں لذت آئے گی یا نہیں یقیناً اس وقت وہ نامرغوب چیز آپ کو تمام مرغوبات سے زیادہ لذیذ معلوم ہو گی کیوں اس لئے کہ وہ محبوب کے ہاتھ سے ملی ہے۔ بس اسی طرح یہاں سمجھ لیجئے کہ اس وقت جو آپ قورمہ کھاتے ہیں اس میں اس لئے مزا نہیں آتا کہ آپ کو یہ خبر نہیں ہے کہ یہ خدا کا دیا ہوا ہے اور اگر اعتقاداً علم بھی ہے تو خدا کے ساتھ آپ کو پوری محبت نہیں ہے اس لئے پورا مزا نہیں آتا اور اس دستور العمل پر عمل کر کے آپ پر حقیقت منکشف ہو جائے گی اس وقت آپ ہر چیز کو حق تعالیٰ کی طرف سے سمجھیں گے اور یوں کہیں گے مصرع: ہرچہ از دوست میرسد نیکوست (جو کچھ دوست کی جانب سے آئے وہ بہتر ہی ہے) اس وقت اس انتساب سے اس میں وہ لذت ہو گی جس کے سامنے تمام لذتیں گرد ہوں گی پھر آپ کو ہر حالت میں راحت ہو گی کبھی بے چینی نہ ہو گی۔ اور یہی بات تو ہے جس کو ایک بزرگ نے ایک بادشاہ کے جواب میں کہا تھا۔

پوشش تو اطلس و دیبا حریر   بخیہ زدہ خرقہ پشمین ما

(تیرا لباس ریشم واطلس کا ہے اور ہمارا خرقہ پشمین زبخیہ زدہ ہے)

اسی طرح بہت چیزوں میں موازنہ کر کے اخیر میں کہتے ہیں۔

باش کہ تاطبل قیامت زنند   آن تو نیک آید و یا این ما

(ذرا صبر کرو قیامت میں معلوم ہو جائے گا کہ وہ تمہاری راحت اچھی تھی یا یہ ہماری محنت)

یعنی اس وقت تو تو ہر چیز میں خوشحال ہے اور ہم خستہ حال ہیں مگر ٹھہرا رہ ابھی قیامت آنے والی ہے اس وقت تجھے معلوم ہوگا کہ بادشاہ کون ہے اور مفلس کون ہے صاحب خدا کے تعلق سے قلب میں ایسی راحت اور چین ہوتی ہے جس سے انسان فقر میں بھی بادشاہ ہوتا ہے۔

حکایت حضرت پیران پیرؒ

حضرت غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ کو ملک سنجر نے لکھا تھا کہ میں ملک نیمروز کا ایک حصہ آپ کی خانقاہ کے لئے مقرر کرنا چاہتا ہوں تو آپ جواب میں ارشاد فرماتے ہیں۔

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد

(چتر سنجری کی طرح میرا منہ کالا ہو)

اس زمانہ میں چتر شاہی سیاہ ہوا کرتا تھا اس لئے فرماتے ہیں۔

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد ۔۔۔ دردل اگر بود ہوس ملک سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبراز ملک نیم شب ۔۔۔ من ملک نیمروز بیک جونمی خرم

(چتر سنجری کی طرح میرا منہ کالا ہو اگر میرے دل میں ملک سنجر کا وسوسہ بھی ہو مجھے جب سے نیم شب کی سلطنت حاصل ہوئی ہے میری نظر ملک نیمروز کی سلطنت ایک جو کے برابر نہیں ہے)

فرماتے ہیں کہ جب سے مجھ کو ملک نیم شب کی خبر ملی ہے یعنی جب سے آدھی رات کی مناجات وعبادات میں لذت حاصل ہوئی ہے اس وقت سے مجھے ملک نیم روز کی جو برابر بھی قدر نہیں ہے تو صاحبو! یہ حلاوت ہوتی ہے خدا کے تعلق میں اور یہ لذت ہوتی ہے اس انتساب میں جو دنیا بھر سے مستغنی کر دیتی ہے اس لئے میں کہتا ہوں کہ اس دستور العمل سے آپ کی دنیا بھی با حلاوت ہو جائے گی اور کھانے پینے میں بھی وہ لذت آئے گی جو اس وقت خواب میں بھی نہ دیکھی ہوگی۔ اس وقت آپ کو تنبہ ہوگا اور خدا کی ناراضی کسی طرح گوارا نہ ہوگی اور سب گناہ ایک ایک کر کے چھوٹ جائیں گے تو دین بھی درست ہو جائے گا اور اس وقت آپ ہمارے پیچھے پیچھے پھریں گے اب ایک بات قابل بیان رہی وہ یہ کہ اس دستور العمل کا ایک جزو یہ بھی تھا کہ محققین کے رسائل دیکھو اور محققین

سے مسائل پوچھو اور ان کے پاس آمد و رفت رکھو اس پر سوال یہ ہوتا ہے کہ وہ محققین کون لوگ ہیں یہ بہت کٹھن سوال ہے جس نے مسلمانوں کو اس وقت پریشان کر رکھا ہے وہ دیکھتے ہیں کہ علماء میں باہم سخت اختلاف ہے۔ کوئی ایک بات کو حرام کہتا ہے تو دوسرا اس کو جائز کہتا ہے کوئی ایک بات کو سنت کہتا ہے تو دوسرا اس کو بدعت بتلاتا ہے اب کس کی مانیں کس کی نہ مانیں یا تو سب پر عمل کریں یہ تو غیر ممکن ہے یا ایک کو دوسرے پر ترجیح کی وجہ کیا۔ لہٰذا بعض نے تو یہ فیصلہ کیا کہ سب کو چھوڑ دو۔

صاحبو! مجھے اس فیصلہ کی تو شکایت نہیں مگر رونا اس کا ہے کہ جب یہی صورت اختلاف فنون دنیا کے ماہروں میں پیش آئی تو وہاں آپ نے یہ فیصلہ کیوں نہیں کیا وہاں کسی ایک کو ترجیح دے کر کیوں پکڑا یعنی بار ہا ایسا ہوتا ہے کہ کسی مریض کے علاج میں اطباء اور ڈاکٹروں کی رائے مختلف ہوتی ہے کوئی کچھ مرض کی تشخیص کرتا ہے کوئی کچھ اور ہر ایک اپنی رائے کو صحیح بتلاتا ہے اور دوسرے کی رائے پر عمل کرنے کو مریض کے لئے مہلک بتلاتا ہے وہاں آپ نے سب حکیموں کو کیوں نہیں چھوڑا اور یہ کیوں نہیں کہا کہ افسوس اطباء میں اتفاق ہی نہیں اب ہم کس کا علاج کریں بس جاؤ مریض کو مرنے دو ہم کسی کا بھی علاج نہیں کرتے وہاں آپ ایک حکیم کو ترجیح دے کر اس کا علاج کیوں کرتے ہیں علیٰ ہذا اپنے وکلاء کے ساتھ بھی یہی برتاؤ کیوں نہیں کیا جو علماء کے ساتھ کیا گیا ہے کیا وکلاء میں باہم اختلاف نہیں ہوتا۔ ہوتا ہے اور یقیناً ہوتا ہے پھر وہاں ایک وکیل کو دوسرے پر ترجیح کیوں دی جاتی ہے اور سب کو کیوں نہیں چھوڑا جاتا اس کا جواب آپ کے پاس کیا ہے۔ لیجئے میں ہی اس کا جواب بھی دے دیتا ہوں جو ایک گہری بات ہے وہ یہ کہ دو قسم کی چیزیں ہوتی ہیں ایک وہ جن کو ضروری سمجھا جائے دوسرے وہ جن کو ضروری نہ سمجھا جائے۔ جن باتوں کو ضروری سمجھا جاتا ہے ان کو تو کسی اختلاف کی وجہ سے ترک نہیں کیا جاتا بلکہ وہاں آدمی اپنی عقل سے تدبیر سوچتا ہے اور باوجود اختلاف کے ایک کو دوسرے پر ترجیح دے لیتا ہے اور جن باتوں کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی ان کو اختلاف وغیرہ کی صورت میں چھوڑ دیا جاتا ہے اور وہاں تدبیر و تامل سے ایک کو ترجیح دینے کی مشقت گوارا نہیں کی جاتی۔ یہ قاعدہ ہے طبیعت انسانیہ کا۔ اسی کے موافق یہاں عمل کیا گیا ہے کہ انسان میں دو چیزیں ہیں جان اور ایمان۔ جان چونکہ عزیز ہے اس لئے اس کی صحت و حفاظت

کے اسباب میں اختلاف ہونے سے سب کو ترک نہیں کیا جاتا بلکہ وہاں یہ قاعدہ نکالا جاتا ہے کہ اہل کمال میں تو اختلاف ہوا ہی کرتا ہے اس سے گھبرانا نہ چاہئے ہم اپنی عقل سے اور اپنے خیر خواہوں سے دریافت کریں گے کہ ان سب حکیموں اور ڈاکٹروں میں کون سب سے زیادہ حاذق ہے بس اس کا علاج اختیار کر لیں گے۔ اور ایمان عزیز نہیں اس لئے علماء کے اختلاف میں عقل سے کام لینا اور غور و تامل کی محنت برداشت کرنا گوارا نہیں۔

علماء حق کا انتخاب

تو اے صاحبو! اگر آپ ایمان کو بھی عزیز سمجھتے تو علماء میں بھی اسی طرح انتخاب کرتے جس طرح حکماء میں کیا جاتا ہے۔ مگر افسوس آپ کو ایمان عزیز نہیں اس لئے صاف سب کو چھوڑ دیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس اختلاف میں مولویوں کی خطا نہیں ہے بلکہ ضرور ہے اور آگے میں یہ بھی بتلا دوں گا کہ ان میں سے خطا کن کی ہے، مگر آپ کی اتنی شکایت ضرور کروں گا کہ اس اختلاف کی وجہ سے سب کو چھوڑ دینا یہ بے ترتیب اور غلط رائے ہے جو ایمان کو عزیز نہ سمجھنے کی علامت ہے بعض لوگ اس اختلاف کو دیکھ کر علماء کو رائے دیتے ہیں کہ سب مولویوں کو متفق ہو جانا چاہئے نا اتفاقی بری چیز ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ کیا نا اتفاقی علی الاطلاق جرم ہے یا اس کے لئے کوئی قید بھی ہے اگر نا اتفاقی علی الاطلاق جرم ہے اور اس کی وجہ سے ہر فریق مجرم ہو جاتا ہے تو عدالت کو چاہئے کہ جب اسکے پاس کوئی مدعی دعوے پیش کرے تو قبل تحقیق مقدمہ ہی مدعی اور مدعی علیہ دونوں کو سزا کر دیا کرے کیونکہ دعوے اور انکار سے دونوں میں نا اتفاقی کا ہونا ثابت ہو گیا اور نا اتفاقی علی الاطلاق جرم ہے تو مدعی اور مدعی علیہ دونوں مجرم ہوئے اگر عدالت ایسا کرے تو سب سے پہلے آپ ہی مخالف ہوں گے اور دنیا بھر میں شور و غل مچا دیں گے کہ یہ کون سا انصاف ہے کہ تحقیق مقدمہ سے پہلے ہی دونوں کو مجرم بنا دیا گیا اب اگر کوئی آپ سے پوچھے کہ پھر کیا کرنا چاہئے تھا تو آپ عاقل بن کر یہ رائے دیں گے کہ عدالت کو تحقیق کرنا چاہئے تھا کہ مدعی اور مدعی علیہ میں جو باہم مخالفت و نا اتفاقی ہے تو ان میں سے حق پر کون ہے اور ناحق پر کون ہے جو حق پر ہوتا اس کی حمایت کی جاتی اور جو ناحق پر ہوتا اس کو سزا دی جاتی۔ لیجئے آپ ہی کے فیصلہ سے ثابت ہو گیا کہ نا اتفاقی علی الاطلاق جرم نہیں بلکہ نا اتفاقی وہ جرم ہے جو ناحق ہو اور جو نا اتفاقی بحق ہو وہ جرم نہیں اور اگر کسی معاملہ میں دو

فریق ہو جائیں تو ہر فریق کو مجرم نہیں کہا جا سکتا بلکہ جس کی مخالفت ناحق ہو وہ مجرم ہے اور جو بحق ہو وہ مجرم نہیں۔ پس علماء کی باہم نااتفاقی اور اختلاف سے آپ کا سب کو مجرم بنانا اور ہر فریق سے یہ کہنا کہ دوسرے سے اتفاق کرلو غلط رائے ہے بلکہ اول آپ کو تحقیق کرنا چاہئے کہ حق پر کون ہے ناحق پر کون ہے پھر جو ناحق پر ہو اسے مجرم بنائے اور اس کو اہل حق کے ساتھ اتفاق کرنے پر مجبور کیجئے ورنہ اہل حق کو دوسروں کے ساتھ اتفاق پر مجبور کرنے کے تو یہ معنے ہوں گے کہ وہ حق کو چھوڑ کر ناحق طریق اختیار کرلیں اور اس کو کوئی عاقل تسلیم نہیں کرسکتا تو اتنی شکایت آپ کی رہ گئی کہ آپ قبل از تحقیق ہی سب کو متفق ہو جانے کی رائے دیتے ہیں اور مولویوں کی شکایت ہم کو بھی ہے مگر صرف ان کی جو ناحق پر ہیں۔

اختلاف اُمت رحمت ہے

اور اگر یہ کہا جائے کہ صاحب دوسرا فریق بھی اتفاق سے مجبور ہے کیونکہ ان کی سمجھ میں یوں ہی آیا وہ اسی کو حق سمجھتے ہیں جو ان کی سمجھ میں آیا تو جناب ایسا اختلاف تو اختلاف رحمت ہے اس اختلاف سے فتنے اور فساد کی نوبت نہیں آیا کرتی۔ دیکھئے آئمہ اربعہ میں سمجھ ہی کا اختلاف ہے۔ مگر اس کے ساتھ پھر سب متفق ہیں کوئی ایک دوسرے پر ملامت وطعن نہیں کرتا بلکہ ہر ایک سب کو حق پر سمجھتا ہے اگر ایسا اختلاف ہوتا تو مسلمانوں کو آج یہ پریشانی نہ ہوتی جو آنکھوں سے نظر آ رہی ہے بلکہ یہ اختلاف تو روٹیوں کا ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ اگر اہل حق کے پاس کافی روپیہ ہو اور وہ ان سب فرقوں کی تنخواہ مقرر کردیں تو سارا اختلاف ایک دن میں مٹ جائے یہ سارا اختلاف پیٹ کی وجہ سے ہے کوئی مولود پر زور دیتا ہے کوئی فاتحہ پر کوئی تیجہ، دسویں پر ایک عالم سے جو بدعات کے بڑے حامی ہیں کسی نے سوال کیا کہ تم تو مولود و فاتحہ کو سنت کہتے ہو اور ان پر بہت زور دیتے ہو اور جو ان سے منع کرے اس کو برا بھلا کہتے ہو پھر یہ کیا وجہ ہے کہ تمہاری مستورات بہشتی زیور پڑھتی ہیں (اللہ کی شان ہے کہ اس کتاب کو سب مسلمان اپنی مستورات کے لئے تجویز کرتے ہیں خواہ وہ کسی خیال کے ہوں، چنانچہ ان عالم صاحب کی مستورات بھی بہشتی زیور پڑھتی تھیں ۱۲) تو انہوں نے اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ سارا اختلاف تو اس کی خرابی ہے ورنہ حق وہی ہے جو بہشتی زیور میں لکھا ہے۔

زمانہ طاعون میں تیجہ دسواں موقوف رہا

میں نے ایک دفعہ لکھنؤ میں دیکھا کہ ہر کھانے پر الگ الگ فاتحہ دی جارہی ہے پھر وہاں بیان کی فرمائش ہوئی تو میں نے اس بیان میں کہا کہ فاتحہ و مولود کے سنت اور بدعت ہونے کا امتحان بہت آسانی سے اس طرح ہوسکتا ہے کہ جو مولوی صاحب مولود پڑھیں یا فاتحہ دیں ان کو کچھ دیا نہ جائے ان سے خوب مولود پڑھواؤ اور الگ الگ ہر رکابی پر فاتحہ دلواؤ مگر نذرانہ کچھ نہ دو نہ مٹھائی کا دہرا حصہ دو پھر دیکھنا وہ خود ہی اس کو فضول اور بدعت کہنے لگیں گے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے اس پر عمل کیا تو اسی روز شام کو آ کر ایک فاتحہ خواں صاحب کہنے لگے کہ واقعی یہ تو ایک فضول سا قصہ معلوم ہوتا ہے کہ الگ الگ فاتحہ ہو ایک ہی کافی ہے میں نے جی میں کہا کہ اب تو معلوم ہو ہی جائے گا صاحبو! میں سچ کہتا ہوں کہ ان کی آمدنی بند کردو تو وہ خود ہی کہنے لگیں گے کہ سب فضول قصہ ہے یہ ساری باتیں روٹیاں کھانے کی ہیں۔ جب ایک سال طاعون بہت زور کا ہوا تو میں دیکھ رہا تھا کہ چنے پڑھوانا اور فاتحہ دلوانا اور تیجہ دسواں سب موقوف ہے میں دیکھتا رہا جب طاعون کا زور ختم ہوگیا تو میں نے لوگوں سے کہا کہ کیوں جناب وہ چنے اور فاتحہ کہاں گئے اور اب وہ تیجے دسویں کیوں نہیں ہوئے۔ کہنے لگے اجی ان باتوں کی کسے فرصت تھی میں نے کہا بھلا اس عدیم الفرصتی میں کسی نے جنازہ کی نماز بھی چھوڑی اور کفن دفن بھی چھوڑا کہا نہیں۔ میں نے کہا بس سمجھ لو جو کام حذف ہوگئے وہ دین کے کام نہ تھے بلکہ فرصت کی باتیں تھیں اور یہ دین کے کام تھے اس لئے یہ کم فرصتی میں بھی ترک نہ ہوئے بس خاموش ہی تو ہوگئے۔ اسی طرح گاؤں کے ایک صاحب کہنے لگے کہ فاتحہ میں حرج کیا ہے بلکہ فائدہ ہے کہ اس میں سورتوں کا ثواب بھی مردوں کو پہنچ جاتا ہے، میں نے کہا یہ فائدہ تو کھانے کے ساتھ مخصوص نہیں روپے پیسے اور کپڑے میں بھی ہوسکتا ہے پھر کبھی اللہ نام کے روپے پیسے اور کپڑے پر بھی فاتحہ پڑھی کہنے لگے کبھی نہیں۔ میں نے کہا کیوں نہیں پڑھی مردہ کو فائدہ ہی ہوتا سورتوں کا بھی ثواب پہنچ جاتا کہنے لگے اجی بس سمجھ میں آ گیا تم سچ کہتے ہو۔ صاحبو! یہ بالکل کھلی ہوئی باتیں ہیں یہ سارے قصے محض آمدنی کے واسطے نکالے گئے ہیں اگر ان فاتحہ مولود پڑھنے والوں کی

آمدنی بند کردی جائے تو پھر دیکھئے وہ بھی وہی کہنے لگیں گے جو ہم کہتے ہیں اس مجلس میں میں نے سنت و بدعت کی تحقیق بیان نہیں کی بلکہ وہ باتیں بیان کردی ہیں جو بہت موٹی ہیں جن سے ہر شخص کو بآسانی حق کا پتہ چل سکتا ہے۔ اگرچہ بحمد اللہ سنت و بدعت کی شناخت کے حقیقی اصول بھی اپنے پاس موجود ہیں مگر ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ۔۔۔ ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(راز کا فاش کرنا مصلحت کے خلاف ہے ورنہ عارفین کی مجلس میں کوئی چیز ایسی نہیں کہ نہ ہو)

علماء اہل حق کی پہچان

ہاں اگر کوئی طلب ظاہر کرے اور ہمارے پاس آ کر رہے تو اس کو وہ اصول بھی بتلا دیں گے۔ غرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ اختلاف علی الاطلاق محل شکایت نہیں ہوسکتا بلکہ پہلے آپ حق کو متعین کیجئے اس کے بعد دیکھئے کہ علماء مختلفین میں سے حق پر کون لوگ ہیں اور ناحق پر کون اس طرح محقق اور غیر محقق کی پہچان ہو جائے گی جس کی میں ایک آسان ترکیب بتلاتا ہوں وہ یہ کہ دو قسم کے لوگ ہیں بعض تو پڑھے لکھے ہیں خواہ اردو ہی میں لکھے پڑھے ہوں اور بعض ان پڑھ ہیں پہلے طبقہ کے لئے تو تحقیق حق کا طریقہ یہ ہے کہ وہ سب علماء کی کتابیں دیکھیں مگر دونوں طرف کے علماء کی کتابیں خالی الذہن ہو کر انصاف کے ساتھ دیکھیں پہلے سے کسی کی طرف داری اور حمایت کا خیال دل میں نہ لائیں کیونکہ اعتقاد کے بعد اس کی ہر بات اچھی معلوم ہوگی اور عیب نظر نہ آئے گا سو تحقیق حق کا یہ طریقہ نہیں بلکہ اس کا طریقہ یہی ہے خالی الذہن ہو کر دونوں کی کتابوں کا مطالعہ انصاف کے ساتھ کیا جائے خدا کے ساتھ معاملہ ہے اس کو پیش نظر رکھ کر دیکھنا چاہئے ان شاء اللہ تعالیٰ اگر طلب حق ہے تو بہت جلد آپ کے ذہن میں خود بخود حق واضح ہو جائے گا۔ جب ایک کا حق پر ہونا معلوم ہو جائے تو بس اسی سے تعلق رکھو اور اسی سے دین کی باتیں اور خدا کا راستہ دریافت کرو مگر دوسرے کو بھی برا نہ کہو کیونکہ کسی کو برا بھلا کہنے سے تمہارا کیا بھلا ہو جائے گا۔ بس تم اپنی یہ حالت رکھو ؎

ہمہ شہر پر ز خوبان منم و خیال ما ہے ۔۔۔ چہ کنم کہ چشم بدخو نہ کند بکس نگا ہے

(تمام شہر محبوبوں سے بھرا ہوا میں ہوں اور خیال ایک محبوب کا ہے کیا کروں کہ چشم بدخو کسی کی طرف دیکھتی ہی نہیں)

دیکھو اگر کوئی شخص کسی حسین پر عاشق ہو جائے تو وہ دوسرے حسینوں کو گالیاں بھی نہیں دیا کرتا بس یہ کہتا ہے کہ کوئی اور بھی حسین ہو مگر میں تو اپنے محبوب ہی کا عاشق ہوں اور یہ حال ہونا چاہئے۔

دل آرامیکہ داری دل درو بند　　دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

(جس دل آرام (محبوب سے) تمہارا دل گرفتار ہے تو پھر تمام عالم سے آنکھ بند کرلو)

اگر کوئی برا بھی ہو تو اس کو برا نہ کہو وہ اگر برا ہے تو تم کو کیا اور اگر دوسرا تم کو برا کہے جب بھی تم اسے کچھ نہ کہو ذوق نے خوب کہا ہے۔

تو بھلا ہے تو برا ہو نہیں سکتا اے ذوق　　ہے برا وہ ہی کہ جو تجھ کو برا جانتا ہے

اور اگر تو ہی برا ہے تو وہ سچ کہتا ہے　　پھر برا کہنے سے کیوں اس کے برا مانتا ہے

یزید کو برا کہنا کیسا ہے؟

کان پور میں ایک شخص نے مجھ سے پوچھا کہ یزید کو برا کہنا جائز ہے کہ نہیں میں نے کہا جائز ہے اگر یہ اطمینان ہو کہ تم اس سے اچھی حالت میں مرو گے اور ظاہر ہے کہ مرنے سے پہلے یہ اطمینان ہو ہی نہیں سکتا پس اپنا انجام دیکھنے سے پہلے اس کو برا نہ کہنا چاہئے کہیں ایسا نہ ہو کہ یزید ہی ہم پر ملامت کرے کہ تم مجھے کس منہ سے برا کہتے تھے ذرا اپنی حالت تو دیکھو اور ظاہر ہے کہ زندگی میں خاتمہ کا حال کسی کو معلوم نہیں۔ اب تو یہ حالت ہے۔

گہ رشک برو فرشتہ برپاکی ما　　گہ خندہ زند دیوز ناپاکی ما

ایمان چو سلامت بلب گور بریم　　احسنت بریں چستی و چالاکی ما

(کبھی فرشتہ ہماری پاکی پر رشک کرتا ہے کبھی ہماری ناپاکی پر ہنستا ہے ایمان جب گور کے کنارے پر سلامت لے جائیں تو ہماری چستی و چالاکی پر آفریں ہے)

جب یہ حالت ہے تو کیوں کسی کو برا کہے۔ کیا تبرا کرنے سے کچھ ثواب ملتا ہے میاں اپنی خیر مناؤ کسی سے تم کو کیا لینا اور یاد رکھو کہ کسی کو برا بھلا وہی کہے گا جسے کوئی کام نہ ہو اور جو کام میں لگا ہوتا ہے اس کو اس کی فرصت ہی نہیں ملتی۔

ارشاد حضرت بہلولؒ

شیخ سعدیؒ نے لکھا ہے کہ ایک حکیم نے کسی درویش کو ایک آدمی سے لڑتے ہوئے دیکھا اور فیصلہ کیا۔

چہ خوش گفت بہلول فرخندہ خو ۔ چوں بگذشت بر عارف جنگ جو
گر ایں مدعی دوست بشناختے ۔ بہ پیکار دشمن نہ پرداختے

(بہلول مبارک خصلت نے کیا اچھی بات کہی جبکہ وہ عارف جنگ جو پر گذرے اگر اس مدعی کو اللہ تعالیٰ کی معرفت ہوتی تو دشمن کے ساتھ لڑائی میں مشغول نہ ہوتا)

حکیم نے کہا کہ اگر اس درویش کو خدا تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی تو اسے لڑنے کی فرصت کہاں ہوتی۔ دیکھو اگر ہم اپنے کسی مجازی محبوب کو دیکھ لیں تو اس وقت اس کی صورت دیکھیں گے اور خدمت میں مشغول ہوں گے یا لوگوں سے کشتم کشتا ہوں گے۔ غرض محقق کا پتہ لگانے کے بعد اتباع تو اسی کا کرو مگر برا بھلا دوسروں کو بھی نہ کہو یہ طریقہ تو پڑھے لکھوں کے واسطے ہے اور جو بے پڑھے ہوں وہ یہ کریں کہ دو مولویوں کے پاس جا کر ایک ایک ہفتہ رہیں اور جو وقت ان کی فرصت کا ہو (دریافت کرنے سے معلوم ہو جائے گا) اس میں ان کے پاس بیٹھیں اور ان کی باتیں سنیں اور دیکھیں کہ جو مسائل متفق علیہ ہیں ان کی پابندی کا کس کو زیادہ اہتمام ہے اور نیز یہ کہ کس کے پاس جا کر کیا اثر ہوتا ہے۔ اگر کسی کے پاس جا کر آخرت کی طرف رغبت پیدا ہو، عبادت الٰہی کا شوق بڑھے اور خدا کی نافرمانی سے دل میں نفرت اور خوف پیدا ہو اور اس کے پاس رہنے والوں کی زیادہ تر حالت اچھی ہو تو بس اس کو اختیار کر لیں اسی سے ہر بات پوچھا کریں اور اس کی صحبت میں گاہے گاہے آیا جایا کریں (اور یہ طریقہ پڑھے لکھے کو بھی بہت مفید ہے محض کتابوں کے مطالعہ سے کسی عالم کی اصلی حالت ایسی نہیں معلوم ہوتی جیسی پاس رہنے سے معلوم ہوتی ہے اس لئے وہ بھی اگر یہ طریقہ اختیار کریں تو زیادہ بہتر ہے ۱۲) ان کی صحبت سے آپ کو اموال و اولاد کے حقوق معلوم ہوں گے اس وقت آپ کو بھی میت کے مال میں بدوں ورثا کی اجازت کے تصرف کرنا گوارا نہ ہوگا اور ان بزرگ کی حکایت پر تعجب نہ ہوگا جنہوں نے اپنے دوست کے مرتے ہی چراغ گل کر کے بازار سے

ایک پیسہ کا تیل منگایا تھا بلکہ آپ خود بھی ایسی ہی احتیاط کیا کریں گے اور پھر آپ کو آم وغیرہ کی بیع میں بھی اس طریقہ کی ضرورت معلوم ہوگی جو میں نے بیان کیا ہے غرض ہماری حالت کی خرابی کا زیادہ تر سبب یہ حب مال ہی ہے جس سے دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں بزرگوں کی صحبت سے ان شاء اللہ یہ پردے اٹھ جائیں گے۔

حب مال کا علاج

صاحبو! ایک تو ہمارا مرض حب مال ہے جس سے ہمارے اندر اختلافات پیدا ہوتے ہیں اور حب مال ہی سے بعض لوگ دوسروں کی آبرو کے درپے ہوتے ہیں اور حب مال ہی کی وجہ سے انسان رشوت لیتا ہے اور اسی کی وجہ سے ہمارے دلوں میں خدا کی محبت پیدا نہیں ہوتی اور دوسرا مرض حب اولاد ہے یہ بھی بہت سے گناہوں کا سبب ہے۔ کہیں اولاد کی صحت وتندرستی کے لئے ٹونے ٹوٹکے کیے جاتے ہیں جو شرک میں داخل ہیں کہیں اولاد ہونے کے لئے قبروں پر نذرانے چڑھائے جاتے ہیں، غیر اللہ کی منت مانی جاتی ہے اور اولاد ہی کے لئے مال کا ذخیرہ جمع کیا جاتا ہے۔ جائیدادیں خریدی جاتی ہیں پھر اس میں حلال وحرام کی بھی تمیز نہیں کی جاتی۔ کبھی مال بڑھانے کے لئے سود لیا جاتا ہے، کبھی کسی کا حق بلا وجہ دبا لیا جاتا ہے جس سے مقدمہ بازی کی نوبت آتی ہے۔ غرض یہ امراض ہمارے اندر پھیلے ہوئے ہیں جن کا منشا ان دو چیزوں کی محبت ہے مال کی اور اولاد کی۔

لفظ فتنہ کا مفہوم

اسی کو حق تعالیٰ اس آیت میں بیان فرماتے ہیں۔ اِنَّمَا اَمْوَالُکُمْ وَ اَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ کہ تمہارے اموال واولاد محض فتنہ ہیں اس میں فتنہ کا لفظ ایسا عجیب ہے جس سے نفع کی طرف بھی اشارہ ہے اور ضرر کی طرف بھی۔ کیونکہ فتنہ کا لفظ محاورات میں ضرر کے موقعہ پر بولا جاتا ہے (اور شریعت میں بھی ایسے مواقع پر اس کا استعمال موجود ہے۔ چنانچہ احادیث میں ابواب الفتن کے نام سے ایک باب منعقد کیا گیا ہے جس میں آخر زمانہ کے فتنوں کا بیان ہے اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آخر زمانہ میں ایسے ایسے فتنے ہوں گے اور ظہور الفتن علامت قرب ساعت کی ہے۔ ان احادیث میں فتنہ سے پریشان کن

واقعات اور برے حالات ہی مراد ہیں ۱۲) اس معنے کے اعتبار سے تو اموال واولاد کو فتنہ کہنا ان کے مضرت پر دلالت کرتا ہے کہ یہ چیزیں انسان کو مضرت میں مبتلا کرنے والی ہیں اور نعمت کے اعتبار سے فتنہ کے معنے آزمائش اور امتحان کے ہیں جس کا نتیجہ کبھی نفع بھی ہوتا ہے۔

مال اور اولاد میں امتحان

اس لحاظ سے اموال واولاد کی منفعت کی طرف بھی اشارہ ہوگا کہ یہ چیزیں تم کو خدا تعالیٰ نے اس لئے دی ہیں تا کہ تمہارا امتحان ہو کہ مال کو طاعات میں خرچ کرتے ہو اور اس صورت میں نافع ہو یا معاصی میں اور اس صورت میں مضر ہو اور ان کے حال کرنے میں حلال وحرام کی پرواہ کرتے ہو یا نہیں۔ اسی طرح اولاد کی پرورش وتربیت میں حدود شرعیہ کا لحاظ کرتے ہو یا نہیں اور ان کی وجہ سے احکام الٰہیہ میں تو سستی نہیں کرتے چنانچہ مال فی نفسہ بری چیز نہیں بلکہ اس میں بعض فوائد بھی ہیں مثلاً اگر مال اپنے پاس ہو تو اس سے فراغ قلب حاصل ہوتا ہے۔ قلب مطمئن رہتا ہے اور اس صورت میں طاعات بھی اطمینان وفراغ کے ساتھ ادا ہوتی ہیں اور مال نہ ہو تو یہ حالت ہوتی ہے ۔

شب چہ عقد نماز بر بندم   چہ خورد بامداد فرزندم

کہ رات کو جب نماز کی نیت باندھتا ہوں تو یہ خیالات اور وسوسے دل میں آتے ہیں کہ کل کو بچے کہاں سے کھائیں گے۔ کیونکر ہوگا۔ ایک ایرانی نے اس شعر کی شرح یہ کی کہ شب جو عقد نماز بر بندم بجائے تکبیر تحریمہ میگویم چہ خورد بامداد فرزندم کہ رات کو نماز کی نیت میں اس طرح باندھتا ہوں کہ کل کو بچے کہاں سے کھائیں گے گویا یہ الفاظ بجائے نیت وتحریمہ کے کہے جاتے ہیں واقعی اہل زبان اپنی زبان کو خوب سمجھتے ہیں۔ مطلب تو اچھا بیان کیا۔ غرض خواہ یہی نیت کے قائم مقام ہو یا نیت کے بعد یہ خیال آوے تنگی اور پریشانی میں عبادت بھی اچھی طرح ادا نہیں ہوتی تو مال کا یہ بڑا نفع ہے کہ اس سے فراغ حاصل ہوتا ہے۔ نیز مال ہو تو دوسروں کی مدد بھی کرسکتا ہے۔ مثلاً اس وقت ترکوں کے معاملہ میں مالدار ہی زیادہ مدد کرسکتے ہیں یہ تو فوائد ہیں اور مضرتیں وہ ہیں جو اوپر مذکور ہوئیں اس لئے مال امتحان کی چیز ہے کہ اس کو حاصل کرکے احکام شرعیہ پر قائم رہنا بڑے

مرد کا کام ہے اور اگر ذرا ہمت سے کام لیا جائے تو کچھ زیادہ دشواری نہیں بس مال میں دو باتیں قابل لحاظ ہیں ایک یہ کہ آمد قاعدہ کے موافق ہو دوسرے خرچ کے موافق ہو بعض لوگ آمد میں تو احتیاط کا خیال رکھتے ہیں۔ مگر خرچ میں اس کی رعایت نہیں کرتے بس یوں سمجھتے ہیں کہ ہمارا مال ہے جس طرح چاہیں خرچ کریں حالانکہ تم تو خود بھی اپنے نہیں ہو بلکہ خدا کے ہو پھر مال تمہارا کدھر سے ہوا بلکہ تم محض امین ہو اور مال تمہارے ہاتھ میں امانت ہے اور امانت میں خیانت کرنا جرم ہے لہٰذا مال میں تم خلاف مرضی حق کسی تصرف کے مجاز نہیں ہو بس چونکہ مال میں مضرت کے ساتھ نفع بھی ہے اس لئے اس کو فتنہ فرمایا یعنی آزمائش کی چیز اسی طرح اولاد میں منافع بھی ہیں مضار بھی مضرتوں کا بیان تو اوپر ہو چکا اور منافع یہ ہیں کہ اولاد کے نیک اعمال سے والدین کو نفع ہوتا ہے اور وہ مرنے کے بعد دعا یا ایصال ثواب سے والدین کو یاد رکھیں تو ان کے درجات بلند ہوتے ہیں اس لئے وہ بھی فی نفسہ بری چیز نہیں بلکہ امتحان کی چیز ہے اگر آدمی اس امتحان میں کامیاب ہو تو مالدار ہونا اور صاحب اولاد ہونا کمال ہے نقص نہیں۔

اموال اور اولاد میں امتحان

ایک صاحب نے یہاں فتنہ کے مشہور معنے سمجھ کر اعتراض کیا کہ حق تعالیٰ نے اولاد کو فتنہ فرمایا ہے اور احادیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کی ترغیب دی ہے جو اولاد کے لئے موضوع ہے اور خود ازواج کا نافع ہونا بھی اس سے ثابت ہوتا ہے تو ان دونوں میں اجتماع کیسے ہوگا اور اس سے انہوں نے نتیجہ یہ نکالا تھا کہ نکاح ہی نہ کرے میں نے کہا جناب آپ کو نکاح تو یاد رہا مال یاد نہ رہا اس پر بھی تو یہی اشکال ہے کہ حق تعالیٰ نے اموال کو فتنہ فرمایا ہے اور حدیث میں کسب مال کی ترغیب ہے بلکہ امر ہے چنانچہ ارشاد ہے کسب[1] الحلال فریضة بعد الفریضة ۱۲) حلال مال کمانا فرض ہے بعد اور فرائض کے تو مال کے نہ کمانے کا بھی نتیجہ نکالنا چاہئے اور نوکری چھوڑ دینا چاہئے (اور یہ شخص نوکر تھے مگر پہلی بیوی کے مرنے پر دوسرا نکاح نہ کرتے تھے) پھر میں نے کہا کہ حق تعالیٰ نے جو اموال و اولاد کو فتنہ فرمایا ہے تو اس میں ان کی

---

[1] حلية الأولياء ۷: ۱۲۲، كشف الخفاء للعجلوني ۲: ۱۲۲

مذمت نہیں کی بلکہ ان کو امتحان کی چیز فرمایا ہے اور اگر مذمت ہی تسلیم کی جائے تو علی الاطلاق نہیں بلکہ بعض افراد کے اعتبار سے ہے کیونکہ اسی جگہ اوپر کی آیت میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ وَ اَوْلَادِکُمْ عَدُوًّا لَّکُمْ (تمہارے بعض ازواج اور اولاد تمہارے دشمن ہیں) جس میں من تبعیضیہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب افراد ضرر رساں نہیں بلکہ بعض ان میں سے معین اور مفید بھی ہیں پس ترغیب نکاح انہی افراد کے لحاظ سے ہے (اسی لئے جس شخص کو نکاح سے ابتلاء بالمعاصی (گناہوں میں مبتلا ہونے کا) اندیشہ ہو اس کے لئے نکاح مسنون نہیں کما صرح به الفقهاء (جیسا کہ فقہاء نے اس کی تصریح کی ہے)

اصل کمال

بہرحال مجرد ہونا کوئی خوبی کی بات نہیں اور مفلس ہونا بھی کوئی خوبی کی بات نہیں۔ کمال تو یہ ہی ہے کہ سب کچھ ہو مال بھی اولاد بھی بیوی اسباب بھی اور پھر احکام الٰہیہ کی مخالفت نہ ہو دیکھو سب انبیاء علیہم السلام صاحب ازواج تھے بجز عیسیٰ علیہ السلام کے (اور وہ بھی اخیر میں نکاح کریں گے ۱۲) اسی طرح انبیاء علیہم السلام مفلس نہ ہوتے تھے ہاں زاہد ہوتے تھے کہ حق تعالیٰ نے ان کو دیا سب کچھ مگر جمع نہیں کیا بلکہ حاجت مند لوگوں کو بانٹ دیا کرتے اور خود خالی ہاتھ رہتے تھے اور اگر کسی کو اس کی ہمت ہو تو یہ بہت بڑا کمال ہے مگر میں آج کل مسلمانوں کو خالی ہاتھ رہنے کی رائے نہیں دیتا بلکہ وہ رائے دیتا ہوں جو حضرت سفیان ثوری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے زمانہ والوں کو دی تھی وہ فرمایا کرتے تھے کہ آج کل اگر کسی کے پاس کچھ دینار ہوں تو ان کی قدر کرے۔ کیونکہ پہلے تو ایسا زمانہ تھا کہ روپیہ پاس ہونے سے دین پر اندیشہ ہوتا تھا اور اب وہ زمانہ ہے کہ روپیہ پاس نہ ہونے سے دین پر اندیشہ ہے اور روپیہ پاس ہو تو دین کی حفاظت رہتی ہے جب حضرت سفیان ثوریؒ ہی کے زمانہ میں یہ حالت ہو چلی تھی تو اب تو اس کی زیادہ ضرورت ہے اس لئے ہمارے حضرات اپنے متعلقین کو ترک اسباب کی رائے نہ دیتے تھے چنانچہ حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں ایک خان صاحب کسی جائداد کے مقدمہ میں دعا کرانے آیا کرتے تھے ایک بار آئے اور عرض کیا حضرت اب تو فلاں بنیئے نے میری زمین دبا ہی لی حضرت نے فرمایا بھائی جانے دو اور اللہ پر نظر کر کے صبر کرو خدا کچھ اور سامان کر دے گا حضرت حافظ محمد ضامن صاحب نے اپنے حجرہ میں سن لیا اور باہر نکل آئے اور خان صاحب

سے فرمایا ہرگز صبر نہ کرنا جاؤ مقدمہ کرو عدالت میں دعویٰ کردو ہم دعا کریں گے۔ اور حضرت حاجی صاحب سے فرمایا کہ سبحان اللہ آپ اپنی طرح ساری مخلوق سے صبر کرانا چاہتے ہیں چاہے کسی کو ہمت ہو یا نہ ہو۔ آپ کے تو بیوی ہے نہ بچہ ہے اکیلے تھے صبر کر کے بیٹھ گئے اس غریب کے پیچھے بیوی بچے لگے ہوئے ہیں وہ ان کے فقر وفاقہ پر کیسے صبر کرے گا۔ انجام یہ ہوگا کہ پریشان ہوگا اور توکل کی ہمت نہیں ہے تو کسی کسی کے مال پر نظر دوڑائے گا۔ اب تو آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ مولوی ترک دنیا نہیں کراتے بلکہ ترک بغاوت کراتے ہیں۔

شریعت نے ذرائع ترقی سے منع نہیں کیا

صاحبو! دنیا کماؤ مگر خدا کے حکم کے موافق کماؤ بغاوت کے ساتھ نہ کماؤ آخر دنیا کمانے میں حکام دنیا کے قوانین کی بھی تو تم رعایت کرتے ہو اور گورنمنٹ کی بغاوت سے بچتے ہو اسی طرح خدا کی بغاوت سے بھی بچتے رہو اور اگر پابندی احکام شرعیہ ترقی دنیا کے لئے مانع ہے تو پابندی احکام گورنمنٹ اس سے کیوں مانع نہیں دیکھئے بغاوت میں تو بہت ترقی ہوتی ہے کہ بدوں کچھ کمال حاصل کئے سہولت سے روپیہ مل جاتا ہے چوری اور ڈاکہ زنی کر کے دولت خوب حاصل ہوتی ہے اور نوکری میں اول تو کمال کی ضرورت ہے پھر نوکری ملتی مشکل سے ہے اور ملے بھی تو تنخواہ سے زیادہ خرچ کرنا پڑتا ہے تحصیلدار اور ڈپٹی کو گھوڑا اور سائیس رکھنا بھی ضروری ہے ذرا لباس بھی اچھا رکھنا ہوتا ہے آنے جانے والوں کی دعوت ضیافت بھی کرنا ہوتی ہے اس لئے میں تو چندوں کے موقعہ پر کہا کرتا ہوں کہ ان امراء کو مت ستاؤ جیسے ان کی آمدنی زیادہ ہے ویسے ہی ان کا خرچ بھی بہت زیادہ ہے۔ غرض بظاہر ترقی کا سب سے اچھا ذریعہ ڈکیتی اور چوری ہے جس کو گورنمنٹ نے جرم قرار دیا ہے لیکن گورنمنٹ سے کوئی نہیں کہتا کہ آپ نے ترقی کے ذرائع بند کر دیئے ہیں اللہ میاں ہی مفت کے مل گئے ہیں کہ کسی بات کو جرم قرار دیں تو کہا جاتا ہے کہ شریعت نے ترقی کا راستہ بند کر دیا کہ سود بھی حرام رشوت بھی حرام، فصل سے پہلے آموں کی بیع بھی حرام میں کہتا ہوں ذرا گورنمنٹ سے بھی تو پوچھو کہ اپ نے ڈکیتی کو بھی ممنوع چوری اور رشوت کو بھی ممنوع کر دیا اور ترقی کا ذریعہ کیا نکالا نوکری اور تجارت، سو تجارت کے لئے تو سب کے پاس روپیہ نہیں ہے اور نوکری میں خرچ زیادہ ہے سب سے آسان ذریعہ ترقی کا چوری اور ڈکیتی اور رشوت تھی انہیں کو آپ نے منع کر دیا کیا کسی

کو ہمت ہے کہ گورنمنٹ سے یہ سوال کرے ہرگز نہیں بلکہ یہاں تو سب یہ کہتے ہیں کہ گورنمنٹ نے ذرائع ترقی کو بند نہیں کیا بلکہ ناجائز وسائل سے روکا ہے تو میں کہتا ہوں کہ اسی طرح شرع نے بھی ذرائع ترقی کو بند نہیں کیا بلکہ ناجائز وسائل سے منع کیا اور ترک بغاوت کی تعلیم کی ہے کہ خدا تعالیٰ کی نافرمانی کر کے دنیا نہ کماؤ خواہ ایک ہی جزو میں نافرمانی ہو پس شریعت کے تابع ہو کر رہو پھر چاہے رئیس ہو جاؤ یا نواب یا ہفت اقلیم کے بادشاہ بن جاؤ ترقی مبارک ہے اور اس سے کوئی نہیں روکتا اور اگر دین کھو کر دنیا کمائی تو میں یوں کہوں گا۔

مبادا دل آں فرومایہ شاد   کہ از بہر دنیا دہد دیں بباد

(اس کمینے کا دل کبھی خوش نہ ہو جو دنیا کے پیچھے دین برباد کر دے)

مال واولاد میں نفع

تو یہ ہے فتنہ کہنے کی وجہ کہ مال واولاد میں نفع بھی ہے اور ضرر بھی ہے اور ان سے ہماری آزمائش کی گئی ہے اگر امتحان میں کامیاب ہو گئے تو یہ دونوں مفید ہیں اور اگر ناکام ہو گئے تو دونوں مضر ہیں آگے ارشاد فرماتے ہیں وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (اور اللہ ہی کے ہاں اجر عظیم ہے) اوپر یہ فرمایا تھا کہ تمہارے اموال واولاد تمہارے لئے ایک آزمائش کی چیز ہیں کہ دیکھیں کون ان میں پڑ کر خدا کے احکام کو بھول جاتا ہے اور کون یاد رکھتا ہے اب فرماتے ہیں کہ جو شخص ان میں پڑ کر اللہ کو یاد رکھے گا تو اللہ کے پاس ان کے لئے بڑا اجر ہے اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اگر تم کو عمل میں کچھ کوتاہی معلوم ہو یا عمل کچھ کم ہوتا نظر آوے تو گھبراؤ نہیں اور یہ مت سمجھو کہ اس عمل قلیل سے کیا فائدہ کیونکہ خدا تعالیٰ کے پاس بڑا اجر ہے وہ تھوڑے سے عمل پر بہت اجرت دے سکتے ہیں اس لئے خدا کی ذراسی اطاعت کو بھی حقیر نہ سمجھو اللہ اکبر کیسی بشارت اور کتنا بڑا وعدہ ہے۔

بس اب میں ختم کرتا ہوں تو میں نے آیتیں تو کئی پڑھی تھیں اور بیان سب کا نہیں ہو سکا بلکہ صرف ایک آیت کا بیان ہوا ہے مگر اصولاً بحمد اللہ سب کے مضامین قریب اسی میں آ گئے ہیں اب خدا تعالیٰ سے دعا کرو کہ حق تعالیٰ عمل خیر کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔ و صلی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقه سیّدنا و مولانا محمّد و علیٰ آله و اصحابه اجمعین و آخر دعوانا ان الحمدللّٰہ رب العالمین٥

الحج

۳۔شوال ۱۳۳۱ ہجری کو جامع مسجد تھانہ بھون میں ۳ گھنٹے تک منبر پر بیٹھ کر ارشاد فرمایا۔فضائل حج کی طرف رغبت دلائی۔تقریباً ۵۰۔سامعین موجود تھے۔وعظ شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد رحمۃ اللہ علیہ نے قلمبند کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ نحمدہ و نستعینه و نستغفرہ و نومن به ونتوکل علیه ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل له ومن یضلله فلا ھادی له ونشھد ان لا اله الا اللہ وحدہ لا شریک له ونشھدان سیدنا و مولانا محمداً عبدہ و رسوله صلی اللہ تعالیٰ علیه وعلیٰ اله واصحابه و بارک وسلم. امابعد فقد روی مسلم عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ اِنَّ الْاِسْلَامَ یَهْدِمُ مَا کَانَ قَبْلَهٗ وَ الْهِجْرَةَ تَهْدِمُ مَاکَانَ قَبْلَهَا وَاِنَّ الْحَجَّ یَهْدِمُ مَاکَانَ قَبْلَهٗ

ترجمہ:- اسلام پہلے گناہوں کو گرا دیتا ہے اور ہجرت پہلے گناہوں کو گرا دیتی ہے اور بے شک حج پہلے گناہوں کو گرا دیتا ہے۔

فضائل اسلام

ہر چند کہ آج طبیعت نہایت کسلمند ہے پھر مجمع بھی کم ہے اس لئے طبیعت بیان کرنے کو نہیں چاہتی مگر چونکہ آج کل ایام حج ہیں اس لئے اس خیال سے بیان کرتا ہوں کہ شاید اس مجمع میں کوئی ایسا شخص ہو جس پر حج فرض ہو تو وہ اس بیان کو سن کر حج کا قصد کر کے گناہ سے بچ جائے اسی ضرورت سے میں نے ایک حدیث پڑھی ہے جس میں حج کی یہ فضیلت مذکور ہے کہ اس سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور یہ حدیث کئی اجزاء پر مشتمل ہے مگر اس وقت مقصود اعظم ایک جزو ہے بقیہ اجزاء کو اس لئے پڑھ دیا گیا کہ ان کو مقصود اعظم کے سمجھنے میں دخل ہے اسی لئے ان کو بھی مختصراً بیان کیا جائے گا گو مقصوداً نہ ہو ترجمہ سے اجزاء ثلثہ کا علم ہو جائے گا فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ اسلام پہلے گناہوں کو گرا دیتا ہے یعنی کسی شخص نے کفر کی حالت میں ایک زمانہ گزارا ہو اور اس نے کبھی خدا کا نام نہ لیا ہو اور لیا ہو تو بے ادبی سے لیا ہو تو اسلام کے بعد سب گناہ معاف ہو جائیں گے کیا رحمت ہے حق تعالیٰ کی کہ اب اگر یہ باغی باوجود سنگین

بغاوت کے اسلام لے آئے یعنی زبان سے لا الٰہ الا اللّٰہ محمّد رسول اللّٰہ کہہ دے اور دل سے تصدیق کر دے جس میں دو سیکنڈ خرچ ہوتے ہیں اور کچھ دشواری بھی نہیں بلکہ نہایت آسان کام ہے اتنے آسان کام کے کر لینے سے سالہا سال کی بغاوت اور سنگین سے سنگین جرائم ایک دم سے معاف ہو جاتے ہیں کام اس قدر آسان ہے جس میں دو ہی جزو ہیں ایک جوارح کے متعلق ہے ایک قلب کے قلب کا کام تو بہت ہی سہل ہے اور دوسرا کام زبان کا ہے جو دوسرے جوارح کے اعمال کی نسبت سے بہت سہل ہے کیونکہ مشاہدہ سے یہ بات معلوم ہے کہ اگر ہاتھ پیر سے کوئی کام کیا جائے تو تھوڑی دیر میں ہاتھ پیر تھک جاتے ہیں چنانچہ بوجھ اٹھانے سے ہاتھ کو کلفت کا احساس ہوتا ہے چلنے سے پاؤں کو کلفت کا احساس ہوتا ہے مگر یہ کبھی نہ سنا ہوگا کہ زبان سے بولنے میں زبان میں درد ہوا ہو یہ اور بات ہے کہ زیادہ بک بک کرنے سے دماغ تھک جائے مگر زبان نہیں تھکتی یہی وجہ ہے کہ زبان سے گناہ بہت ہوتے ہیں کیونکہ اور جتنے اعضاء ہیں وہ گناہ کرتے کرتے ایک حد پر تھک جاتے ہیں مثلاً زنا بدکاری کب تک کرے گا آخر ایک دن عاجز ہو جائے گا مگر زبان کیا ممکن ہے کہ کبھی تھکے؟ تو زبان کا کام سب سے زیادہ سہل ہے اور یہ سہولت اللہ تعالیٰ نے تو اس لئے رکھی تھی تا کہ نیک کام زبان سے بکثرت ہوتے مگر جن لوگوں کی عقل الٹی ہوتی ہے ان کا ہر کام الٹا ہوتا ہے۔ ہر چہ گیرد علتی حلت شود۔ ہم نے اس نعمت کی بیقدری کی زبان سے گناہ بکثرت شروع کر دیئے۔

نعمت کی بے قدری

اللہ تعالیٰ نے ایک مقام پر انسان کی یہ شکایت بیان فرمائی ہے کہ وہ نعمت کی بے قدری کرتا اور اس سے الٹا کام لیتا ہے چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے ساتھ جو نمرود نے کج بحثی کی تھی اللہ تعالیٰ اس کو اس طرح بیان فرماتے ہیں۔ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ حَاجَّ اِبْرَاھِیْمَ فِیْ رَبِّہٖ اَنْ آتَاہُ اللّٰہُ الْمُلْکَ (ترجمہ) اے لوگو تم کو اس شخص کا قصہ تحقیق نہیں ہوا (یعنی نمرود کا) جس نے حضرت ابراہیم علیہ السّلام سے مباحثہ کیا تھا اپنے پروردگار کے بارے میں کہ خدائے تعالیٰ نے اس کو کس طرح سلطنت دی تھی پارہ نمبر ۳ رکوع ۳) کہ تم نے اس شخص کو بھی دیکھا (مراد نمرود ہے کہا (قالہ المفسرون ۱۲) جس نے ابراہیم علیہ السّلام

سے خدا تعالیٰ کے بارے میں حجت لگائی (کہ خدا ہے یا نہیں) محض اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو سلطنت دے دی تھی یہ تو ترجمہ ہوا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سلطنت کا دیا جانا کفر کا باعث کیسے ہو گیا تو میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ مقصود یہ ہے کہ ملک تو اس کو اس لئے دیا گیا تھا تاکہ شکر گزار ہو کر خدا پر ایمان لاتا مگر اس نے الٹا کیا گویا اس کو سلطنت ناشکری کرنے کو دی گئی تھی ایسے ہی ہم لوگوں نے نعمت زبان سے الٹا کام لیا ہے کہ اس سے بکثرت گناہ کرتے ہیں ہم نے اس کی غایت (مقصود کو عکس کر دیا جیسا ایک شخص نے اصلاح الرسوم کو دیکھ کر کہا تھا کہ اس کتاب سے ہم کو بڑا فائدہ ہوا پہلے ہم کو تقریبات کے موقعہ پر بڑی دقت ہوتی تھی کیونکہ معلوم نہ تھا کہ کیا کیا رسمیں ہوا کرتی ہیں اور ہم کو کیا کرنا چاہئے لوگوں سے پوچھنے کی ضرورت ہوا کرتی تھی اب آسان نسخہ مل گیا کہ اس کتاب کو سمجھ کر دیکھ کر سب رسمیں کر لیا کریں گے تو اس نے بھی مصنف کی خلاف مقصود کتاب سے کام لیا کیونکہ مقصود تو کتاب کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ اس سے رسوم کی اصلاح و ابطال مقصود ہے غرض اللہ تعالیٰ نے زبان کے کام کو اس لئے آسان کیا تھا کہ اس سے عبادت و ذکر کر و تلاوت قرآن بکثرت ہو سکے چنانچہ خود ارشاد فرماتے ہیں۔ فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰہُ بِلِسَانِکَ لِتُبَشِّرَ بِہِ الْمُتَّقِیْنَ وَ تُنْذِرَ بِہٖ قَوْمًا لُّدًّا کہ ہم نے قرآن کو آپ کی زبان میں اس لئے آسان کیا تاکہ آپ اس سے اہل تقویٰ کو بشارت دیں اور جھگڑنے والوں کو ڈرائیں یعنی قرآن کے یسر کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ عمل زبان سے متعلق ہے اور غایت و مقصود یسر کا یہ ہے تاکہ آپ تبلیغ کر سکیں اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اسلام کو ایک سہل کام پر رکھا ہے کہ دل سے تصدیق ہو اور اس کے بعد زبان ہلا لو کہ وہ بھی آسان کام ہے۔

سلام کی غرض و غایت

اور یہاں سے معلوم ہو گیا کہ بعض لوگ جو سلام کے جواب میں سر ہلاتے ہیں اور زبان سے وعلیکم السلام نہیں کہتے ہیں وہ بدمذاق ہیں کہ ٹکا سی زبان نہیں ہلاتے دھڑا سا سر ہلا دیتے ہیں ممکن ہے کوئی معقولی اس کی یہ توجیہ کرے کہ فعل بسیط فعل مرکب سے آسان ہوتا ہے اور سر کا ہلانا اضافہ فعل بسیط ہے اور زبان کا چلانا فعل مرکب ہے کیونکہ الفاظ کو مخارج سے خاص ہیئت و ترکیب کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے سو جواب اس کا یہ ہے کہ اس لحاظ سے اگرچہ

7

سر ہلانا سہل ہے مگر جس غرض سے سلام کرتے ہیں اس غرض وغایت کے لحاظ سے زبان ہی کا فعل آسان ہے کیونکہ سر ہلانے سے وہ غرض حاصل نہیں ہوتی سلام سے مقصود دعا ہے اور وہ بدوں کلام وتکلم کے حاصل نہیں ہوتی تو جو لوگ سلام و جواب سلام میں سر ہلاتے ہیں ان کو غایات ومقاصد سے دلچسپی نہیں اور یہی بدمذاقی کی علامت ہے۔

اسلام کا مدار

بہرحال چونکہ فعل لسان وفعل قلب بہت سہل ہے اس لئے حق تعالیٰ نے اسلام کا مدار احکام دنیا میں تو صرف زبان کے اقرار پر رکھا اور احکام آخرت میں تصدیق قلب بھی ضروری ہے اور جو افعال اس کے علاوہ ہیں نماز، روزہ، حج وزکوٰۃ وغیرہ وہ مکمل اسلام ہیں اجزاء اسلام نہیں ہیں یعنی تارک صلوٰۃ کافر نہیں اور یہ نکتہ اہل سنت نے سمجھا ہے کہ جب اسلام اتنی سہل چیز ہے جو زبان ہلانے سے متعلق ہے تو اس کے اجزاء یہ امور شاقہ نہیں ہوسکتے پس مومن تارک صلوٰۃ اگرچہ معذب ہوگا مگر پٹ جھٹ کر کسی وقت جنت میں ضرور پہنچ جائے گا پس خدا تعالیٰ کی یہ بہت بڑی رحمت ہے کہ اسلام کو پھولوں ہلکا کردیا حالانکہ یہ اتنی قیمتی شے ہے کہ کوئی چیز اس کے برابر قیمتی نہیں کیونکہ عذاب دائمی سے نجات کا مدار اسی پر ہے اور جنت کی دائمی راحت کا استحقاق اسی سے ہوتا ہے اگر یہ سب سے زیادہ دشوار ہوتا تو بجا تھا مگر قربان جایئے رحمتِ حق کے کہ سب سے زیادہ ضروری چیز کو سب سے زیادہ آسان کردیا۔

قہر الٰہی

صاحبو! اس رحمت کے اندر خدا کا ایک بڑا قہر بھی ظاہر ہورہا ہے وہ یہ کہ اتنا آسان کام کافر کو بہت ہی مشکل ہے کتنا تو سہل کام مگر کافر سے نہیں ہوسکتا اس کو گردن دے دینا جان کا برباد کرنا آسان ہے مگر اسلام لے آنا آسان نہیں آپ سمجھے کہ یہ حجاب کس چیز کا ہے؟ یہ حجاب قہر الٰہی کا ہے اسی وجہ سے اہل اللہ خدا کے قہر سے ہر وقت لرزاں ترساں رہتے ہیں۔

کارکنان دین کے دو مرض

اسی لئے کام کرنے والوں کو چاہئیے کہ اپنے اعمال کو اپنا کمال نہ سمجھیں بلکہ خدا تعالیٰ کا احسان سمجھ کر شکر کریں کہ انہوں نے ہم سے کام لے لیا ورنہ ہماری کیا طاقت تھی۔

اصلاح ظاہر-7

منت منہ کہ خدمت سلطان ہمی کنی　　　منت شناس ازو کہ بخدمت بداشت

(تو بادشاہ پر اس کا احسان نہ رکھ کہ بادشاہ کی خدمت کرتا ہے بلکہ بادشاہ کا تجھ پر احسان ہے کہ اس نے تجھے خدمت پر مامور کیا)

کام کرنے والوں کو دین کا کام کرنے سے دو مرض پیدا ہو جاتے ہیں ایک کبر دوسرا تواضع مفرط کبر تو یہ ہے کہ وظیفہ پڑھ کر اپنے اوپر نگاہ کرنے لگے نماز پڑھ کر بے نمازیوں کو حقیر سمجھنے لگے تو اے نمازی تو بے نمازی کو حقیر نہ سمجھ؟ کیونکہ۔

غافل مرد کہ مرکب مردان مرد را　　　در سنگلاخ بادیہ پیہا بریدہ اند

نومید ہم مباش کہ رنداں بادہ نوش　　　ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

(غافل ہو کر نہ چل اس لئے مردان راہ کے گھوڑے سخت جنگل میں چلنے سے عاجز رہے ہیں، نا امید بھی مت ہو اس لئے کہ رند شرابی اچانک ایک نالہ سے منزل پر پہنچ گئے)

یعنی اپنے اوپر نگاہ نہ کرو کیونکہ تکبر کی وجہ سے بڑے بڑے عابدوں کے قدم توڑ دیئے گئے کہ منزل مقصود پر نہ پہنچ سکے راستہ ہی سے واپس کر دیئے گئے شیطان اور بلعم باعورو غیرہ کی حالت اس کی نظیر ہے اور نا اُمید بھی نہ ہو کیونکہ بعض دفعہ شراب خوار ایک آہ سے بہت دور پہنچ گئے ہیں۔

تیر محبت

میرے ایک دوست نے ایک شخص کی حکایت بیان کی جو مارہرہ کا رہنے والا تھا اور تمام بازیوں کا جامع اور ساری بدمعاشیوں کا مجمع تھا جتنے برے کام تھے سب اس کے اندر موجود تھے گر ایک مرتبہ دفعۃً اس کی زبان سے یہ نکلا کہ ہائے میرا کیا انجام ہوگا؟ اس کے بعد زبان تو بند ہو گئی اور آنکھوں سے دریا کا دھانہ کھل گیا۔

یارب چہ چشمہ ایست محبت کہ من ازاں　　　یک قطرہ آب خوردم و دریا گریستم

(اے اللہ چشمہ محبت کیسا ہے کہ اس کا میں نے ایک قطرہ پیا اور آنسوؤں کا ایک دریا بن گیا)

غرض روتے روتے اس کا برا حال ہوا نہ کھانے کا رہا نہ پینے کا تین روز تک برابر روتا رہا اور تین دن کے بعد مر گیا معلوم ہوتا ہے کہ خوف الٰہی نے اس کے جگر کے ٹکڑے کر دیئے اور دل پھاڑ دیا تھا اس لئے واقعی وہ شہید اکبر ہوا محبت کا تیر بھی عجیب ہے کہ جب کسی کے لگتا

ہے تو یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ کہاں سے آیا کدھر سے آیا مگر دل و جگر سے پار ہو جاتا ہے۔

درون سینہ من زخم بے نشان زدہ　　　بحیرتم کہ عجب تیرے کماں زدہ

(تو نے میرے سینے میں بے نشان تیر مارا ہے حیرت ہے کہ کیا عجیب تیر بلا کمان کے مارا ہے)

اس شخص کی حکایت پر مجھے ایک اور قصہ یاد آ گیا جو میرے ایک اور دوست نے بیان کیا ہے کہ ایک شخص سفر حج میں تھا مگر حالت یہ تھی کہ ہاتھ میں دف تھا اور گاتا بجاتا جار ہا تھا کسی نے کہا کہ میاں حج کے راستہ میں ناچنا گانا کیسا؟ اس نے کہا کہ تم کیا جانو! واقعی کوئی کسی کی حالت کو کیا جانے۔

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خنداں ست　　　بعندلیب چہ فرمودہ کہ نالاں ست

(پھول سے کیا فرمادیا کہ خنداں ہے بلبل سے کیا فرمایا کہ نالاں ہے)

ہر شخص کا خدا تعالیٰ سے ایک تعلق ہے جس کو دوسرے نہیں جانتے غرض جس وقت یہ شخص مکہ میں پہنچا اور اس کے رفقاء معلم کے ساتھ خانہ کعبہ کے طواف کو چلے تو دروازہ مسجد حرام پر پہنچ کر مطوف نے کہا ھذا بیت اللہ یہ بیت اللہ ہے اس کی نظر جو دوسرے کعبہ پر اور غلاف کعبہ پر پڑی ہے اس پر وجد طاری ہو گیا اور کہنے لگا۔

چو رسی بکوئے دلبر بسپار جان مضطر　　　کہ مباد بار دیگر نرسی بدیں تمنا

(در محبوب پر جب پہنچ جاؤ تو اپنی جان کو اسی پر فدا کر دو شاید پھر تمنائے دل پورا کرنے کا موقع نہ ملے)

یہ شعر پڑھا اور جاں بحق تسلیم ہو گیا واقعی اس سے بڑھ کر جان دینے کا وقت اور کون سا ہو گا جب یہ حالت ہے تو تم کس بات پر کسی کو حقیر سمجھتے ہو ہاں یہ جائز ہے کہ برا کام کرنے والے پر غصہ کرو اس سے بغض کرو مگر اپنے سے کم نہ سمجھو اور اگر کبھی تم کو کسی کی سزا و تادیب کے واسطے مقرر کیا جائے تو خبردار اپنے کو اس سے اچھا ہرگز نہ سمجھنا ممکن ہے کہ وہ خطاوار شہزادہ کی مثل ہو اور تم نوکر جلاد کے درجہ میں ہو جس کے متعلق سزا کا کام اور اس کے اختیارات ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ خطاوار شہزادہ کو بادشاہ جلاد کے ہاتھوں سزا دلوائے تو جلاد اس سے افضل نہیں ہو سکتا شہزادہ سزا کے بعد بھی شہزادہ ہی ہے اور جلاد نوکر ہی کے درجہ میں ہے پس کسی سے اپنے کو افضل نہ سمجھو جب

اس کے عیب پر نظر پڑی اپنے عیب کو دیکھ لو اسی کو جامیؒ فرماتے ہیں۔

جامی چہ لاف می زنی از پاک دامنی　　　بر خرقہ تو ایں ہمہ داغ شراب چیست

(جامی پاک دامنی کے بارے میں لاف زنی کرتا ہے مگر تیرے خرقہ پر شراب کے داغ کس بات کی غمازی کرتے ہیں)

عارف فرماتے ہیں۔

نقد صوفی نہ ہمہ صافی و بغیش باشد　　　اے بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد

(صوفی کی موجودہ حالت اگر بالکل درست نہ ہو وہ کافی نہیں اگر چہ خرقہ پہن لے، اے شخص بہت خرقہ پوش آگ میں جلانے کے قابل ہیں)

تقدس کا دعویٰ ہرگز جائز نہیں اپنے خرقہ کو اور اپنی عارفانہ باتوں کو ایسا سمجھو۔

ایں خرقہ کہ من دارم در رہن شراب اولے　　　زیں دفتر بمعنی غرق مۓ ناب اولے

(یہ خرقہ جو میرے پاس ہے شراب محبت میں گرمی رکھتا ہے، اور یہ دفتر بے معنی کو محبت الٰہی کی خاص شراب میں ڈبونا بہتر ہے)

تکبر سے بچنا لازم ہے کسی کو حقیر و ذلیل نہ سمجھو۔

حکایت سیدنا حضرت شیخ عبدالقادرؒ جیلانی

شیخ عبدالحق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سیدنا غوث اعظم جیلانی قدس سرہ کے حال میں ایک کتاب لکھی ہے اس میں ایک حکایت بڑی عبرت کی لکھی ہے کہ حضرت غوث اعظم کے ایک خادم بیان کرتے ہیں کہ ایک رات کو حضرت تہجد سے فارغ ہو کر خانقاہ سے باہر ایک طرف کو چلے میں بھی پیچھے پیچھے اس طرح ساتھ ہو لیا کہ حضرت شیخ کو میری اطلاع نہ ہو اور کسی خدمت کی ضرورت ہو تو جلدی سامنے حاضر ہو سکوں یہاں تک کہ شہر پناہ بغداد کے دروازہ پر پہنچے جو مقفل تھا قفل خود بخود کھل گیا اور جب میں بھی باہر ہو گیا تو دروازہ خود بخود بند ہو گیا یہاں تک کہ تھوڑی سی دیر میں ہم ایک شہر میں پہنچ گئے جو بغداد کے قریب کبھی نہیں دیکھا گیا اس شہر میں تھوڑی دور چل کر ایک مکان میں پہنچے وہاں ایک مجمع تھا حضرت غوث اعظمؒ کو دیکھ کر سب حضرات کھڑے ہو گئے ایک سمت سے آواز کراہنے کی آ رہی تھی جو تھوڑی دیر میں منقطع ہو گئی پھر کچھ پانی گرنے کی آواز آتی رہی پھر ایک چھوٹی سی

جماعت ایک جنازہ کو لے کر باہر نکلی اور حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے جنازہ کی نماز پڑھائی اس کے بعد وہ آدمی اس جنازہ کو لے کر چلے گئے اور حاضرین میں سے ایک بزرگ نے حضرت غوث اعظم سے سوال کیا کہ ان کی جگہ کس کو مقرر کیا جائے آپ نے گردن جھکائی اور کچھ وقفہ کے بعد فرمایا کہ قسطنطنیہ کے کنیسہ میں اس وقت ایک نصرانی صلیب پرستی کر رہا ہے اس کو مقرر کیا جاوے تھوڑی ہی دیر میں ایک عیسائی حاضر ہوا جس کے گلے میں زنار پڑا ہوا تھا حضرت شیخ نے حکم دیا کہ زنار توڑ دو اور اس کو غسل دے دو غسل کے بعد فرمایا کہو اشهد ان لا اله الا الله و اشهد ان محمد ارسول الله اس نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا اس کے بعد حضرت شیخ نے فرمایا کہ ان کی جگہ اس کو مقرر کر دیا جائے یہ خادم بڑا حیران ہوا پھر صبح سے پہلے دونوں خادم و مخدوم اسی طرح بغداد میں پھر خانقاہ میں پہنچ گئے صبح کی نماز کے بعد جب حضرت شیخ معمولات سے فارغ ہو کر حجرہ سے باہر تشریف لائے تو خادم نے رات کے واقعہ کا تذکرہ کیا کہ مجھے اس واقعہ کی حقیقت نہ معلوم ہونے سے بڑی حیرت ہے حضرت شیخ نے فرمایا کیا تم میرے ساتھ تھے کہا جی ہاں؟ فرمایا وہ مقام جہاں ہم گئے تھے شہر موصل ہے یہاں سے اللہ تعالیٰ نے ہمارے واسطے زمین کو سمیٹ دیا تھا اور وہ جماعت ابدال کی تھی اور جس کا وہ جنازہ تھا وہ بھی ابدال میں سے تھا ان کی جگہ دوسرے کو مقرر کرنے کی ضرورت تھی اس لئے میں وہاں گیا تھا پھر جو کچھ ہوا وہ تو تمہارے سامنے ہوا غرض خدا تعالیٰ کا دربار عجیب ہے وہ بعض دفعہ ایسے شخص کو قبول فرما لیتے ہیں جس کی نسبت گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ مقبول بارگاہ ہوگا وہ دربار بڑا اغنا کا دربار ہے جس کی شان یہ ہے۔

ہر کہ آید گو بیاؤ ہر کہ خواہد گو برو   دارو گیر و حاجب و دربان دریں درگاہ نیست

(جس کا دل چاہے آئے جس کا دل چاہے چلا جائے۔اس دربار میں کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں)

غنا کا مفہوم

مگر غنا کے معنی یہ نہیں کہ وہاں اندھیر ہے انتظام نہیں ہے جس کا یہ عقیدہ ہو وہ توبہ کرے کیونکہ یہ عقیدہ کفر ہے اور جس کا عقیدہ یہ نہیں وہ بھی ایسے الفاظ سے احتراز کرے جن سے اس معنی کا ابہام ہوتا ہے جیسے بعض لوگ کسی شخص کی جوان موت پر کہہ دیا کرتے

ہیں کہ میاں خدا کی ذات بڑی بے پرواہ ہے اس موقعہ پر اس کلمہ سے متبادر یہی ہوتا ہے کہ معاذ اللہ خدا کو کسی پر رحم نہیں نہ مصالح وحکم کی رعایت ہے نہ کسی بات کا انتظام؟ صاحبو خدا تعالیٰ سے زیادہ انتظام کرنے والا کون ہوگا جس کی شان قدرت یہ ہے:

اَلشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ

اور اس کی شان یہ ہے:

وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ۔

اور یہ شان ہے:

اَلَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى

نظام عالم کی پختگی اور اس کی مضبوط رفتار احکم الحٰکمین کے نظام کامل پر خود شاہد ہے یہ تو جملہ معترضہ تھا۔

تمام تر شریعت سہل ہے

میں یہ کہہ رہا تھا کہ کام کرنے والوں میں دو مرض پیدا ہو جاتے ہیں ایک تکبر جس کا اب تک بیان ہوا دوسرے تواضع مفرط یعنی بعض اس حد تک تواضع کرتے ہیں کہ اپنے اعمال صالحہ کی بے قدری کرنے لگتے ہیں کہ ہمارے اعمال کیا ہیں کچھ بھی نہیں تواضع بہت عمدہ شے ہے کیونکہ عبدیت کے آثار سے ہے اور عبدیت مطلوب ہے بلکہ تمام مطالب میں اعلیٰ مقام عبدیت ہی ہے مگر بعض دفعہ تواضع اس طرح کی جاتی ہے کہ اس سے اپنے اعمال کی بے قدری اور تحقیر ہوتی ہے اور تحقیر اعمال کے ساتھ در پردہ خدا تعالیٰ کی شکایت بھی ہوتی ہے مثلاً بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگرچہ ہم نماز پڑھتے ہیں مگر اس میں خشوع تو ہے ہی نہیں ذکر کرتے ہیں مگر انوار بالکل نہیں ہیں گویا خدا کی شکایت کر رہے ہیں کہ دوسروں کو تو انوار دیئے ہم کو نہیں دیئے سو یاد رکھو کہ جہاں خدا تعالیٰ نے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (بے شک اللہ تعالیٰ ہر تکبر کرنے والے، فخر کرنے والے کو پسند نہیں فرماتے) فرمایا ہے وہاں اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے رب کی نعمت ہے میں آپ اسے بیان

کیجئے) بھی فرمایا ہے کہ خدا تعالیٰ کی نعمت کو بیان کرو اور اس کی نعمت کی قدر و عظمت کرو اس مقام پر بہت سے ناواقف شریعت کی تعلیم سے گھبرا اٹھتے ہیں کہ تواضع کرو تو عمل کی تحقیر ہوتی ہے اور عمل کی قدر کرو تو حکم یہ ہے کہ دعویٰ نہ کرو اور اسی حالت میں کسی بیباک نے کہہ دیا ہے۔

درمیاں قعر دریا تختہ بندم کردہ باز میگوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

(درمیان دریا میں تختہ باندھ کر رکھ دیا پھر کہتے ہو کہ خبردار دامن تر نہ ہو)

مگر یہ لوگ محقق نہیں بخدا ساری شریعت اگر نظر تحقیق سے دیکھی جائے اس کی مصداق ہے۔

زفرق تابقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

(سر سے قدم تک جس جگہ دیکھتا ہوں کرشمہ دامن دل کو کھینچتا ہے کہ یہی محبوب کی جگہ ہے)

صاحبو! تمام شریعت اس کا مصداق ہے یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کرنا چاہتے ہیں دشواری نہیں چاہتے اور ایک مقام پر خود ہم کو یہ دعا تعلیم فرمائی گئی ہے رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَا اِصْرًا کَمَا حَمَلْتَہٗ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَالَا طَاقَۃَ لَنَا بِہٖ (ترجمہ: اور اے پروردگار ہمارے اوپر ایسا بوجھ نہ لادیئے جیسا ہم سے پہلے لوگوں پر لادا گیا ہے اور ہمارے پروردگار ہم پر ایسا بوجھ نہ لادیئے جس کی (برداشت کی) ہم کو طاقت نہیں اور حدیث میں ہے کہ یہ سب دعائیں قبول ہو چکی ہیں پس شریعت میں تحمل سے زیادہ کوئی حکم نہیں اور جو شخص کسی حکم شریعت کو تحمل سے باہر کہتا ہے وہ نصوص قرآنیہ کی تکذیب کرتا ہے شریعت تمام تر سہل ہے ہاں کسی کی آنکھیں چوندھی ہوں کہ حسن شریعت اس کو نظر نہ آتا ہو تو کیا کرے حدیث میں ہے جئتکم بالحنیفیۃ السمحۃ البیضاء لیلھا ونھارھا سواء میں تمہارے پاس ایسی آسان اور روشن شریعت لایا ہوں جس کا رات دن برابر ہے (یعنی اوامر و نواہی سب آسان ہونے میں یکساں ہیں اور سب حکمتوں اور مصلحتوں سے لبریز ہیں) اسی لئے میں تو اکثر یہ کہتا ہوں۔

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم چو غلام آفتابم ہمہ زآفتاب گویم

(نہ شب ہوں نہ شب پرست جو خواب کی تعبیر بیان کروں، محبوب حقیقی کا غلام ہوں، اسی کی باتیں کرتا ہوں) اور مولانا فرماتے ہیں۔

کوے نومیدی مرو کامید ہاست　　سوے تاریکی مرو خورشید ہاست

(ناامیدی کی راہ نہ جاؤ بہت سی امیدیں ہیں تاریکی کی طرف نہ چلو بہت سے آفتاب ہیں)

شکر اور تواضع

اب اشکال کا حل سنیئے وہ یہ ہے کہ تم یوں کہو اے اللہ آپ کا شکر ہے کہ آپ نے ہم کو نماز کی توفیق دی ورنہ ہماری کیا مجال تھی جو آپ کی بندگی کر لیتے۔

واللہ لولا اللہ ما اھتدینا　　ولا تصدقنا ولا صلینا

(اور اگر اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت نہ دیتا تو ہم ہدایت یافتہ نہ ہوتے اور نہ صدقہ کرتے اور نہ نماز پڑھتے)

اب شکر و تواضع دونوں جمع ہوگئے دعویٰ بھی قطع ہو گیا اور اعمال کی بے قدری بھی نہ ہوئی اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

بحر تلخ و بحر شیریں ہمعناں　　درمیاں شان برزخ لایبغیاں

(بحر تلخ اور بحر شیریں دونوں برابر جاری ہیں، مگر انکے درمیان ایسا پردہ حائل ہے جس کی وجہ سے باہم مختلط اور مشتبہ نہیں ہوتے)

کامل کی علامت

اسی لئے کامل وہ ہے جو اپنے اعمال صالحہ کو ظاہر کرے اخفاء کا اہتمام نہ کرے تا کہ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ پر عمل ہو جائے ہاں متوسط کو اظہار مضر ہوتا ہے مگر وہ اس لئے کہ اس کی نظر میں اغیار ہیں اور کامل کی نظر سے اغیار مفقود ہو چکے ہیں وہ نہ کسی کے واسطے کوئی عمل کرتا ہے نہ کسی کی وجہ سے کسی عمل کو ترک کرتا ہے اس کی نظر صرف ایک ذات پر ہے باقی سب مخلوق اس کی نظر سے غایت ہیں اس کے نزدیک آدمی میں اور مسجد کی دیوار اور بوریئے میں کچھ فرق نہیں پھر وہ کسی سے چھپ کر عمل کیوں کرے کسی نے مسجد کی دیوار سے بھی اخفاء کا اہتمام ہے دوسرے عارف کبر جز مظہر حق او مراۃ جمال حق نظر آتی ہے اور اخفاء ہوتا ہے غیر سے اس لئے اس کو کسی سے اخفاء کا اہتمام نہیں اسی کو ایک عارف فرماتے ہیں۔

ہر چہ بینم در جہاں غیر تو نیست یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

(تمام عالم آپ کی صفات کا مظہر ہے ہر چیز کو آپ سے تعلق ہے غیر وجود ہی نہیں ، بلکہ ہر جگہ آپ کا ظہور ہے)

توئی سے ذات مراد ہے اور خوئی تو سے صفات اور بوئے تو سے افعال مراد ہیں مطلب یہ ہے کہ عالم میں بعض دفعہ تو عارف کو ذات حق کا مشاہدہ بلا واسطہ بلا کیف ہوتا ہے مثلاً اوقاتِ خلوت وعبادت میں کبھی بواسطہ ہوتا ہے کیونکہ جتنی مخلوقات ہیں ان میں صفت حق کا ظہور ہو رہا ہے اور تصرفات حق جلوہ نما ہیں پس عارف ہر چیز پر نظر ڈالتے ہوئے یہ دیکھتا ہے کہ اس میں خدا تعالیٰ کی کس صفت کا ظہور ہوا ہے صفت جمال کا یا صفت جلال کا اور حق تعالیٰ نے اس کے ساتھ کیا برتاؤ کیا ہے اور کس طرح تصرف فرما رہے ہیں تو اب کوئی چیز اس کے لئے حاجب حق نہیں بلکہ مرآۃ جمال وجلال حق ہے اسی لئے ایک عارف نے کسی شاعر کا جو یہ قول سنا ۔

گلستاں میں جا کر ہر اک گل کو دیکھا نہ تیری سی رنگت نہ تیری سی بو ہے

تو فوراً اس کی یوں اصلاح کی ۔

گلستان میں جا کر ہر اک گل کو دیکھا تیری ہی سی رنگت تیری ہی سی بو ہے

مثنوی مولانا روم کے چند اشعار کا حل

مولانا اسی مضمون کو ایک مثال سے واضح کر کے بیان فرماتے ہیں ۔

ماہمہ شیراں ولے شیر علم حملہ شان از باز باشد دمبدم

حملہ شان و ناپیداست باد آنچہ ناپیداست ہرگز کم مباد

(ہماری ایسی مثال ہے جیسے پرچم کا شیر ہوتا ہے ، ہوا چلنے سے حملہ کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے یعنی ہمارا تصرف تصرف حق کی وجہ سے ہے ، ان کا حملہ نظر آتا ہے حملہ کرنے والی (ہوا) نظر نہیں آتی ۔ (آگے بطور دعا فرماتے ہیں) جو چیز نظر نہیں آتی یعنی مؤثریت حق وہ ہمارے دل سے کم نہ ہو)

یعنی ظاہر میں ہم بھی شیر معلوم ہوتے ہیں مگر ہم ایسے شیر ہیں جیسے جھنڈے پر شیر کی تصویر ہوتی ہے کہ جس وقت ہوا سے جھنڈا ہلتا ہے یوں معلوم ہوتا ہے کہ شیر حملہ کر رہا ہے

لیکن شیر کا حملہ تو نظر آتا ہے ہوا نظر نہیں آتی اسی طرح یہاں سمجھو کو ظاہر میں تم کام کرتے ہوئے نظر آتے ہو مگر حقیقت میں کوئی دوسری قوت ہے جو تم کو نچارہی اور تم سے کام لے رہی ہے لیکن تم تو نظر آتے ہو اور وہ کام لینے والا نظر نہیں آتا مگر دل میں اس کا یقین ضرور ہے اور اسی ہی بابت دعا فرماتے ہیں آنچہ ناپیداست ہرگز کم مباد۔ یعنی از دل ما کہ جو کام لینے والا نظر نہیں آتا خدا کرے اس کی یاد ہمارے دل سے کم نہ ہو یہ تفسیر حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ کے پاس پہنچ کر معلوم ہوئی ورنہ یہ شعر حل ہی نہ ہوتا تھا۔

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں۔

دو دہاں داریم گویا ہمچو نے ۔۔۔ یک دہاں پنہاں ست در رب ہائے و لے

یک دہاں نالاں شدہ سوئے شما ۔۔۔ ہائے ھوئے در فگندہ در سما

(بانسری کی طرح ہم گویا دو منہ رکھتے ہیں ایک منہ اس کے لبوں میں پوشیدہ ہے ایک منہ تمہاری طرف نالاں ہے ہائے ھوکہ کے عالم میں ڈالے ہوئے ہیں)

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں۔

من چو کلکم درمیاں اصبعیں ۔۔۔ عیستم در صف طاعت بیں بیں

کہ ہماری ایسی مثال ہے جیسے انگلیوں کے درمیان قلم ہوتا ہے کہ بظاہر کتابت قلم سے ظاہر ہو رہی ہے مگر حقیقت میں کام لینے والا دوسرا ہے اگر وہ کام نہ لے تو قلم کی کیا مجال ہے کہ ایک حرف بھی لکھ سکے چونکہ یہ حقائق عارف پر منکشف ہیں اس لئے غیر پر اس کی نظر نہیں رہتی پھر وہ کس سے اپنے عمل کو چھپائے ظاہر میں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اخفاء عمل عمدہ حالت ہے مگر کمال یہ ہے کہ اظہار ہو مگر دعویٰ نہ ہو اور اس سے بڑھ کر کمال یہ ہے کہ اگر دعویٰ بھی ہو مگر اپنے اوپر نظر نہ ہو شاید بعض لوگ اس کو نہ سمجھے ہوں گے اس لئے میں اس کی تفصیل کرتا ہوں کہ دعویٰ اور تکبر بھی وہ ممنوع ہے جس میں اپنے اوپر نظر ہو اگر اپنے اوپر نظر نہ ہو بلکہ خدا تعالیٰ پر نظر ہو تو بعض مقامات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صورت دعویٰ اور صورت تکبر کو جائز فرمایا ہے حدیث میں ہے کہ دو مقام میں تکبر جائز ہے ایک صف قتال میں دوسرے صدقہ دیتے ہوئے تو ظاہر میں یہ تکبر معلوم ہوتا ہے مگر اصل میں وہ شخص اس وقت منصور کے مثل ہے کہ انہوں نے انا الحق کہا تھا مگر وہ اس وقت شجرہ طور کی مثل تھے شجرہ طور سے بھی اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ رَبُّ

الْعٰلَمِیْنَ نکل رہا تھا مگر کیا وہ درخت اپنے کو خدا کہہ رہا تھا ہرگز نہیں بلکہ کہنے والے حق تعالیٰ تھے شجرہ محض واسطہ اور آلہ تھا اسی طرح منصور کی زبان سے جو انا الحق نکلا اس وقت وہ خود نہ کہہ رہے تھے بلکہ اللہ تعالیٰ ان کی زبان سے تجلی کلامی فرما رہے تھے آخر اس میں تعجب کیا ہے؟ جب شجرہ کی زبان سے اللہ تعالیٰ تکلم فرما سکتے ہیں تو منصور کی زبان سے کیوں نہیں فرما سکتے اسی طرح ایک بزرگ کے پاس ایک شخص اپنے لڑکے کو لایا جو اندھا پیدا ہوا تھا اور کہا حضرت اس کے لئے دعا کر دیجئے انہوں نے فرمایا کہ کیا میں عیسیٰ علیہ السلام ہوں جو اندھوں کو سوانکھا کروں وہ شخص مایوس ہو کر چلا گیا تو دفعۃً ان بزرگ کی زبان سے نکلا باز آرید ما کینم ما کینم کہ اس کو واپس لاؤ ہم اس کو اچھا کریں گے ہم کر دیں گے چنانچہ خدام نے یہ سن کر اس شخص کو واپس بلایا آپ نے دعا کی اور بچہ کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا تو وہ بینا ہو گیا اس کے بعد کسی خادم نے پوچھا کہ اول تو آپ نے اس شخص کی درخواست کو اس سختی کے ساتھ رد کیا تھا کہ میں عیسیٰ علیہ السلام نہیں ہوں اور اس کے بعد اس دعویٰ کے ساتھ فرمایا ما کینم ما کینم (ہم کریں گے) انہوں نے جواب دیا کہ یہ لفظ میں نے نہیں کہا بلکہ جب میں نے یہ جواب دیا کہ میں عیسیٰ علیہ السلام نہیں ہوں تو مجھے الہام کے ذریعہ عتاب ہوا کہ کیا عیسیٰ علیہ السلام اندھوں کو اچھا کرتے تھے جو تم نے یہ جواب دیا بلکہ ہم اچھا کرتے تھے اور ہم اب بھی موجود ہیں پھر تم نے یہ جواب کیوں دیا اس الہام میں حق تعالیٰ کی طرف سے یہ ارشاد ہو رہا تھا ما کینم ما کینم (ہم کریں گے) وہی بیساختہ میری زبان پر جاری ہو گیا تو اس واقعہ میں یہ بزرگ بھی مثل شجرہ طور کے تھے اور ان کا حال بھی مثل منصور کے تھا اس لئے صورت دعویٰ بعض صورتوں میں جائز ہے جو حدیث میں مذکور ہیں اور حقیقی دعویٰ حرام ہے۔

اخفائے عمل مطلق کمال نہیں

پس اظہار عمل مطلقاً نقص نہیں اور نہ اخفائے عمل مطلقاً کمال ہے بلکہ نقص جب ہے کہ اپنے اوپر نظر ہو اور کمال جب ہے کہ اپنے اوپر نظر نہ ہو بلکہ صرف خالق جل وعلا پر نظر ہو پس گو اخفائے عمل متوسط کے لئے محمود ہے مگر کمال نہیں مگر متوسط کے لئے بھی فرض نماز کو تنہائی میں ادا کرنا جائز نہیں کیونکہ فرض سے قرب زیادہ ہوتا ہے اور زیادہ قرب میں اخفاء نہیں ہوا کرتا چنانچہ جو شخص بادشاہ کا زیادہ مقرب ہوتا ہے بادشاہ برسر دربار اس کے درجہ اور

منصب کو ظاہر کرتا ہے اور جس کو کم قرب ہوتا ہے اس کے قرب کو بر سر دربار ظاہر نہیں کیا جاتا غرض فرض نماز چونکہ خاص قرب کا وقت ہے اس لئے اس کا اخفاء جائز نہیں بلکہ اشاعت فرض ہے اور جو لوگ اس واسطے اپنے اعمال صالحہ کا اخفاء کرتے ہیں تا کہ لوگ ملامت نہ کریں اور یوں نہ کہیں کہ یہ بزرگ بننا چاہتا ہے یا ریاکاری کرتا ہے ان کو اس خیال سے بھی اخفاء نہ کرنا چاہئے بلکہ اپنے کام میں لگیں اور ملامت سے نہ ڈریں کیونکہ عاشق کو ملامت محبت سے مانع نہیں ہوا کرتی بلکہ ملامت سے تو عشق کی گرم بازاری ہے۔

خوشا رسوائی کوے ملامت نسازد عشق را کنج سلامت

متنبی کہتا ہے۔

عذل العواذل حول قلبي التائه وهوى الاحبة منه في سوادئه

(ملامت گروں کی ملامتیں قلب کے اردگرد ہیں اور محبوب حقیقی کی محبت دل کی گہرائیوں میں ہے)

بلکہ محبت تو بعض دفعہ چھپانے سے بھی نہیں چھپتی۔

می تواں داشت نہاں عشق زمردم لیکن زردی رنگ رخ و خشکی لب راچہ علاج

(تم آدمیوں سے عشق کے تذکرہ کو تو چھپا سکتے ہو مگر چہرے کی زردی اور لبوں کی خشکی کو کس طرح چھپاؤ گے)

یہ تو عشق مجازی کی حالت ہے اور عشق حقیقی کے متعلق مولانا فرماتے ہیں۔

نور حق ظاہر بود اندر ولی نیک بیں باشی اگر صاحب دلی

(ولی میں انوار الٰہی نمایاں ہوتے ہیں، مگر اس کا ادراک اہل دل کو ہوتا ہے)۔

تو جب اعمال صالحہ کو تکلف کے ساتھ چھپانے کی بھی اجازت نہیں الالعذر خاص تو ان کی بے قدری اور تحقیر کی کب اجازت ہو سکتی ہے رہا یہ کہ نماز میں خشوع نہیں اور ذکر وغیرہ میں انوار نہیں اس لئے ہم ان کو کالعدم اور حقیر سمجھتے ہیں میں کہتا ہوں کہ خشوع نہ ہوا نوار نہ ہوں جب بھی تم اعمال کی بے قدری نہ کرو کیونکہ بلا بودے اگر اینہم نہ بودے (اگر یہ بھی نہ ہوتا تو بڑی مصیبت ہوتی) اگر یہ بھی نہ ہوتے تو کیا ہوتا یہ تھوڑی نعمت ہے کہ تم نماز تو پڑھتے ہو گو ناقص ہی سہی اللہ کا نام لیتے ہو گو اعلیٰ درجہ میں نہ سہی ہاں تکمیل میں سعی کرتے رہنا لازم ہے۔

ذکر ریائی

مولانا جامیؒ سے کسی نے کہا کہ فلاں شخص ریا سے ذکر کرتا ہے فرمایا وہ تم سے پھر بھی اچھا ہے کہ خدا کا نام تو لیتا ہے تم تو ریا سے بھی خدا کا نام نہیں لیتے قیامت میں اس کا ذکر ریائی ٹمٹماتا ہوا چراغ بن کر پل صراط سے اس کو پار کردے گا مگر تمہارے پاس تو ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی نہیں یہ ہیں محقق لوگ جو اعمال صالحہ کی اتنی قدر کرتے ہیں غرض کام نہ کرنے والے سے پھر بھی بہت اچھا ہے کہ کچھ کرتا تو ہے اور جو بالکل نہیں کرتا وہ تو بالکل محروم ہے حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے ایک مجمع صلحاء کے بارے میں جو ایک دینی کام کے لئے اٹھے تھے مگر ناکام رہے طعن کے طور پر کہا کہ ان لوگوں نے ناحق اس میدان میں قدم ڈالا بھلا کیا حاصل ہوا تو مولانا نے اس کے جواب میں سودا کا یہ قطعہ پڑھ دیا۔

سودا قمار عشق میں شیریں سے کوہ کن　　بازی اگرچہ پانہ سکا سر تو کھوسکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز　　اے روسیا تجھ سے تو یہ بھی نہ ہوسکا

پس اپنے نیک اعمال کی تحقیر و بے قدری بھی نہ کرو اور نہ اپنے آپ کو بزرگ اور بڑا سمجھو بلکہ اپنی ایسی مثال سمجھو جیسے بادشاہ کسی چمار کو قیمتی موتی دیدے ظاہر ہے کہ اس صورت میں چمار اپنے کو چمار ہی سمجھے گا اور موتی کو موتی سمجھے گا یہ نہیں کہ موتی کے آجانے سے وہ اپنے کو سید یا پٹھان سمجھنے لگے یا موتی کو اپنے ہاتھ میں آنے سے کانچ سمجھنے لگے اگر ایسا کرے گا تو عتاب شاہی میں گرفتار ہوگا ہاں یہ ضرور ہے کہ موتی ملنے کے بعد اس کو پہلے سے زیادہ بادشاہ کا خوف ہوگا کہ مجھ کو بڑی شے ملی ہے خدا خیر کرے اور مجھے اس کی حفاظت کی توفیق دے ایسا نہ ہو کہ مجھ سے اس کی حفاظت و قدر دانی میں کوتاہی ہو جائے اور بادشاہ ناراض ہو اسی طرح جس کو نماز کی توفیق ہوگئی ہے وہ نماز کو حقیر نہ سمجھے کیونکہ وہ تو بڑا قیمتی جوہر ہے مگر اپنے کو چمار ہی سمجھے اور نماز کی حفاظت میں پوری کوشش کرے کیونکہ قانون الٰہی یہ ہے لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ اگر میری نعمت کی قدر کروگے تو اور زیادہ دوں گا اور بے قدری کروگے تو (سن لو کہ) میرا عذاب بہت سخت ہے اگر نعمت میں ترقی چاہو تو اس کی قدر کرو کیونکہ ناشکری سے نعمت سلب ہو جاتی ہے اور نعمت کا شکر یہ

بھی ہے کہ اس کو ظاہر کرو مگر دعویٰ و تکبر نہ کرو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس طرح جمع فرمایا ہے انا[1] سید ولد آدم ولا فخر میں تمام اولاد آدم کا سردار ہوں اور فخر سے نہیں کہتا بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کہتا ہوں حضرات انبیاء اور اولیاء کاملین کی زبان سے جو ایسی باتیں نکلتی ہیں درحقیقت اس وقت وہ خود نہیں کہتے بلکہ اللہ تعالیٰ ان سے کہلواتے ہیں اور اس وقت ان کے دل میں تکبر کا شائبہ بھی نہیں ہوتا کیونکہ اس وقت وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سفیر ہوتے ہیں اور سفیر اداء سفارت کے وقت جو کہتا ہے اپنے مالک کی طرف سے کہتا ہے جیسے آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک اردلی حاکم کے سامنے بڑے بڑے رؤسا اور نوابوں کو نام لے لے کر پکارتا ہے کہ فلاں شخص حاضر ہے اور یقیناً وہ جانتا ہے کہ اس رئیس اور نواب کے سامنے میری کچھ بھی ہستی نہیں مگر حاکم کے حکم سے اجلاس کے وقت وہ سب کا نام لے کر پکارتا ہے پس ایسی تواضع اختیار کرو جس میں اعمال کی بے قدری نہ ہو اور تکبر سے ہمیشہ بچو کیونکہ جو کچھ اعمال تم کر رہے ہو خود نہیں کر رہے ہو بلکہ اللہ تعالیٰ تم سے کام لے رہے ہیں انہوں نے تمہارے واسطے اس کو آسان کر دیا ہے اگر وہ آسان نہ کرتے تو تمہاری کیا مجال تھی دیکھو! اسلام کس قدر آسان ہے مگر اسی کے لئے آسان ہے جس پر خدا نے اس کو آسان کر دیا ورنہ کفار اسلام کیوں نہیں لے آتے معلوم ہوا کہ جس کو وہ توفیق نہ دے اس کو آسان کام بھی دشوار ہے یہی حال نماز کا ہے چنانچہ خود فرماتے ہیں وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کہ نماز بے شک گراں ہے مگر خاشعین پر گراں نہیں اس کے بعد فرماتے ہیں کہ خاشعین کون ہیں؟ وہ وہ لوگ ہیں جو لقاء اللہ کا یقین رکھتے ہیں واقعی یہ عجیب کلام ہے کہ دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ نماز کی گرانی کا سبب زیادہ تر یہ ہے کہ نفس آزادی کا عادی ہے اور نماز میں پابندی ہے اور ظاہری پابندی نفس پر اتنی گراں نہیں جتنی باطنی پابندی گراں ہے کہ نماز میں سب طرح کے خیالات سے خالی ہو کر صرف نماز کی یا خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ رہے کیونکہ نفس تو میدان خیالات میں چکر لگانے کا عادی ہے تو اس کا علاج یہ ہے کہ نفس کو سکون کا عادی بنایا جائے کیونکہ العلاج بالضد اور حرکت کی ضد سکون ہی ہے۔

---

[1] المستدرک للحاکم ۲:۶۰۴، اتحاف السادۃ المتقین للزبیدی ۷:۶۰۴، کنز العمال: ۳۲۰۴۰، ۳۲۶۸۲

سکون کے دو طریقے

پھر سکون کے دو طریقے ہیں ایک یہ کہ نفس کو تمام خیالات سے خالی کیا جائے ایک یہ کہ کسی ایک خیال میں لگا دیا جائے جس سے دوسرے خیال خود دفع ہو جائیں گے ظاہر ہے کہ پہلی صورت دشوار ہے جو نفس رات دن خیالات میں چکر لگانے کا عادی ہے وہ تمام خیالات سے دفعۃً خالی کیونکر ہو سکتا اس لئے سہل تدبیر یہی ہے کہ اس کو کسی ایک خیال میں مستغرق کر دیا جائے خاص کر ایسے خیال میں جو ہادم لذات و ہادم جملہ خیالات ہو۔

خشوع کا طریقہ

حق تعالیٰ نے خشوع کا یہی طریقہ تعلیم فرمایا ہے کہ خاشعین وہ ہیں جو لقاء اللہ کا یقین رکھتے ہیں یعنی مراقبہ آخرت میں مشغول ہیں اور مراقبہ آخرت کا جمنا بھی دفعۃً سہل نہیں کیونکہ آخرت مشاہد نہیں اور غیر مشاہد کا خیال دیر سے دل میں جمتا ہے اس لئے اس کا طریقہ یہ بتلایا کہ انھم الیہ راجعون کا مراقبہ کیا جائے یعنی موت کا اور موت کے واقعات رات دن مشاہدہ سے گذرتے رہتے ہیں پس اول تو موت کا مراقبہ کیا جائے اور اس کو راسخ کر لیا جائے یہ ایسا مراقبہ جو دنیا سے دل سرد کر دے گا اور تمام خیالات کو ختم کر دے گا پھر لقاء اللہ کا مراقبہ کیا جائے کہ مرنے کہ بعد ہم خدا کے سامنے کھڑے ہوں گے وہاں حساب کتاب اعمال کا ہوگا جو شخص اس مراقبہ کا عادی ہو جائے گا اس کو سکون قلب حاصل ہو جائے گا کیونکہ جس دل میں خدا کی یاد جم جاتی ہے پھر سب خیالات اس کے اندر سے نکل جاتے ہیں۔

ماند الا اللہ و باقی جملہ رفت   مرحبا اے عشق شرکت سوز رفت

(الا اللہ باقی رہ گیا باقی تمام فنا ہو گئے، مرحبا اے عشق شرکت سوز، تجھ پر سوائے محبوب حقیقی کے سب کو فنا کر دیا)

نماز میں طریق حصول حضور قلب

(احقر جامع عرض کرتا ہے کہ اس تقریر کا حاصل یہ ہے کہ تکمیل نماز کے لئے مراقبہ موت و مراقبہ لقاء اللہ کا عادی ہونا چاہئے اور میرا ذوق یہ کہتا ہے کہ آیت میں یہ مراد ہے کہ

عین نماز کے اندر بھی اس مراقبہ میں قلب کو مشغول کیا جائے جس کی صورت یہ ہے کہ نمازی نماز کی ہیئت میں غور کرے کہ میں جو تمام دنیا سے رخ پھیر کر ہاتھ باندھ کر اس طرح کھڑا ہوں کہ نہ کسی سے بات کرسکتا ہوں نہ کسی کی طرف دیکھ سکتا ہوں نہ کھا پی سکتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہوں اور ان سے عرض معروض کر رہا ہوں پھر قیام کی حالت میں یہ سوچے کہ خدا تعالیٰ کے مجھ پر کس قدر احسانات وانعامات ہیں جن کا شکریہ میرے ذمہ واجب ہے اور سورۃ فاتحہ پڑھتے ہوئے یہ سوچے کہ میں اللہ تعالیٰ کے انعامات کا شکریہ ادا کر رہا ہوں اور اس کی ربوبیت کا اقرار اور اپنی عبدیت کا اعتراف کر رہا ہوں اور اسی عبدیت پر قائم رہنے اور اہل عبدیت کے طریقے پر چلنے کی دعا کر رہا ہوں اور جو لوگ طریق عبدیت سے بہک گئے اور لعنت وغضب کے مستحق ہوگئے ہیں ان کے طریقے سے بیزاری کا اظہار کر رہا ہوں اور جو قانون الٰہی تکمیل طریق عبدیت کے لئے نازل ہوا ہے اس پر ہمیشہ چلنے کا عہد کر رہا ہوں فاتحہ کے بعد سورت پڑھنے کا یہی مطلب ہے پھر جب رکوع میں جائے تو یہ سوچے کہ میری پیدائش اسی مٹی اور زمین سے ہے جو میرے پاؤں تلے ہے زمین کی خاک سے جیتا جاگتا سمیع وبصیر انسان پیدا ہو جانا محض خالق جل وعلا کی قدرت ہے اور جس کی پیدائش زمین کی خاک اور اس کی نباتات وغیرہ سے ہو اس کو عبدیت اور بندگی کے سوا کچھ زیبا نہیں بڑائی اور بزرگی صرف خالق جل وعلا کو زیبا ہے جو تمام عیوب سے بری ہے اسی لئے نماز میں بار بار اللہ اکبر کہا جاتا ہے کہ اے خدا ہم نے آپ کی عظمت کے سامنے اپنی خیالی عزت کو قربان کر دیا پھر سجدہ میں جاتے ہوئے یہ سوچے کہ مجھے ایک دن زمین کے اندر پیوند ہونا ہے اور اس وقت خدا کے سوا میرا ساتھ دینے والا کوئی نہ ہوگا دنیا سے میرا نام بھی مٹ جائے گا اور نشان بھی اس کے بعد دوسرے سجدے میں یہ تصور کرے کہ گویا میں مر چکا اور خدا سے مل گیا ہوں اب خدا کے سوا کوئی میرے ساتھ نہیں پھر جلسہ تشہد میں یہ سوچے کہ مرنے کے بعد پھر ایک زندگی ہوگی جہاں اسلام اور اعمال واقوال و احوال صالحہ ہی کام آئیں گے جو اللہ کے واسطے کئے گئے ہوں اور سیّدنا صلی اللہ علیہ وسلم اور جملہ انبیاء وحضرات ملائکہ اور تمام نیک بندوں کی عزت ظاہر ہوگی کہ وہ گنہگاروں کی شفاعت کریں گے لہٰذا ان پر سلام بھیج کر ان سے تعلق پیدا کرنا چاہیے پھر چونکہ اُمت محمدیہ کو سیّدنا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سب سے زیادہ تعلق ہے اس لئے اخیر رکعت میں آپ پر

خصوصیت کے ساتھ درود شریف پڑھنا چاہیئے جب یہ تصور جم جائے تو اس کے بعد میں یوں تصور کرے کہ گویا مرنے کے بعد یہ میدان قیامت حاضر ہوا ہے اور تمام اعمال و افعال و اقوال جو دنیا میں کئے ہیں اس کے سامنے ہیں جن میں سے وہی کام آ رہے ہیں جو اللہ کے واسطے کئے گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء و صلحاء و ملائکہ کی جماعت کے سامنے ہے جو دربار الٰہی میں حاضر ہوں اور میں ان سب پر درود شریف و سلام بھیج رہا ہوں اور آخر میں اپنے لئے کامیابی و نجات و فلاح کی دعا کر رہا ہوں اور اسی واسطے آیت میں لفظ یظنون اختیار کیا گیا ہے حالانکہ لقاء اللہ کا تو اعتقاد جازم فرض ہے محض ظن کافی نہیں مگر چونکہ مقصود یہ ہے کہ نماز میں لقاء اللہ و رجوع الی اللہ کا استحضار کیا جائے اور یہ استحضار درجہ وقوع میں لازم نہیں بلکہ اسکا ظن اور تصور بھی نماز میں کافی ہے کہ گویا میں اسی وقت خدا کے سامنے حاضر ہوں اور مر گیا ہوں یا مرنے والا ہوں اور گویا میں اس وقت عالم آخرت میں حاضر ہوں اس واسطے لفظ ظن اختیار کیا گیا اس طرح نماز پڑھنے سے خشوع خاص ہو جائے گا اور تمام خیالات وساوس قلب سے نکل جائیں گے واللہ تعالیٰ اعلم ۱۲ جامع)

قرآن عجیب کیمیا ہے

صاحبو! قرآن عجیب کیمیا ہے جس میں سارا کام مفت ہی ہے مگر ذرا سی نگہداشت ہمارے ذمہ ہے اور جتنے طریقے سلوک کے ہیں جو دوسرے مذاہب میں معمول بہا ہیں ان کی مثال اس کیمیا کے مشابہ ہے جس میں اکیس روپے خرچ کئے جائیں اور مال بیس کا بھی حاصل نہ ہو اور شریعت مقدسہ کی کیمیا ایسی ہے جس میں نفع ہی نفع ہے نقصان کچھ نہیں شریعت مقدسہ نے بڑے سے بڑے کام کو بھی ایسا آسان کر دیا ہے کہ پھول سے زیادہ ہلکا ہو گیا ہے مگر توفیق نہ ہو تو وہ بھی سخت مشکل ہے غور تو کیجئے کہ اسلام میں کیا دشواری ہے رحمت ہی رحمت اور سہولت ہی سہولت ہے مگر توفیق رفیق نہ ہو تو بہت مشکل ہے ایک تو یہ جزو ہے اجزاء ثلاثہ مذکورہ فی الحدیث میں سے جس کا بیان کرنا مقصود نہ تھا مگر چونکہ جزو مقصود الحج یھدم ما کان قبلہ کے لئے معین تھا جیسے عنقریب اس کا بیان ہوتا ہے اس لئے اس کا مفصل بیان کر دیا گیا۔

دارالکفر کی دو قسمیں

دوسرا جز و یہ ہے الهجرة تهدم ماکان قبلها[1] کہ ہجرت بھی پہلے گناہ گرا دیتی ہے ہجرت کے معنی ہجرت دار خوف سے دار امن کی طرف کیونکہ دارالکفر دو قسم کے ہیں ایک دارالخوف جس میں شعائر اسلام ظاہر کرنے پر مسلمانوں کو قدرت نہ ہو بلکہ اس اظہار میں جان و مال کا خطرہ ہو دوسرا دارالامن جہاں سلطنت تو کافر کی ہے مگر مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہے کہ وہ شعائر سلام کو بلا خوف و خطر ظاہر کر سکتے ہیں اور ہجرت اس دارالکفر سے فرض ہے جو دارالخوف بھی ہو اور دارالکفر دارالامن ہو وہاں سے ہجرت فرض نہیں تو جاہلوں کا یہ شبہ دور ہو گیا کہ اگر ہندوستان دارالکفر ہے تو یہاں سے ہجرت کیوں نہیں کی جاتی اس شبہ کا جواب ہمارے استاد محقق و مدقق مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خوب دیا تھا کہ مکہ معظمہ سے جبکہ وہ دارالحرب تھا پہلی ہجرت صحابہؓ نے حبشہ کی طرف کی ہے جہاں اس وقت تک اسلام موجود نہ تھا پس حبشہ بھی اس وقت دارالحرب تھا اور وہاں جانے والوں کو مہاجر کہا گیا اور صحابہ وہاں ہجرت کر کے اسی واسطے گئے کہ وہ دارالامن تھا اور ان کی یہ ہجرت معتبر ہوئی اور ان کو ہجرت کا ثواب بھی ملا پھر ان صحابہؓ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو ان کا لقب ذوالہجرتین ہوا پس معلوم ہوا کہ دارالامن گو دارالایمان نہ ہو بلکہ دارالکفر ہی ہو وہاں سے ہجرت کرنا فرض نہیں بلکہ وہ تو خود ہجرت گاہ بن سکتا ہے ہاں اس میں شک نہیں دارالایمان کی طرف ہجرت کرنا افضل ہے مگر اداء فرض کے لئے دارالامن کی طرف بھی ہجرت بھی کافی ہے جو شخص دار خوف سے دارالامن کی طرف بھی ہجرت نہ کرے وہ تارک فرض ہے اور اسی کے لئے سخت وعید ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا.

---

[1] الطبقات الکبری لا بن سعد ۴:۲:۲

(ترجمہ) جن لوگوں کی جانیں فرشتے اس حالت میں قبض کرتے ہیں کہ وہ اپنی جانوں پر (ترک ہجرت سے) ظلم کرنے والے تھے ان سے ملائکہ نے کہا کہ تم کس کام میں تھے انہوں نے جواب دیا کہ ہم اس سرزمین میں محض مغلوب اور کمزور تھے فرشتوں نے کہا کیا خدا کی زمین فراخ نہ تھی کہ تم اس کے کسی حصہ میں ہجرت کر جاتے (اس کا ان کے پاس کچھ جواب نہ تھا) ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بری جائے بازگشت ہے ہاں مگر وہ مرد اور وہ عورتیں اور بچے جو واقعی مغلوب و کمزور تھے جو نہ کوئی تدبیر (ہجرت کی) کر سکتے تھے اور نہ ان کو کوئی راہ ملتی تھی ان کو امید ہے کہ خدا تعالیٰ معاف کر دیں اور اللہ تعالیٰ تو معاف کرنے والے مغفرت کرنے والے ہی ہیں (وہ عذاب کے لئے بہانہ نہیں ڈھونڈتے بلکہ اسی کو عذاب کرتے ہیں جو بلا وجہ گناہ کا مرتکب ہو ۱۲)

جو لوگ محض ترجمہ دیکھ کر محقق بننے کا دعویٰ کرتے ہیں ان کو عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ میں امید کے لفظ سے یہ شبہ ہوگا کہ خدا تعالیٰ نے اس مضمون کو شک کے ساتھ کیوں بیان فرمایا ان کو تو اپنے فعل کا یقین ہے پھر یقینی بات کو یقین کے لفظ سے بیان کرنا چاہئے تھا اس کا جواب یہ ہے کہ تم نے محض ترجمہ دیکھا ہے قرآن کو سمجھا نہیں ہے اس واسطے یہ شبہ ہوا تم کو چاہئے کہ پہلے یہ بھی دیکھ لو کہ یہاں متکلم کون ہے اور مخاطب کون ہیں سو ظاہر ہے کہ متکلم حق تعالیٰ شانہ احکم الحاکمین ہیں۔

شاہانہ محاورات

پس خدا تعالیٰ کے کلام کو شاہانہ محاورات پر منطبق کر کے دیکھو یہ عامیانہ محاورات پر منطبق نہ کرو اور شاہانہ محاورات میں وعدہ جازمہ کے لئے بھی امید ہی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اسی سے ڈپٹی صاحب دہلوی کے ترجمہ کی غلطی معلوم ہوگئی جنہوں نے دہلی کی بازاری زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا ہے چنانچہ ایک جگہ ٹامک ٹوئیاں مارنا استعمال کیا ہے ایک جگہ کبڈی کھیلنا لکھا ہے اور سب جانتے ہیں کہ یہ الفاظ شاہی زبان میں استعمال نہیں ہوئے مترجم قرآن کو لازم ہے کہ ترجمہ میں شاہانہ طرز و انداز کو ہاتھ سے نہ دے جو قرآن کا خاص طرز ہے عربی دان طبقہ خوب جانتا ہے کہ قرآن کی زبان کیسی پر شوکت اور کس قدر با سطوت ہے دوسرے یہ دیکھو کہ مخاطب کلام کے کون ہیں سو ظاہر ہے کہ مخاطب بندے ہیں اور بندہ کا فرض یہ ہے کہ اخیر دم تک

امید وہم ہی میں رہے کسی وقت جلال شاہی سے بے خوف نہ ہو اسی لئے حکام مقدمات میں اخیر تک فریقین کو امید وہم ہی میں رکھتے ہیں فیصلہ کے دن ظاہر ہوتا ہے کہ کون کامیاب ہے اور کون ناکام ایسے ہی یہاں بھی فیصلہ کے دن سے پہلے یعنی قیامت سے پہلے بندوں کو امید وہم ہی میں رکھا گیا ہے اتنا فرق ہے کہ حکام تو اپنی غرض کے واسطے ایسا کرتے ہیں اور حق تعالیٰ نے بندوں کے فائدہ کے لئے ایسا کیا ہے کیونکہ بندے کو اگر کسی وقت اطمینان ہو جائے کہ میں جنتی ہوں تو وہ جرائم سے نڈر ہو جائے گا اور اگر یہ معلوم ہو جائے کہ میں جہنمی ہوں تو وہ نا اُمید ہو کر بھلائی سے بالکل دور جا پڑے گا اور اس میں علاوہ اس کے نقصان کے نظم عالم کے درہم برہم ہو جانے کا بھی اندیشہ ہے کیونکہ کثرت جرائم سے نظام کا درہم برہم ہونا ظاہر ہے۔

فضائل ہجرت

غرض ہجرت کی یہ فضیلت ہے کہ اس سے گذشتہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور یہ ہجرت متمم اسلام ہے کیونکہ بغیر اس کے اسلامی کام نہیں ہو سکتے اور ظاہر ہے کہ اعمال اسلامیہ ہی سے اسلام کامل ہوتا ہے اور ہجرت گو ظاہر میں دشوار ہے کیونکہ وطن اور خاندان کا چھوڑنا آسان نہیں مگر واقع میں سہل ہے کیونکہ یہ تو معلوم ہو چکا کہ ہجرت اسی وقت فرض ہے جب مسلمان اپنے مذہب اور شعائر مذہب کو بجانہ لاسکے اور جو شخص مذہب پر عمل کرنے سے روکے وہ باپ بھی ہو تو پاپ ہے کیونکہ انسان کو مذہب سب سے زیادہ عزیز اور پیارا ہوتا ہے اسی لئے مذہب ہمیشہ اپنے مذہب کی حفاظت وحمایت کے لئے جانوں کی قربانیاں کرتے رہے ہیں۔

فضائل حج

تیسرا جزو الحج یھدم ما کان قبلہ[1] ہے اور اسی کا بیان مقصود ہے اب میں حسب وعدہ یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ جزئین اولین جزو ثالث کے لئے کس طرح معین ہیں تو بات یہ ہے کہ اس لفظ سے کہ حج پہلے گناہوں کو گرا دیتا اور مٹا دیتا ہے حج کی فضیلت معلوم ہوئی فرضیت معلوم نہیں ہوئی اور مقصود فرضیت کا بیان اصالۃً ہے اور فضیلت کا تبعاً اس لئے جزئین اولین کو میں نے بیان کر دیا کیونکہ وہ دونوں اثبات فرضیت میں اس طرح معین ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ

[1] الترغیب و الترھیب للمنذری ۲: ۱۶۳، الطبقات الکبریٰ لابن سعد ۴: ۲: ۶

وسلم نے اس حدیث کو دو چیزوں کے ساتھ مقروں فرمایا ہے اور وہ دونوں فرض ہیں اس سے بعض اصولیین کی رائے پر تو یہ معلوم ہوا کہ حج بھی فرض ہے کیونکہ بظاہر حضور صلی اللہ علیہ وسلم امور متناسبہ ہی کو جمع فرماتے ہیں البتہ اگر کوئی مستقل دلیل عدم اشتراک کی ہو تو اس وقت یہ ظاہر حجت نہ ہوگا اور جن اصولیین نے اس اقتران فی الذکر کو حجت نہیں سمجھا وہ بھی اس کی اہمیت ہونے سے انکار نہیں کر سکتے تو اگر وان علی الافتراض نہ ہوتا ہم اس میں معین ضرور ہے اور افتراض دلیل مستقل سے ثابت ہے دوسرے یہ کہ یہاں جو فضیلت حج کی مذکور ہے وہ بہت ہی بڑی فضیلت ہے جو ظاہراً فرض کے لائق ہے یعنی پہلے گناہوں کو مٹا دینا گرا دینا چنانچہ حج سے پہلے جن امور کے لئے یہ فضیلت بیان کی گئی ہے وہ دونوں بھی فرض ہیں پس حج کا بھی فرض ہونا اقرب ہے اور یہ دلیل مستقل نہیں ہے بلکہ دوسرے ادلہ فرضیت کے لئے مؤید ہے اور فرضیت دوسرے دلائل سے ثابت ہے غرض یہ بات معلوم ہے کہ حج فرض ہے اس اقتران سے ظاہراً اور دوسرے دلائل سے نصاً میں اس پر آپ کو اس وقت متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر کسی کے ذمہ حج فرض ہوا تو وہ سستی نہ کرے کیونکہ اور عبادات اگر وقت پر ادا نہ ہوں تو فوراً ہی ان کی قضا ہو سکتی ہے بخلاف حج کے کہ یہ اگر وقت پر ادا نہ ہوا تو پھر سال بھر کے بعد اس کا وقت آئے گا اور سال بھر بڑی مدت ہے کیا خبر سال بھر تک زندگی ہے یا نہیں پس وقت کو غنیمت سمجھو اس لئے حدیث میں ہے اغتنم[1] خمسا قبل خمس فراغک قبل شغلک وحیاتک قبل موتک الحدیث۔ (پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں کے آنے سے پہلے غنیمت سمجھو) فراغت کے وقت کی مشغولی سے پہلے پہلے غنیمت سمجھو زندگی کو موت سے پہلے غنیمت سمجھو۔

خوشا وقتے و خرم روز گارے کہ یارے برخورداز وصل یارے

(وہ وقت اور زمانہ کیسا خوشگوار تھا جب ایک دوست اپنے محبوب کے وصل سے بہرہ اندوز ہو رہا تھا)

صاحبو! فراغت کے وقت کو غنیمت سمجھو اس طرح ٹالنے سے کبھی کام نہ ہوگا یہ خیالات

---

[1] المستدرک۴:۳۰۶،الترغیب۴:۲۵۱،حلیۃ الأولیاء۴:۱۴۸،شرح السنۃ للبغوی ۱۴:۲۲۴،کشف الخفاء للعجلونی ۱:۱۶۷،مشکوٰۃ المصابیح:۵۱۷۴، کنزالعمال: ۴۳۴۹۰

چھوڑ دو کہ یہ کام ہو جائے تو حج کو جائیں تم کو کیا خبر ہے کہ آئندہ سال دوسرا کام نہ نکل آئے گا دنیا کے دھندے کبھی ختم نہیں ہو سکتے متنبی کہتا ہے۔ لا ینتھی ارب الا الی ارب

ایک عارف فرماتے ہیں۔

ہر شبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم — باز چوں فردا شود امروز را فردا کنم

(ہر رات کو ارادہ کرتا ہوں کہ کل یہ جنون چھوڑ دوں جب کل آتی ہے تو اس کو کل پر ٹال دیتا ہوں)

کام کرنے کا طریقہ

یہاں تک کہ اسی طرح ایک دن موت کا وقت قریب آجائے گا اور اس وقت کہنے لگے گا رَبِّ لَوْلَا اَخَّرْتَنِیْ اِلٰی اَجَلٍ قَرِیْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَکُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ کہ اے پروردگار مجھے تھوڑی سی مہلت اور کیوں نہ دے دی؟ کہ میں صدقہ خیرات کر لیتا اور نیک بندوں میں داخل ہو جاتا حق تعالیٰ اس کا جواب دیتے ہیں وَلَنْ یُّؤَخِّرَ اللّٰہُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُھَا وَاللّٰہُ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ کہ جب وقت آجاتا ہے پھر حق تعالیٰ کسی کو مہلت نہیں دیتے اور اللہ تعالیٰ تمہارے کرتوتوں سے پوری طرح خبردار ہیں (کہ اگر تم کو مہلت دی جاتی تو تم اس مہلت کو بھی یوں ہی برباد کرتے جیسے ساری عمر کو برباد کیا تھا) صاحبو! دنیا کے جھگڑے تو یوں ہی چلتے رہیں گے ان سے فراغت تو مرنے کے ساتھ ہی ہو گی ع کار دنیا کسے تمام نہ کرد (دنیا کے کام کسی نے مکمل نہیں کئے) ع ہر کہ آمد عمارت نو ساخت (جو آیا اس نے نئی عمارت تعمیر کی) اگر کام کرنا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ان جھگڑوں کو بیچ ہی میں چھوڑ دو اور کام میں لگ جاؤ حضرات اہل اللہ ایسا ہی کرتے ہیں چنانچہ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں جب جاذبہ حق پیدا ہوا تو سلطنت کو بیچ ہی میں چھوڑ کر الگ ہو گئے نہ کسی کو اپنا قائم مقام کیا نہ کچھ انتظام کیا کہ وزراء وغیرہ خود انتظام کر لیں گے۔

اہل اللہ کی ہمت

اسی کے مناسب ایک بڑی بی کا قصہ سنا ہے کہ غدر سے پہلے جب کراچی کا سفر حاجیوں کو بہلی میں کرنا پڑتا تھا کیونکہ ریل اس وقت تک جاری نہ ہوئی تھی تو پچاس سو بہلیاں ساتھ مل کر چلتی

تھیں تا کہ ڈاکوؤں سے امن رہے تو ایک دفعہ اسی طرح حاجیوں کی بہلیاں جارہی تھیں کہ ایک بڑی بی نے جو جنگل میں بکریاں چرارہی تھی بہلیوں کو دیکھ کر پوچھا کہ میاں یہ کس کی بارات ہے لوگوں نے کہا بارات نہیں ہے بلکہ حاجی لوگ اللہ کے گھر جارہے ہیں یہ سن کر بڑھیا کے دل میں جاذبہ حق پیدا ہوا اور اس نے کہا پھر ہم بھی اللہ کے گھر کی زیارت کریں گے یہ کہہ بہلیوں کے ساتھ ہوگئی اور بکریوں کو وہاں ہی میدان میں چھوڑا ان کو گھر تک بھی نہ پہنچایا واقعی سچ ہے۔

تابدانی ہر کرا یزداں بخواند　　　از ہمہ کار جہاں بے کار ماند

(جسے اللہ تعالیٰ چاہتا ہے اسے گھر بیٹھے روزی ملتی ہے اسے کیا پڑی کہ وہ دنیا میں خوار ہوتا پھرے)

اور

آنکس کہ تراں شناخت جانرا چہ کند　　　فرزند و عیال و خانمانرا چہ کند

(جس نے آپ کو پہچان لیا وہ جان کی کیا پرواہ کرے گا اور بی بچوں مال واسباب کو لے کر کیا کرے گا)

پھر بڑھیا کی ہمت تو دیکھئے کہ لاٹھی کے سہارے پیدل قافلہ کے ساتھ ہوگئی واقعی اپنے وقت کی رابعہ تھی اور رابعہ نہ تھی تو خاصہ تو ضرور تھی بات یہ ہے کہ اہل اللہ کی ہمت بہت بلند ہوتی ہے ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ حالت تھی کہ اسی برس کی عمر ہوگئی تھی اور یوں تو ابتدا ہی سے حضرت نحیف الجثہ تھے مگر بڑھاپے میں اور بھی ضعف زیادہ ہوگیا تھا لیکن نماز کو جب کھڑے ہوتے تھے تو ذرا ضعف نہ معلوم ہوتا تھا بڑی لمبی لمبی رکعتیں پڑھتے تھے گویا بزبان حال یوں فرماتے تھے۔

ہر چند پیر خستہ وبس ناتواں شدم　　　ہر گہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

(ہر چند بہت بوڑھا اور ناتواں ہوگیا ہوں مگر جس وقت تیرے چہرہ پر نظر ڈالتا ہوں جوان ہوجاتا ہوں)

یہی حالت اس بڑھیا کی تھی کہ باوجود بڑھاپے کی ہمت ایسی تھی کہ جوانوں کو بھی مات کردیا اور عشاق کی ہمت بلند ہونے کا راز یہ ہے کہ ان کو اپنی سی کوشش کرلینا مقصود ہوتا ہے

کامیابی ہو یا نہ ہو ان کا مذاق یہ ہے۔

دست از طلب نہ دارم تا کام من برآید   یا تن رسد بجاناں یا جان زتن برآید

(جب تک میرا مقصد پورا نہ ہوگا طلب سے باز نہ آؤں گا یا تو جسم محبوب حقیقی کی طرف پہنچے یا جان جسم سے نکل جائے)

اس لئے وہ ہر مشکل سے مشکل کام کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اور وہ ان کی نظر میں مشکل نہیں ہوتا کیونکہ وہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ہمارا کام تو طلب ہے اور اپنی ہمت کے موافق عمل شروع کر دینا آگے پورا ہونا نہ ہونا یہ ہمارے قبضہ میں نہیں یہ دوسرے کے قبضہ میں ہے اس سے ہم کو کیا سروکار۔

ملنے کا اور نہ ملنے کا مختار آپ ہے   پر تجھ کو چاہیئے کہ تک و دو لگی رہے

جب بڑھیا قافلہ کے ساتھ ہو گئی تو لوگوں نے اس کو بہت سمجھایا کہ بیت اللہ بہت دور ہے ایک دو منزل نہیں کہ تم پیدل وہاں پہنچ جاؤ مگر اس کا یہ حال تھا کہ جوں جوں نصیحت کرتے اس کا شوق دونا ہوتا تھا۔

ناصحا مت کر نصیحت دل مرا گھبرائے ہے   میں اسے سمجھوں ہوں دشمن جو مجھے سمجھائے ہے

لوگوں نے کہا کہ ہمارے بھروسہ پر نہ چلنا ہم بہلی میں سوار نہ کریں گے ہمارے پاس گنجائش نہیں اس نے ڈانٹ کر جواب دیا کہ میں تمہارے بہلیوں کے بھروسہ پر نہیں چلتی ہوں اپنے خدا کے بھروسہ پر چلتی ہوں چنانچہ ایک بڑی مسافت پیادہ طے کی سب کو حیرت ہو گئی پھر لوگوں نے ترس کھا کر بڑھیا سے کہا کہ اچھا بہلی میں سوار ہو جاؤ اس نے کہا ہرگز نہیں میں سوار نہ ہوں گی اور میں تو تمہارے ساتھ بھی نہ ہوتی الگ لپٹتی جاتی مگر عورت ذات ہوں میرا الگ تنہا سفر کرنا مناسب نہیں دوسرے مجھے راستہ بھی معلوم نہیں بس تمہاری رفاقت صرف اس لئے گوارا کی ہے اور کچھ مقصود نہیں مگر لوگوں نے خوشامد شروع کی منتیں کیں تب سوار ہو گئیں جب کراچی پہنچے تو جہاز کے مالک نے کہا کہ میں الگ الگ ہر شخص سے کرایہ نہیں کر لیتا بلکہ پورے جہاز کا کرایہ کرتا ہوں کیونکہ حجاج کم ہیں اگر پورے جہاز کا کرایہ ادا کر دو تو میں چل سکتا ہوں ورنہ نہیں اب تمہیں اختیار ہے جس کو چاہو خود سوار کر لو مجھے ہر شخص سے الگ الگ کچھ واسطہ نہیں لوگ سمجھ

گئے کہ یہ بڑی بی کی پہلی کرامت ہے پھر خیال ہوا کہ جہاز میں تو اس کے لئے یہ سامان ہو گیا آگے جدہ سے کیا انتظام ہوگا جب جہاز میں سوار ہوئے تو بچوں میں بیماری پھیل گئی اور بڑی بی نے بچوں پر دم کرنا شروع کیا جس پر دم کر دیا فوراً اچھا ہو گیا اب تو اس کی طرف بہت رجوعات ہوئیں اور خوب نذرانے ملے کہ بہت روپے اس کے پاس جمع ہو گئے اور آرام سے جدہ پھر مکہ معظمہ پہنچیں حج سے فراغت ہوئی تو حجاج نے مدینہ کا قصد کیا بڑی بی بھی قافلہ کی ہمراہ پیدل چل پڑی ایک منزل تو پیادہ طے کی اگلے دن کوچ سے پہلے ایک رئیس عورت کی بہن کا انتقال ہو گیا جس کی جگہ اونٹ پر سوار ہونے کے لئے ایک عورت کی اس کو تلاش ہوئی کیونکہ اونٹ شندف میں دو آدمی سے کم سوار نہیں ہو سکتے میزان برابر کرنے کے لئے دو آدمی ضروری تھے بیگم صاحبہ کے نوکر عورت کی تلاش میں تھے کہ بڑی بی کے سوا کوئی عورت نہ ملی وہ ان کے پاس آئے کہ بیگم صاحبہ آپ کو یاد کرتی ہیں۔ بڑی بی نے بے رخی سے جواب دیا کہ جاؤ میں نہیں آتی کون بیگم میں نہیں جانتی مگر زیادہ اصرار سے ان کے پاس آئیں بیگم نے کہا کہ میں آپ کو بمنزلہ ماں کے سمجھوں گی آپ میری سرپرستی قبول فرمائیں اور میرے ساتھ اونٹ پر سوار ہو جائیں میں ہر طرح آپ کے تمام مصارف کا تحمل کروں گی اور علاوہ مصارف کے اپنی اس مرنے والی بہن کا تمام ترکہ بھی آپ کو دوں گی کیونکہ اس کی وارث صرف میں ہی ہوں اور کوئی نہیں غرض بڑی خوشامدوں کے بعد بڑی بی راضی ہوئیں اور راحت و آرام کے ساتھ شندف میں سوار ہو کر مدینہ پہنچیں پھر اسی بیگم کے ساتھ جدہ واپس آئیں اور اسی کے خرچے سے جہاز میں سوار ہو کر کراچی پہنچیں اور اس کی بہن کا ترکہ لے کر جس میں نقد و زیور و کپڑا بہت کچھ تھا اپنے وطن واپس گئیں حافظ محمد یوسف صاحب جو اس قصہ کے ناقل ہیں فرماتے تھے کہ ہمارا جہاز بعد میں کراچی پہنچا بڑی بی ہم سے بھی پہلے پہنچ گئیں جب کراچی پر اتر کر ہم بہلیوں کے راستہ سے چلے تو بڑی بی کے گاؤں میں پہنچ کر ہم نے دریافت کیا کہ یہاں کی ایک بڑھیا حج کو اس اس طرح ہمارے ہمراہ ہو گئی تھی وہ آ گئی یا نہیں تو اس کے بیٹے ملے اور کہا وہ تو بالکل خیرت سے ہیں اور بہت دن پہلے اپنے گھر پہنچ گئی ہیں اور بہت سامان ساتھ لائی ہیں انہوں نے پوچھا کہ بکریوں کا ان کے پیچھے کیا حال ہوا کہا ہم نے شام تک ان کا انتظار کیا جب دیر ہو گئی تو جنگل میں جا کر دیکھا سب بکریاں صحیح سالم ہیں مگر بڑی بی نہیں ہیں ان کو ہر طرف بہت تلاش کیا جب

ناامیدی ہوگئی تو بکریاں لے کر گھر کو آ گئے اور یہ سمجھ لیا کہ ان کو بھیڑیا یا شیر کھا گیا ہے مدت کے بعد صحیح سالم آ گئیں اور بکریوں میں خوب توالد تناسل ہوا تو دیکھئے یہ ایک عورت تھی جس نے کسی بات کی فکر نہ کی جب حج کا ارادہ کر لیا سب کام بیچ ہی میں چھوڑ دیا تو جو مرد عورت سے بھی کم ہو وہ کیا مرد ہے پس سب مشاغل بیچ میں چھوڑ دو اور کام کا ارادہ کر لو ورنہ کیا اطمینان ہے کہ آئندہ سال تم کو موقعہ ملے یا نہ ملے حدیث میں ہے من[1] ارادالحج فلیعجل جو حج کا قصد کر لے اس کو جلدی کرنا چاہیے اور ہمارے ائمہ تصریح کرتے ہیں کہ حج میں تاخیر کرنے سے ایک دو سال تک تو گناہ صغیرہ کا گناہ ہوتا ہے اور اس کے بعد اصرار میں داخل ہو کر گناہ کبیرہ ہو جاتا ہے مگر جب حج کر لے گا تو یہ تاخیر کا گناہ بھی معاف ہو جائے گا کیونکہ اس کو گناہ اس لئے تھا کہ فوت کا خطرہ تھا اور یہ خطرہ میں حج کو ڈال رہا تھا اور جب خطرہ فوت مرتفع ہو گیا اب گناہ بھی مرتفع ہو گیا یہ سب درمختار وردالمحتار میں مذکور ہے۔

حضرات ائمہ کی تقلید کے وجوب کا سبب

یہ ہے حضرات ائمہ کا اجتہاد جس میں کیسے دقائق کی رعایت ہے جو لوگ آج کل اپنے آپ کو مجتہد سمجھتے ہیں وہ ایسے اجتہاد کی نظیر لائیں اور جب وہ ایسا اجتہاد اپنے اندر نہیں پاتے تو ان کے عمل بالحدیث کا حاصل یہ ہوا کہ وہ کامل مجتہد کی تقلید چھوڑ کر ناقص مجتہد کی تقلید کرتے ہیں یعنی اپنے فہم کا اتباع کرتے ہیں جس کو ائمہ کی فہم سے کچھ بھی نسبت نہیں کانپور میں ایک طالب علم نے امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھی تو میں نے اس سے سوال کیا کہ تم نے امام کے پیچھے قرأت کیوں کی کہا مولوی عبدالحیٔ صاحب نے لکھا ہے میں نے کہا سبحان اللہ! کیا مولوی عبدالحیٔ صاحبؒ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ سے بھی بڑھے ہوئے ہیں کہ امام کی تقلید چھوڑ کر ان کی تقلید کرنے لگے یہی حال ان مدعیان عمل بالحدیث کا ہے کہ ائمہ اربعہ کو چھوڑ کر علامہ شوکانی وغیرہ کی تقلید کرتے ہیں ایک سفر میں ایک غیر مقلد میرے ساتھ ہوئے مگر تھے مصنف ان کو شک تھا کہ ائمہ کی تقلید واجب کیوں ہے جب کہ ہم بھی عربی پڑھ کر قرآن و

---

[1] سنن أبي داود: ۱۷۳۳، مسند الإمام أحمد بن حنبل ۱: ۲۱۴، ۲۲۵، ۳۲۳، ۳۵۵، السنن الکبریٰ للبیهقي ۴: ۳۴۰، المستدرک للحاکم ۱: ۴۴۸، ۴۴۹، مشکوۃ المصابیح: ۲۵۲۳

حدیث کو سمجھ سکتے ہیں میں نے کہا کہ آپ کے لئے اجتہاد فی القرآن والحدیث جائز نہیں کیونکہ آپ کو اجتہاد کا درجہ حاصل نہیں اور میں اجتہاد کی حقیقت آپ کے سامنے ایک مثال میں بیان کرتا ہوں بتلایئے اگر دو شخص سفر میں ہوں جو علم میں فقہ میں عمر میں نسب وتقویٰ میں برابر ہوں اور ان میں سے ایک کو غسل کی حاجت ہوگئی اور دوسرے کا وضو ٹوٹ گیا اور جنگل میں پانی نہیں ہے دونوں نے تیمّم کیا ایک نے غسل کا تیمّم کیا دوسرے نے وضو کا تو ان میں امامت کے لئے افضل کون ہے کہا تیمّم وضو والا افضل ہے کیونکہ اس کا حدث اصغر ہے تو اس کی نجاست حکمیہ اخف ہے اور دوسرے کی اشد اور طہارت دونوں کو یکساں حاصل ہوئی اس لئے تیمّم وضو والا اطہر ہے میں نے کہا کہ فقہاء نے تیمّم غسل والے کو امامت کے لئے افضل فرمایا ہے کیونکہ غسل وضو سے افضل ہے اور افضل کا خلیفہ غیر افضل کے خلیفہ سے افضل ہے اب دونوں اجتہادوں میں موازنہ کرلو اس جواب کو سن کر وہ مان گئے کہ واقعی ہم لوگ اجتہاد نہیں کر سکتے یہ فقہاء ہی کا کام تھا انہی کی تقلید واجب ہے صاحبو! اجتہاد کے واسطے اس کی ضرورت نہیں کہ وہ دوسروں سے زیادہ احادیث کا حافظ ہو بلکہ اجتہاد کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص حسین ہو مگر ظاہر میں اس کا حسن دوسروں کے حسن سے زیادہ نہ ہو لیکن اس میں ایک آن ہے جو دوسروں میں نہیں ہے اس لئے وہ سب حسینوں سے بڑھا ہوا ہے اور اس کے سامنے سب حسین گرد ہو گئے ہیں اسی کو عارف فرماتے ہیں ۔

شاہد آں نیست کہ موئے ومیانے دارد   بندہ طلعت آن باش کہ آنے دارد

(معشوق وہ نہیں جو اچھے بال اور پتلی کمر رکھتا ہو حسین وہ ہے کہ اس میں کچھ آن ہو)

حضرات فقہاء واقعی اُمت کے لئے رحمت ہیں انہوں نے جیسا دین کو سمجھا ہے کسی فرقہ نے نہیں سمجھا اسی طرح حضرات صوفیہ کرام اپنے فن کے امام ہیں احکام متعلقہ قلب کو صوفیہ سے زیادہ کوئی نہیں سمجھا بہر حال جو شخص حج میں تاخیر کرتا ہے وہ گناہ صغیرہ کا ابتداء اور کبیرہ کا اصرار کے بعد مرتکب ہوتا ہے اور اگر اسی حالت میں مر گیا تو اس کے واسطے حدیث میں بڑی سخت وعید ہے کہ جس شخص پر حج فرض ہوگیا ہو پھر وہ حج نہ کرے اور اسی حال میں مر جائے تو کچھ بعید نہیں کہ وہ نصرانی مرے یا یہودی بن کر مرے جو لوگ حج کر چکے ہیں وہ تو بے فکر رہیں

ہاں جن پر حج فرض ہوا اور ابھی تک نہ کیا وہ جلدی کریں اور زندگی پر اطمینان نہ کریں کیونکہ بعض لوگ گذشتہ سال رمضان میں زندہ تھے اور اس سال نہ تھے میرے گھر میں کی ایک لڑکی شاگرد ہے وہ رمضان کے ختم پر کہنے لگی کہ دیکھئے اگلا رمضان کس کو نصیب ہو کس کو نہ ہو میرے گھر میں سے کہنے لگیں کہ تو تو ابھی بچی ہے ان شاء اللہ اگلا رمضان پالے گی ہاں ہم جیسوں کو البتہ خطرہ ہے اس نے جواب دیا کہ میں تو یہ دیکھتی ہوں کہ اس سال میری بہن ساتھنوں میں سے کئی مرچکی ہیں جو گذشتہ سال رمضان میں زندہ تھیں اور اس سال نہ تھیں اور آپ کی بہن ساتھنیں سب زندہ سلامت ہیں ایک بھی کم نہیں ہوئی اس لئے آج کل جوانوں کو زیادہ خطرہ ہے طاعون، ہیضہ اور بخار دق میں جوان ہی زیادہ مرتے ہیں۔

ادائیگی قرض کی اشد ضرورت

اب میں اس حدیث کے متعلق چند باتیں بیان کر کے ختم کرتا ہوں کیونکہ مقصود تو پورا ہو چکا اب صرف تتمہ باقی ہے اس حدیث کے متعلق ایک مسئلہ تو بیان کرنا ہے کہ **یھدم ما کان قبله** میں لفظ ما بظاہر عام ہے مگر یہ اپنے عموم پر باقی نہیں اس لئے حقوق العباد مستثنیٰ ہیں کیونکہ حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ اگر میں شہید ہو جاؤں تو میرے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے حضور نے فرمایا ہاں سب معاف ہو جائیں گے اس کے بعد حضرت جبریل علیہ السلام نے فرمایا یا رسول اللہ **الا الدین** مگر دین یعنی حق العباد معاف نہ ہوگا حضور نے سائل کو واپس بلایا اور فرمایا **الا الدین فان جبریل قاله لی آنفا** مگر دین معاف نہ ہوگا حضرت جبریل نے مجھ سے ابھی فرمایا ہے:

قلت و اخرج الحاکم فی مستدرکه عن عبدالله ابن عمرو بن العاص رضی الله تعالیٰ عنهما مرفوعاً[1] قال یغفر للشهید کل ذنب الا الدین و صححه هو والذهبی ص ۱۱۹ ج ۱)

پس جب شہادت سے بھی دین معاف نہیں ہوتا حالانکہ شہادت کا درجہ بہت بڑا ہے تو حج سے بھی دین معاف نہ ہوگا۔

---

[1] الصحیح لمسلم کتاب الإمارة: ۱۱۹، مسند الإمام أحمد بن حنبل ۲: ۲۲۰، المستدرک للحاکم ۲: ۱۱۹، الترغیب والترھیب للمنذری ۲: ۳۱۱، کنز العمال: ۱۱۱۱۰، مشکوٰة المصابیح: ۲۹۱۲

مسئلہ کے بیان میں کوتاہی کا تدارک

اور اس حدیث سے ایک مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ اگر مسئلہ بیان کرنے میں کچھ کوتاہی ہو جاوے تو اس کی تلافی اور تدارک بعد میں کر دینا چاہئے اور اگر کوئی ہم کو کوتاہی پر متنبہ کرے تو فوراً اپنی کوتاہی کا اقرار کر لینا چاہئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ جب آپ سے کوئی سوال کرتا اور آپ کو جواب معلوم نہ ہوتا صاف فرما دیتے کہ جبریل علیہ السلام سے پوچھ کر بتلاؤں گا اسی طرح حضرات صحابہؓ سے جب کوئی کافر سوال کرتا اور ان کو جواب معلوم نہ ہوتا صاف فرما دیتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ کر بتلائیں گے مگر آج کل یہ مرض عام ہے کہ کسی سوال کے جواب میں لا ادری نہ کہیں گے اور کبھی اپنی غلطی یا کوتاہی کا اقرار نہ کریں گے اسی واسطے آج کل مناظرہ جائز نہیں کیونکہ مناظرہ وہ جائز ہے جو اظہار حق کے واسطے ہو اور جب فریقین نے یہ ٹھان لی ہے کہ ہر مسئلہ میں بولے جاویں گے خواہ اس کی تحقیق ہو یا نہ ہو اور اپنی غلطی وعجز کا کبھی اعتراف نہ کریں گے تو اس صورت میں اظہار حق کہاں اذا فات الشرط فات المشروط۔ (جب شرط ختم تو مشروط بھی ختم شد)

برصغیر کے مدرسین کی ایک کوتاہی

ہندوستان کے اکثر مدرسین میں بھی یہ برا مرض ہے کہ اپنی غلطی کا کبھی اعتراف نہ کریں گے اگر کسی مقام کی غلط تقریر زبان سے نکل گئی اور طالب علم نے کہہ دیا کہ اس مقام کی یہ تقریر نہیں بلکہ صحیح تقریر یہ ہے تو کبھی طالب علم کی بات کو نہ مانیں گے برابر رد کئے جائیں گے یہاں تک کہ ایسی جھک جھک میں سبق کا وقت ختم ہو جاتا ہے ان کو اس حدیث سے سبق لینا چاہیے کیا ان کا علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم سے بھی بڑھ گیا حضورؐ تو ایک جواب دے کر حضرت جبریلؑ کے مطلع کرنے سے علی الاعلان اپنے جواب کا ناتمام ہونا ظاہر فرمائیں اور تم کبھی اپنی کوتاہی کو ظاہر نہیں کرتے ہمارے استاد مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ کی یہ حالت تھی کہ اگر درس میں کسی ادنیٰ طالب علم نے بھی حضرت کی تقریر پر اعتراض کر دیا اور اس کا اعتراض معقول ہوا تو فوراً اپنی غلطی کا اعتراف فرما لیتے اور کئی کئی بار

یہ فرماتے رہتے کہ ہاں واقعی مجھ سے غلطی ہوئی تم نے صحیح سمجھا یہاں تک کہ طالب علم شرمندہ ہو جاتا اور اس سے ایسی عظمت مولانا کی طلبہ کے دل میں پیدا ہوتی تھی کہ تاویل کرنے والے مدرسین کو اس کا دسواں حصہ بھی نصیب نہیں ہوسکتی البتہ مدرسین عرب کا مذاق وہی ہے جو حضرت استاد کا مذاق تھا وہ کبھی اعتراف خطا سے نہیں شرماتے۔

کبائر بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتے

بہر حال الحج یھدم ما کان قبلہ[1] سے ایک تو دیون (یعنی حقوق العباد و حقوق اللہ از قسم صلوٰۃ فائتہ و صوم فوت شدہ و زکوٰۃ واجبہ سبقا ونحوھا) مستثنٰی ہیں دوسرے کبائر مستثنٰی ہیں حج سے کبائر معاف نہیں ہوتے صرف صغائر معاف ہوتے ہیں کیونکہ قرآن میں اَلْحَسَنَاتُ یُذْهِبْنَ السَّیِّئَاتِ کہ نیک کام برے کاموں کو مٹا دیتے ہیں اور قرآن ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے سیئات سے مراد صغائر ہیں چنانچہ ارشاد ہے اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ یہاں سیئات کو کبائر کے مقابلہ میں لانا اس کی دلیل ہے کہ مراد صغائر ہیں پس معلوم ہوا کہ اعمال حسنہ سے صرف صغائر معاف ہوتے ہیں کبائر معاف نہیں ہوتے جب تک کوئی دلیل نہ ہو اور ہجرت سے بھی صغائر ہی معاف ہوتے ہیں کبائر معاف نہیں ہوتے۔

ذنوب اور حقوق میں فرق

البتہ اسلام سے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں صغائر بھی کبائر بھی مگر حقوق معاف نہیں ہوتے کیونکہ ذنوب اور ہیں حقوق اور ہیں اسلام و اعمال صالحہ سے ذنوب معاف ہو جاتے ہیں (علی التفصیل التی مر ذکرہا ۱۲) حقوق معاف نہیں ہوتے۔

تیس سالہ تحقیق

آج مجھے شامی کی ایک تقریر دیکھ کر اپنی تیس سالہ تحقیق کی تائید ملی وہ یہ کہ میں کہا کرتا تھا کہ اعمال صالحہ سے یا توبہ سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں حقوق معاف نہیں ہوتے مثلاً کسی

---

[1] الترغیب والترھیب للمنذری ۲:۱۶۳، الطبقات الکبری لابن سعد ۴:۲:۶

نے آج گناہوں سے توبہ کی تو اس کے گناہ تو معاف ہوگئے مگر اس نے جتنی نمازیں قضا کی ہیں روزے کھائے ہیں یا کسی کا قرض لے کر مار لیا ہے یہ حقوق اللہ وحقوق العباد اس کے ذمہ سے ساقط نہیں ہوئے ان کا ادا کرنا اس کے ذمہ واجب ہے بس آج سے ان کی ادا میں لگ جائے جس قدر اس سے ہو سکے ادا کرے اور سب کے ادا کا عزم رکھے اگر کچھ باقی رہ گئے اور مر گیا تو اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ اس کو بری الذمہ کردیں گے مگر توبہ کے بعد حقوق ماضیہ سے بے فکر ہونا جائز نہیں تو علامہ شامیؒ کے کلام میں اس کی تصریح مل گئی کہ ذنوب اور چیز ہیں حقوق اور ہیں اور توبہ سے ذنوب معاف ہوتے ہیں نہ حقوق اھ اور حج سے یا ہجرت سے صرف صغائر معاف ہوتے ہیں نہ کبائر اور صغائر کا معاف ہوجانا کیا تھوڑی بات ہے آپ کو معلوم نہیں کہ صغائر کیسے ہوتے ہیں۔

صغائر کی مثال

صغائر کی ایسی مثال ہے جیسے آگ کے شرارے پھیلے ہوئے ہوں اور کبائر کی ایسی مثال ہے جیسے بڑا شعلہ ہو تو اندیشہ ناک دونوں ہیں کیونکہ بعض دفعہ ذرا سی چنگاری سے شہر کا شہر جل جاتا ہے کوئی شخص بھی اپنے چھپر میں چھوٹی چنگاری لگانے پر راضی نہ ہوگا اور یہ نہ کہے گا کہ یہ تو ذرا سی چنگاری ہے اس لئے صغائر کی معافی کو تھوڑا نہ سمجھو یہ بھی بڑی دولت ہے اب میں ایک سوال کا جواب دے کر بیان کو ختم کرتا ہوں وہ یہ کہ حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے وقت عرفہ کی شام کو اُمت کے لئے دعا فرمائی کہ اے اللہ! میری اُمت کی مغفرت فرما دیجئے پھر فرمایا کہ دعا قبول ہوگئی مگر مظالم (یعنی حقوق العباد) کے بارہ میں قبول نہیں ہوئی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ظالم سے مظلوم کا حق ضرور لوں گا میں نے عرض کیا اے پروردگار آپ مظلوم کو اس کے حق کے عوض جنت کی نعمتیں دے کر بھی خوش کر سکتے اور ظالم کی مغفرت فرما سکتے ہیں مگر یہ قبول نہ ہوا پھر یوم مزدلفہ کی صبح کو آپ نے تبسم فرمایا صحابہؓ نے تبسم کا سبب دریافت کیا فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آج مظالم کے بارہ میں بھی میری دعا قبول فرمائی اور میری اُمت کو بخش دیا تو شیطان سر پر خاک ڈالتا ہوا ہائے واویلا کرتا ہوا بھاگا اس کی حالت دیکھ کر مجھے ہنسی آ گئی یہاں سے شیطان کا کشف بھی معلوم ہوا

کہ اس کا کشف ایسا قوی ہے کہ اس کو فوراً اس وحی کا علم ہو گیا خیر یہ تو مسئلہ استطراداً تھا اصل مقصود سوال کا جواب دینا ہے وہ سوال یہ ہے کہ اس حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حج سے صغائر کبائر اور حقوق وغیرہ سب معاف ہو جاتے ہیں اور یہ تمہاری تقریر سابق کے خلاف ہے اور اس کا جواب بعض علماء نے تو یہ دیا ہے کہ یہ حدیث ابن ماجہ کی ہے جس کی سند میں دو راوی ضعیف ہیں اس لئے یہ حدیث حجیت کے قابل نہیں مگر **الحمدللہ کم ترک الاول للآخر** مجھے ایسا جواب معلوم ہوا ہے جس کے بعد اس حدیث کے رد کرنے کی ضرورت نہیں مجھے حیرت ہے کہ اس حدیث سے یہ کہاں معلوم ہوا کہ حج سے حقوق العباد وغیرہ معاف ہو جاتے ہیں اس حدیث میں تو حج کا بیان ہی نہیں بلکہ صرف اتنی بات ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کے لئے دعا فرمائی تھی خواہ حاجی ہوں یا نہ ہوں۔

ہمارا عقیدہ

اب حدیث کا مطلب سنیئے بات یہ ہے کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب باتیں اور تمام علوم ایک دفعہ ہی معلوم نہیں ہوئے بلکہ آہستہ آہستہ معلوم ہوئے ہیں اور جب تک آپ کو کسی امر کی پوری حقیقت معلوم نہ ہوتی آپ کو بے چینی اور حیرت رہتی اسی کے متعلق حق تعالیٰ کا ارشاد ہے **وَوَجَدَکَ ضَالاًّ فَهَدیٰ۔ وجدک حائرا طالبا للزیادة فی العلم فعلمک مالم تکن تعلم** کہ خدا نے آپ کو طلب حقائق میں حیران و بے چین پایا تو آپ کو پوری طرح حقائق پر مطلع فرمایا اور یہ حیرت اب بھی اہل الہام کو حاصل ہے چنانچہ مولانا فرماتے ہیں۔

در تردد ہر کہ او آشفتہ است | حق بگوش او معما گفتہ است

کہ جو عارف کسی تردد میں پریشان ہے سمجھ لو کہ حق تعالیٰ نے اس کے کان میں کوئی معما کہہ دیا ہے جس کے حل کے لئے وہ بے چین ہے ایک جگہ فرماتے ہیں۔

گہ چنیں بنماید وگہ ضد ایں | جز کہ حیرانی نہ باشد کارا دیں

آگے حیرت محمودہ و حیرت مذمومہ کا فرق بتلاتے ہیں کہ تم ان کی حیرت کو غیر عارف کی حیرت پر قیاس نہ کرنا۔

9 نے چنیں حیراں کہ پشتش سوے دوست	بل چنیں حیراں کہ رویش روے دوست

کہ غیر عارف تو اس لئے پریشان وحیران ہے کہ اس کی پشت محبوب کی طرف ہے اور عارف کی حیرت اس لئے ہے کہ اس کا منہ محبوب کی طرف ہے جس کو مبالغۃً روئے دوست فرمادیا پس یہ تو مشاہدہ جمال کے بعد اس حسن کی وجہ سے حیران ہے اور وہ فقدان مشاہدہ کی وجہ سے حیران ہے دونوں کی حیرت میں زمین وآسمان کا فرق ہے جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب سمجھو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تو معلوم ہو چکا تھا کہ کافر اسلام لے آئے تو اسلام سے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ اسلام کے بعد اس سے گناہ ہوں تو وہ بھی توبہ کرنے سے سب معاف ہو جائیں گے یا بدوں توبہ کے بھی معاف ہو سکتے ہیں اور اسی وقت کی یہ آیت ہے وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاءُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا الآية (اور جس شخص نے کسی مؤمن کو جان بوجھ کر قتل کیا تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا) اس لئے بعض صحابہؓ اس کے قائل ہو گئے کہ قاتل عمد کے واسطے توبہ نہیں یعنی اس کو اس جرم کی سزا ضرور بھگتنا ہوگی اور یہ حیرت اب بھی معتزلہ و خوارج کو باقی ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ اسلام کے بعد گناہ کبیرہ معاف نہیں ہوتا بلکہ گناہ کبیرہ سے وہ ایمان کو زائل شدہ سمجھتے ہیں خواہ دخول فی الکفر ہو یا نہ ہو غرض ابتداء میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم نہ تھا کہ ذرہ برابر ایمان بھی سب گناہوں کی مغفرت کے لئے کافی ہو سکتا ہے اس لئے آپ نے دعا فرمائی کہ اے اللہ میری اُمت کی مغفرت فرما دیجئے مطلب یہ تھا کہ اگر وہ توبہ کرلیں تو بدوں سزا کے ان کو بخش دیا جائے اور توبہ نہ کریں تو گناہ کی سزا کے بعد بخش دیا جائے یعنی کسی وقت ان کو جنت میں ضرور بھیج دیا جائے چنانچہ عرفہ کی شام کو یہ دعا قبول ہوئی مگر مظالم وحقوق العباد کے متعلق قبول نہ ہوئی جس کا مطلب یہ تھا کہ توبہ کے بعد بھی حقوق العباد معاف نہیں ہوں گے مزدلفہ کی صبح کو ان کے متعلق بھی دعا قبول ہوگئی کہ جو شخص توبہ کر کے مر جائے اور اس کو توبہ کے بعد ادائے حقوق کا موقعہ نہ ملے تو توبہ سے اس کے لئے حقوق العباد بھی معاف ہو جائیں گے یعنی اللہ تعالیٰ مظلوم کو خوش کر کے ظالم کی مغفرت فرمادیں گے اور جس کو توبہ کے بعد ادا حقوق کا موقعہ

اصلاح ظاہر-9

ملے اس سے گناہ تو معاف ہوگئے مگر حقوق ساقط نہیں ہوئے اگر اس نے اداء حقوق میں کوتاہی کی تو یہ توبہ کے بعد دوسرا گناہ ہوا اگر مرنے سے پہلے اس سے بھی توبہ کر لی تو یہ گناہ بھی معاف ہو جائے گا اور حق تعالیٰ مظلوم کو خوش کر دیں گے اور اگر توبہ نہ کی تو اس گناہ کی سزا بھگت کر مغفرت ہو جائے گی یہ تو توبہ کے بعد حکم ہے اور توبہ نہ کرنے کی حالت میں یہ حکم ہے کہ حق تعالیٰ کو اختیار ہے خواہ اس کو سزا دے کر بخشیں یا بدوں سزا ہی کے بخش دیں اور مظلوم کو جنت کی نعمتوں سے خوش کر دیں بہر حال مغفرت سب کی ہو جائے گی اور کسی وقت سب مسلمان جنت میں پہنچ جائیں گے یہ حاصل ہے اس حدیث کا جس کو حج سے کچھ تعلق نہیں بلکہ اس میں اُمت محمدیہ کی مغفرت کا قاعدہ مذکور ہے۔

حجر اسود کسوٹی ہے

غرض حج کی فضیلت تو معلوم ہوگئی کہ اس سے گناہ سابق معاف ہو جاتے ہیں خواہ سب یا بعض مگر حج کے بعد کے گناہ تو معاف نہیں ہوتے اس لئے حاجی کو آئندہ کی احتیاط بہت ضروری ہے بلکہ پہلے سے بھی زیادہ احتیاط اس لئے ضروری ہے کہ حاجی کی حالت ایک خاص وجہ سے زیادہ خطرناک ہے وہ وجہ یہ ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ حجر اسود کسوٹی ہے اس کے چھونے سے انسان کی اصلی حالت ظاہر ہو جاتی ہے اگر واقعی فطرۃ صالحہ ہے تو حج کے بعد اعمال صالحہ کا اس پر غلبہ ہوگا اور اگر فطرۃ طالع ہے محض تصنع سے نیک بنا ہوا ہے تو حج کے بعد اس پر اعمال سیئہ کا غلبہ ہوگا یہ وجہ ہے خطرہ کی اور اس خطرہ کا علاج یہ ہے کہ حاجی زمانہ حج میں اللہ تعالیٰ سے اپنے اصلاح حال کی خوب دعا کرے اور دل سے اعمال صالحہ کے شوق کی دعا کرے اور حج کے بعد اعمال صالحہ کا خوب اہتمام کرے اور خیر آئندہ کا کام تو حج سے آ کر ہوگا اس وقت تو اس کام کا اہتمام کرنا چاہئے جو اس وقت کے متعلق ہے اور آئندہ کی اصلاح کی وہ بناء بھی ہے پس جس پر حج فرض ہو وہ فوراً جلدی ٹال مٹول نہ کرے اس وقت الحمدللہ قصبہ سے ایک غریب شخص حج کو جا رہا ہے یعنی حافظ عبداللہ صاحب نعلبند کا بیٹا اللہ تعالیٰ مالداروں کو بھی توفیق عطا فرمائیں یہ بے چارہ میرے پاس آیا تو میں نے اس کو ایک خط دے دیا جو میرے ایک

دوست کے نام تھا تا کہ وہ اس کو سفر حج کا تمام حال بتلادیں اور رفیق سفر بھی میں نے اس کو بتلا دیا ہے یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ سفر حج کے متعلق ہر شخص سے باتیں نہ پوچھا کرو کیونکہ آج کل اخباروں میں واہی تباہی روایتیں راستہ کے خطرناک ہونے یا نہ ہونے کے متعلق شائع ہوتی رہتی ہیں ان خبروں پر اعتماد نہ کرنا چاہئے بلکہ کسی ایک شخص پر اعتماد کر کے جو قابل اعتماد ہو اس کے مشورہ پر عمل کرنا چاہئے اور جن لوگوں پر حج فرض نہیں وہ توکل کے دعوے پر ارادہ نہ کریں بلکہ وہ ہندوستان ہی میں رہ کر خدا کو راضی کریں اور اپنے کو کسی محقق کے سپرد کریں جس وقت وہ حج کی اجازت دے اس وقت حج کا ارادہ کریں ایسے ہی لوگوں کے متعلق حضرت مسعود بکؒ کا قول ہے۔

اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید معشوق در نیجاست بیائید بیائید

(اے قوم جو حج کو گئی ہوئی ہے کہاں ہو، معشوق (محبوب حقیقی) تو یہاں ہے یہاں آؤ)

اس مضمون کے مخاطب تو ناقص ہیں اور کاملین کے بارہ میں مولانا فرماتے ہیں۔

حج زیارت کردن خانہ بود حج رب البیت مردانہ بود

(حج بیت اللہ کی زیارت کرنے کا نام ہے، اس میں خانہ کعبہ کے مالک کی ہیبت مردانہ ہے)

حج مردانہ

پس جس پر حج فرض ہو اس کو اس کی کوشش کرنا چاہئے کہ حج مردانہ نصیب ہو جس کا طریقہ یہ ہے کہ کسی محقق سے تعلق پیدا کر کے حج کو جائیں ان شاء اللہ اگر درجہ اعلیٰ میں کامل حج نہ ہوگا تو ایک درجہ میں کامل ضرور ہو جائے گا تیسرے وہ لوگ ہیں جن پر حج فرض نہیں مگر خدا تعالیٰ نے ان کو وسعت قلب وقوت توکل عطا فرمائی ہے ان کو بدوں زاد و راہ کے بھی حج کی اجازت ہے چنانچہ ایک صاحب حال عازم نے شاہ فضل الرحمٰن صاحب سے سفر حج کی اجازت مانگی تو شاہ صاحب نے فرمایا تم کو شرائط حج بھی معلوم ہیں کہا ہاں حضور معلوم ہیں فرمایا بتلاؤ کیا معلوم ہے کہا۔

دررہ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بجان شرط اول قدم آن ست کہ مجنوں باشی

(لیلیٰ کی راہ کی منزل جان کو خطرے لاحق ہیں اس راہ کی شرط اوّل مجنون ہونا ہے)

اس جواب سے شاہ صاحب پر وجد کی سی حالت طاری ہوئی اور ایک چیخ ماری پھر چونکہ صاحب مقام تھے اس لئے سنبھلے اور فرمایا کہ یہ سب فضول ہے زاد وراہ ساتھ ہونا چاہئے جس کا شریعت میں حکم ہے مگر وہ مولوی صاحب بدوں زادوراہ ہی کے چل پڑے اور چونکہ توکل صحیح تھا اس لئے کسی جگہ پریشان نہیں ہوئے پھران کی ایک کرامت یہ ظاہر ہوئی جس کی مجھ سے ایک حاجی نے چشم دید روایت کی کہ جب بیت اللہ میں داخل ہونے لگے تو شیبی (خادم کعبہ) سب سے فیس لے کر اندر جانے کی اجازت دیتا تھا مولوی صاحب سے بھی فیس لی اور انہوں نے دے دی مگر ان سے رقم لیتے ہی اس پر پریشانی کا اثر ظاہر ہوا اور حجاج کے نکلنے کے وقت وہ ایک ایک کا منہ تکتا تھا جب یہ باہر آنے لگے تو اس نے ان کی رقم واپس کر دی تو ایسے لوگ بدوں زادراہ کے جائیں تو مضائقہ نہیں باقی ہر اک کا یہ منہ نہیں۔

توکل یا تاکل

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جب حج کو جانے لگے تو کوئی حج میں ساتھ چلنے کو کہتا تو آپ پہلے یہ پوچھتے کہ زادراہ بھی ہے بعض لوگ کہہ دیتے کہ حضرت توکل پر چل رہے ہیں مولانا فرماتے جی ہاں جس وقت ہم ریل یا جہاز کا ٹکٹ لینے جائیں گے تم توکل کا پوٹلہ بابو کے آگے رکھ دینا کہ اس میں سے ٹکٹ کے دام نکال لو جاؤ یہ فضول خیالات ہیں۔

بات یہ ہے کہ لوگوں نے بعض بزرگوں کے واقعات اور قصے سن لئے ہیں ان کی ریس کرنے کو ان کا جی چاہتا ہے مگر انہوں نے یہ نہیں سنا۔

ناز را روئے بباید ہمچو ورد چوں نداری گرد بدخوئی مگرد

زشت باشد چشم نابینا و باز عیب باشد روئے نادیبا و ناز

(ناز کے لئے گلاب جیسے حسین چہرہ کی ضرورت ہے اگر تو ایسا حسین چہرہ نہیں رکھتا تو بدخوئی مت کر، بدصورت کا ناز کرنا برا معلوم ہوتا ہے جیسے اندھے کی آنکھ کا کھلا رہنا برا معلوم ہوتا ہے)

ایک متوکل نوجوان کی حکایت

چنانچہ غالباً روض الصالحین میں ایک حکایت لکھی ہے اس کو بیان کر کے ختم کردوں گا کہ مالک بن دینارؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حج کے راستہ میں ایک نوجوان لڑکے کو دیکھا جو بدوں زادراہ کے جارہا تھا میں نے کہا کہ تم بدوں زادراہ کے اتنا لمبا سفر کرتے ہو؟ کہا

وفدت علی الکریم بغیر زاد   من الحسنات و القلب السلیم

فان الزاد اقبح کل شیٔ   اذا کان الوفود علی الکریم

کہ ہاں میں یوں ہی خالی ہاتھ جارہا ہوں کیونکہ کریم کے گھر پر توشہ باندھ کر لے جانا نازیبا ہے اس جواب سے میں سمجھا کہ نوجوان عارف ہے معمولی آدمی نہیں اس کے بعد احرام کا وقت آیا تو سب نے احرام باندھ کر لبیک کہا مگر اس لڑکے کا چہرہ مارے خوف کے زرد ہوگیا اور اس کے منہ سے لبیک نہ نکلا میں نے کہا صاحبزادے تلبیہ کیوں نہیں کہتے کہا ڈرتا ہوں کہ میں تو لبیک کہوں اور وہاں سے جواب آئے **لالبیک ولا سعدیک وحجک مردود علیک** غرض تمام اعمال حج میں اس کی ایک نئی شان ظاہر ہوتی تھی حتیٰ کہ منیٰ میں جب حجاج پہنچے اور سب لوگ قربانی کرنے لگے تو نوجوان نے حسرت کے ساتھ آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور عرض کیا خداوند آپ کے سب بندے آپ کی جناب میں نذریں پیش کررہے ہیں مگر میرے پاس کچھ نہیں جو پیش کروں ہاں یہ جان حقیر ہے اگر قبول ہو تو جان حاضر ہے یہ کہنا تھا کہ دفعۃً ایک چیخ ماری اور جان بحق ہوگیا کما قیل

چو رسی بکوے دلبر بسپار جان مضطر   کہ مباد بار دیگر نرسی بدیں تمنا

(در محبوب جب پہنچ جاؤ تو اپنی جان کو اسی پر فدا کردو شاید تمنائے دل پورا کرنے کا موقع نہ ملے)

مالک بن دینارؒ فرماتے ہیں کہ اس نوجوان نے ہم سب کو میدان عشق میں پیچھے چھوڑ دیا اور عشاق کے دل پر خاص نشان لگا دیا اس کے بعد ہم نے اس کو غسل وکفن دے کر نماز پڑھ کر دفن کردیا پھر مجھے غنودگی طاری ہوئی تو میں نے ایک غیبی آواز سنی کہ اے مالک! اس

سال اس نوجوان کی برکت سے سب صاحبوں کا حج قبول کیا گیا اور اس کی قربانی کی برکت سے سب کی قربانیاں قبول ہوگئیں تو صاحبو! جو ایسا عاشق ہو اس کو بغیر زادوراہ کے سفر حج کی اجازت ہوسکتی ہے ہر شخص کو دعوئ توکل اور دعوئ محبت کا حق نہیں کیونکہ آج کل تو ہم لوگوں کا توکل چند روز کے بعد تاکل بن جاتا ہے کہ توکل کو بھیک کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔

اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو بھی اپنے دربار میں حاضری کی توفیق عطا فرمائیں اور جو لوگ حج کو جارہے ہیں ان کو خیر وخوبی کے ساتھ حج نصیب ہو اور مع الخیر اپنے گھر پہنچ جائیں۔ آمین۔

والحمدلله رب العلمين و صلى الله على سيّدنا و مولانا محمّد و على آله و اصحابه اجمعين.

النعم المرغوبة
فی النعم المرکوبة

نعمتوں کی اقسام کے بارے میں یہ وعظ مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں ۵ رجمادی الثانی ۱۳۴۷ ہجری کو ۳ گھنٹے تک منبر پر بیان فرمایا سامعین کی تعداد تقریباً ۳۰ تھی وعظ مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے قلمبند کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللّٰہ نحمدہ و نستعینه و نستغفرہ و نومن به ونتوکل علیه ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل له ومن یضلله فلا ھادی له ونشھد ان لا اله الا اللّٰہ وحدہ لا شریک له ونشھدان سیدنا و مولانا محمداً عبدہ و رسوله صلی اللّٰہ تعالیٰ علیه وعلیٰ اله واصحابه و بارک وسلم۔

اما بعد فاعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم وتحمل اثقالکم الی بلدلم تکونوا بالغیه الابشق الانفس ان ربکم لرؤف رحیم والخیل والبغال والحمیر لترکبوھا وزینة ویخلق مالا تعلمون. (النحل آیت نمبر ۷ ، نمبر ۸)

ترجمہ: ’’اور وہ تمہارے بوجھ بھی (لادکر) ایسے شہر کو لے جاتے ہیں وہاں تم بدوں جان کو محنت میں ڈالے ہوتے (خودبھی) نہیں پہنچ سکتے تھے واقعی تمہارارب بڑی شفقت والا اوررحمت والا ہے اور گھوڑے اور خچر اور گدھے بھی پیدا کیے تاکہ تم ان پرسوار ہواور نیز زینت کے لئے بھی اورایسی چیزیں بناتا ہے جن کی تم کوخبر نہیں‘‘

ظاہری نعمتوں کی تقسیم

یہ سورۂ نحل کی آیات ہیں جن میں حق تعالیٰ نے خاص انعامات کا ذکر فرمایا ہے۔ ہر چند کہ حق تعالیٰ کی بہت سی نعمتیں ہیں جن کا شمار بھی نہیں ہوسکتا چنانچہ خود اللہ تعالیٰ ہی نے ارشاد فرمایا ہے وان تعدوانعمة اللّٰہ لا تحصوھا (اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنے لگو تو ان کا احاطہ نہیں کرسکتے) مگر اس کثرت وتعدد کے ساتھ وہ دوقسم پر منقسم ہیں ایک قسم تو وہ نعمتیں ہیں جن سے ملابست زیادہ ہے اور بعض وہ ہیں جن سے ملابست زیادہ نہیں اور ہماری حالت یہ ہے کہ جن نعمتوں کے ساتھ تلبس زیادہ رہتا ہے ان کی طرف تو کچھ توجہ ہوتی بھی ہے اوران کا شکر بھی کرلیتے ہیں کبھی کبھی زبان سے بھی دل کی موافقت کے ساتھ یہ لفظ نکل جاتا ہے کہ اللہ تیرا شکر ہے اور جن کے ساتھ تلبس کم ہے ان کی طرف

التفات بھی کم ہے اوران کا شکر بھی کم کیا جاتا ہے بلکہ غالب حالت یہ ہے کہ ان کا شکر نہیں کیا جا سکتا۔ان نعمتوں میں سے جن کے ساتھ تلبس کم ہے اوراسی لئے ان کی طرف التفات کم ہے مرکوبات بھی ہیں (یعنی سواری کی چیزیں)

چند ظاہری نعمتیں

کیونکہ ظاہری نعمتیں چند ہیں ماکولات ۔ مشروبات ۔ ملبوسات ۔ منکوحات ۔ مسکونات ۔معلومات اور مرکوبات میں نے قافیہ کے لئے مرکوبات کہہ دیا ہے ورنہ مستعمل مراکب ہے مجھے اس کی تحقیق نہیں کہ مرکوب کی جمع مرکوبات صحیح ہے یا نہیں تحقیق کر لی جائے ان میں سب سے زیادہ تلبس تو اول کی تین نعمتوں سے ہے یعنی ماکولات ومشروبات و ملبوسات سے اسی لئے عام طور پر لوگ انہی کو نعمتوں میں شمار کرتے ہیں اوراسی پر شکر کرتے ہیں چنانچہ کھانا کھا کر پانی پی کر عام طور سے لوگ خدا کا شکر کرتے ہیں اور نیا کپڑا پہن کر بھی بعض لوگ شکر بجالاتے ہیں (اور معلومات سے عوام کو تلبس کم ہے اہل علم کو زیادہ ہے مگر اس کی طرف ان میں سے التفات بہت کم لوگوں کو ہے ہاں جب کوئی نیا علم حاصل ہوتا ہے تو اکثر التفات ہوتا ہے اوراس پر بھی شکرادا کرتے ہیں ۱۲) اس کے بعد تلبس زیادہ منکوحات و مسکونات سے ہے کیونکہ بیوی سے ہر روز تلبس ہوتا ہے اور گھر سے بھی گو دن میں تلبس کم ہو مگر رات میں ضرور ہوتا ہے اسی لئے حدیث میں جو آیا ہے کہ تین چیزوں میں نحوست ہے اور حضرت عائشہؓ کی روایت میں یہ ہے کہ اگر نحوست کسی چیز میں ہوتی تو ان تین میں ہوتی المراۃ والدار والفرس یعنی عورت میں اور مکان میں اور گھوڑے میں۔

تین چیزوں سے زیادہ اختلاط

یہ پہلی روایت کی تفسیر ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ان سے تلبس زیادہ ہے اور جس چیز سے زیادہ تلبس ہوتا ہے اس کے آثار پر نظر زیادہ ہوتی ہے اوراس کے عیوب سے تطلیف بھی زیادہ ہوتی ہے اور فرس ہر چند کہ مرکوبات سے ہے اور میں نے اوپر کہا تھا کہ مرکوبات سے تلبس کم ہے اور حدیث میں اس کو دار ومراۃ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ بھی تلبس زیادہ ہے (بناء علی الوجه الذی ذکرناه) سواس

کی توجیہ یہ ہے کہ فرس کے ساتھ مالک فرس کو تلبس اختلاط زیادہ ہوتا ہے کیونکہ اس کو کھلاتا پلاتا ہے اس کی خدمت کرتا ہے خصوصاً اہل عرب کو زیادہ اختلاط تھا۔ وہ گھوڑوں سے بہت محبت کرتے تھے حتیٰ کہ اپنی اولاد کی طرح محبت سے ان کو پالتے تھے اور ایک عجیب بات یہ تھی کہ گھوڑوں کے انساب بھی محفوظ رکھتے تھے۔ اسی لئے عرب کے اشعار میں آپ کو گھوڑوں کی بہت تعریف ملے گی حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شاعر خاص ہیں ۱۲) فرماتے ہیں۔

نظل جیادنا متمطرات　　　　　　یلطمهن بالخمر النساء

(ہمارے گھوڑے فتح مکہ کے دن یکے بعد دیگرے آگے بڑھتے ہوں گے اور عورتیں اپنی اوڑھنیوں سے ان کے منہ پر طمانچہ مارتی ہوں گی) یا یہ مطلب ہے کہ ہماری عورتیں اپنی اوڑھنیوں سے ان کے منہ صاف کریں گی۔ یعنی جنگ میں جو غبار وغیرہ ان کے منہ پر لگ گیا ہوگا میدان جنگ سے واپسی پر اس کو اپنے دوپٹوں سے دو ریں گی۔ (اختار المعنی الاول المولوی حبیب احمد فی ترجمة کلام الملوک والمختار عندی المعنی الثانی وهو الذی اختاره صاحب مجمع البحار ص ۲۵۴ ج ۲ ۱۲ ه یمسحهن النساء بها واستعارله اللطم ای ینفضن ما علیها بخمرهن لیز لن الغبار لعزتها عندهم ۱ ه) پس اختلاط کے اعتبار سے تو گھوڑے کے ساتھ تلبس زیادہ ہے مگر رکوب کے اعتبار سے تلبس کم ہے۔

نعمت مرکوب کی طرف التفات کم ہے

اسی لئے میں نے کہا تھا کہ مرکوبات ان نعمتوں میں سے ہیں جن کے ساتھ تلبس کم ہے یعنی رکوب کے اعتبار سے کم ہے۔ اسی لئے نکاح پر شکر کیا جاتا ہے گھر بنا کر شکر کیا جاتا ہے اور سواری کا جانور خریدتے وقت تو شاید شکر کر لیا جاتا ہو مگر سواری کے وقت بہت کم شکر کرتے ہیں اس کی یہی وجہ ہے کہ نعمت مرکوب کی طرف التفات کم ہے اس لئے میں اس وقت اس نعمت کا بیان کرنا چاہتا ہوں تا کہ اس پر توجہ والتفات زیادہ ہو اور اس کا بھی شکر ادا کیا جائے اور اس وقت یہ مضمون جو اختیار کیا گیا ہے حالانکہ پہلے سے بیان کا خیال نہ تھا اس

کی وجہ یہ ہے کہ بعض صاحبوں نے درخواست کی ہے اور درخواست ایسے وقت کی ہے جبکہ ایک خاص نعمت ہم کو عطا ہوئی ہے کہ ایک خاص مرکوب میں ہم کو سہولت کا سامان عطا کیا گیا ہے اس وجہ سے یہ مضمون جو نعمت مرکوبات کے متعلق ہے اختیار کیا گیا ہے۔

مرکوبات کی ایک بڑی نعمت

اب سمجھئے کہ ایک بڑی نعمت تو ان مرکوبات کے متعلق یہ ہے کہ وہ باوجود اتنی قوت کے ہمارے مطیع ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر جتنے مرکوبات کا ذکر فرمایا ہے وہ سب کے سب ہم سے زیادہ قوی ہیں اور ہم شتر کے برابر تو کیا ہوتے شتر مرغ بھی نہیں بلکہ اس سے بھی کمزور ہیں شتر مرغ عجیب جانور ہے صورت میں تو اونٹ کے مشابہ ہے مگر اس کے دو بازو بھی ہیں جیسے پرندے کے ہوتے ہیں مگر ان سے وہ اڑ نہیں سکتا ہاں بھاگتا خوب ہے اب نہ وہ بوجھ لادنے کے قابل ہے کیونکہ پرندوں میں شمار کیا جاتا ہے نہ پرندوں ہی میں داخل ہے کیونکہ نام کے ساتھ شتر بھی لگا ہوا ہے فرید عطارؒ فرماتے ہیں کہ نفس کی حالت بھی بالکل شتر مرغ جیسی ہے صوفیا ہر جگہ سے سبق لے لیتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

چوں شتر مرغ شناس ایں نفس را — نے کشد بارو نہ پرد بر ہوا

گر بپر گوئیش گوید اشترم — ورنہی بارش بگوید طائرم

(نفس کی مثال شتر مرغ کی سی ہے کہ جب اس سے اڑنے کو کہا جاتا ہے تو کہتا ہے کہ میاں تم بھی عجیب آدمی ہو اڑنے کو مجھ سے کہتے ہو، اونٹ بھی دنیا میں کہیں اڑا ہے تم میرا نقشہ اور صورت نہیں دیکھتے بتلاؤ میں اونٹ سے کس بات میں کم ہوں اور جب کہا جاتا ہے کہ تم اڑنے سے معذور ہو کہ تم اونٹ ہو تو پھر اونٹ ہی کے کام کرو بوجھ لادو اور آگے آگے چلو تو جواب دیتا ہے کہ تم بالکل آنکھوں سے اندھے اور عقل سے خارج معلوم ہوتے ہو تم کو میرے دو بڑے بڑے بازو اور لمبے لمبے پر نظر نہیں آتے کہیں پرندوں نے بھی بوجھ لادا ہے)

نفس کی مثال

اگر اس پر بوجھ لادو تو کہتا ہے کہ میں تو پرندہ ہوں اور جو اڑنے کو کہو تو کہتا ہے میں تو شتر ہوں کہیں اونٹ بھی اڑا ہے۔ غرض نفس سے جو کام بھی لو تو وہ بہانہ ڈھونڈھتا ہے جیسے

ہندوستان کے سودخوار کہ اگران سے یہ کہو کہ سود حرام ہے اس سے توبہ کرو تو جواب دیتے ہیں کہ دارالحرب میں سود لینا جائز ہے بعض علماء کا اس پر فتویٰ ہے اس لئے ہم لیتے ہیں اور اگر کہو کہ اس کی زکوٰۃ کیوں نہیں دیتے تو کہتے ہیں کہ مال حرام میں بھی کہیں زکوٰۃ فرض ہے۔ اب دینے کے وقت وہ سود ہو گیا اور حرام۔ اور لینے کے وقت حلال تھا۔ بہرحال شترمرغ تو کمزور جانور ہے گو نام میں شتر ہے مگر وہ بار برداری کے قابل نہیں۔

انسان کے لئے سواریوں کی تسخیر

لیکن اونٹ گھوڑا بیل بھینسا خچر وغیرہ اس قدر قوی ہیں کہ اگران میں سے کوئی آدمی کے اوپر پیر رکھ دے تو اس سے اٹھا بھی نہ جائے مگر خدا تعالیٰ کی کیسی نعمت ہے کہ ایسے قوی قوی جانوروں کو ایک ذرا سا لونڈا لکڑی لئے ہوئے ہانکتا ہے اور سب کان دبائے اس کے آگے آگے ہو لیتے ہیں کیا غضب کی تسخیر ہے۔ اسی لئے ارشاد ہے کہ سواری ہوتے ہوئے نعمت کو یاد کرو اور اس کا شکر کرو۔ وَتَقُوْلُوْا سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَلَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّالَهٗ مُقْرِنِیْنَ اور یوں کہو کہ پاک ہے وہ ذات جس نے اس کو ہمارے تابع کر دیا حالانکہ ہم قوت وطاقت سے خود اس کو قابو میں نہ کر سکتے تھے۔

تسخیر کا مفہوم

یہاں تسخیر کے یہ معنی ہیں کہ ان کو تمہارے تابع کر دیا۔ اور کسی جگہ تسخیر کے معنی کام میں لگا دینا بھی ہے جیسا کہ اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَلَكُمْ مَافِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور وَسَخَّرَلَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ وَسَخَّرَلَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ کیونکہ ظاہر ہے کہ سموات وارض کی تمام اشیاء ہمارے تابع نہیں نہ شمس وقمر نہ لیل ونہار بلکہ یہاں تسخیر سے مراد یہ ہے کہ تمام عالم کو تمہارے کام میں لگا دیا گیا ہے۔ بہرحال جن جانوروں کو ہم اپنا تابع دیکھتے ہیں یہ تسخیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے ورنہ اگر کسی وقت اللہ تعالیٰ جانور کو مست کر دیں اور وہ سرکشی پر آ جائے تو انسان کی کچھ حقیقت نہیں کہ قوت سے اس کا مقابلہ کر سکے بلکہ اگر مقابلہ کرے گا تو خارجی اسباب سے کرے گا جیسے بندوق وغیرہ۔ مگر جانور کے پاس گھر کے آلات موجود ہیں جیسے سینگ وغیرہ اس کو خارجی اسباب کی ضرورت نہیں۔

ربط آیت از ما قبل

اس لئے حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ سوار ہوتے ہوئے اس نعمت تسخیر کو یاد کر کے خدا تعالیٰ کی حمد کرو اس کے بعد یہ بھی یاد کرو وَاِنَّا اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ کہ ہم اپنے پروردگار کے پاس جانے والے ہیں اس کا ربط ما قبل سے یہ ہے کہ نعمت معاش کو یاد کر کے معاد کو بھی یاد کرو تو مشہور ربط ہے۔ اور بعض اہل لطائف نے کہا ہے کہ اس کا ربط یہ ہے کہ اس سواری سے دوسری سواری کو یاد کرو یعنی جنازہ کو جس کے متعلق کسی نے کہا ہے۔

دھریں گے تجھ کو جنازہ پر تخت شاہی سے اگر خزانہ و لشکر ہزار ہووے گا

عوام تو اس ربط سے خوش ہوئے ہوں گے کیونکہ چٹ پٹا مضمون ہے مگر اہل علم جانتے ہیں کہ پختہ بات کون سی ہے (اور ایک ربط یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اِنَّا اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْن (بے شک ہم اپنے رب کے پاس لوٹائے جانے والے ہیں) میں اس امر کی دلیل کی طرف اشارہ ہے کہ یہ تسخیر حیوانات من جانب اللہ ہے کیونکہ ایک وقت ایسا بھی آنے والا ہے کہ خود دوسروں کے ہاتھوں میں مردہ بدست زندہ ہوگے۔ پس اس حالت کو یاد کر کے سمجھ لو کہ اس حیات چند روزہ میں جو تم حیوانات کو اپنا مسخر دیکھتے ہو یہ محض اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تو تم خود تو اپنے وجود اور ذات پر بھی قابض نہیں ہو دوسروں پر تو کیا قابض ہوتے ۱۲ جامع)

ذکر لسانی و قلبی

اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو باتوں کی تعلیم فرمائی ہے ایک وہ وَتَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ دوسرے وَتَقُوْلُوْا سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَلَنَا هٰذَا یعنی اس نعمت کو دل سے بھی یاد کرو اور زبان سے بھی اس کا اقرار کرو پس ہر چند کہ دل سے استحضار بھی کافی تھا مگر حق تعالیٰ نے اس کی قولاً بھی تعلیم فرمائی ہے تاکہ اس سے استحضار بالقلب آسان ہو جائے کیونکہ تجربہ و مشاہدہ ہے کہ زبان سے ذکر کرنے میں قلب آسانی کے ساتھ ذاکر ہو جاتا ہے اسی واسطے فقہاء نے نیت صلوٰۃ بالقول کو مندوب فرمایا ہے جس پر بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ بدعت انہوں نے کہاں سے نکالی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نیت باللسان کا کہیں ثبوت نہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اگر عملاً ثبوت نہیں تو قولاً ثبوت موجود ہے اور قول بھی حق

تعالیٰ کا دیکھو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر بالقلب و ذکر باللسان کو جمع فرمایا ہے پس جو حکمت یہاں ذکرین کے جمع کرنے میں ہے اسی حکمت کی وجہ سے اگر فقہاء نیت صلوٰۃ میں جمع ذکرین کو افضل فرمائیں تو کون سا جرم ہے پھر میرے پاس اس کی نظیر سنت سے بھی موجود ہے یعنی تلبیہ جس میں ذکر باللسان افضل ہے بلکہ شرط احرام ہے محض نیت سے احرام منعقد نہیں ہوتا جب تک تلبیہ نہ کہے (پھر تلبیہ میں رفع صوت بھی مسنون ہے جیسا کہ حدیث میں ہے الحج العج والثج[۱] اب اگر کوئی یہ سوال کرے کہ تلبیہ بالقلب کافی تھا زبان سے کہنے کی کیا ضرورت ہے تو یہی جواب دیا جائے گا کہ ذکر باللسان کو ذکر بالقلب کی تیسیر میں دخل ہے پس یہی حکمت یہاں بھی موجود ہے ۱۲) یہ تو درمیان میں ایک علمی لطیفہ تھا۔

ہر نعمت عطائے حق ہے

میں یہ کہہ رہا تھا کہ مرکوب میں ایک نعمت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسی قوی قوی مخلوقات کو انسان کے تابع کر دیا ہے اور یہ نعمت ہم کو بلا کسب و اکتساب کے حاصل ہے اس میں حق تعالیٰ کا انعام پوری طرح ہر شخص کو محسوس ہو سکتا ہے اور جو نعمت انسان کو کسب و اکتساب سے حاصل ہوتی ہے اس میں تو وہ کبھی دعویٰ بھی کرنے لگتا ہے جیسے قارون نے کہا تھا انما اوتیته علی علم عندی جب اس کو لوگوں نے نصیحت کی کہ جیسے خدا تعالیٰ نے تجھ پر احسان کیا ہے تو دوسروں پر احسان کر تو کہنے لگا کہ یہ مال تو مجھے ایک علم کی بدولت حاصل ہوا ہے جو میرے پاس ہے۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس کو کیمیا آتی تھی لیکن تفسیر اس پر موقوف نہیں۔ میرے نزدیک علم سے مراد سلیقہ اور لیاقت ہے مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنی ذاتی لیاقت اور سلیقہ سے یہ مال حاصل کیا ہے (نعوذ باللہ) خدا کا مجھ پر کیا احسان ہے۔ خیر قارون کم بخت کا یہ اعتقاد ہوگا مسلمانوں کا خدا نہ کرے یہ اعتقاد کیوں ہونے لگا وہ تو ہر نعمت کو عطائے حق سمجھتے ہیں خواہ سبب سے ہو یا بلا سبب کے اور کسب سے حاصل ہو یا بلا کسب کے مگر یہ ضرور ہے کہ جو نعمت بلا سبب ظاہری اور بدوں کسب کے حاصل

---

[۱] سنن الترمذی: ۸۲۷، ۲۹۹۸، سنن ابن ماجة: ۲۸۹۶، ۲۹۲۴، سنن الدارمی ۲: ۳۱، السنن الکبریٰ للبیهقی ۴: ۳۳۰، ۵: ۴۲، ۴۳، ۵۸، المستدرک للحاکم ۱: ۴۵۰، کنز العمال: ۱۲۳۰۶ تفسیر ابن کثیر ۲: ۶۸

ہو اس نعمت کا اثر زیادہ ہوتا ہے جیسے کوئی ہمیں بہت سا روپیہ ہدیہ میں دے جائے اور جو روپیہ تجارت اور ملازمت یا مزدوری سے حاصل ہو اس کے نعمت ہونے کی طرف التفات کم ہوتا ہے گو اعتقاد قارون جیسا نہ ہو مگر حالت ایسی ہے جس سے دیکھنے والے کو شبہ ہوسکتا ہے کہ یہ اس کو نعمت نہیں سمجھتے بلکہ اپنے علم و ہنر کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔

امراض باطنی کا علاج بھی اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں

چنانچہ ایک قصہ مشہور ہے کہ ایک شخص گھوڑا خریدنے جارہا تھا راستہ میں ایک دوست سے ملاقات ہوئی اس نے پوچھا کہاں جارہے ہو؟ کہا بازار جارہا ہوں، گھوڑا خریدوں گا۔ دوست نے کہا کہ ان شاء اللہ بھی کہہ لو بولا اس میں ان شاء اللہ کی کیا بات ہے؟ گھوڑا بازار میں ہے روپے میری جیب میں ہیں اب جاکر خریدلوں گا بس روپیہ پاس ہونے سے انسان یہ سمجھتا ہے کہ سب کام اس کے قبضہ میں ہے مگر کبھی اللہ تعالیٰ اس کا عجز ظاہر کردیتے ہیں اور یہ بھی رحمت ہے اگر انسان پر ابتلاء واقع نہ ہو تو استدراج میں تو یہ تباہ ہوجائے پس مصائب و بلا میں بھی حکمتیں ہیں بڑی حکمت تو یہی ہے کہ اس سے انسان کو اپنی حقیقت معلوم ہوجاتی ہے اپنا عجز مشاہد ہوجاتا ہے مولانا فرماتے ہیں۔

گر خدا خواہد نہ گفتند از بطر　　پس خدا بنمود شان عجز بشر

مولانا نے کنیزک کے قصہ میں فرمایا ہے کہ بادشاہ نے اس کے معالجہ کے لئے بڑے بڑے اطباء کو جمع کیا جن کو اپنے علم وفن پر ناز تھا مگر حق تعالیٰ نے ان کو ان کا عاجز ہونا دکھلا دیا جو دواوہ استعمال کراتے اس سے الٹا اثر ہوتا ہے۔

از قضا سر کنگبیں صفرا فزود　　روغن بادام خشکی می نمود

از ہلیلہ قبض شد اطلاق رفت　　آب آتش را مدد شد ہمچو نفت

(قضا سے شہد نے صفرا بڑھایا اور روغن بادام خشک کرتا تھا اور ہڑڑ سے قبض ہوا اور پانی مثل تارکول کے آگ کو تیز کرتا تھا)

پس دراصل ہر زخم کا مرہم اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے ان کے سوا کسی کے قبضہ میں شفا نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اسی طرح امراض باطنہ کا علاج بھی حق تعالیٰ ہی فرماتے ہیں۔

ابتلاء وامتحان میں مشاہدہ عارفین

عارفین کو تو اس کا شب و روز مشاہدہ ہوتا ہے اور غیر عارفین کو بھی کبھی حق تعالیٰ اپنی قدرت دکھلاتے رہتے ہیں مگر ان کو عارفین کے برابر مشاہدہ اس لئے نہیں ہوتا کہ یہ غور نہیں کرتے حق تعالیٰ کی طرف متوجہ نہیں رہتے اور عارفین اللہ تعالیٰ کے معاملات کو جو ان کے ساتھ ہو رہے ہیں غور سے دیکھتے رہتے ہیں اس لئے ان کو خوب مشاہدہ ہوتا ہے کہ فلاں مصیبت سے ہمارے فلاں مرض کا علاج کیا گیا ہے اور فلاں تکلیف ہماری فلاں خطا کا بدلہ ہے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ جب مجھ سے حق تعالیٰ کی کوئی نافرمانی ہو جاتی ہے تو میں اس کا اثر اپنے گھر والوں میں اور سواری کے جانور میں مشاہدہ کرتا ہوں کہ اس دن یہ سب کے سب مجھ سے نافرمان ہو جاتے ہیں۔ گھر والے بات کا جواب نہیں دیتے اور میرا مقابلہ کرتے ہیں۔ گھوڑا پوری طرح سواری نہیں دیتا شرارت کرنے لگتا ہے۔ یہ وقعات کم و بیش سب کو پیش آتے ہیں مگر عام لوگ اس کو اتفاقیات پر محمول کرتے ہیں یا گھر والوں کی بد خلقی پر اور گھوڑے کے عیب پر کیونکہ ان کو نہ اپنے افعال پر نظر ہے نہ ان کے نتائج پر توجہ ہے مگر بعض دفعہ حق تعالیٰ ایسی دست بدست سزا دیتے ہیں جس سے ہر شخص کو محسوس ہو جاتا ہے کہ یہ میرے اس فعل کی سزا ہے اور اسی کو میں نے کہا تھا کہ حق تعالیٰ کی اس میں بڑی رحمت ہے۔ اگر کبھی ایسا نہ ہوا کرے تو انسان کی آنکھیں ہی نہ کھلیں چنانچہ وہ گھوڑا خریدنے والا یہ کہہ کر کہ انشاء اللہ کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ بازار میں پہنچا تو کسی جیب کٹ نے جیب میں سے روپے نکال لئے۔ گھوڑے کا سودا کر کے جو اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو وہاں میدان صاف تھا شرمندہ ہو کر ناکام واپس ہوا۔ اتفاق سے وہ دوست پھر ملا اور کہا کیا حال ہے؟ کہنے لگا ہم بازار گئے تھے۔ انشاء اللہ گھوڑا خریدنے کا قصد تھا انشاء اللہ جیب کٹ نے جیب میں روپے نکال لئے۔ انشاء اللہ اب خالی ہاتھ گھر جا رہا ہوں انشاء اللہ ایسا سبق ملا کہ اب موقع بے موقع بھی انشاء اللہ کا ورد ہو گیا۔

تفسیر آیت متلو

غرض انسان کی یہ عادت ہے کہ جو چیز بلا سبب و بلا کسب کے اس کو حاصل ہو اس کو تو نعمت سمجھتا ہے اور جس کے اسباب اس کے قبضہ میں ہوں اور اس کے کسب کو اس میں دخل

ہو اس کو نعمت نہیں سمجھتا اور اگر اعتقاداً سمجھے بھی تو شان نعمت کا زیادہ اثر اس کے اوپر ظاہر نہیں ہوتا۔ اس لئے ایسی نعمتوں کے نعمت ہونے پر متوجہ کرنے کے لئے حق تعالیٰ مرکوب کی نعمت کو بیان فرماتے ہیں اور اس میں بھی یہاں رکوب کو نہیں بیان فرمایا کیونکہ رکوب سے جو نفع حاصل ہوتا ہے یعنی طی طریق اس کو بعض لوگ پیادہ چل کر بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

بلکہ اللہ تعالیٰ نے یہاں ایسی بات بیان فرمائی ہے جو کھلی نعمت ہے جو ظاہراً انسان کی قدرت سے باہر ہے یعنی وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ کہ مراکب تمہارے بوجھ لاد کر ایسے مقام تک پہنچاتے ہیں جہاں تم اس بوجھ کو تو کیا پہنچاتے خود بھی پہنچ سکتے تھے مگر سخت مشقت اور مصیبت کے ساتھ یا یہ ترجمہ ہو کہ مع بوجھ کے اس جگہ نہ پہنچ سکتے تھے مگر مشقت کے ساتھ۔ سواری کی چیزوں میں یہ نعمت کھلی نعمت ہے۔ اس میں کسی کو یہ وہم نہیں ہو سکتا کہ ہم کو سواری کی ضرورت نہیں بلکہ سب اپنے کو اس کام میں سواری کا محتاج سمجھتے ہیں۔

احتیاط فی الکلام کی تعلیم

مگر سبحان اللہ۔ حق تعالیٰ کا کلام کیسا جچا تلا ہے کہ اس نعمت میں بھی صرف یہ نہیں فرمایا لَمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ بلکہ اس کے ساتھ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ بھی بڑھا دیا کہ وہاں سخت مصیبت کے ساتھ پہنچنا پہنچانا ممکن تھا۔ اس میں ہم کو احتیاط فی الکلام کی تعلیم کی گئی ہے کہ بات ایسی کہو جو ہر حال میں صحیح ہو۔ کوئی اس پر نقض وارد نہ کر سکے۔ پس ہر چند کہ یہاں بظاہر یہ دعویٰ بالکل تام ہے کہ تم بوجھ لاد کر ایک شہر سے دوسرے شہر میں بدوں سواری کے نہیں پہنچ سکتے تھے مگر کوئی معقولی اس پر یہ کہہ سکتا تھا کہ ایک صورت سے پہنچ سکتے ہیں وہ یہ کہ سارا سامان ایک دم سے نہ اٹھایا جاتا بلکہ اس کے مختلف عدد بنا کر ایک عدد کو تھوڑی دور پر رکھ دیں پھر دوسرے کو لے جائیں پھر تیسرے کو اس طرح ایک ایک کر کے سب کو ایک جگہ پہنچا دیں پھر وہاں سے ایک ایک کر کے سب کو قریب کی دوسری جگہ پہنچا دیں تو اس طرح بدوں سواری کے بوجھ کو لے جا سکتے ہیں اور یہ احتمال عقلی ہے۔

ایک معقولی مولوی کی عجیب حکایت

ایک معقولی مولوی نے ہم کو بتلایا۔انہوں نے اس عقلی احتمال کو واقع کر کے دکھلا دیا۔ ہمارے ایک دوست ہیں کیرانوی وہ شاملی کے اسٹیشن پر بہت سا بوجھ لے کر اترے اور قلیوں سے کہا کہ اس کو باہر ٹمٹم کے پاس پہنچا دو اور مزدوری طے کرلو۔قلیوں نے بہت مزدوری مانگی آپ نے انکار کر دیا اور کہا ہم خود لے جائیں گے۔قلی ہنسنے لگے کہ یہ اکیلا آدمی اتنا سامان کیونکر لے جائے گا مگر انہوں نے قلیوں کو نیچا دکھا دیا۔آپ نے یہی کیا کہ سارے سامان کو جو ایک دو عدد کی صورت میں تھا کھولا اور اس کے متفرق عدد ہلکے ہلکے بنائے۔پھر قلیوں کے سامنے ہی ایک عدد کو اٹھا کر دور رکھ آئے مگر اتنی دور کہ سامان بھی زیر نظر رہے پھر دوسرا عدد اٹھا کر لے گئے پھر تیسرا۔یہ حکمت دیکھ کر قلی ڈھیلے ہوگئے اور سمجھ گئے کہ یہ تنہا سارے سامان کو باہر لے جاسکتے ہیں تو اب وہ خود ہی تھوڑی مزدوری پر راضی ہوگئے۔واقعی یہ صورت ہمارے ذہن میں تو نہ آتی۔مگر وہ معقولی آدمی تھے۔انہوں نے یہاں بھی معقول سے کام لیا تو اگر آیت میں اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ (مگر سخت مصیبت کے ساتھ) نہ ہوتا تو کوئی معقول یہ احتمال نکال کر آیت پر اعتراض کرسکتا تھا اس لئے حق تعالیٰ نے یہ جملہ بڑھا کر کلام کو مضبوط کر دیا کہ اگر پہنچاتے بھی تو بڑی مصیبت سے پہنچاتے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں مصیبت بہت ہے (دن بھر میں اس طرح دو تین کوس بھی طے نہیں ہوسکتے۔بڑی منزل تو کسی طرح طے ہی نہیں ہوسکتی) اور گو یہ احتمال بہت بعید ہے کہ اس صورت سے کوئی شخص بوجھ کو پہنچائے مگر حق تعالیٰ نے اس بعید احتمال کا بھی لحاظ فرمایا جس میں ہم کو تعلیم ہے کہ کلام میں بہت احتیاط کرنا چاہیے۔دیکھو ہماری کیسی شان ہے کہ لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَھُمْ یُسْئَلُوْنَ ہم سے کوئی باز پرس نہیں کرسکتا مگر پھر بھی ہم اپنے کلام میں کس قدر احتیاط کرتے ہیں۔پس تم کو بھی احتیاط فی الکلام کا عادی ہونا چاہیے۔

حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو احتیاط فی الکلام کی تعلیم

قرآن میں جو حضرت موسیٰ علیہ السّلام اور خضر کا قصہ مذکور ہے اس کی بنا بھی اسی مسئلہ کی تعلیم پر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام سے کلام میں ایک بے احتیاطی ہوگئی تھی کہ وعظ میں کسی

نے آپ سے سوال کیا ای الناس اعلم کہ اس وقت آدمیوں میں سب سے بڑا عالم کون ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے اطلاق کے ساتھ جواب دیا انا کہ میں سب سے زیادہ عالم ہوں۔ مطلب یہ تھا کہ علوم شرائع اور علوم نبوت میں سے سب سے بڑا عالم میں ہوں اور اسی مراد کے اعتبار سے کلام صحیح تھا کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام انبیاء اولوالعزم سے ہیں ہزاروں انبیاء ان کی شریعت کے متبع ہوئے ہیں اور خود ان کے زمانہ میں بھی حضرت ہارون علیہ السّلام نبی تھے مگر وہ بھی موسیٰ علیہ السّلام کے تابع تھے اور موسیٰ علیہ السّلام کسی نبی کے تابع نہیں بلکہ مستقل صاحب شریعت تھے۔ پس علوم شرائع ونبوت میں اس وقت ان سے زیادہ عالم کوئی نہ تھا مگر آپ نے جواب میں لفظاً یہ قید بیان نہ فرمائی تھی بلکہ اطلاق کے ساتھ جواب دیا اس پر عتاب ہوا اور وحی نازل ہوئی بلی عبدنا خضرا ھو اعلم منک کہ کوئی آپ سے زیادہ عالم کیوں نہیں۔ ہمارا بندہ خضر آپ سے زیادہ عالم ہے یعنی بعض علوم میں وہ زیادہ عالم ہیں گو وہ علوم شرائع اور علوم نبوت سے افضل نہ ہوں مگر آپ کے اطلاق کلام پر تو علم خضر سے نقض وارد ہوسکتا ہے کیونکہ علم میں تو وہ بھی داخل ہے۔ میں اس مقام پر علم موسیٰ اور علم خضر کا فرق تفصیل کے ساتھ بیان کرنا نہیں چاہتا کیونکہ دوسرے مقامات پر اس کا بیان مفصل ہو چکا ہے۔

حضرت خضر علیہ السّلام کا علم لدنی تھا

مگر اجمالاً اتنا کہے دیتا ہوں کہ خضر علیہ السّلام کا علم کشف کونی تھا اور اس علم کو علم نبوت اور کشف الٰہی سے جو کہ موسیٰ علیہ السّلام کا علم تھا کوئی نسبت نہیں مگر فی نفسہ وہ بھی ایک علم ہے اور علم لدنی ہے جس میں وہ موسیٰ علیہ السّلام سے بڑھے ہوئے تھے اور اللہ تعالیٰ نے محض تنبیہ قولی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ عملی اصلاح فرمائی کہ موسیٰ علیہ السّلام کو حکم ہوا کہ جاؤ خضر سے ملو اور اس کے علوم کو دیکھو۔ اس کو مشائخ صوفیا سمجھتے ہیں علماء ظاہر عملی اصلاح کو کچھ نہیں جانتے۔ (الا الاسم والرسم ۱۲) علماء تو کسی کے اندر تکبر دیکھیں گے تو اس کی اصلاح میں صرف تکبر کی مذمت اور وعیدیں بیان کردیں گے اور بس اور شیخ اس طرح اصلاح کرتا ہے کہ جاؤ فلاں مسافر کے پیر دباؤ جو خراب خستہ حالت میں پڑا ہے جس کی رال بھی چل رہی ہے۔ اب مرید چونکہ شیخ کے سامنے چوں نہیں کرسکتا اس لئے جھک مار کر جاتا ہے اور پیر دباتا ہے

گو دل میں شیخ کو کوستا بھی ہے کہ بڑے متشدد ہیں مگر ایسا کوسنا ہزار کوس بھاگ جاتا ہے وہ شیخ کو نہیں لگتا پھر اس غریب مسافر پر غصہ آتا ہے کہ یہ کم بخت کہاں سے آمرا تھا وہ میرے سپرد اس کی خدمت ہوئی۔ مگر یہ غصہ فضول ہے اگر وہ نہ آتا تو شیخ کسی اور تدبیر سے علاج کرتا مثلاً نمازیوں کے جوتے سیدھے کراتا۔ شروع میں تو یہ علاج پہاڑ کے برابر بلکہ اس سے بھی زیادہ گراں معلوم ہوتا ہے مگر چند روز میں نفس کی اصلاح ہو جاتی ہے کیونکہ ایسے ایسے کام کرتے کرتے نفس کو تواضع کی عادت ہو جاتی ہے پھر نفس درست ہو جاتا ہے۔

عادت پر ایک حکایت

عادت کے اوپر ایک اور حکایت یاد آئی مولوی صدیق احمد صاحب گنگوہی جو گڑھی میں بھی مدرس رہے ہیں اپنی حکایت بیان فرماتے تھے کہ جب میں نیا نیا دیو بند کے مدرسہ میں گیا تو ایک رئیس کے یہاں میرا کھانا مقرر ہوا۔ اس زمانہ میں دیو بند کے لوگ طلباء کی بہت عزت کرتے تھے اب کی خبر نہیں مگر جہاں تک میرا خیال ہے دیو بند کے لوگ اب بھی دوسری جگہ کے لوگوں سے زیادہ طلباء کی عزت کرتے ہیں اور جو زمانہ ہم نے دیکھا اس وقت تو بہت ہی عزت کرتے تھے کہ طلباء کو دیکھ کر رؤسا اپنی کرسی چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے اور طلباء کو عزت کے ساتھ بٹھلاتے تھے۔ اس زمانہ میں چونکہ عوام متواضع تھے اس لئے طلباء کو گھروں سے کھانا لانا معیوب نہ تھا اور شاید پہلے بزرگوں نے اسی واسطے طلباء کے لئے یہ صورت اختیار کی ہوتا کہ ان کا تکبر زائل ہو مگر اب میری رائے نہیں ہے کہ طلباء گھروں پر کھانا لینے جائیں کیونکہ اب اہل دنیا طلباء کو ذلیل و حقیر سمجھنے لگے۔ اگر طلباء ان کے گھروں پر روٹی کے واسطے جائیں گے تو وہ اور زیادہ ان کو ذلیل سمجھیں گے۔ ہاں مؤذن اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ وہ اہل محلّہ سے اپنا حق وصول کرتا ہے وہ ان کی مسجد کی خدمت کرتا ہے اور اپنی خدمت کا معاوضہ طلب کرتا ہے تو یہ ایسا ہے جیسے کوئی درزی کسی رئیس کے یہاں اپنے پیسے مانگنے جائے اس کا کچھ مضائقہ نہیں اور گو طلباء کا بھی حق مسلمانوں کے ذمہ ہے مگر لوگ عام طور پر اس حق کو اپنے اوپر نہیں سمجھتے اور جو شخص اپنے ذمہ حق نہ سمجھتا ہو اس سے جبراً حق وصول کرنا ذلت ہے ہم کو اس کی ضرورت نہیں۔ قیامت کے دن ان کو خود معلوم ہو جائے گا کہ

انہوں نے دین اور اہل دین کی کس قدر حق تلفی کی ہے۔ تو مولوی صدیق احمد صاحب کہتے تھے کہ اول وقت جو میں روٹی لینے گھر پر گیا تو قدم نہ اٹھتا تھا پھر گھر پر پہنچ کر آواز دینے کی ہمت نہ ہوئی کہ روٹی بھیج دو۔ شرم کے مارے دیوار سے لگ کر خاموش کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں صاحب خانہ جو ایک رئیس تھے خود باہر آئے اور مجھے کھڑا دیکھا تو کہنے لگے کہ آپ کا ہی کھانا میرے غریب خانہ پر مقرر ہوا ہے؟ میں نے کہا جی ہاں یہ سن کر انہوں نے فوراً چارپائی منگائی اور مجھے عزت سے بٹھلایا اور پوچھا آپ کھانا یہاں ہی کھائیں گے یا مدرسہ لے جائیں گے۔ میں نے شرم کی وجہ سے کہہ دیا کہ یہیں کھاؤں گا۔ انہوں نے فوراً ملازم سے کہا کہ آپ کے ہاتھ دھلاؤ اور گھر میں سے کھانا لاکر آپ کو کھلا دو۔ جب کھانے سے فارغ ہو کر مدرسہ میں آیا تو ساتھیوں نے کہا کہ تم کھانا نہیں لائے؟ میں نے کہا کہ مجھ کو تو گھر تک جانا ہی محال تھا اور میں سب کے سامنے ہاتھ پر رکھ کر روٹیاں یہاں تک بھی لاتا میں نے تو وہیں کھا لیا۔ ساتھیوں نے کہا ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ ہمارے اندر بعضے ایسے بھی ہیں جن کا کھانا کہیں مقرر نہیں تو جن کا مقرر ہے وہ سب مل کر ان کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیتے ہیں تو سب کا کام چل جاتا ہے شام سے تم کھانا یہیں لانا۔ میں نے کہا بہت اچھا لاؤں گا۔ کہتے تھے کہ شام کو جو میں کھانا لایا تو بار بار دل میں یہ آتا تھا کہ زمین پھٹ جائے تو میں اس میں سما جاؤں مگر دو تین وقت لانے کے بعد پھر دل کھل گیا اور اب تو یہ حالت ہے کہ اگر تم کہو تو بھنگی کے گھر سے میں کھانا لے آؤں۔ سو واقعی چند روز تک ایسا کام کرنے سے جس میں نفس کی ذلت ہو نفس ذلت کا عادی ہو جاتا ہے۔ اسی لئے مشائخ تکبر وغیرہ کی عملی اصلاح کرتے ہیں۔

حکایت مولانا ابوسعید صاحب گنگوہی قدس سرہ

چنانچہ حضرت شیخ عبدالقدوس قدس سرہ کے پوتے مولانا ابوسعید صاحب جب سلطان نظام الدین بلخی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس دولت باطنیہ کی طلب میں پہنچے ہیں تو آپ نے سنا ہوگا کہ انہوں نے کیسی کیسی تکبر شکن خدمتیں ان سے لی ہیں تاکہ امراض نفس کا عملی علاج ہو پھر جیسی ان کی اصلاح ہوئی ہے سب کو معلوم ہے۔ غرض اس واقعہ میں حق تعالیٰ نے قولی اصلاح پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ عملی اصلاح بھی فرمائی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت

خضر کے پاس جانے کا حکم ہوا پھر حالانکہ حق تعالیٰ تمام جغرافیہ عالم سے موسیٰ علیہ السّلام کو واقف فرما سکتے تھے مگر موسیٰ علیہ السّلام کو حضرت خضر کا موقع ومکان تعین کے ساتھ نہیں بتلایا بلکہ اجمالاً اتنا بتلایا کہ وہ مجمع البحرین پر ملیں گے اور حکم ہوا کہ ایک مچھلی تل کر ساتھ لے لو جب وہ زندہ ہو کر توشہ دان سے نکل بھاگے تو سمجھ لینا کہ خضر علیہ السّلام اسی جگہ ہیں۔ اس اجمال کی وجہ سے موسیٰ علیہ السّلام سالہا سال کے سفر کے لئے تیار ہو کر چلے کہ نہ معلوم کب اور کتنی مدت میں پہنچنا ہوگا چنانچہ نص میں ہے وَاِذْقَالَ مُوْسیٰ لِفَتٰهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰی اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَیْنِ اَوْ اَمْضِیَ حُقُبًا۔ (اور وہ وقت یاد کرو جبکہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے خادم سے فرمایا کہ میں سفر میں برابر چلوں گا یہاں تک کہ اس موقع پر پہنچ جاؤں جہاں دو دریا آپس میں ملتے ہیں یا یوں ہی زمانہ دراز تک چلتا رہوں گا) اس اجمال میں بھی موسیٰ علیہ السّلام کی اصلاح تھی اور موسیٰ علیہ السّلام کی طلب دیکھئے کہ سالہا سال تک چلنے پر مستعد ہو گئے۔ سبحان اللہ۔ پھر حق تعالیٰ کی امداد یہ ہوئی کہ مجمع البحرین تک جانے میں تو ان کو ذرا تکان نہیں ہوئی ہاں جب موقع سے تجاوز ہو گیا تو اب تکان محسوس ہوا (اللہ تعالیٰ طالبین کی اسی طرح امداد فرمایا کرتے ہیں کہ طریق کو ان کے لئے آسان کر دیتے ہیں ۱۲) چنانچہ آپ نے خادم سے فرمایا کہ آج کے سفر سے تکان معلوم ہوا ہے لاؤ ناشتہ لاؤ اس پر خادم نے عرض کیا کہ میں آپ سے کہنا بھول گیا وہ مچھلی تو کل ہی زندہ ہو کر سمندر میں چلی گئی ہے۔ موسیٰ علیہ السّلام نے فرمایا کہ ہم تو اسی کے منتظر تھے واپس لوٹو منزل مقصود اسی جگہ ہے جہاں سے ہم آگے بڑھ گئے۔

استاد کا ایک ادب

پھر اس کے بعد موسیٰ علیہ السّلام نے حضرت خضر سے درخواست کی هَلْ اَتَّبِعُکَ عَلٰی اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا کہ کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں تاکہ جو علم آپ کو حاصل ہے وہ آپ مجھے بھی سکھلا دیں۔ حالانکہ موسیٰ علیہ السّلام حق تعالیٰ کے بھیجے ہوئے تھے ان کو استیذان کی ضرورت نہ تھی مگر ادب یہی ہے کہ استاد سے اجازت لے اور اپنی طلب کو ظاہر کرے اور علماء تو صرف الفاظ ظاہرہ کے درپے ہوتے ہیں مگر صوفیہ نے اس سے یہ مسئلہ بھی مستنبط کیا ہے کہ اگر کسی کے ساتھ چلنا ہو تو بلا اجازت کے ساتھ نہ چلے بلکہ اجازت لے کر ساتھ چلنا چاہیے کیونکہ ساتھ چلنے سے بعض دفعہ دوسرے کو تکلیف ہوتی ہے اس کی آزادی میں خلل

پڑتا ہے چنانچہ ایک دفعہ برسات کے زمانہ میں ایک مولوی صاحب رات کے وقت میرے ساتھ ہولیے۔ میں نے ان کی وجہ سے اچھا راستہ ان کے لئے چھوڑ دیا اور خراب راستہ خود اختیار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اندھیرے میں ایک گڑھے کے اندر میرا پیر گرا جس سے تمام کپڑے خراب ہو گئے۔ اگر وہ میرے ساتھ نہ ہوتے تو میں خراب راستہ کیوں اختیار کرتا۔ ایک دفعہ ایک وکیل صاحب ایک مجلس نکاح سے گھر تک میرے ساتھ ہولئے حالانکہ اس وقت آنت اتر جانے کے سبب تقاضے کے ساتھ گھر جارہا تھا ان کی وجہ سے مجھے باتوں میں مشغول ہونا پڑا اور آہستہ آہستہ چلا۔ تنہا ہوتا تو تیزی کے ساتھ جاتا مگر وہ ظالم گھر پر پہنچنے کے بعد بھی واپس نہ ہوئے بلکہ دروازے پر جم کر کھڑے ہوگئے اور باتوں کا سلسلہ قائم رکھا آخر مجبور ہو کر مجھے بے مروتی سے کہنا پڑا کہ اب مجھے جانے دیجئے مگر وہ پھر بھی نہ ٹلے تو میں منہ موڑ کر خود ہی چل دیا۔ آج کل لوگوں کو اس کا احساس ہی نہیں کہ دوسرے کو ان کے فعل سے تکلیف ہوگی۔

ایذا رسائی سے بچنے کی ضرورت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ آپ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس سے بھی اگر رات کو اٹھتے تو اس کا لحاظ فرماتے تھے کہ ان کی نیند خراب نہ ہو ان کو تکلیف نہ ہو حالانکہ وہ محبوبہ ہونے کے ساتھ خود محب و جاں نثار بھی تھیں اور ایسی جاں نثار تھیں کہ حضور کی شان میں فرماتی ہیں۔

لو امی زلیخا لو رأین جبینه　　　لاثرن بالقطع القلوب علی الیه

زلیخا کو ملامت کرنے والیاں اگر حضور کا چہرہ مبارک دیکھ لیتیں تو بجائے ہاتھ کاٹنے کے دل کے ٹکڑے کر ڈالتیں۔

عرب کا سادہ مذاق

ایشیائی مذاق کے اعتبار سے جو کہ عرب کا سادہ مذاق تھا یہ کلام غایت عشق کو ظاہر کر رہا ہے اور زلیخا کے جس قصہ کی طرف اس شعر میں اشارہ ہے اس کا اجمالی واقعہ یہ ہے کہ جب زلیخا کا عشق مصر میں مشہور ہوا تو وہاں کی عورتوں نے اس کو ملامت کی کہ غلام پر فریفتہ ہے کیونکہ یوسف علیہ السلام اس وقت غلاموں ہی کی طرح فروخت ہو کر اس کے ہاتھ میں

آئے تھے یہ باتیں سن کر زلیخا نے ان کے اعتراض کا عملی جواب دینا چاہا زبان سے کچھ نہیں کہا۔ تدبیر یہ کی کہ ان کو دعوت کے بہانہ سے اپنے گھر بلایا اور یوسف علیہ السلام کو پردہ میں کر دیا پھر سب عورتوں کے سامنے چاقو سے کاٹ کر کھانے کے پھل اور میوے رکھ دیئے اور ہر ایک کے سامنے ایک ایک تیز چاقو رکھ دیا جب عورتوں نے چاقو ہاتھ میں لے لیا اور پھل تراشنے کا قصد کیا تو عین اس موقعہ پر زلیخا نے یوسف علیہ السلام کو بلایا کہ ذرا یہاں تو آؤ (وہ سمجھے کسی کام سے بلاتی ہوگی چونکہ وہ ظاہر میں آقا تھی اس لئے خدمت کے ارادہ سے تشریف لے آئے ۱۲) اب جو وہ سامنے آئے اور عورتوں کی نظر ان کے حسن و جمال پر پڑی تو سب کے ہوش اڑ گئے۔ بدحواسی میں چاقو سے پھل کی جگہ اپنے ہاتھ کاٹ لئے۔

اب زلیخا کو موقعہ ملا کہ کیوں تمہارے حواس کہاں گئے۔ ہوش تو ٹھکانے کرو میں تو ایک دن بھی ایسی بدحواس نہیں ہوئی سب نے شرمندہ ہو کر کہا حَاشَ لِلّٰہِ مَاھٰذَا بَشَرًا اِنْ ھٰذَا اِلَّا مَلَکٌ کَرِیْمٌ کہ بخدا یہ آدمی نہیں یہ تو کوئی فرشتہ معلوم ہوتا ہے۔ زلیخا نے کہا فَذٰلِکُنَّ الَّذِیْ لُمْتُنَّنِیْ فِیْہِ کہ دیکھ لو یہی ہے جس کی محبت پر تم نے مجھے ملامت کی تھی اس قول کا ترجمہ کسی نے شعر میں خوب کہا ہے ۔

این ست کہ خوں خوردہ ودل بردہ بسے را — بسم اللہ اگر تاب نظر ہست کسے را

(یہ وہی تو ہیں جنہوں نے میرا دلی راحت وسکون برباد کر رکھا ہے اگر ان کو دیکھنے کی کسی میں تاب ہے تو بسم اللہ)

تو حضرت عائشہؓ ان عورتوں کے بارہ میں فرماتی ہیں کہ یوسف علیہ السلام کا جمال دیکھ کر تو انہوں نے ہاتھ ہی کاٹے تھے اگر ہمارے حضورؐ کا جمال جہاں آرا دیکھ لیتیں تو دل و جگر کے ٹکڑے کاٹ ڈالتیں۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کو حضورؐ سے کس درجہ کا عشق تھا تو کیا ان کو حضورؐ کے کسی فعل سے کلفت ہوسکتی تھی۔ ہرگز نہیں مگر بایں ہمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک رات حضور آدھی رات کو اٹھے فقام رویدا وانتعل رویدا وفتح الباب رویدا و خرج من الباب رویدا آہستہ سے اٹھے آہستہ سے نعلین پہنے آہستہ سے دروازہ کھولا آہستہ سے باہر نکلے۔ آپ نے اس قدر احتیاط کی مگر حضرت عائشہؓ کے تو دل کو آپ سے تعلق تھا آپ کا جدا ہونا تھا

کہ دل پر اس کا اثر ہوا اور فوراً آنکھ کھل گئی جب آپ کو بستر پر نہ پایا تو آپ کو وساوس عاشقانہ آنا شروع ہوئے۔

باسایہ ترانمی پسندم عشق است و ہزار بدگمانی

یہ خیال ہوا کہ شاید کسی دوسری بیوی کے پاس تشریف لے گئے ہیں اور جب عاشق کی یہ حالت ہے کہ باسایہ ترانمی پسندم۔ تو بالغیرہ ترانمی پسندم تو بدرجہ اولیٰ ہوگا۔ اس خیال کا آنا تھا کہ حضرت عائشہؓ سے رہا نہ گیا اور فوراً اوڑھنی اوڑھ کر آپ کے نشانات قدم کو دیکھتی ہوئی پیچھے پیچھے چلیں۔ دیکھا کہ آپ بقیع الغرقد میں (جو مدینہ کا قبرستان ہے) مردوں کے لئے دعا کر رہے ہیں۔ اس کے بعد کا قصہ سامعین کو غالباً معلوم ہوگا کیونکہ مواعظ میں بیان ہو چکا ہے۔

مقصود اس سے یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ السلام کو دوسروں کی راحت کا اس قدر اہتمام تھا مگر آج کل لوگوں کو اس کا مطلق اہتمام نہیں۔ اسی لئے بدوں اجازت کسی کے ساتھ ہو لیتے ہیں خواہ اس پر گرانی ہی ہو۔

ہمراہ چلنے کے لئے ضرورت اجازت

صوفیہ نے اس سے منع کیا ہے اور قصہ موسیٰ و خضر سے اس مسئلہ پر استدلال کیا ہے کہ ساتھ چلنے کے لئے بھی اجازت لینا چاہئے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خضر سے ساتھ رہنے کی اجازت لی۔ اس کے جواب میں خضر علیہ السلام نے استادانہ ناز سے کام لیا کہ تم میرے ساتھ رہ کر تحمل نہیں کر سکتے ممکن ہے ان کو کشف سے معلوم ہو گیا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک خطا پر متنبہ کرنے کے لئے بھیجا ہے اس لئے ان کے ساتھ ناز استادانہ برتنا مناسب ہے کہ اس سے اصلاح کامل ہوگی۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا سَتَجِدُنِیْ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِیْ لَکَ اَمْرًا کہ نہیں ان شاء اللہ آپ مجھے صابر و متحمل پائیں گے اور میں کوئی بات آپ کے خلاف نہ کروں گا۔ سبحان اللہ۔ کیسی شان ہے کہ ابھی تو تمام عالم کے پیشوا اور مقتدا بنے ہوئے تھے اور آج دوسرے کی شاگردی اور اطاعت پر آمادہ ہیں۔ اس پر حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا فَاِنِ اتَّبَعْتَنِیْ فَلَا تَسْـَٔلْنِیْ عَنْ شَیْءٍ حَتّٰۤی اُحْدِثَ لَکَ مِنْهُ ذِکْرًا کہ اگر آپ میرے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو چپ چاپ ساتھ ہو لیں کسی معاملہ میں خود سوال کی ابتداء نہ کریں۔ جب تک میں خود نہ بتلاؤں۔

سالک کو سکوت لازم ہے

اس میں خاموشی کی تعلیم تھی اور یہاں سے معلوم ہوا کہ سالک کو سکوت لازم ہے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے ہر درویشے کہ چون و چرا کند و ہر طالب علمے کو چون و چرانکند ہر دور را ور چراگاہ باید فرست۔ (جو درویش چوں و چرا کرے اور جو طالب علم چون و چرا نہ کرے دونوں کو اپنی خانقاہ اور درسگاہ سے باہر نکال دینا چاہئے) اور اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس واقعہ میں موسیٰ علیہ السّلام کو خضر علیہ السلام نے طریقت کی یعنی طریق باطنی کی تعلیم دی تھی۔ ہرگز نہیں۔ کیونکہ طریقت شریعت سے جدا نہیں۔ شریعت ہی کی تکمیل ظاہر و باطن کا نام طریقت ہے اور اس میں موسیٰ علیہ السّلام سے حضرت خضر علیہ السلام زیادہ عالم نہ تھے اور جو واقعات ملاقات خضر کے بعد ظاہر ہوئے ہیں جن میں حضرت خضر علیہ السلام نے اپنا علم ظاہر کیا تھا ان کو طریقت سے کچھ بھی علاقہ نہیں بلکہ وہ تو محض کسب تکوینی سے تعلق رکھتے ہیں اور کشف کونی نہ کمال ہے نہ مقصود ہے۔ ہاں بلا طلب کے کسی کو حاصل ہو جائے تو نعمت ہے کیونکہ وہ بھی ایک علم ہے۔

حضرت خضر علیہ السّلام فی نفسہ شیخ طریقت تھے

اور میں نے جو خضر علیہ السّلام کے اقوال سے مسائل سلوک مثلاً سکوت سالک وغیرہ کا استنباط کیا ہے سو نہ اس وجہ سے کہ یہاں سلوک کی تعلیم تھی بلکہ اس وجہ سے کہ خضر فی نفسہ شیخ طریقت تھے ان کا مذاق یہی تھا۔ تو دیکھئے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو احتیاط فی الکلام کی تعلیم عملاً کس طرح دی کہ ان کو خضر کا شاگرد بنایا گیا جو ان سے کسی طرح بھی درجہ قرب میں زیادہ نہ تھے۔ نہ علوم شرائع و نبوت میں افضل تھے۔

اسی کی طرف یہاں اِلَّا بِشِقِّ الْاَ نْفُسِ بڑھا کر ہم کو متوجہ کیا گیا ہے کہ دیکھو ہم نے کلام میں کس قدر احتیاط کی ہے تم کو بھی احتیاط کرنا چاہئے۔

اب سمجھو کہ میں نے لَمْ تَكُوْنُوْا بَالِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَ نْفُسِ (مگر سخت مصیبت ہے) کے ترجمہ میں یہ کہا ہے کہ تم اس شہر میں مع اسباب واثقال کے نہ پہنچ سکتے تھے۔ حالانکہ نص میں صرف بالغیہ وارد ہے۔ بالغیہ بہا نہیں ہے مگر قرآنیہ مقام سے یہ بات معلوم ہے کہ

مراد بھی ہے تم مع اسباب واثقال کے وہاں نہ پہنچ سکتے تھے کیونکہ اگر بلوغ مع الاثقال مراد نہ ہوتا تو لَمْ تَكُوْنُوا بَالِغِيْهِ .کو تَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ سے ربط نہ ہوگا۔

مبالغہ خلاف احتیاط نہیں

پس ربط اس بات کو چاہتا ہے کہ لَمْ تَكُوْنُوا بَالِغِيْهِ سے مراد لَمْ تَكُوْنُوا بَالِغِيْهِ بِهَا ہے اور جب یہ مراد ہے تو مقام مبلغیہ کو مقتضی ہے اب یہ سوال ہوگا کہ اس کی جگہ بالغیہ کیوں فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مبالغہ کے لئے بالغیہ اختیار فرمایا کہ تم مع اسباب کے تو کیا جریدہ بھی وہاں نہ پہنچ سکتے تھے اور مبالغہ خلاف احتیاط نہیں۔ کیونکہ مخاطب پر مبالغہ کا مبالغہ ہونا مخفی نہیں رہتا۔

اس کے بعد ارشاد ہے اَلْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً یعنی خدا تعالیٰ نے گھوڑے اور خچر اور گدھے پیدا کیے سواری اور زینت کے لئے۔

سواری کی دو نعمتیں

یہاں حق تعالیٰ نے دو نعمتیں بیان فرمائی ہیں۔ ایک رکوب (سوار ہونا) دوسرے زینت چونکہ یہ مجموعہ سب انعام میں نہیں ہے اس لئے اس کو خیل و بغال و حمیر کے ساتھ ذکر فرمایا۔ کیونکہ اونٹ کی سواری میں کوئی زینت نہیں ہاں گھوڑے کی سواری میں بڑی زینت ہے اور خچر میں بھی زینت ہے کیونکہ وہ گھوڑے کے قریب ہی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ بعض روسا فٹن میں خچر کو بھی جوڑتے ہیں مگر گدھے میں شاید کلام ہو کہ ان میں کون سی زینت ہے۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ گدھے بھی سب گدھے نہیں ہوتے بلکہ بعضے گدھے خچر کے قریب ہوتے ہیں دوسرے یہ کہ جیسے خچر گھوڑے کے قریب ہے اسی طرح خر خچر کے قریب ہے اور قریب کا قریب قریب ہے مگر اس پر معقولی طلبہ کو یہ اعتراض ہوگا کہ اس طرح تو کلکتہ بھی قریب ہے کیونکہ ہمارے سے دہلی قریب ہے اور دہلی سے علی گڑھ۔ اس سے ٹونڈلہ، اس سے کانپور، اس سے آلہ آباد۔ اسی طرح قریب سے قریب کو ملاتے جاؤ اور اخیر میں کہہ دینا کہ قریب کا قریب ہے۔ مگر انہوں نے غور نہیں کیا کیونکہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ قریب کا قریب قریب ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کے درمیان وسائط زیادہ نہ ہوں اور عرفاً ایک دو واسطہ سے بعد نہیں ہوتا اس سے زیادہ سے بعد ہو جاتا ہے

اور قرآن میں کلام محاورات کے موافق ہے۔ اس کو عرف سے سمجھنا چاہیے۔ سو عرف میں ایک دو واسطہ بعید نہیں سمجھا جاتا۔ مثلاً کوئی اپنے کو فاروقی صدیقی کہے تو اس میں بعد نہیں اور کوئی اپنے کو نوح علیہ السّلام آدم علیہ السّلام کی طرف منسوب کرے تو اس میں بعد ہوگا۔

ایک بھنگی کا لطیفہ

جیسے ایک بھنگی ڈوبنے لگا تھا اس نے چلا کر کہا، ارے میں ڈوبا مجھے بچاؤ، تو کسی نے اس کے حال پر توجہ نہ کی تو اس نے یوں کہنا شروع کیا کہ نبی زادہ ڈوبا جاتا ہے جلدی بچاؤ۔ یہ سن کر لوگ دوڑ پڑے اور اس کو نکال لیا۔ دیکھا تو بھنگی ہے کہا تو نبی زادہ کدھر سے ہو گیا تو وہ جواب دیتا ہے کہ آدم علیہ السّلام نبی تھے یا نہیں؟ کہا ہاں، کہا میں آدم کی اولاد میں ہوں یا نہیں؟ تو میں بھی نبی زادہ ہوا۔

تیسرے یہ کہ گدھا غریب تو خواہ مخواہ ہی ذلیل اور بدنام ہے ورنہ عقلاً اس میں ذلت کی کیا چیز ہے۔ مشہور یہ ہے کہ گدھا بیوقوف ہوتا ہے مگر ایک گدھے والے جو شیخ زادہ تھے اور بزادہ کا کام کرتے تھے مجھ سے کہتے تھے کہ گدھا بڑا عاقل ہوتا ہے اب ہمیں تحقیق کی ضرورت نہیں پس تقلید ہی کافی ہے ہاں اس کی آواز البتہ منکر ہے مگر یہ ذلت کا سبب نہیں ہو سکتا۔ آخر توپ کی آواز ہی کونسی اچھی ہے کان کے پردے پھاڑ ڈالتی ہے مگر ذلیل نہیں پس یہ مسلّم کہ گدھے کی آواز بری ہے۔ خصوصاً جب کہ سب مل کر بولیں ہمیں اس کا زیادہ تجربہ ہے۔ کیونکہ ہم گدھوں کے محلہ میں رہتے ہیں اس لئے مجھے اس پر اتفاق ہے اور نص میں بھی تو اس کی آواز کو انکر الاصوات کہا گیا ہے مگر صوت کے منکر ہونے سے اس کی ذات میں ذلت نہیں آتی۔

ایک حدیث سے متعلق بعض ملحدین کے اعتراض کا جواب

اور ایک عجیب بات ہے کہ گرمیوں کے موسم میں خصوصیت کے ساتھ گدھے زیادہ بولتے ہیں اسی کی بناء پر بعض ملحدین نے اس حدیث پر اعتراض کیا تو اذا[1] سمعتم نهيق الحمار فتعوذوا بالله فانه رائی شیطانا (کہ جب گدھے کی آواز سنو تو اللہ کی پناہ مانگو

---

[1] إذا سمعتم نباح الكلاب أو نهيق الخ سنن أبي داؤد: ۵۱۰۳، مسند الامام أحمد ابن حنبل ۳: ۳۰۶، المستدرك للحاكم ۴: ۲۸۳، مشكوٰة المصابيح: ۴۳۰۲، تفسير ابن كثير ۶: ۳۴۲

کیونکہ اس نے شیطان کو دیکھا ہے اور اس کو دیکھ کر بولا ہے کہ اگر وہ شیطان کو دیکھ کر بولتا ہے تو
اس کی کیا وجہ ہے کہ گرمیوں میں زیادہ بولتا ہے کیا گرمیوں میں شیطان کو زیادہ دیکھتا ہے؟ اس
کا ایک جواب تو یہ ہے کہ ہاں یہ بھی کچھ بعید نہیں کیونکہ شیاطین نار سے پیدا ہوئے ہیں ممکن
ہے ان کو حرارت سے خوشی ہوتی ہو اس لئے گرمیوں میں زیادہ پھیلتے ہوں اور دوسرا جواب یہ
ہے کہ حدیث میں انه رائی شیطانا قضیہ مطلقہ ہے جو بعض ازمنہ میں وقوع سے بھی صادق
ہوسکتا ہے لہٰذا نہیق حمار کے بعض افراد بھی اگر رویت شیطان سے ناشی ہوں یہ قضیہ صادق
ہو جائے گا۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر نہیق کا سبب رویت شیطان ہی ہو اور یہ وہ بت ہے۔

قضیہ مطلقہ

جو میں نے دہلی کے ایک جلسہ میں ایک عالم کے جواب میں بیان کی تھی اور یہ وہ وقت
تھا جبکہ یونان نے ترکی حکومت کو شکست دے کر اوڈریانوپل وغیرہ فتح کر لئے تھے جس سے
بعض ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کے دلوں میں اضطراب اور تزلزل آ گیا تھا اور ملاحدہ تو برملا
کہنے لگے تھے کہ خدا بھی نصرانیت کا حامی ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کا حامی نہیں۔ اس پر
دہلی کے بعض مخلصین نے مجھے بلایا کہ یہاں بیان کی ضرورت ہے تا کہ اس قسم کے شبہات کا
ازالہ کیا جائے چنانچہ میں گیا اور اسی موضوع پر بیان ہوا جس میں اس قسم کے شکوک و شبہات
کا بہت خوبی کے ساتھ بحمد اللہ ازالہ کر دیا گیا اور خاتمہ پر بطور اتمام حجت کے میں نے یہ بھی
کہہ دیا کہ اگر اب بھی کسی کے ذہن میں کچھ شبہ اور وسوسہ ہو تو ظاہر کر دے ایسا نہ ہو کہ میرے
جانے کے بعد یوں کہا جائے کہ یہ شک رہ گیا اور وہ شبہ رہ گیا اور یہ بات منجانب اللہ اتمام
حجت کے لئے میری زبان سے نکل گئی تھی ورنہ میں اس قابل نہ تھا کہ اس طرح تحدی کے
ساتھ اعلان کرتا اس پر ایک پنجابی عالم کھڑے ہوئے اور کہا اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے
ہیں وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُوْنَ
(اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد یہ لکھ دیا ہے کہ اس زمین کے وارث و مالک میرے
نیک بندے ہوں گے) پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ اس کے مالک کفار ہو گئے۔ میں نے کہا
مولانا آپ تو عالم ہیں ذرا یہ تو دیکھئے کہ یہ قضیہ دائمہ ہے یا مطلقہ ہے؟ چونکہ وہ عالم تھے اتنی

ہی بات سے سمجھ گئے اور کہا بس بس میں سمجھ گیا اب کچھ شبہ نہیں رہا (حاصل جواب کا یہ ہوا کہ آیت میں یہ نہیں کہا گیا کہ زمین کے مالک ہمیشہ نیک ہی بندے ہوں گے کفار کبھی مالک نہ ہوں گے۔ بلکہ اس میں اطلاق کے ساتھ یہ وعدہ ہے کہ میرے نیک بندے زمین کے وارث ہوں گے اور اطلاق کے صدق کے لئے ایک بار وقوع کافی ہے چنانچہ بحمد اللہ حضرات صحابہؓ روئے زمین کے مالک بن چکے ہیں۔ زمانہ عروج اسلام میں کوئی سلطنت مسلمانوں کے مقابلہ کی تاب نہ رکھتی تھی۔ اور یہ جواب اس تقدیر پر ہے کہ یہ تسلیم کرلیا جائے کہ ان الارض سے مراد بھی دنیا کی زمین ہے۔ ورنہ ظاہراً آیت کے سیاق وسباق سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد ارض جنت ہے کہ جنت کی زمین کے مالک نیک بندے ہوں گے۔ اس پر کچھ بھی اشکال نہیں خوب سمجھ لو ۱۲) بہر حال حدیث پر کچھ اشکال نہیں ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ نہیق حمار کا سبب رویت شیطان ہے مگر یہ دائی سبب نہیں۔ ممکن ہے کبھی وہ اپنی طبیعت سے بھی چیختا ہو اور قضیہ کے مطلقہ یا دائمہ ہونے پر نظر کرنے سے بہت سے اشکال کے جواب میں پریشان ہو جاتے ہیں ان کو چاہئے کہ جب کسی آیت یا حدیث پر اشکال وارد کیا جائے کہ یہ حکم فلاں مادہ میں متخلف ہے فوراً اس پر اول نظر کی جائے کہ آیت یا حدیث حکم دائمی ہے یا مطلق تو ان شاء اللہ معلوم ہوگا کہ زیادہ اشکالات کا منشا یہ ہے کہ لوگوں نے مطلقہ کو دائمہ سمجھ لیا ہے میں یہ کہہ رہا تھا کہ گدھے کی آواز کا منکر ہونا مسلم ہے مگر اس سے زینت پر کیا کلام ہے آواز کو زینت میں کچھ دخل نہیں بلکہ جس فن کی زینت عام طور پر آواز ہی سے سمجھی جاتی ہے یعنی فن موسیقی اس میں بھی اہل کسال آواز کی عمدگی کو کمال نہیں سمجھتے بلکہ کمال دوسری شے کو سمجھتے ہیں۔

حکایت حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ

چنانچہ ہمارے استاد مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کو ایک زمانہ میں جبکہ مولانا گورنمنٹ کے مدارس کے ممتحن مقرر تھے اور اجمیر میں ملازم تھے فن موسیقی سیکھنے کا شوق ہوا اور اس شوق کا منشا صرف یہ تھا کہ مولانا کو جامعیت کا شوق تھا۔ ہر علم کو حاصل کرنا چاہتے تھے اس کے سوا اور کچھ منشا نہ تھا کیونکہ مولانا کے ہم عمروں میں سے ایک ثقہ نے (جن کا نام مولوی رعایت الحق تھا) مجھ سے بیان کیا ہے کہ مولانا بچپن اور جوانی میں بھی ویسے ہی نیک تھے جیسے بڑے ہو کر نیک تھے۔ مولانا نے جوانی میں بھی کبھی معصیت کا ارتکاب نہیں کیا۔

غرض مولانا نے ایک میر صاحب سے جوفن موسیقی کے ماہر تھے اس فن کو حاصل کیا،
پھر مولانا کوتو اس شغل سے خدا تعالیٰ نے اس طرح نکالا کہ ایک دن آپ اپنے حجرہ میں بیٹھے
ہوئے جولب سڑک بالا خانہ پر تھا موسیقی کی مشق کر رہے تھے کہ ایک مجذوب نیچے سے گزرا
اور اس نے پکار کر کہا ارے مولوی! تجھے خدا نے اس کام کے واسطے پیدا نہیں کیا دوسرے کام
کے واسطے پیدا کیا ہے۔ مولانا کے دل میں تو اسی وقت سے نفرت پڑ گئی اور اس شغل کو چھوڑ
دیا اور مولانا کے استاد کو اس طرح نفرت ہوئی کہ ایک دفعہ کوئی راجہ اجمیر آیا وہ اس فن کا
شائق تھا اس نے سب اہل کمال کو جمع کیا ان میں وہ میر صاحب بھی تھے۔ انہوں نے جب
گانا شروع کیا تو راجہ کے ہمراہ جو ایک استاد تھا اس نے ان کی تعریف کرتے ہوئے یہ کہہ دیا
کہ سبحان اللہ کیا گلا پایا ہے بس اس پر انہوں نے ستار وغیرہ پھینک دیا اور کہا لعنت ہے اس
کام پر جس میں کمال حاصل کرنے کی داد وہ ملتی ہے جو ایک ڈوم کو دادوی جاتی ہے کہ کیا گلا
پایا ہے کیا موسیقی اس کا نام ہے کہ آواز اچھی ہو آواز تو ایک رنڈی کی اور ایک بچہ کی بھی مجھ
سے اچھی ہوسکتی ہے۔ اگر میرے فن کی یہی قدر ہے تو میں اس پر لعنت بھیجتا ہوں اس واقعہ
سے ان کو گانے بجانے سے نفرت ہوگئی اور دونوں استاد شاگرد اس کام سے تائب ہوگئے۔
یہ بظاہر مولانا کی برکت تھی کہ حق تعالیٰ نے مولانا کے استاد کو بھی آپ کی صحبت کی برکت
سے توبہ نصیب کی تو دیکھئے حالانکہ گانے بجانے کی خوبی اور زینت آواز ہی سے ہے مگر اہل
کمال کی نظر میں اس کی کچھ وقعت نہیں بلکہ وہ کمال کسی اور چیز کو سمجھتے ہیں پس آواز کی خرابی
سے گدھے کی زینت میں خرابی نہیں۔ مگر اس کو زیور اور عمدہ زین لگام پہنایا جائے تو گھوڑے
کی طرح یہ بھی اچھا لگے گا بمبئی میں دو سیٹھ بے اولاد تھے انہوں نے اپنا حوصلہ نکالنے اور شوق
پورا کرنے کے لئے ایک گدھے اور گدھی کی شادی کی تھی اولاد والے تو اپنے بیٹا بیٹی کی شادی
میں دل کے حوصلے نکالتے ہیں اور نام ونمود کے لئے بے دریغ روپیہ خرچ کرتے ہیں بے
اولادوں کو یہ خبط سوجھتا ہے کہ لاؤ جانوروں ہی کو بیٹا بیٹی بنا کر ان کا بیاہ کرو۔ چنانچہ ایک سیٹھ کا
گدھا تھا ایک کی گدھی تھی۔ ایک گدھے کا باپ بنا ایک گدھی کا اور دونوں کو خوب عمدہ لباس
پہنایا گیا گدھی کو زیوروں سے آراستہ کیا گیا تو یقیناً وہ گدھی زینت میں گھوڑے سے کچھ کم نہ
رہی ہوگی ہندوستان کے گدھے اس واسطے بھی اچھے نہیں لگتے کہ ان کی خدمت نہیں کی جاتی

جس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں گدھے کی سواری کو معیوب سمجھا جاتا ہے اگر یہاں گھوڑے کی طرح گدھے کی بھی سواری کا رواج ہو جاتا اور گھوڑے کی طرح اس کی خدمت کی جاتی تو اتنا برا نہ لگتا چنانچہ عرب کے گدھے یہاں کے گدھوں سے اچھے ہوتے ہیں (خصوصاً نجد کے ۱۲) ان میں زینت بھی ہے اور سواری کا کام بھی گھوڑے کے برابر دیتا ہے۔ اگر کوئی یہ شبہ کرے کہ لباس اور زیور وغیرہ سے اونٹ میں بھی زینت آ جائے گی وہ بھی اچھا لگنے لگے گا ؟ تو میں کہتا ہوں ہاں لیکن اس کی بے ڈھنگی رفتار ساری زینت کو کھو دیتی ہے ۔

طاؤس را بہ نقش و نگارے کہ ہست خلق　　　تحسین کنند و او خجل از زشت پائے خویش

(مور کے نقش و نگار دیکھ کر مخلوق اس کی تعریف کرتی ہے اور وہ خود اپنے پاؤں دیکھ کر شرمندہ ہوتا ہے)

تفسیری نکتہ

اور یہاں ایک اور نکتہ قابل غور ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں لترکبوھا پر تو لام غایت داخل کیا ہے اور زینۃ پر لام داخل نہیں کیا گیا اس سے معلوم ہوا کہ رکوب تو ایسی غرض ہے جو قابل قصد ہے جو شان غایت کی ہوتی ہے اور زینت قابل قصد نہیں بلکہ امور زائدہ میں سے ہے اس لئے اس کو بصورت غایت ذکر نہیں فرمایا گو معنی غایت ہی ہے لیکن یہ امر مقصوداً قابل تحقیق ہے کہ اگر کوئی شخص زینت ہی کے لئے اور اسی قصد سے کسی چیز کا استعمال کرے مثلاً عمدہ لباس پہنے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جائز ہے مگر اطلاق کے ساتھ نہیں جس سے اہل تفاخر کو گنجائش مل سکے بلکہ اس میں تفصیل ہے جس کو میں موارد سے سمجھتا ہوں وہ تفصیل یہ ہے کہ عمدہ لباس اپنا جی خوش کرنے کے لئے یا اپنے کو ذلت سے بچانے کے لئے یا دوسرے شخص کے اکرام کے لئے پہنے تو جائز ہے مثلاً اگر ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلاں جگہ تشریف فرما ہیں تو ہم یقیناً عمدہ لباس پہن کر جائیں گے اور اس وقت مقصود حضور کی تعظیم ہوگی۔ انسان اپنے معظم کے سامنے اچھے ہی لباس میں جایا کرتا ہے تا کہ اس کی عظمت ظاہر ہو۔ ہاں عمدہ لباس اس نیت سے پہننا حرام ہے کہ اپنی عظمت ظاہر کی جائے اور دوسروں کی نظر میں اپنی بڑائی ثابت کی جائے۔

11 لباس کے چار درجے

خلاصہ یہ ہوا کہ لباس میں چار درجے ہیں ایک تو ضرورت کا درجہ ہے دوسرا آسائش کا تیسرا آرائش بمعنی زینت کا۔ یہ تین درجے تو مباح ہیں بلکہ پہلا درجہ واجب ہے اور چوتھا درجہ نمائش کا ہے یہ حرام ہے اور یہ لباس ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر چیز میں یہی چار درجے ہیں ایک ضرورت، دوسرے آسائش، تیسرے آرائش، چوتھے نمائش ضرورت کا قافیہ بھی اگر مل جاتا تو اچھا ہوتا کہ کلام میں زینت ہو جاتی اور زینت جائز ہے غرض دوسروں کی نظر میں اپنی وقعت بڑھانے کو زینت کرنا حرام ہے باقی نفس زینت حرام نہیں دیکھئے شریعت کے کیسے پاکیزہ حدود ہیں اور اس میں کس قدر وسعت ہے کہ چار درجوں میں سے صرف ایک درجہ کو حرام کیا گیا ہے۔ باقی سب کی اجازت ہے مگر افسوس ملحدین آنکھیں بند کر کے شریعت پر تنگی کا الزام لگاتے ہیں واللہ ان لوگوں نے شریعت کو دیکھا ہی نہیں اور اگر دیکھا ہے تو سمجھا نہیں اس کے بعد ارشاد ہے یَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ اور اللہ تعالیٰ وہ وہ چیزیں پیدا کرتے ہیں جن کو تم نہیں جانتے۔ مطلب یہ ہے کہ مخلوقات الٰہیہ کا تمہاری معلومات ہی میں انحصار نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ ایسی چیزیں بھی پیدا کرتے رہتے ہیں جن کی تم کو خبر نہیں۔ مثلاً زمین کے اندر بعض جراثیم ایسے پیدا ہوتے ہیں جو انسان وحیوان کے لئے قاتل ہیں اور بعض مواد ایسے پیدا ہوتے ہیں جو موذیات کو فنا کرنے والے ہیں ہم کو اس کی کچھ بھی خبر نہیں ہوتی کہ کون سا مادہ کب پیدا ہوا اور کب فنا ہو گیا۔

تفسیری چند فوائد

یہ تو آیت کی تفسیر تھی اب میں اس کے متعلق چند فوائد ذکر کرنا چاہتا ہوں ایک فائدہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں جو ایک سواری ریل ایجاد ہوئی ہے بعض ذہنوں کو اس کے متعلق اس کی تلاش ہے کہ ریل کا ذکر بھی قرآن شریف میں کہیں ہے یا نہیں ہر چند کہ اس کی کچھ ضرورت نہیں کیونکہ قرآن حرفت وصنائع اور ایجادات کے بیان کرنے کو نازل نہیں ہوا جیسا کہ بارہا میں نے اس پر متنبہ کیا ہے اور قرآن کو جو تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (ہر چیز کو بیان کرنے والا) کہا

اصلاح مخالا نمبر-11

گیا ہے تو وہاں کل شیٔ سے مراد کل شیٔ من امور الدین (دین کے جملہ امور میں سے ہر چیز) ہے نہ کہ کل شیء ولو من امور الدنیا اس لئے یہ تحقیق مذکور محض ایک امر زائد ہے لیکن تبرعاً اس کو بھی بیان کرتا ہوں کیونکہ اس وقت یہ بیان ایک ایسی ہی نعمت کے شکریہ میں ہورہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ریل کے متعلق ہم کو عطا فرمائی ہے اور جس کو دوسرے مرکوبات کے ساتھ وصف مرکوبیت میں مشارکت بھی ہے سو بعض ذہینوں نے اس کو سورۂ یٰسں کی اس آیت وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ میں داخل کیا ہے کہ اس میں ریل کا بھی ذکر آ گیا ہے (کیونکہ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ لوگوں کے لئے اس بات میں بھی قدرت کی دلیل موجود ہے کہ ہم نے ان کی اولاد کو بھری بھری کشتیوں میں سوار کیا اور ہم نے ان کے لئے کشتی کے مثل اور چیزیں بھی پیدا کی ہیں جن پر وہ سوار ہوتے ہیں) اور ریل سب سے زیادہ کشتی اور جہاز کے مشابہ ہے کہ جیسے جہاز میں انسان اپنی تمام ضروریات کو ساتھ لے کر سفر کرتا ہے ایسے ہی ریل میں کرسکتا ہے مگر یہ قرآن کی تحریف ہے کیونکہ یہاں خلقنالھم صیغہ کا ماضی کا ہے تو لازم آئے گا کہ ریل کا وجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی ہوا اور اس کا بطلان ظاہر ہے بلکہ اس سے مراد بعض کے نزدیک تو اونٹ ہے اور اس کا لطف عربیت کے جاننے سے زیادہ آئے گا کیونکہ اہل عرب اونٹ کو سفائن البر یعنی خشکی کا جہاز کہتے تھے چنانچہ یہ مصرعہ مشہور ہے سفائن برو السراب بحارھا اور میرے نزدیک اس سے مطلق انعام مراد ہیں کیونکہ سورۂ زخرف میں ہے وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَ الْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ (اور تمہارے لئے کشتیاں اور جانور بنائے جس پر تم سواری کرتے ہو) یہاں فلک اور انعام دونوں کو ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انعام و کشتی باہم متناسب ہیں مگر مماثلت کی صورت جب ذہن میں آئے گی کہ کشتی تو چھوٹی لو اور جانور بڑا یہ نہیں کہ جانور چھوٹا لو اور جہاز سے اس کا موازنہ کرو۔

بالک ہٹ

جیسے بیربل اور اکبر شاہ کا قصہ ہے کہ اکبر نے بیربل سے کہا تھا کہ مثل مشہور ہے راج ہٹ، تریاہٹ، بالک ہٹ، سواول کی دو ضدیں تو واقعی سخت ہیں باقی تیسری کیا مشکل ہے

بیربل نے کہا حضور سب سے سخت تو یہی ہے البتہ اگر عقل ہو تو پھر مشکل نہیں۔ اکبر شاہ نے کہا اس میں عقل کی کون سی ضرورت ہے بیربل نے کہا بہت اچھا میں بچہ بنتا ہوں۔ آپ میری ضد پوری کیجئے۔ بادشاہ نے کہا اچھا تو بچہ بنو اور ضد کرو ہم ہر ضد کو پورا کریں گے بیربل نے بچوں کی طرح رونا شروع کیا اور کہا ہم تو ہاتھی لیں گے اکبر نے فیل خانہ سے ہاتھی منگوا دیا اس نے پھر رونا شروع کیا اور کہا ہم تو کلھیا لیں گے اکبر نے کلھیا بھی منگوا دی وہ پھر رونے لگا اور کہا ہاتھی کو کلھیا میں رکھو یہاں اکبر عاجز ہو گیا اور کہا اچھا تم جو کہتے تھے کہ اگر انسان عاقل ہو تو بچوں کی ضد پوری کر سکتا ہے یہاں عقل کیا کام دے گی۔ بیربل نے کہا حضور عقل کے ساتھ بچہ کی ضد ضرور پوری کی جا سکتی ہے۔ اکبر نے کہا اچھا لو ہم بچہ بنتے ہیں تم ہماری ضد پوری کرو۔ چنانچہ آپ نے اسی سبق کو دہرایا کہ ہم تو ہاتھی لیں گے بیربل نے بازار سے مٹی کا ننھا سا ہاتھی منگا دیا پھر کہا ہم تو کلھیا لیں گے اس نے بڑی سی کلھیا منگا دی پھر کہا ہاتھی کو اس میں بند کرو۔ بیربل نے ہاتھی کو کلھیا میں رکھ دیا اور کہا حضور نے یہ غلطی کی کہ بچہ کی ضد پر فیل خانہ سے ہاتھی منگایا۔ آپ کو بچہ ہی کے مناسب ہاتھی منگانا چاہئے تھا اسی طرح یہاں فلک وانعام میں مناسبت کا لحاظ کر کے کشتی چھوٹی اور جانور بڑا لینا چاہئے۔

قرآن اور ایجادات جدید کا ذکر

اور بعض حضرات نے ریل کو سورۂ نحل کی اس آیت وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ میں داخل کیا ہے (کہ اللہ تعالیٰ ایسی ایسی چیزیں پیدا کرے گا جن کو تم نہیں جانتے) گو یہ تحریف تو نہیں ہے مگر بعید ضرور ہے کیونکہ یخلق بظاہر صیغہ حال ہے اور ظاہر ہے کہ ان سواریوں میں جو آج کل ایجاد ہوئی ہیں صحابہؓ کے زمانہ میں کوئی بھی پیدا نہیں ہوئی اور اگر اس کو مستقبل لیا جائے تو صحابہ کچھ سمجھے ہی نہ ہوں گے۔ پھر یہ ایجادات خلق کے بعد تو معلوم ہو گئیں اور اس آیت کے تحت میں وہی اشیاء داخل ہو سکتی ہیں جو بعد خلق کے بھی معلوم نہ ہوں اس لئے اس کی تفسیر میں سہل بات وہی ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے کہ مراد وہ چیزیں ہیں جو انسان کے لئے مثل نعم مذکورہ کے نافع ہیں اور تم کو ان کی خبر بھی نہیں جیسے مواد ارضیہ جو موذیات کو فنا کرتے رہتے ہیں اور نافع

ہونے کی قید باقتضاء مقام ہے کہ اشیاء نافعہ کا ذکر ہو رہا ہے پس حاصل مقام کا یہ ہوا کہ ہم ایسے نفع رساں ہیں کہ بعض چیزوں کی تم کو خبر بھی نہیں اور ہم ان سے تم کو نفع پہنچا رہے ہیں یہ نہ سمجھو کہ بس وہی چیزیں تمہارے نفع کی پیدا کی ہیں جو تم کو معلوم ہیں جیسے نعم مذکورہ اور اس تقریر پر یَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کا ربط بھی نعم مذکورہ سے ظاہر ہو گیا یعنی ربط تقابل۔

نعمت رحمت میں داخل ہے

اور بعض حضرات نے مَا یَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِکَ لَهَا (اللہ تعالیٰ جس رحمت کو لوگوں کے لئے کشادہ کرنا چاہیں کوئی اس کا روکنے والا نہیں) میں ریل کو داخل کیا ہے کیونکہ بعض سلف نے فرمایا ہے کہ من رحمۃ میں ہر وہ نعمت داخل ہے جو بندوں کی راحت و آسانی کے لئے ایجاد ہوئی ہے چنانچہ شغدف وغیرہ کو بھی انہوں نے اس میں داخل کیا ہے اس میں البتہ زیادہ بعد نہیں اسی واسطے میں نے بھی اپنی تفسیر کے حاشیہ میں اس مقام پر لکھ دیا ہے کہ من رحمۃ کے عموم میں ریل بھی داخل ہے اور اتفاق عجیب یہ ہوا کہ جس دن میں اس آیت کی تفسیر لکھ رہا تھا اسی دن پہلے پہل ہمارے قصبے کے سامنے سے ریل گذری ہے اس لئے میں نے تفسیر کے حاشیہ میں یہ بھی لکھ دیا کہ بحمداللہ آج ہماری بستی کے سامنے سے عیدگاہ کے قریب ریل گذری ہے اور اس کے ساتھ ریل کے جاری ہونے کا سن اور تاریخ بھی لکھ دی تا کہ محفوظ رہے غرض اس آیت میں ریل کا داخل کرنا بعید نہیں اور خود میں نے بھی اسی میں اس کو داخل کیا تھا۔ لیکن اس وقت میرے ذہن میں ایک بات اس سے بھی زیادہ قریب آئی ہے وہ یہ کہ اگر ذکر کو حقیقی اور حکمی کے لئے عام لیا جائے تو میرے نزدیک ریل کا ذکر وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بَالِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ (وہ تمہارے بوجھ بھی لاد کر ایسے شہروں کو لے جاتے ہیں جہاں تم اپنی جان کو مشقت میں ڈالے بغیر نہ پہنچ سکتے تھے) میں سب سے اقرب طرق کے ساتھ ہو جاوے گا کیونکہ حق تعالیٰ نے یہاں مراکب میں وجہ نعمت اس غایت کو بیان فرمایا ہے کہ وہ تمہارا بوجھ ایسے بلاد تک پہنچاتے ہیں جہاں تم بدوں مشقت کے نہیں پہنچ سکتے تھے تو جس سواری میں

بھی یہ غایت موجود ہوگی وہ حکماً اس نعمت میں داخل ہوکر مثل انعام کے نعمت کی ایک فرد ہوگی اور ریل میں یہ غایت سب سے زیادہ موجود ہے تو وہ بھی حکماً اس نعمت میں داخل ہے اور جب نعمت میں داخل ہے تو جس طرح نعمت انعام پر ہم کو شکر کی تعلیم دی گئی ہے اسی طرح نعمت ریل پر بھی شکر ادا کرنا چاہئے مگر اکثر لوگ اس سے غافل ہیں۔

حکایت حضرت مولانا شیخ محمد صاحب تھانویؒ

میں نے بچپن میں مولانا شیخ محمد صاحبؒ کا (جو تھانہ بھون کے بڑے علماء میں سے تھے ۱۲) ایک وعظ سنا تھا اس وقت میری عمر زیادہ نہ تھی مگر مولانا سے مجھے محبت تھی اور مولانا کو مجھ سے محبت تھی اس لئے میں کوشش کر کے وعظ میں شرکت کیا کرتا تھا اس لئے مجھے مولانا کے مواعظ کی کچھ کچھ باتیں اب تک یاد ہیں چنانچہ ایک بار مولانا نے وعظ میں فرمایا کہ مجھے ریل کا نعمت ہونا ابھی تک محسوس نہ ہوا تھا یعنی اس طرف التفات نہ ہوا تھا مگر ایک دن جو ریل میں بیٹھا اور جلدی سے منزل پر پہنچ گیا تو اس وقت اس نعمت کی بڑی قدر ہوئی اور معلوم ہوا کہ ریل بھی حق تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے جو ہم لوگوں کو عطا ہوئی ہے پس میں آپ صاحبوں کو بھی مطلع کرتا ہوں کہ اس کو نعمت سمجھو اور اس کا شکر ادا کرو۔ تو جب بڑے بڑے علماء کو اس کا نعمت ہونا جلدی معلوم نہیں ہوا تو عوام کو اگر اس کا نعمت ہونا معلوم نہ ہو تو زیادہ شکایت نہیں۔ مگر تنبیہ کے بعد تو احساس ہونا چاہئے اس لئے میں بھی مولانا شیخ محمد صاحبؒ کی طرح کہتا ہوں کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھو اور اس پر شکر کرو۔

ریل پر سوار ہوتے ہوئے کیا پڑھنا چاہئے

اور شکر مراکب کے دو صیغے قرآن میں وارد ہیں ایک سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَلَنَا ھٰذَا وَمَا کُنَّالَہٗ مُقْرِنِیْنَ وَاِنَّا اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ (وہ ذات پاک جس نے ہمارے لئے اس سواری کو مسخر کیا جبکہ ہم اس کو قابو کرنے والے نہ تھے، اور ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹنے والے ہیں) جو رکوب انعام کے وقت اللہ تعالیٰ نے ہم کو تعلیم فرمایا ہے اور دوسرے بِسْمِ اللّٰہِ مَجْرِیھَا وَمُرْسٰھَا اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔ (اس کا چلنا اور اس کا ٹھہرنا سب

اللہ ہی کے نام سے ہے بالیقین میرا رب غفور ہے رحیم ہے) جو رکوب سفینہ کے وقت نوح علیہ السلام نے اختیار فرمایا تھا اور چونکہ ریل کو حمل اثقال میں انعام کے ساتھ بھی مشابہت ہے اور سرعت سیر وغیرہ میں کشتی کے ساتھ اس لئے بہتر ہے کہ دونوں کو جمع کر لیا جائے۔

ریل سے جہنم کی یاد تازہ ہوتی ہے

ایک فائدہ یہ ہے کہ مولانا محمد یعقوبؒ صاحب نے فرمایا تھا کہ ریل کو دیکھ کر مجھے جہنم یاد آتی ہے کیونکہ اس کا انجن جہنم کی اس صفت کا مصداق ہے وَهِيَ تَفُورُ تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ کہ اس قدر جوش کھاتا ہے گویا غصہ اور قہر سے ابھی پھٹ پڑے گا اور ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے کہ ریل کے تیسرے درجہ جہنم کی اس صفت کا مذکور ہونا ہے كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَّعَنَتْ أُخْتَهَا کہ جیسے جہنم میں ایک جماعت دوسری جماعت پر لعنت کرے گی ایسے ہی ریل میں تیسرے درجہ والے آپس میں خوب لڑتے ہیں جب کسی اسٹیشن پر نئے نئے مسافر تھرڈ میں بھرتے ہیں تو جو پہلے سے بیٹھے ہوتے ہیں وہ انہیں کوستے برا بھلا کہتے ہیں کہ سارے اسی گاڑی میں آ جاؤ تمہارے واسطے اور کہیں جگہ نہیں رہی۔ منہ پر آنکھیں نہیں کہ یہ تو پہلے ہی سے بھر رہی ہے بس تمہاری سزا یہ ہے کہ کھڑے رہو۔ وہ جواب میں کہتے ہیں کہ جگہ تو بہت ہے سیدھے ہو کر بیٹھو کیا تم ہی نے کرایہ دیا ہے تم ریل کے مالک ہو پھر خوب گالم گلوچ اور جھگڑا فساد ہوتا ہے۔ اس وقت بالکل یہی منظر ہوتا ہے كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَّعَنَتْ أُخْتَهَا اور جب کہتے ہیں کہ ہم نے بھی تو ٹکٹ لیا ہے اس وقت اس کا نمونہ ہوتا ہے لکل ضعف اور جب کہتے ہیں کہ تم کو ہم پر کیا ترجیح ہے اس وقت اس کا نمونہ ہوتا ہے فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ۔

ریل میں جنت کی ایک شان

اور ایک شان اس میں جنت کی بھی ہے وہ یہ کہ جنت میں جس چیز کو دل چاہے گا وہ جلدی مل جائے گی اس بات میں ریل جنت کے مشابہ ہے کہ جس چیز کو دل چاہتا ہے ریل کے ذریعہ سے جلدی حاصل ہو جاتی ہے چنانچہ کلکتہ اور پشاور کے میوے یہاں دوسرے دن پہنچ جاتے ہیں بڑے شہروں میں ہر ملک کی چیزیں ہر وقت ملتی ہیں نیز جیسے جنت میں جہاں

جانے کو دل چاہا فوراً پہنچ گئے اسی کا نمونہ گوادنی ہی نمونہ ہو اس میں بھی ہے چنانچہ ظاہر ہے اور اس کے متعلق اسٹیشنوں کے انداز سے تقارب اور ہر اسٹیشن پر ضرورت کی چیزیں ملنا بالکل بلاد سباط کو یاد دلاتا ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّ قَدَّرْنَا فِيهَا السَّيْرَ سِيرُوا فِيهَا لَيَالِيَ وَ اَيَّامًا اٰمِنِيْنَ۔ (اور ہم نے ان کے اور ان کی بستیوں کے درمیان میں جہاں ہم نے برکت کر رکھی ہے بہت سے گاؤں آباد کر رکھے تھے جو نظر آتے تھے اور ہم نے ان دیہات کے درمیان ان کے چلنے کا ایک خاص انداز کر رکھا تھا کہ بے خوف خطر ان میں راتوں کو اور دنوں کو چلو۔) اور گو یہ نعمت دنیوی تھی مگر اس پر ناشکری کی مذمت اس طرح فرمائی گئی فَقَالُوْا رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا وَظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنَاهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ (پس وہ کہنے لگے کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے سفروں میں درازی کر دے اور انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا پس ہم نے ان کو افسانہ بنا دیا اور بالکل تتر بتر کر دیا) الآیۃ پس اس طرح یہ ریل بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے اس کا شکر کرنا چاہیے اور اس کے اندر جو مشابہتیں جنت و دوزخ کی مذکور ہوئیں ان پر اگر نظر کی جائے تو نعمت ظاہرہ کے ساتھ اس سے نعمت باطنہ یعنی تذکرآخرت بھی حاصل ہوگی۔

نعمت خاصہ برائے اہلیان تھانہ بھون

اور ریل میں یہ نعمت عامہ تو سب لوگوں کے لئے تھی جس کا یہاں تک ذکر ہوا اور ایک نعمت خاص ہماری بستی کو یہ حاصل ہوئی ہے کہ ہمارا اسٹیشن پہلے بہت دور تھا اب خدا کے فضل سے بہت قریب ہو گیا جس سے قصبہ والوں کو اور باہر سے یہاں آنے والوں کو بہت ہی راحت اور آسانی ہو گئی اس کا بھی ہم لوگوں کو شکر کرنا چاہیے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ (اگر شکر کرو گے تو میں نعمت کو ترقی دوں گا) اس لئے ان شاء اللہ امید ہے کہ یہ نعمت جس حال میں اس وقت ہے اس سے ترقی پا جائے گی۔ (مثلاً یہ کہ اسٹیشن جو قریب بنا ہے عارضی سے مستقل ہو جائے گا ۱۲) اور چونکہ شریعت کی ہم کو یہ بھی تعلیم ہے من لم يشكر الناس لم يشكر الله (جو شخص انسانوں کا شکر گزار نہیں وہ رب کا بھی شکر ادا نہیں کرتا) کہ

نعمت جن لوگوں کے واسطہ سے تم کو ملے ان لوگوں کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہیئے اس لئے جو لوگ اس امر میں ساعی ہوئے ہیں ہم کو ان کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہیئے یہ بھی شکر نعمت کا تتمہ ہے اور ان کے شکر کا طریقہ یہ ہے کہ زبان سے ان کی تعریف کی جائے۔ ان کو دعا دی جائے اور ان کے اس احسان کو لوگوں میں ظاہر کیا جائے۔

منعم حقیقی کا شکر ہے

(اور سب سے زیادہ منعم حقیقی اللہ جل جلالہ کا شکریہ ادا کیا جائے کہ بدوں ان کی مشیت وحکم کے کچھ نہ ہوسکتا تھا حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی نے اس قصبہ پر یہ انعام فرمایا ورنہ بظاہر اس کی کچھ اُمید نہ رہی تھی اللّٰھم ما اصبح بنامن نعمة اوباحد من خلقک فمنک وحدک لاشریک لک فلک الحمد ولک الشکر دائما ابد احمد الایرید قائلہ الا رضاک ۱۲ جامع) اور اس نعمت الٰہیہ کا شکریہ بہت دنوں تک کرنا چاہیئے بھول نہ جائیں اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اپنی نعمتوں کے شکریہ کی توفیق دے اور ادائے شکر بالعمل کی بھی توفیق دے اور دخول جنت کے ساتھ اتمام نعمت فرمائیں آمین۔

و صلی اللّٰہ علی سیّدنا و مولانا محمّد وعلی الہ و اصحابہ اجمعین و اخردعوانا ان الحمدللّٰہ رب العلمین.

نوٹ:۔ اس بیان کے بعد حضرت حکیم الامۃ نے فرمایا کہ ایک فائدہ اس آیت کے متعلق اور ذہن میں تھا جو بیان نہ ہوسکا وقت پر ذہن سے نکل گیا اگر بعد ظہر کے طبیعت اچھی رہی تو بیان کردوں گا۔

ترجیح المفسدہ علی المصلحہ

یعنی گناہ کسی عقلی یا حالی مصلحت سے حلال نہیں ہوتا یہ وعظ جامع مسجد تھانہ بھون میں ۳ جمادی الثانی ۱۳۳۰ ہجری کو ہوا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھدان سیدنا و مولانا محمداً عبدہ و رسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ و بارک وسلم۔

اما بعد فَاَعُوْذُ بِاللّٰہ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّ جِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّ حِیْمِ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ قُلْ فِیْھِمَا اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُھُمَا اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِھِمَا۔(البقرہ آیت نمبر ۲۱۹)

یعنی لوگ آپ سے شراب اور قمار کی نسبت دریافت کرتے ہیں آپ فرمادیجئے کہ ان دونوں میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں ہیں لوگوں کو بعضے فائدہ بھی ہیں اور وہ گناہ کی باتیں ان فائدوں سے زیادہ بڑھی ہوئی ہیں)

خلاصہ آیت متلو

یہ ایک آیت کا ٹکڑا ہے لیکن مجھ کو خاص اسی جزو کی تفسیر کرنا اور جس بارے میں یہ جزو آیت ہے خصوصیت سے اسی کو بیان کرنا مقصود ہے اور مجھ کو اس سے ایک غلطی کے رفع کا استنباط کرنا منظور ہے جس کو میں عرض کروں گا اول بطور تمہید کے اس جزو آیت کا خلاصہ عرض کیا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لوگوں نے خمر اور قمار کا حکم پوچھا تھا اس کے جواب میں ارشاد ہے کہ ان میں بڑا گناہ ہے۔ اور لوگوں کے لئے ان میں منافع بھی ہیں اور ان دونوں کا گناہ ان کے نفع سے بڑھ کر ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت تحریم خمر و میسر سے پہلے کی ہے اور اس سے حرمت ثابت نہیں ہوتی ہے لیکن لفظوں میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کچھ تسامح ہوا ہے اس لئے کہ باوجود لفظ اثم کبیر کے یہ سمجھ میں نہیں آتا پس ظاہر یہ آیت بھی تحریم کے بعد ہی کی ہے ہاں یہ ضروری ہے کہ اس کے بعد والی آیت یعنی

حاصل آیت متلو

یَا یُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ الخ (یعنی اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور بت وغیرہ اور قرعہ کے تیر سب گندی باتیں، شیطانی کام ہیں) اس کی زیادہ تاکید ہے اس لئے ممکن ہے کہ اس آیت کو سن کر بعض لوگوں نے لفظ منافع پر نظر کر کے شراب کے ترک میں سستی کی ہو اور فِیْھِمَا اِثْمٌ کَبِیْرٌ (ان دونوں میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں ہیں) میں کچھ تاویل کر لی ہو مثلاً یہ کہ ان کو خود اثم نہیں فرمایا بلکہ متضمن اثم فرمایا ہے اس طرح سے کہ کبھی یہ مفضی الی المعاصی ہو جاتے ہیں تو جب ایسا انتظام کر لیا جائے کہ یہ احتمال نہ رہے تو جائز ہوگا جیسے قبیح لغیرہ کی شان ہوتی ہے مگر یہ تاویل بہت بعید ہے اس لئے نہایت شدومد سے یَا یُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا الخ. نازل ہوئی لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس سے قبل تحریم نہیں ہوئی تھی اور منافع للناس سے جواز پر تمسک نہیں ہو سکتا اس لئے کہ کسی محرم شئے میں منافع کے وجود سے اس کی اباحت پر استدلال نہیں ہو سکتا بلکہ منافع کا ذکر منشاء شبہ کو رفع کرنے کے واسطے ہے یعنی اگرچہ ان دونوں میں منافع بھی ہے چنانچہ خمر میں قوۃ عزیزیہ اور میسر میں تکثیر مال بہ سہولت ہے لیکن مفاسد ان کے منافع سے زیادہ ہیں اس لئے حرام ہیں۔ یہ حاصل ہے آیت کا مجھ کو مقصود خاص خمر و میسر کا بیان کرنا نہیں اگرچہ بیان کرنا ان کا اب بھی بےکار نہیں ہے لیکن مجھ کو اس سے ایک مسئلہ کا استنباط منظور ہے۔ اور اس سے ایک ایسی سخت غلطی اور اشتباہ کا رفع کرنا ہے جس میں اکثر سالک مبتلا ہوتے ہیں چنانچہ مجھ سے ایسے لوگ ملے ہیں جو اس غلطی میں مبتلا تھے اور ممکن ہے کہ جن کاموں میں اس مضمون کا غلط ہونا نہیں پڑا ہے وہ بعد میں اس غلطی میں واقع ہو جائیں اس لئے اس کو بیان کرنا ضروری ہے اول میں اس غلطی کو بیان کرتا ہوں کہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ گناہ کا چھوڑنا ضروری ہے اور نیز اس کے چھوڑنے کی تدبیر کرنا بھی ضروری ہے اور تدبیر کا حاصل اسباب کو مہیا کرنا اور موانع کو رفع کرنا ہوتا ہے اب سمجھئے کہ اس تدبیر میں بعض اہل سلوک کو ایک دقیق غلطی ہوگئی۔ وہ غلطی اگر واقع نہ ہوتی تو ضرورت بیان

کی بھی نہ تھی وہ یہ ہے کہ گناہ کے ترک کرنے کی تدابیر میں سے ایک یہ تدبیر انہوں نے تجویز کی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ شیطان نے ان کو سکھلائی ہے اس لئے کہ یہ شیطان بہت پڑھا ہوا ہے ہر شخص کو اس کے طریق کے موافق بہکاتا ہے اور ایسی غامض اور گہری چالوں سے بری بات کو دل میں ڈالتا ہے کہ بظاہر وہ مصلحت معلوم ہونے لگتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب کوئی سالک گناہ میں مبتلا ہوتا ہے اور وہ اس سے دل تنگ ہوتا ہے اور اگر نفس کو روکتا ہے تو اور زیادہ ہیجان بڑھتا ہے تو اس وقت شیطان یہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ تمام پریشانی تم کو اس لئے ہے کہ اس گناہ میں جو لذت ہے اس کو تم نے نہیں چکھا اس لئے بار بار اس کا اشتیاق ہوتا ہے اور اگر خوب سیر ہو کر اس گناہ کو کرلو تو پھر اس کی سب خواہش نکل جائے گی اور وہ ہلکا ہو جائے گا پھر اس گناہ کی طرف رغبت نہ رہے گی مثلاً زنا کرنے یا شراب پینے کو جی چاہا تو شیطان بہکاتا ہے کہ ایک دفعہ خوب پیٹ بھر کر کرلو تو ارمان نکل جائے گا اور ہوس ختم ہو جائے گی پھر خواہش گناہ کی نہ ہوگی اور توبہ خالص ہو جائے گی۔ پس دیکھئے کہ یہ کتنا بڑا دھوکہ ہے کہ گناہ کراتا ہے گناہ کے ترک کے لئے تو چونکہ اکثر مقدمہ امر محمود کا محمود ہوتا ہے اس لئے وہ گناہ اس کی نظر میں بہت خفیف ہو جاتا ہے کہ گویا وہ اچھی نیت سے ہوتا ہے اول تو انسان ہے ہی ضعیف العقل کہ مصلحت غیر واقعیہ کو بھی واقعیہ سمجھتا ہے چہ جائیکہ کوئی امر مصلحت واقعیہ کا رنگ لئے ہوئے بھی ہو ایسے مقام پر تو ضرور اس کو لغزش ہو جائے گی پس معلوم ہوا کہ جو عام لوگ گناہوں میں مبتلا ہیں وہ تو ہیں ہی بعض اچھے لوگوں پر بھی شیطان کا داؤ چل جاتا ہے کہ شیطان ان کو اس طور سے قابو میں کرتا ہے کہ اگر یہ گناہ نہ کرو گے تو تمام عمر نزلہ سا بہتا رہے گا ایک دفعہ جی بھر کر کرلو پھر توبہ کر کے بے فکر ہو جائیں گے ایک مولوی صاحب مجھ کو ملے کہ وہ گناہ میں مبتلا تھے خیر گناہ تو انسان سے ہوتا ہی ہے لیکن زیادہ افسوسناک امر یہ تھا کہ انہوں نے مجھ سے بھی پوچھا کہ اگر اس نیت سے گناہ کرلیں تو کیا حرج ہے میں نے کہا توبہ کرو توبہ کرو اور میں نے ان کو سمجھایا کہ اس کا حاصل تو یہ ہوا کہ خدا کا قرب حاصل کرنے کے لئے گناہ کیا جاتا ہے۔

حرام اشیاء پر تسمیہ پڑھنے کا حکم

فقہاء نے لکھا ہے کہ حرام چیزوں پر بسم اللہ کہے تو کافر ہو جاتا ہے اس لئے کہ اس نے شریعت کا مقابلہ کیا مسئلہ مجوثہ میں میں یہ تو نہ کہوں گا کہ کفر ہے لیکن ہاں اشد درجہ کا گناہ قریب بہ کفر اور بڑی شدید غلطی ہے جب ان کی سمجھ میں آیا اور توبہ کی اس روز سے معلوم ہوا کہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اس غلطی میں مبتلا ہیں اور کاوش کی جائے گی تو ممکن ہے کہ اس غلطی میں ابتلا اکثر لوگوں کو ہوا۔ یہ ہے وہ مضمون اور غلطی جس کا رفع میں اس آیت سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔

حاصل اس بیان کا یہ ہے کہ خمر و میسر کے باب میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اِثْمُھُمَا اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِھِمَا (ان دونوں یعنی شراب اور جوئے کا گناہ ان کے نفع سے بڑھا ہوا ہے)

گناہ کے مفاسد دقیقہ

حق تعالیٰ نے اس میں تسلیم فرمالیا ہے کہ ہر گناہ کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس میں کوئی بھی نفع نہ ہو لیکن اس نفع کے وجود سے وہ جائز نہ ہوگا۔ اس لئے مفاسد اور مصالح کا جب اقتران ہوتا ہے تو مفاسد کو غلبہ رہتا ہے۔ اگرچہ مفسدہ قلیل ہی کیوں نہ ہو اور اس میں تو مفاسد بھی زیادہ ہیں غرض گناہ خواہ کتنے ہی منافع کو مشتمل ہو لیکن وہ گناہ اور منہی عنہ و حرام اور غیر جائز الارتکاب ہی ہے اس قاعدہ کلیہ میں یہ مسئلہ مجبوث فیہما بھی داخل ہے غرض کسی مصلحت کی تحصیل کی غرض سے کوئی گناہ جائز نہیں ہو سکتا۔

کسی مصلحت کی تحصیل کے لئے گناہ جائز نہیں

آج کل بہت سے نو تعلیم یافتہ جب دیکھتے ہیں کہ علماء بیوع فاسدہ و معاملات ربوٰ کو منع کرتے ہیں تو اعتراض کرتے ہیں ان مولویوں کی مصلحت زمانہ کی تو خبر ہے نہیں بس ہانک دیتے ہیں یہ بھی حرام وہ بھی حرام آج کل مصلحت یہ ہے کہ ربوٰ کو حلال کہا جائے دیکھو دوسری قوموں نے اس کی وجہ سے کس قدر ترقی کی ہے میاں مولویوں کو کیا خبر یہ تو اپنے مدرسے میں بیٹھ کر جو چاہے فتویٰ جاری کر دیتے ہیں خبر نہیں کہ قوم پر کیا کیا مصائب نازل ہو رہے ہیں سو ان

معاملات میں چونکہ مصلحت ہے اس لئے ان معاملات کو گناہ نہ کہنا چاہئے یہ بھی اسی قسم کی غلطی ہے میں کہتا ہوں کہ آج کل عقل پرستی کا بہت زور ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس عقل کو دین کے اندر صرف نہیں کیا جاتا آپ مصلحت کی وجہ سے ایک شئے کو جائز کہتے ہیں اور میں کہتا ہوں کہ چونکہ اس میں یہ مصلحت مضمر تھی اسی واسطے تو ضرورت ممانعت کی ہوئی کیونکہ جس میں کوئی مصلحت نہ ہو اس کے منع کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی منع ہمیشہ اسی امر کو کیا جاتا ہے کہ جس میں کچھ مصلحت بھی ہو جس کے سبب سے اس کے کرنے کی رغبت ہو مگر اس میں مفاسد دقیق ہوتے ہیں کہ ان مفاسد تک ہماری عقل نہیں پہنچتی پس گناہ ایسا ہی ہے کہ جس میں کوئی مصلحت باعث علی الفعل ہوتی ہے اور وقوع اس کا ہمیشہ اسی مصلحت کی وجہ سے ہوتا ہے اور اگر یہ نہ ہوتا تو منع کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ اس کو تو ہر ذی ہوش شخص واجب الترک سمجھتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ مصلحت گناہ کے منافی نہیں ہے چنانچہ **فَاِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا** (ان دونوں کا گناہ اس کے نفع سے بڑھا ہوا ہے) میں اول بیان ہو چکا ہے کہ یہ تسلیم کر لیا ہے کہ اس میں نفع ضرور ہے لیکن نقصان زیادہ ہے باقی یہ ہے کہ وہ نقصان کیا ہے تو اس کو اگر ہم نہ جانتے تب بھی ماننا جاننے پر موقوف نہ تھا دیکھو حکام جو قوانین مقرر کرتے ہیں تو قوانین کا علم تو ہر شخص کو ضروری ہے لیکن اس کی لم اور مصالح کا جاننا ہر شخص کیلئے ضروری نہیں پس حق تعالیٰ کا اجمالاً یہ فرما دینا کافی ہے کہ اس میں نقصان ہے باپ کا بیٹے کو یہ کہہ دینا کافی ہے کہ ہم کو تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ فلاں شئے مضر ہے یہ ضرور نہیں کہ اس مضرت کی وہ تفصیل بھی بیان کیا کرے پس خداوند جل جلالہ کو بطریق اولیٰ یہ حق حاصل ہے۔

خمر و میسر کی دینی و دنیوی مضرتیں

لیکن باوجود اس حق کے حاصل ہونے کے پھر بھی کچھ دینی و دنیوی مضرتیں خمر و میسر کی بیان فرما دیں چنانچہ دوسرے مقام پر ارشاد ہے **اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ** (یعنی شیطان تو یوں چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ سے تمہارے آپس میں بغض اور عداوت واقع کر دے اور اللہ تعالیٰ کی یاد اور نماز سے تم کو باز رکھے) بہرحال واثمهما

اکبر من نفعھما (ان دونوں کا گناہ ان کے نفع سے بڑھا ہوا ہے) سے یہ معلوم ہو گیا کہ گناہ میں مصلحت ہو سکتی ہے چنانچہ شراب کے اندر قوت اور یہ کہ شرابی سیر چشم ہو جاتا ہے بخل جاتا رہتا ہے چنانچہ شعراء جاہلیت نے اپنے اشعار میں اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ اور میسر میں اگر جیت ہو تب تو حصول مال اور اگر ہار ہو تو مال سے بے رغبتی ہو جانا پس گناہ میں بعض اوقات امر محمود کا منضم ہو جانا بعید نہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ گناہ گناہ نہ رہے اسی طرح جی بھر کر گناہ کرنا اگر اس میں یہ مصلحت ہو بھی کہ وہ سبب توبہ اور اطاعت کا ہو جائے تب بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ گناہ حرام نہ ہو بلکہ گناہ حرام رہے گا۔

حاصل جواب کا یہ ہوا کہ اگرچہ ہم نے تسلیم کر لیا ہے کہ اس میں مصلحت ہے لیکن چونکہ مفاسد بھی ہیں اس لئے حرام ہے۔

مفاسد گناہ

اب سمجھنا چاہئے کہ مفاسد اس میں کیا ہیں مفاسد اس میں کئی طرح سے ہیں اول تو یہ ہے کہ جس وقت یہ گناہ کر رہا ہے اس کو یہ کیا خبر ہے کہ میری عمر اتنی ممتد ہو گی کہ میں بعد اس گناہ کے زندہ رہوں گا اور جو مصلحت توبہ و خلو نفس کی میں نے سوچی ہے وہ مرتب ہی ہو جائے گی بعض مرتبہ آدمی دفعۃً مر جاتا ہے کانپور میں ایک شخص اپنے گھر آئے اور کھانا مانگا چنانچہ ان کی ماں کھانا لائی دیکھا تو مرے پڑے ہیں ایسے واقعات ہزاروں ہیں کہ آدمی فوراً مر جاتا ہے کوئی سبب ظاہری بھی موت کا نہیں ہوتا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم استنجے سے فارغ ہو کر فوراً تیمم فرما لیتے تھے کسی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پانی موجود ہے فرمایا کہ کیا خبر ہے کہ پانی ملنے تک میں زندہ رہوں گا یا نہیں حالانکہ انبیاء علیہم السلام کی موت دفعۃً نہیں آتی بلکہ ان سے اول پوچھا جاتا ہے کہ ہمارے پاس آنا چاہتے ہو یا دنیا میں رہنا پسند کرتے ہو چنانچہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس جب یہ اطلاع آئی تو فرمایا کہ جناب باری تعالیٰ سے عرض کرو کہ کوئی دوست اپنے دوست کو مارا بھی کرتا ہے وہاں سے حکم ہوا کہ کوئی دوست اپنے دوست

کے ملنے سے عذر بھی کیا کرتا ہے اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی پوچھا گیا تھا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جبرئیل علیہ السّلام سے مشورہ کیا انہوں نے فرمایا کہ تشریف لے چلئے حق تعالیٰ مشتاق ہیں چنانچہ آپ نے اپنا اشتیاق ظاہر کیا اور تشریف لے گئے تو باوجودیکہ آپ کی وفات اس اطلاع کے بعد ہوئی تب بھی خدائے تعالیٰ کی عظمت کے غلبہ کا یہ اثر تھا کہ موت کو ہر وقت حاضر سمجھتے تھے اور ہمارے پاس تو کوئی نوشتہ بھی نہیں کہ ہم دس برس یا دس ماہ یا ہفتہ دو ہفتہ بلکہ پانچ منٹ تک بھی زندہ رہیں گے پھر یہ دھوکہ کس بناء پر کہ گناہ کر کے توبہ کرلوں گا۔ اور بعض اوقات تو وہ گناہ بھی نصیب نہیں ہوتا خواہ مخواہ نیت بگاڑ کر ہی گنہگار ہوتے ہیں ایک عورت کے یہاں ایک شادی تھی اس احمق نے باوجود سب کی فہمائش کے رسوم شادی پوری کرنے کے لئے اپنی جائیداد فروخت کردی اور وہ روپیہ نقد لا کر گھر میں رکھا رات کو تمام روپیہ چور لے گئے گناہ بھی ہوا اور مقصود بھی حاصل نہ ہوا اس لئے جب آدمی پکا ارادہ گناہ کا کر لیتا ہے تو وہ گناہ تو لکھا ہی جاتا ہے بڑا سخت دھوکہ ہے دوسرے یہ کہ ہم نے مانا کہ عمر اس کی ممتد ہو لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ پھر توبہ کی بھی توفیق ہو جائے ممکن ہے بلکہ واقع ہے کہ اکثر ایسے شخص کو توبہ کی توفیق نہیں ہوتی اس لئے کہ پہلے تو جب یہ گناہ نہ کیا تھا اس سے ایک رکاوٹ طبیعت میں تھی بھی اب جبکہ کرلیا تو وہ بھی نہ رہی تو گناہ کا وقوع آئندہ اور زیادہ ہوگا کم نہ ہوگا۔ اور بالفرض اگر توبہ بھی کرلی تو اکثر احوال میں وہ توبہ کامل نہ ہوگی۔ محض صورت توبہ ہوگی اور وہ گناہ کے ترک کے لئے کافی نہ ہوگی پس جو غایت تھی جی بھرنے کی کہ پھر گناہ نہ ہوگا وہ غایت مرتب نہ ہوگی تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ دیکھنا چاہئے کہ ہم لوگ جو طاعت کرتے ہیں نماز پڑھتے ہیں روزہ رکھتے ہیں اور کبھی ناغہ نہیں ہوتا اس کی کیا وجہ ہے آیا اس کے لئے صرف ارادہ ہی کافی ہے یا علاوہ اس کے کوئی اور شئے بھی ہے جو محرک ہے غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نرا ارادہ کافی نہیں اگر نرا ارادہ کافی ہوتا تو بہت لوگ ایسے ہیں کہ بہت سے نیک کاموں کا ارادہ کرتے ہیں اور بعض مرتبہ کرتے بھی ہیں لیکن نباہ نہیں ہوسکتی پس معلوم ہوا کہ کوئی اور ہی شئے ہے جو اس مشین کو چلا رہی ہے وہ کیا

ہے طبیعت کا تقاضا یہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ دل میں ایسی بے چینی اور چلبلاہٹ لگا دی ہے کہ جب تک وہ کام نہیں کر لیتے چین نہیں آتا عراقی اس بے چینی کی تمنا میں کہتے ہیں۔

صنمارہ قلندر سزا وار بمن نمائی ۔۔۔۔ کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

(یعنی تیری پارسائی بدوں محبت اور چلبلاہٹ بڑی دور کا راستہ ہے عشق کا راستہ مجھے بتلایئے)

چنانچہ جو لوگ نمازی ہیں وہ اپنی حالت دیکھ لیں کہ اگر کبھی نماز میں تاخیر ہو جاتی ہے تو ان کو کیسی بے چینی ہوتی ہے جب پڑھ لیتے ہیں اس وقت کیسی راحت ہوتی ہے اور جس شئے کا تقاضا نہیں اس میں یہ کیفیت نہیں چنانچہ جو لوگ تہجد کے پابند نہیں ہیں ہر چند ارادہ کرتے ہیں کہ ہم تہجد التزام سے پڑھا کریں لیکن نہیں ہوسکتا فرض نماز کے لئے جس مستعدی کے ساتھ اٹھ جاتے ہیں اس طرح تہجد کے لئے نہیں اٹھا جاتا ہے وہ بات کیا ہے کہ فرائض کا تقاضا پیدا ہو گیا ہے تہجد کا نہیں ہوا پس اس سے معلوم ہوا کہ صرف ارادے سے کام مکمل نہیں ہوتا بلکہ شرط اس میں طبیعت کا تقاضا ہے۔ کہ تمام طاعات میں یہی حال ہے اب سمجھو کہ توبہ بھی ایک طاعت ہے اور توبہ کی حقیقت ہے ندامت اور خجلت تجربے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ گناہ کا صدور جب زیادہ ہوتا ہے تو پھر توبہ کی جو حقیقت ہے یعنی ندامت و خجلت وہ میسر نہیں ہوتی بلکہ وہ توبہ صرف زبان تک ہی محدود ہوتی ہے قلب کے اندر گناہ سے استنکاف اور انفعال نہیں ہوتا خاص کر جبکہ اس گناہ کو سبب قرب سمجھے اور جب ندامت نہ ہوئی تو تقاضا ترک گناہ کا نہ ہوگا۔ بلکہ گناہ کا داعی بدستور قائم رہے گا۔ اور وہ توبہ صرف ارادے کے درجے تک ہوگی اور اول ثابت ہو چکا ہے کہ جب تک ارادے کے ساتھ تقاضا طبع میں نہ ہو کسی طاعت پر نباہ نہیں ہوسکتا پس یہ توبہ قابل اعتماد نہ ہوگی اور اس کا ٹوٹ جانا بہت سہل ہوگا۔ گویا نفس کے اندر گناہ سے مانع ایک مستحکم قلعہ تھا۔ اس ظالم نے اس کو توڑ دیا اب قلعہ کے اندر غنیم کا گھس آنا مستبعد نہیں ہے سب سے آخر میں میں کہتا ہوں کہ بالفرض دل میں سے ارمان نکل گیا اور توبہ بھی نہیں ٹوٹی لیکن تقویٰ کا اجر تو نہ ملے گا ایک تو وہ شخص ہے کہ جس کو گناہ کرنے کی ہوس ہے اور وہ اپنے نفس کو روکتا ہے اور گھونٹتا ہے اس کو جو اجر حاصل ہوگا وہ اس شخص کو نہ ہوگا جو بیباک ہو کر پیٹ بھر کر گناہ کرتا ہے۔ گو پھر

توبہ کر لیتا ہے پس شیطان نے اس کو ایک اجر عظیم سے محروم کیا اور بہت بڑا مفسدہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی نافرمانی جو یقینی ضرر ہے اس شخص نے اس کا ارتکاب ایک موہوم نفع کی تحصیل کے لئے کیا یقینی ضرر کا التزام بامید نفع موہوم عقلاً بھی جائز نہیں ہے یہ ہے وہ غلطی جس کے رفع کرنے کے واسطے میں نے اس وقت بیان کیا ہے اسی پر قیاس کرنے سے یہاں ایک اور غلطی کی تصحیح اور ایک اشتباہ کا حل ہوتا ہے۔

اہل کشف کو دھوکہ

وہ یہ ہے کہ بعض اہل کشف کو ایک سخت دھوکہ ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اگر کسی گناہ کی نسبت یہ منکشف ہو جائے کہ یہ میری قسمت میں لکھا ہے تو اس کو جلدی سے کر لینا چاہئے اس کا غلط ہونا بھی اسی تقریر سے واضح ہو گیا اس لئے پہلی صورت میں تو ایک مصلحت بھی تھی اور یہاں تو کوئی مصلحت بھی نہیں رہا کشف تو اول تو کشف ہمیشہ صحیح نہیں ہوتا اور اگر صحیح بھی ہو تو جب یہ مکشوف ہوا تھا کہ میری تقدیر میں یہ گناہ ہے تو آخر یہ بھی تو قطعی وحی کے ذریعہ سے مکشوف ہو چکا ہے کہ اس گناہ سے ہوگا اور ندامت اور توبہ واجب ہوگی پھر اس کے کیا معنی کہ جلدی کرنی چاہئے نیز یہ بھی وحی کے ذریعہ سے پہلے سے مکشوف کرا دیا گیا ہے کہ باوجود اس کشف صدور کے رکنے کی کوشش کرنا فرض ہے گو ناکامی ہی ہو۔

دست از طلب ندارم تا کام من برآید   یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

(ہاتھ طلب سے کوتاہ نہ کروں گا جب تک کہ میرا مقصد حاصل نہ ہو جائے وہ مقصد یہ ہے کہ یا تو تن محبوب کے پاس پہنچ جائے یا جان تن سے نکل جائے)

ہم نے دیکھا کہ بعض مریضوں کی نسبت یقین ہو جاتا ہے کہ اب یہ بچے گا نہیں لیکن اخیر وقت تک دوا اُس کے منہ میں چھوڑتے رہتے ہیں اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کشف بعض کے لئے مضر ہو جاتا ہے۔ جیسے اس شخص کو کشف سے گناہ کی جرأت ہو گئی اسی واسطے بعض بزرگوں نے فرمایا کہ کشف را بر کفش زنیم (ہم کشف کو جوتی پر مارتے ہیں) حکم تو یہ ہے کہ رکو بچو بچنے کی کوشش کرو اپنی سی کر لو خواہ بچ سکو یا نہ بچ سکو اگر کوئی کہے پھر اس کوشش سے کیا فائدہ ہے سو فائدہ یہ ہے کہ کوشش کا ثواب ملے گا اور یہ کہ عقیدہ خراب نہ ہوگا۔ عقیدہ کی صحت بڑی شئے ہے۔ اگر کوئی کہے کہ آخر اس گناہ سے پھر نجات کی کیا ضرورت ہے میں کہتا ہوں کہ

نجات کی دو صورتیں ہوا کرتی ہیں ایک تو یہ کہ گناہ ہی واقع نہ ہو دوسرے یہ کہ گناہ واقع ہو اور توبہ سے معاف ہو جائے تو یہاں دوسری صورت سے نجات ہوگئی دیکھئے اگر کسی شخص کو پہلے سے معلوم ہو جائے کہ مجھ کو بخار آئے گا کیا وہ دوا نہ کرے گا۔ ضرور کرے گا اور کرتا ہے پھر یہاں کیا وجہ ہے کہ توبہ نہیں کرتے اور بچنے کی کوشش کی جاتی بلکہ الٹا اس کو جلدی سے کر لینے کا مشورہ دیا جاتا ہے اسی کی نظیر ایک اور دھوکا بھی ہے اور سب سے بڑھ کر ہے اس لئے کہ پہلی صورت میں گناہ کو گناہ تو سمجھتے تھے اور یہ دھوکا ایسا ہے کہ گناہ کو جائز سمجھتا ہے۔

ایک حدیث کی غلط تاویل

وہ یہ ہے کہ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آدمی حق تعالیٰ کی اطاعت کرتے کرتے ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ اس کے لئے گناہ گناہ ہی نہیں رہتا جب وہ مقرب و مقبول ہو جاتا ہے نعوذ باللہ اس کو گناہ کی اجازت ہوتی ہے سو یہ محض باطل ہے اور بعض ذہین لوگوں نے اس کی ایک اصل نکالی ہے وہ یہ ہے کہ حدیث شریف میں اہل بدر کے باب میں آیا ہے **لعل[1] اللہ اطلع علی اھل بدر فقال اعملوا ما شئتم فقد غفرت لکم** (شاید اہل بدر پر اللہ تعالیٰ مطلع ہو گئے ہیں سو فرما دیا جو چاہے تم عمل کرو میں نے تمہاری مغفرت کر دی) اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ایسا علم بھی ہے کہ گناہ گناہ نہیں رہتا حالانکہ خود اس حدیث سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ گناہ ہوتا ہے اس لئے گناہ نہیں تھا تو **قد غفرت لکم** (میں نے تمہاری مغفرت کر دی) کیوں فرمایا **ابحت لکم احللت لکم** (میں نے تمہارے لئے مباح کر دیا میں نے تمہارے لئے حلال کر دیا) فرماتے اور اس سے بڑھ کر دلیل لیجئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ہے **لیغفر لک اللہ ماتقدم من ذنبک** (اللہ تعالیٰ نے تمہارے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیئے) **ذنبک** کے معنی دیکھ لیجئے یہ بحث تو دوسری ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معصوم تھے تو پھر اس آیت کے کیا معنے لیکن اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ کوئی مقام ایسا نہیں ہے کہ جہاں پہنچ کر گناہ گناہ نہ رہے بلکہ مقربین سے تو خلاف اولیٰ بھی ہو جائے تو اس پر بھی عتاب ہوتا ہے اور منشاء اس غلطی کا ایک قیاس فاسد ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کے مجنونوں کو دیکھا ہے کہ ان کی بری باتیں بھی بھلی معلوم

---

[1] سنن أبي داود كتاب السنة باب: ٨

ہوتی ہیں پس اسی پر حق تعالیٰ کے مقبول بندوں کو بھی قیاس کرلیا ہے حالانکہ یہ قیاس مع الفارق ہے اس لئے کہ بری بات کا بھلا معلوم ہونا عقل کے خلاف ہے صرف طبیعت کا اقتضا ہے اور آدمی چونکہ طبیعت کا مغلوب ہوجاتا ہے اور محبت کا اس پر غلبہ ہوتا ہے اس لئے محبوب کی بری بات بھی اس کو بھلی معلوم ہوتی ہے عقل کا اقتضا اس کے برعکس ہے وہ یہ ہے کہ محبوب کی چھوٹی سی برائی بھی کھٹک جائے کہ یہ برائی بھی اس میں کیوں ہے چنانچہ دیکھ لو جب تم اپنے لڑکے کو کوئی حرکت کرتے دیکھتے ہو تو اتنا غصہ آتا ہے کہ غیر کے لڑکے پر اس قدر نہیں آتا لیکن یہ جب ہی ہوتا ہے کہ باپ پر عقل کا غلبہ ہو اور اگر حب غالب ہوگی تو بمصداق **حبک الشیٔ یعمی ویصم**[1] (کسی چیز کی محبت تم کو اندھا اور بہرا کر دیتی ہے) بچے کی برائی بھی اچھی معلوم ہوگی پس آدمی تو چونکہ مغلوب ہوتا ہے طبیعت کا اس لئے آدمی میں ایسا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ طبیعت سے پاک ہیں ان پر کوئی شئے غالب نہیں وہ سب پر غالب ہیں اس لئے ان کو آدمی پر قیاس نہیں کر سکتے بلکہ وہاں وہی ہوتا ہے جو حکمت کا مقتضا تھا کہ محبوب سے ادنیٰ ناپسندیدہ فعل بھی برا معلوم ہو چنانچہ مقربین پر ذرا ذرا سی حرکات میں عتاب ہوا ہے لوگ اسی فکر میں ہیں کہ مقبول ہو کر جو چاہیں گے کریں گے یہاں مقبول ہو کر اور زیادہ حق بڑھ جاتا ہے اسی واسطے تو کہتے ہیں نزدیکاں را بیش بود حیرانی (مقربین کو حیرانی زیادہ ہوتی ہے) ایک بزرگ ایک صحراء میں گوشہ نشین تھے ایک روز بارش ہوئی فرمانے لگے آج کیا موقع سے بارش ہوئی ہے حکم ہوا کہ او بے ادب! اور بے موقع کس دن ہوئی تھی ہوش اڑ گئے۔

سید الطائفہ حضرت حاجی صاحبؒ کا ادب

ہمارے حضرت حاجی صاحب قدس سرہ پاؤں پھیلا کر نہ سوتے تھے کسی خادم نے کہا کہ حضرت آپ پاؤں کیوں نہیں پھیلاتے فرمایا کہ کوئی اپنے بادشاہ کے سامنے پیر بھی پھیلایا کرتا ہے حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ کو بعد انتقال کے کسی نے خواب میں دیکھا پوچھا کہ کیا گزری فرمایا کہ جب میں پیش کیا گیا تو پوچھا گیا کہ کیا لائے میں نے عرض کیا کہ

[1] سنن أبي داود: ۵۱۳۰، مسند احمد ۵:۱۹۴، ۶:۴۵۰، مشكوة المصابيح: ۴۹۰۸، تفسير ابن كثير ۱:۱۸۱، ۳:۴۷۳

اے اللہ تعالیٰ اعمال تو میرے کچھ ہیں نہیں ہاں شرک نہیں کیا توحید کا اقرار کرتا رہا۔ فرمایا اما تذکر لیلة اللبن یعنی دودھ کی رات تم کو یاد نہیں ہے قصہ یہ ہوا تھا کہ ایک رات حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے دودھ پی لیا تھا پیٹ میں درد ہوا تو منہ سے یہ نکل گیا کہ دودھ سے درد ہوا ہے تو اس کی نسبت ارشاد ہے کہ کیا توحید یہی ہے کہ پیٹ کے درد کے اندر دودھ کو مؤثر سمجھو اور وہ درد بھی تو ہمارا ہی پیدا کیا ہوا تھا۔

درد ازیار ست درماں نیز ہم　　　دل فدائے اوشد و جاں نیز ہم

(درد یار کی جانب سے اور درماں بھی اس کی طرف سے اس پر دل فدا ہے اور جان بھی)

دریں نوعے از شرک پوشیدہ ہست　　　کہ زیدم بیازرد و عمر بخست

(اس بات میں شرک کی ایک خفی نوع ہے کہ زید نے مجھ کو ستایا اور عمر نے مجھ کو رنجیدہ کیا کیونکہ مؤثر حقیقی سوائے خدا کے کوئی نہیں)

ایک نازک بات

لیکن یہاں ایک بات نازک ہے وہ یہ ہے کہ یہ سب خواص کے لئے ہے عوام کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ ہر بات کو اس کے اسباب ہی کی طرف نسبت کیا کریں اعتقاد کے درجے میں تو یہ سمجھیں کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے مگر اس کا مراقبہ نہ کریں اس طرح سے کہ اسباب پر نظر نہ رہے اور ما بہ الفرق یہ ہے کہ خواص کو تو ذات باری کے ساتھ عشق ہوتا ہے اس لئے جو کچھ پیش آئے گا وہ اس میں راضی رہیں گے اور کسی حال میں حق تعالیٰ سے مکدر نہ ہوں گے ان کا مذہب تو یہ ہے ع

دل شدہ مبتلائے تو　　　ہرچہ کنی رضائے تو

(دل آپ پر فریفتہ ہو گیا ہے آپ جو کچھ تصرف کریں ہم آپ سے راضی ہیں)

اور ان کا مشرب یہ ہوتا ہے۔ ع

اسیرش نخواہد رہائی زبند

(اسیر قید سے رہائی نہیں چاہتا)

عوام کے لئے سلامتی کا طریق

بخلاف عوام کے کہ وہ عشق سے عاری ہیں اس لئے اگر وہ ہر جزئی کو حالاً اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب سمجھیں گے اور اسباب سے بالکلیہ ان کی نظر اٹھ جائے گی اور کوئی امر ناگوار طبع پیش آئے گا تو اس کو منجانب اللہ سمجھنے کے سبب ان کے لئے اندیشہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ان کو اعتراض وتکدر ہو جائے اس لئے ان کو اعتقاد کے درجے میں تو خالق ہر شے کا اللہ تعالیٰ کو سمجھنا چاہئے باقی اسباب پر نظر رہے تو ان کے لئے سلامتی کا طریق ہے ان کے ذہن میں تو یہی ہونا چاہیے کہ ابا جان دق یا اسہال کی بیماری سے بحکم الٰہی مر گئے اسی واسطے ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ نے اس زمانے کے سالکین کو مراقبہ توحید سے ضیاء القلوب میں منع فرمایا ہے یہ درمیان میں اس بات کی تحقیق ہوگئی اس کے قبل اس کا بیان تھا کہ مقرب ہو کر حرام افعال حلال نہیں ہو جاتے بلکہ خود حلال میں بھی کچھ تنگی ہو جاتی ہے اور گناہ کا گناہ نہ ہونا اور مباحات میں توسع نہ کر سکنا تو بمراحل دور ہے۔ وہ حضرات تو اپنی طاعات کو بھی طاعات نہیں سمجھتے اور اپنے کو طاعت سے تہی دست سمجھتے ہیں چنانچہ ایک بزرگ مرنے کے وقت کہتے تھے ۔

مفلسا نیم آمدہ در کوئے تو ‏ ‏ شیئاً للہ از جمال روئے تو

(یعنی ہم آپ کے دربار میں مفلس ہو کر آئے ہیں اپنے جمال کے صدقے میں کچھ عنایت کیجئے)

دست بکشا جانب زنبیل ما ‏ ‏ آفریں بردست و بربازوئے تو

(ہماری زنبیل کی طرف ہاتھ بڑھایئے آپ کی دست و بازو پر آفریں ہے)

اور فرماتے ہیں ۔

وفدت علی الکریم بغیر زاد ‏ ‏ من الحسنات و القلب السلیم

(میں محبوب و کریم کے پاس اس حالت سے جا رہا ہوں کہ نیکیوں اور قلب سلیم کی زادِ راہ میرے پاس نہیں ہے)

حکایت حضرت شبلیؒ

حضرت شبلیؒ چلے جا رہے تھے ندا آئی کہ شبلیؒ کیا یہ قدم اس قابل ہے کہ ہمارا راستہ اس سے طے کرو کھڑے ہو گئے پھر ندا آئی کہ کیا ہم سے صبر آ گیا چیخ مار کے بے ہوش ہو گئے ان

حضرات کی تو یہ حالت تھی جناب! خالہ جی کا گھر نہیں بڑی کشاکشی ہوتی ہے لیکن اس میں ان کو ایسا لطف ہوتا ہے کہ ہفت اقلیم کی سلطنت میں وہ حلاوت نہیں ہے۔

گدایانے از پادشاہی نفور باُمیدش اندر گدائی صبور

(ایسے فقیر کہ بادشاہی سے متنفر ہیں اور محبوب کی اُمید پر فقیری میں قناعت کرنے والے ہیں)

دما دم شراب الم درکشند وگر تلخ بینند دم درکشند

(ہر دم رنج والم کی شراب پیتے ہیں اور جب اس میں کڑواہٹ دیکھتے ہیں تو خاموش رہتے ہیں)

اگر ان سے پوچھا جائے کہ تم سلطنت زیادہ پسند کرتے ہو یا اس طریق کے اندر جو تم کو مشقت اور تعب لاحق ہے وہ پسند کرتے ہو تو وہ زبان سے یہ کہیں گے۔

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ آپ کی تیغ کا کشتہ ہو عاشقوں کا سر سلامت رہے کہ اسی پر آپ خنجر آزمائی فرمائیں)

بزرگوں سے چھوٹی باتوں کے سبب پر مؤاخذہ

یہاں ایک بات یاد آئی وہ یہ ہے کہ بزرگوں سے جو ظاہراً چھوٹی چھوٹی باتوں پر مؤاخذہ ہوتا ہے سو وہ بالنظر الی عظمت الحق وعظمت خداوندی کی طرف نظر کر کے واقع میں چھوٹی نہیں اور مؤاخذہ ہونا ان پر عجیب نہیں ہے وہ قابل مؤاخذہ ہوتی ہیں اوروں سے جو مؤاخذہ نہیں ہوتا یہ البتہ عجیب ہے اور ان سے مؤاخذہ نہ ہونے کی ایک وجہ ہے وہ یہ کہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ حکام کے سامنے گنوار بہت سی ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ واقع میں وہ خلاف ادب اور قابل مؤاخذہ ہیں اگر وہی باتیں سررشتہ دار کہے تو ابھی معتوب ہونے لگے جس کی وجہ یہی ہے کہ گنواروں کو خبر نہیں اور یہ باخبر ہیں اسی طرح یہاں سمجھئے کہ وہ باتیں فی نفسہٖ چھوٹی نہیں لیکن چونکہ عوام کم عقل ہیں اس لئے حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ معاف فرما دیتے ہیں امام غزالیؒ نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک عابد جنگل میں رہتا تھا اور اس کے

پاس ایک گدھا تھا بارش کی کمی سے گھاس جل گئی تھی دفعۃً بارش ہوئی اور گھاس سے تمام جنگل ہرا ہو گیا تھا وہ گدھا گھاس چرتا پھرتا تھا عابد کی نظر اس پر پڑی تو محبت کے جوش میں آ کر حماقت سے کہنے لگا کہ (توبہ توبہ) اے اللہ اگر آپ کے پاس کوئی گدھا ہوتا اور وہ اس جنگل میں چرنے آتا تو میں کبھی اس کو نہ روکتا یہ خبر اس زمانے کے نبی کو ہوئی ان کو بہت برا معلوم ہوا اور اس پر عابد پر بددعا کرنے کا ارادہ کیا ارشاد ہوا کہ ہم ہر شخص سے اس کی عقل کے موافق معاملہ کرتے ہیں اس کو اتنی ہی عقل ہے تم بددعا مت کرنا۔ شبان موسیٰ علیہ السلام کا قصہ مشہور ہے غرض جس قدر ادب اور تہذیب ہوتی ہے اسی قدر تکلیف ہوتی ہے۔

عوام کی غلطی

پس عام لوگوں کی یہ غلطی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دنیا کے عشاق پر اور اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کو دنیا کے محبوبوں پر قیاس کر کے یہ سمجھا جائے کہ ان کے لئے سب کچھ مباح ہو جاتا ہے اس لئے کہ دنیا کے عاشق طبیعت کے مغلوب ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے یہاں طبیعت نہیں حکمت و علم ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے نزدیک کسی کے محبوب ہونے کے وہ معنی نہیں جیسے دنیا کے محبوب کے معنی ہیں یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو بغیر ان کے بے قراری ہوتی ہے بس صرف مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو جاتا ہے دوسرے کسی میں کون جمال و کمال ہے جس سے اللہ تعالیٰ کو کسی سے بالمعنی الحقیقی محبت ہو جائے۔ بہت لوگ براہ ہوس اس لئے ذکر و شغل کرتے ہیں کہ ہم خدا کے ایسے ہی محبوب ہو جائیں اس کی تو ایسی مثال ہے کہ کوئی شخص گنجا اندھا لنجا بدصورت ہو اور وہ یوں چاہے کہ فلاں محبوب جو حور کی مثل ہے مجھ پر عاشق ہو جائے ایسے شخص کو عاقل لوگ تو احمق کہیں گے ایسے ہی جو ذاکر یہ چاہے کہ میں بالمعنی المتعارف محبوب بن جاؤں ذرا وہ اپنے کو یہ تو دیکھے کہ مجھ میں اور حق تعالیٰ میں کیا نسبت ہے بخدا اگر اپنی حالت منکشف ہو جائے تو اسی پر تعجب ہو کہ مجھ کو کس طرح اس کی اجازت ہوگی کہ میں اس کو نظر محبت سے دیکھوں جب محبّ ہونے کی بھی صلاحیت نہیں تو محبوب ہونے کے لئے تو ذرا منہ دھو رکھے اپنے محبّ ہونے کے قابل بھی نہ ہونے کے باب میں خوب کہا گیا ہے۔

بخدا کہ رشکم آید ز دو چشم روشن خود   کہ نظر دریغ باشد بہ چنیں لطیف روئے

(بخدا مجھ کو اپنی دونوں آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ افسوس وہ محبوب کے پاکیزہ چہرہ کی طرف دیکھتی ہیں) اور ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

(مجھ کو آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ان کو محبوب کے چہرہ انور کو نہ دیکھنے دوں اور کانوں کو بھی اس کی باتیں نہ سننے دوں)

اس بد صورت کو تو محبوب اگر ایک نظر دیکھنے کی بھی اجازت دے دے تو اسی پر متعجب ہونا چاہیے کہ مجھ میں کون سی بات ہے کہ محبوب نے مجھ کو اپنے دیکھنے کی اجازت دیدی اس مقام پر بطور تفریح کے ایک مسئلہ کا بیان کر دینا ضروری ہے جو حضرت حاجی صاحب قبلہ قدس سرہ کی بدولت حل ہوا وہ یہ ہے کہ حضرت نے فرمایا کہ جیسے جاہ عندالخلق مذموم ہے محققین کے نزدیک جاہ عندالحق بھی اسی درجے میں ہے حاصل اس کا یہ ہے کہ جیسے نیک کام اس کے لئے کرنا کہ میں خلق کے نزدیک بزرگ اور بڑا بن جاؤں یہ برا ہے اسی طرح طاعت اس لئے اختیار کرنا کہ میں خالق کی نظر میں صاحب جاہ بنوں یہ بھی اہل بصیرت کے نزدیک امر منکر ہے برا ہے اس لئے کہ کبریائی تو خاصہ خاص باری تعالیٰ کا ہے حق تعالیٰ کے ہوتے ہوئے جاہ کے کسی رتبے کی بھی ہوس زیبا نہیں۔ الحاصل حق تعالیٰ کے نزدیک محبوب ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا فضل اس کے حال پر متوجہ ہو گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو عاشق رسول کہنا سخت گناہ ہے

یہاں پر ایک اور غلطی کا ازالہ کرنا بھی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ بعض لوگ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا معشوق کہتے ہیں چنانچہ شعراء اشعار نعتیہ میں اسی مضمون کو باندھتے ہیں سو عشق کا خاصہ ہے عاشق کو مضطرب کر دینا اور حق تعالیٰ اس سے منزہ ہے مگر غضب یہ ہے کہ بعض بیباکوں نے اس اضطراب کو بھی نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کیلئے مان لیا چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے ؎

پئے تسکین خاطر صورت پیراہن یوسفؑ محمدؐ کو جو بھیجا حق نے سایہ رکھ لیا قد کا

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دنیا میں بھیج دیا اور چونکہ وہ معشوق تھے اور عاشق کو بدوں معشوق کے قرار نہیں ہوتا اس لئے تسلی کے واسطے سایہ ان کا وہاں رکھ لیا کہ اسی سے مجھ کو تسلی رہے گی جیسے یعقوب علیہ السلام کو یوسف علیہ السلام کے کرتے سے تسلی

ہوگئی تھی یہ نعت نہیں یہ حد درجے کی بے ادبی ہے باری عزا اسمہ کی جناب میں اور نیز حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں بھی ایسے اشعار سننا اور پڑھنا گناہ ہیں احتراز ضروری ہے بعض دینداروں کو بھی خبط ہوتا ہے کہ اشعار نعتیہ خواہ ان کا مضمون شریعت پر منطبق ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو ذوق وشوق میں پڑھتے ہیں بعض اشعار نعت کے ایسے ہیں کہ ان میں دیگر حضرات انبیاء علیہم السلام کی بے ادبی ہوتی ہے۔ الحاصل معشوق کہنا یہ سخت بے ادبی ہے اس لئے کہ عشق خاصہ آدمی کا ہے اس لئے کہ عشق نام ہے نفس کے ایک خاص انفعال کا اور اللہ تعالیٰ انفعال اور تاثر سے پاک ہے ہاں یہ کہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے مقبول ہیں اگر کوئی عشق کو معنی مجازی میں لینے لگے تو حق تعالیٰ کی جناب میں ایسا اطلاق اذن شرعی کا محتاج ہے البتہ اگر کسی مغلوب الحال کے کلام میں ہو اس کو معذور سمجھیں گے بدوں غلبہ حال کے کسی کو اجازت نہ ہوگی خلاصہ یہ کہ مقربان الٰہی کو محبوبان مجازی پر قیاس کرنا صحیح نہیں پس جبکہ یہ مبنیٰ ہی منہدم ہوگیا تو مبنی یعنی آدمی کا ایسا مرتبے پر پہنچنا کہ گناہ گناہ نہ رہے غلط ہوا۔ اور بعضوں کو بزرگوں کے اس قول سے شبہ ہوگیا ہے کہ بندہ ایسے موقع پر پہنچ جاتا ہے کہ تکالیف شرعیہ اس سے اٹھ جاتی ہیں یہ قول صحیح ہے لیکن اس کے یہ معنی سمجھنا کہ طاعات کا وجوب نہیں رہتا یہ غلط معنی اس قول کے یہ ہیں کہ طاعات اس کے لئے طبعی بن جاتے ہیں جیسے افعال طبعیہ میں طبیعت ان کے ارتکاب کی طرف مضطر ہوتی ہے اسی طرح طاعات کی اس کو رغبت ہوجاتی ہے تکالیف اس کے لئے تکالیف نہیں رہتی۔

خلاصہ وعظ

خلاصہ تمام بیان کا ان غلطیوں کا ارتفاع ہوا کہ جی بھر کر گناہ اس لئے کرنا کہ گناہ کی ہوس نہ رہے اور گناہ کو کسی مصلحت کی وجہ سے کرنا اور خدا کا مقرب ہوجانے سے اور کسی گناہ کے مکشوف ہونے سے کسی گناہ کا حلال ہونا بعض اغلاط قصداً رفع کئے گئے بعض تبعاً مذکور ہوئے اب اس سے قرآن شریف کی جامعیت کا بھی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ مختصر الفاظ کتنے معانی کو مشتمل ہیں اس کے بعد سمجھئے کہ ایسی غلطیوں کی اصلاح علم اور صحبت محققین سے ہوتی ہے اس لئے ان دونوں کو اختیار کرنا چاہئے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ تمام غلطیوں سے محفوظ رکھیں آمین۔ (برحمتک یا ارحم الراحمین)

غض البصر

۱۴۔شوال ۱۳۲۹ ھ ہجری کو جامع مسجد تھانہ بھون میں ۳۔ گھنٹے بیٹھ کر خطاب فرمایا۔تقریباً ۱۲۰۰ افراد نے سنا۔وعظ مولوی عبداللہ صاحب گنگوہیؒ نے قلمبند کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھدان سیدنا و مولانا محمداً عبدہ و رسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ و بارک وسلم. اما بعد فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ یَعْلَمُ خَائِنَۃَ الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ ٥ (المؤمن آیت نمبر ۱۹)

ترجمہ: آیت شریفہ کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آنکھوں کی خیانت کو جانتے ہیں اور جس شئے کو سینے میں چھپاتے ہیں اس کو بھی جانتے ہیں۔

معصیت بھی ایک مرض ہے

یہ ایک آیت ہے جس کے الفاظ تھوڑے ہیں اور معانی بہت ہیں اس میں اللہ تعالیٰ نے ایک امر قبیح پر مطلع فرمایا ہے اور علاوہ اطلاع کے اس میں زجر بھی ہے اس کو اس وقت اس لئے اختیار کیا ہے کہ جس مرض کا اس میں بیان ہے آج کل اس میں بہت ابتلا ہے اور امراض میں سے وہی مرض متنبہ کرنے کے لئے لیا جاتا ہے جس میں ابتلا ہو اور مرض سے یہاں مراد معصیت ہے گو لوگ اس کو مرض سمجھیں کہ تعجب ہوگا کہ اس کو مرض کیوں کہا گیا لیکن بعد بیان حقیقت مرض کے اس کی وجہ سمجھ میں آ جائے گی۔

مرض کی حقیقت

مرض کی حقیقت ہے اعتدال سے مزاج کا خارج ہو جانا اور معصیت میں بھی قلب کا مزاج اعتدال سے خارج ہو جاتا ہے بلکہ یہ خروج عن الاعتدال جو قلب کے متعلق ہے زیادہ مضر ہے اس لئے کہ بدنی مرض کا انجام بہت سے بہت یہ ہے کہ مر جاوے گا اور مرنے سے بعض اوقات نفع ہوتا ہے کہ بہت سے جھگڑوں سے چھوٹ جاتا ہے کیونکہ جس قدر آلام ہیں

وہ اس بدن اور روح ہی کے تعلق کی وجہ سے ہیں دیکھئے مرض جذریعنی سن ہو جانے میں بدن کو اگر کاٹ ڈالیں تو کچھ بھی تکلیف محسوس نہیں ہوتی اور مفلوج کے فالج زدہ حصہ میں اگر سوئیاں بھی چبھوئیں تو کچھ بھی اثر نہیں ہوتا کیونکہ روح کا تعلق بدن سے ویسا نہیں رہا باوجودیکہ اس حالت میں روح سے تعلق رہتا ہے گو وہ تعلق ضعیف سہی اور اس تعلق ہی کا اثر یہ ہے کہ وہ عضو گلتا سڑتا نہیں جیسے مردہ کا بدن گل جاتا ہے۔

مردہ کا تعلق روح سے ضعیف ہوتا ہے

اور جب کہ بالکل ہی روحی مفارقت ہو جاوے اور یہ تعلق ضعیف بھی نہ رہے گا تو ظاہر ہے کہ بطریق اولیٰ تکلیف نہ ہوگی یعنی جو مفہوم تکلیف کا ہمارے نزدیک ہے اور جو معنی متبادر الم کے ہیں وہ نہ ہوگی ہاں دوسرے دلائل سے معلوم ہوا کہ روح کو بعد مفارقت جسم کچھ تاذی ہوتی ہے جیسا کہ بعض نصوص میں ہے کہ مردہ کی ہڈی توڑنا ایسا ہے جیسا زندہ کی ہڈی توڑنا جس سے ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ ایسے فعل سے روح کو کچھ الم ہوتا ہے مگر جس قسم کا الم روح کے تعلق مع الجسم کی حالت میں ہڈی توڑنے سے روح کو ہوتا ہے وہ الم نہیں ہوتا اس کو ایک مثال کے ضمن میں سمجھنا چاہیے کہ مثلاً زید کے بدن کو اگر مارا جاوے تو اس کو تکلیف ہوگی اور زید کی رضائی اُتار کر چولہے میں رکھ دی جاوے تب بھی تکلیف ہوگی مگر دونوں تکلیفیں جدا جدا ہیں پس روح کے مفارق ہونے کے بعد روح کو ایسی ہی تکلیف ہوتی ہے جیسے رضائی جلانے سے زید کو ہوئی اور اس تکلیف کی وجہ بھی وہی تعلق سابق ہے جو بدن کے ساتھ اس کو تھا وہ تعلق اس کو مستحضر ہوتا ہے اس لئے تکلیف ہوتی ہے خلاصہ یہ ہے کہ جب روح مفارق ہو جاتی ہے تو کوئی الم نہیں رہتا اس وقت ایک لطیفہ یاد آیا ایک طبیب کی تعریف کی گئی کہ یہ بڑے اچھے حکیم ہیں ان کے علاج سے مرض ہی نہیں رہتا یعنی مریض ہی نہیں رہتا جو مرض رہے کیونکہ مرض نہ رہنے کی دو صورتیں ہیں یا تو مریض رہے اور تندرست ہو جاوے یا یہ کہ مریض ہی چل دے جیسے کسی افیونی کی ناک پر مکھی آ کر بیٹھی اس نے اڑا دیا وہ پھر آ بیٹھی جب کئی بار اڑانے سے نہ گئی تو آپ نے چھری لے کر ناک اڑا ڈالی اور کہا وہ اڈا ہی نہیں رہا جس پر اب بیٹھے گی۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب آدمی مرجاتا ہے نہ زکام رہتا ہے نہ کھانسی نہ بخار نہ فکر نہ رنج سب بلائیں اور آلام دور ہو جاتے ہیں بالکل سکون ہو جاتا ہے۔

ایک شرعی اور حکیمانہ لطیفہ

سکون کے لفظ پر ایک شرعی لطیفہ یاد آیا اور وہ حکیمانہ لطیفہ ہے اور وہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ اور ان کی بی بی ام سلیمؓ کا قصہ ہے ان دونوں میاں بی بی کی حدیث میں بڑی فضیلت آئی ہے ایک مرتبہ ان کا ایک بچہ بیمار ہوگیا حضرت ابوطلحہؓ ہمیشہ آ کر بی بی سے اس کا حال پوچھتے ایک روز وہ بچہ انتقال کر گیا حضرت ابوطلحہؓ اس وقت باہر تھے بی بی نے یہ خیال کیا کہ اگر میں اب اطلاع کروں گی تو شب کا وقت نہ کھانا کھائیں گے اور نہ۔ ان کو نیند آئے گی خواہ مخواہ بے چین ہوں گے اس لئے مناسب ہے کہ اس وقت اطلاع ہی نہ کی جائے حقیقت میں دین عجب شئے ہے تمام عمر کی اصلاح کر دیتا ہے حضرت ابوطلحہؓ جب باہر سے تشریف لائے تو حسب عادت دریافت فرمایا کہ بچہ کیسا ہے اب یہ وقت بڑے امتحان کا تھا اگر سچ بولیں تو وہ مصلحت فوت ہوتی ہے اور جھوٹ میں شرعاً گناہ حقیقت میں بڑی کشمکش کا وقت تھا لیکن دین فہم کو تیز کر دیتا ہے چنانچہ من جانب اللہ ایک جواب ان کو القا ہوا فرمایا کہ اب تو اس کو سکون ہے آرام ہے اس لئے کہ موت سے بڑھ کر کوئی سکون اور آرام نہیں ہے اس لئے کہ آرام وراحت کی دو صورتیں ہیں دفع مضرت یا جلب منفعت دونوں حالتوں میں عرفاً آرام سے ہونا کہا جاتا ہے موت میں دونوں چیزیں موجود ہیں دفع مضرت بھی ہے وہ تو ظاہر اور جلب منفعت یہ ہے کہ موت سے وصول الی المحبوب الحقیقی ہوتا ہے یہ خاص مسلمانوں کے لئے ہے۔

لطیفہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ

ایک لطیفہ یاد آیا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب میرے باپ یعنی حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوگیا تو جیسا کہ ایک اعرابی نے مجھ کو تسلی دی ایسی کسی نے نہیں دی سچ یہ ہے کہ دیندار خواہ گاؤں کا ہو یا شہر کا اس کا فہم چونکہ دین کی وجہ سے درست ہو جاتا ہے اس لئے وہ حقائق امور کو خوب سمجھتا ہے وہ مضمون تسلی کا یہ ہے

اصبر تکن بک صابرین فانما — صبر الرعیة بعد صبر الراس

خیر من العباس اجرک بعده — واللہ خیر منک للعباس

مطلب یہ ہے کہ اب صبر کیجئے ہم بھی آپ کی وجہ سے صبر کریں گے کیونکہ چھوٹوں کا صبر بڑے کے صبر کے بعد ہوتا ہے اور اس واقعہ میں نہ تمہارا کچھ نقصان ہوا بلکہ نفع ہی ہے اور وہ نفع یہ ہے کہ تم کو ثواب ملا اور وہ ثواب تمہارے لئے حضرت عباسؓ سے بہتر ہے اور حضرت عباسؓ کا بھی کچھ نقصان نہیں ہوا اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے مل گئے اور اللہ تعالیٰ عباسؓ کے لئے تم سے بہتر ہے یعنی تمہارے پاس رہنے سے اللہ کے پاس رہنا بہتر ہے یہ عجیب مضمون ہے۔

موت مومن کا تحفہ ہے

حقیقت میں موت ایسی ہی آرام کی شئے ہے حدیث میں آیا ہے کہ موت مومن کا تحفہ ہے اور انسان کی حالت یہ ہے کہ اس سے بھاگتا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ اس عالم کو دیکھا نہیں موت ایک ریل گاڑی کی طرح ہے جیسے گاڑی ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیتی ہے اسی طرح موت اس عالم سے دار آخرت میں پہنچا دیتی ہے جب گاڑی میں آدمی بیٹھا ہوتا ہے تو اس کو کچھ خبر نہیں ہوتی کہ میرے لئے وہاں کیا کیا تیار ہو رہا ہے جب ریل سے اسٹیشن پر اترے دیکھا تو وہاں طرح طرح کے سامان ہیں ایک مخلوق استقبال کے لئے کھڑی ہے اقسام اقسام کی نعمتیں کھانے پینے کی موجود ہیں تو اس وقت جانتا ہے کہ اللہ اکبر یہاں تو ہمارے لئے بڑا سامان ہے اور جہاں سے آیا تھا وہ سب اس کی نظر میں ہیچ معلوم ہوتا ہے بلکہ اس کا خیال تک بھی نہیں آتا اسی طرح اس دنیا کا حال ہے کہ اس وقت یہاں کچھ خبر نہیں لیکن جب یہاں سے رحلت ہوگی تو ان شاء اللہ تعالیٰ وہاں دیکھ لیں گے کہ یہاں ہمارے لئے کیا نعمتیں ہیں اور بزرگوں نے بصر سے یا بصیرت سے دیکھا ہے اس لئے ان کی نظر میں دنیا کی کوئی وقعت نہیں ہے دنیا کو عالم آخرت کے ساتھ وہ نسبت ہے جو ماں کے رحم کو اس دنیا کے ساتھ ہے جیسے بچہ اپنی رضامندی سے دنیا میں نہیں آتا اسی طرح آدمی وہاں جانا نہیں چاہتا اور جیسے بچہ ماں کے رحم ہی کو سمجھتا ہے کہ تمام جہان یہی ہے اور آگے اس کی نظر ہی نہیں جاتی اور جب ماں کے رحم سے نکلتا ہے تو حقیقت معلوم ہوتی ہے اسی طرح ہم لوگ جب یہاں سے جاویں گے تو اس دنیا کی حقیقت معلوم ہوگی بہر حال موت ہر طرح سکون اور آرام کی شئے ہے اسی واسطے حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے فرمایا اب کس کو سکون ہے اس کے بعد حضرت ابو طلحہؓ رضی

اللہ عنہ نے کھانا کھایا اور پھر ان کو بی بی کے پاس جانے کی رغبت ہوئی اور بی بی کا حال یہ کہ ظاہر میں تو جو کچھ میاں کہتے تھے ان کی رضا مندی کے واسطے سب کچھ کر رہی تھیں مگر اندر جو کچھ تھا وہ حق تعالیٰ کو معلوم تھا غرض میاں تو فارغ ہو کر سو رہے اور بی بی کو کیا نیند آئی ہوگی صبح کے وقت جب حضرت ابوطلحہؓ نماز پڑھ کر تشریف لائے تو بی بی نے پوچھا کہ بھلا ایک بات تو بتلاؤ اگر کوئی شخص کسی کے پاس کوئی امانت رکھ دے تو جب وہ اپنی امانت مانگے تو ہنسی خوشی دینا چاہیے یا ناک منہ چڑھانا چاہیے انہوں نے فرمایا کہ نہیں ہنسی خوشی دینا چاہیے کہا تو اللہ تعالیٰ نے اپنی امانت لے لی۔ اب تم صبر کرو میاں ناراض بھی ہوئے کہ رات تم نے خبر نہ کی فرمایا کہ کیا نفع تھا تم پریشان ہوتے مجھے اس پر قصہ یاد آیا تھا کہ انہوں نے موت کا نام سکون رکھا حاصل یہ کہ امراض بدنیہ کا انتہائی انجام موت ہے اور موت چونکہ قاطع تمام مصائب کی ہے اسی لئے کچھ مضر نہیں مگر پھر بھی امراض بدنیہ کا اس قدر اہتمام ہوتا ہے جس کی کوئی حد نہیں بخلاف مرض روحانی کے جس کی حقیقت ہے حدود شرعیہ سے تجاوز کرنا اور اعتدال سے خارج ہو جانا کہ اس کا انجام وہ ہلاکت ہے جس کی نسبت فرمایا ہے لا یموت فیھا ولا یحییٰ جس کا نام جہنم ہے اگر موت آجاتی تو سب قصے ختم ہو جاتے مگر وہاں موت بھی نہیں پس جس مرض کا انجام صرف ہلاکت بدن ہے اس کو جب قابل اہتمام سمجھتے ہیں تو جس مرض کا نتیجہ ہلاکت ابدی یا مدید شدید ہے کیا وہ قابل اہتمام نہیں کیا اس کو مرض نہ کہا جاوے گا مگر حالت یہ ہے کہ زکام ہو جاوے تو حکیم جی کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں اور صدہا روحانی امراض میں مبتلا ہیں اور کچھ پرواہ نہیں اور یوں تو ہر معصیت قابل اہتمام و فکر ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ وہ معصیت زیادہ قابل فکر ہے جس کو خفیف سمجھا جاوے۔

مقولہ بقراط

کسی نے بقراط سے پوچھا تھا کہ امراض میں کون سا زیادہ شدید ہے کہا کہ جس مرض کو خفیف سمجھا جاوے وہ بہت اشد ہے اسی طرح جس گناہ کو ہلکا سمجھا جاوے وہ بہت شدید ہے اس لئے کہ وہ لا علاج ہے سو منجملہ ایسے امراض کے ایک مرض یعنی گناہ وہ ہے جس کا اس آیت کریمہ میں ذکر ہے اور اسی واسطے اس کو اس وقت اختیار کیا گیا ہے۔

13 زبان ودل کے دو گناہوں کا ذکر

چنانچہ فرماتے ہیں یَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْیُنِ الخ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دو گناہوں کا ذکر فرمایا ہے آنکھوں کے گناہ کو اور دل کے گناہ کو یوں تو آنکھوں کے بہت سے گناہ ہیں لیکن یہاں بقرینہ سباق خاص گناہ کا ذکر ہے یعنی نیت بری ہونا ان دونوں گناہوں کو لوگ گناہ سمجھتے ہیں لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ جس درجہ ان کی مضرت ہے اس قدر نہیں سمجھتے چنانچہ گناہ کا ادنیٰ اثر یہ ہونا چاہیے کہ دل تو میلا ہو جائے مگر اس گناہ کے بعد دل بھی میلا نہیں ہوتا بہت خفیف سمجھتے ہیں کسی عورت کو دیکھ لیا کسی لڑکے کو گھور لیا اس کو ایسا سمجھتے ہیں جیسے کسی اچھے مکان کو دیکھ لیا یا کسی پھول کو دیکھ لیا اور یہ گناہ وہ ہے کہ اس سے بوڑھے بھی بچے ہوئے نہیں ہیں بدکاری سے تو بہت محفوظ ہیں کیونکہ اس کے لئے بڑے اہتمام کرنے پڑتے ہیں اول تو جس سے ایسا فعل کرے وہ راضی ہو اور روپیہ بھی پاس ہو اور نیز حیاو شرم بھی مانع نہ ہو غرض اس کے لئے شرائط بہت ہیں اسی طرح موانع بھی بہت ہیں چنانچہ کہیں تو یہ امر مانع ہوتا ہے کہ اگر کسی کو اطلاع ہوگئی تو کیا ہوگا کسی کو خیال ہوتا ہے کہ کوئی بیماری نہ لگ جاوے کسی کے پاس روپیہ نہیں ہوتا کسی کو اس کی وضع مانع ہوتی ہے چونکہ موانع زیادہ ہیں اس لئے کوئی شائستہ آدمی خصوصاً جو دیندار سمجھے جاتے ہیں اس میں بہت کم مبتلا ہوتے ہیں بخلاف آنکھوں کے گناہ کے کہ اس میں سامان کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ نہ اس میں ضرورت روپیہ کی ہے اور نہ اس میں بدنامی ہے کیونکہ اس کی خبر تو اللہ ہی کو ہے کہ کیسی نیت ہے کسی کو گھور لیا اور مولوی صاحب مولوی صاحب رہتے ہیں اور قاری صاحب قاری صاحب رہتے ہیں نہ اس فعل سے ان کی مولویت میں فرق آتا ہے اور نہ قاری صاحب کے قاری ہونے میں کوئی دھبہ لگتا ہے۔

بزرگوں کی پردہ پوشی

اور گناہوں کی خبر تو اوروں کو بھی ہوتی ہے مگر اس کی اطلاع کسی کو نہیں ہوتی معصیت کرتے ہیں اور نیک نام رہتے ہیں لڑکوں کو گھورتے ہیں اور لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کو بچوں سے بڑی محبت ہے جب کہ آنکھوں کے گناہ میں اطلاع نہیں ہوتی تو دل کے گناہ پر تو کیسے ہو سکتی ہے اور جن کو اطلاع ہوتی بھی ہے وہ حضرات ایسے متحمل اور ظرف والے ہیں کہ کسی کو خبر نہیں کرتے۔

اصلاح ظاہر-13

بدنگاہی سے آنکھ بے نور ہو جاتی ہے

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک شخص آیا اور وہ کسی کو بری نگاہ سے دیکھ کر آیا تھا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خطاب خاص سے تو اس کو کچھ نہ فرمایا لیکن یہ فرمایا مابان اقوام یترشح الزنامن اعینھم۔ یعنی لوگوں کا کیا حال ہے کہ ان کی آنکھوں سے زنا ٹپکتا ہے تو یہ عنوان ایسا ہے کہ اس میں رسوائی کچھ نہیں لیکن جو کرنے والا ہے وہ سمجھ جائے گا کہ مجھے فرما رہے ہیں اہل کشف نے لکھا ہے کہ بدنگاہی سے آنکھوں میں ایک ایسی ظلمت ہو جاتی ہے کہ جس کو تھوڑی سی بصیرت ہو وہ پہچان لے گا کہ اس شخص کی نگاہ پاک نہیں ہے اگر دو شخص ایسے لئے جاویں کہ عمر میں حسن و جمال میں اور ہر امر میں وہ برابر ہوں فرق ان میں صرف اس قدر ہو کہ ایک فاجر ہو دوسرا متقی ہو جب چاہے دیکھ لو متقی کی آنکھ میں رونق اور دل فریبی ہوگی اور فاسق کی آنکھ میں ایک قسم کی ظلمت اور بے رونقی ہوگی لیکن اہل کشف خصوصیت سے کسی کو کہتے نہیں بلکہ عیب پوشی کرتے ہیں۔

شاہ عبدالقادر صاحبؒ کی حکایت متعلق پردہ پوشی

اس پر مجھے مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت یاد آئی شاہ صاحب مسجد میں بیٹھ کر حدیث کا درس دیا کرتے تھے ایک مرتبہ حسب معمول حدیث کا درس ہو رہا تھا کہ ایک طالب علم وقت سے دیر کر کے سبق کے لئے آئے حضرت شاہ صاحب کو منکشف ہو گیا کہ یہ جنبی ہے غسل نہیں کیا وہ طالب علم معقولی تھے معقولی ایسے ہی لاپرواہ ہوتے ہیں شاہ صاحب نے مسجد سے باہر ہی روک دیا اور فرمایا کہ آج تو طبیعت سست ہے جمنا پر چل کر نہائیں گے سب لنگیاں لے کر چلو سب لنگیاں لے کر چلے اور سب نے غسل کیا اور وہاں سے آ کر فرمایا کہ ناغہ مت کرو کچھ پڑھ لو وہ طالب علم ندامت سے پانی پانی ہو گیا اہل اللہ کی یہ شان ہوتی ہے کیسے لطیف انداز سے اس کو امر بالمعروف فرمایا اور جب بزرگوں کی شان معلوم ہوگئی کہ وہ کسی کو رسوا نہیں کرتے تو اب مستفیدین کو بھی چاہیے کہ ایسے شیوخ سے اپنے عیب کو نہ چھپایا کریں اس لئے کہ عیب ظاہر نہ کرنا دو وجہ سے ہوتا ہے یا تو خوف ہوتا ہے کہ یہ ہم کو حقیر سمجھیں گے سو ان حضرات میں نہ تو یہ بات ہے کہ کسی کو حقیر سمجھیں اس لئے

کہ یہ حضرات سوائے اپنے نفس کے کسی کو حقیر نہیں سمجھتے اور یا یہ خوف ہوتا ہے کہ کسی کو اطلاع کردیں گے سو نہ ان حضرات میں یہ بات ہے اس لئے ان سے صاف کہہ دینا چاہئیے مگر یہ اظہار معالجہ کے لئے ہے نہ کہ بلا ضرورت کیونکہ بلا ضرورت گناہ کو ظاہر کرنا بھی گناہ ہے اور بضرورت ظاہر کرنے کے حق میں حضرت عارف شیرازیؒ فرماتے ہیں۔

چنداں کہ گفتیم غم با طبیباں　　درماں نکردند مسکیں غریباں
ماحال دل را با یار گفتیم　　نتواں نہفتن درد از حبیباں

(ہر چند کہ طبیبوں کے پاس ہم نے اپنا غم بیان کیا لیکن انہوں نے ہم مسکینوں غریبوں کے درج کا درماں نہ کیا، ہم اپنے دل کا اپنے محبوب دوست سے بیان کریں گے محبوبوں سے اپنا درد نہ چھپانا چاہیئے)

غرض چونکہ وہ لوگ کسی کو فضیحت نہیں کرتے اور جو فضیحت کرنے والے ہیں اُن کو اطلاع نہیں ہوتی اس لئے یہ گناہ بدنگاہی کا اکثر چھپا ہی رہتا ہے اس لئے لوگ بے دھڑک اس کو کرتے ہیں۔

بوڑھے لوگ بھی بدنظری میں مبتلا ہیں

پھر زنا و دیگر معاصی مثل سرقہ وغیرہ میں تو ضرورت اس کی بھی ہے کہ قوت طاقت ہو اس میں اس کی بھی ضرورت نہیں اس لئے بوڑھے بھی اس میں مبتلا ہیں۔ دیکھئے بوڑھا اگر عاشق ہو جاوے اور قابو بھی چل جاوے تو کچھ بھی نہیں کرسکتا اس لئے کہ وہ قوت ہی نہیں مگر آنکھوں کے سینکنے میں تو اس کی بھی ضرورت نہیں خواہ لب گور ہی ہو جاویں۔ مجھ سے ایک بوڑھے آدمی ملے اور وہ بہت متقی تھے انہوں نے اپنی حالت بیان کی کہ میں لڑکوں کو بری نظر سے دیکھنے میں مبتلا ہوں ایک اور بوڑھے وہ عورتوں کے گھورنے میں مبتلا تھے اور یہ مرض اول جوانی میں پیدا ہوتا ہے بلکہ سب گناہوں کی یہی شان ہے کہ اول جوانی میں تقاضے کی وجہ سے کیا جاتا ہے پھر وہ مرض اور روگ لگ جاتا ہے اور لب گور تک کیا جاتا ہے جیسے حقہ کہ اول کسی مرض کی وجہ سے پینا شروع کیا تھا مگر پھر یہ مرض لگ جاتا ہے اور شغل ہو

جاتا ہے لیکن جوان اور بوڑھے میں فرق یہ ہے کہ جوان آدمی تو معالجہ کے لئے کسی سے کہہ بھی دیتا ہے اور بوڑھا آدمی شرم کی وجہ سے کسی سے کہتا بھی نہیں۔ پس اس کے مخفی رہنے اور خفیف ہونے کی وجہ سے اس میں کثرت سے ابتلا واقع ہے۔

تفسیر آیت تعلیم خائنۃ الاعین ونکات

اسی واسطے فرماتے ہیں یَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ (اللہ تعالیٰ آنکھوں کی خیانت کو بھی جانتے ہیں، اور جو سینوں میں چھپاتے ہیں اسے بھی جانتے ہیں) یعلم کا لفظ دال ہے کہ اور لوگ اس سے واقف نہیں ہیں ہم ہی واقف ہیں مطلب یہ ہے کہ تم جو یہ سمجھتے ہو کہ ہمارے اس گناہ کی کسی کو خبر نہیں یہ صحیح نہیں ایسے کو خبر ہے کہ جس کو خبر ہو جانا غضب ہے اس لئے کہ اس کو تم پر پوری قدرت ہے اور اس گناہ کو ذکر فرما کر اس کی سزا بیان نہیں فرمائی بخلاف دیگر معاصی کے کہ ان کی سزا ساتھ ساتھ بیان فرمادی ہے، اس میں ایک نکتہ ہے وہ یہ کہ طبائع ہم لوگوں کی مختلف ہیں بعض طبائع تو ایسی ہوتی ہیں کہ ان کو سزا ہونا مانع اور زاجر ہوتا ہے وہ تو وہ لوگ ہیں جو بے حیا و بے شرم ہیں کہ جوتوں سے ڈرتے ہیں اور بغیر جوتیوں کے خواہ کسی کو خبر ہو جاوے ان کو کچھ باک نہیں اور بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں کہ سزا کی اگر اطلاع ہو جائے تو رکاوٹ کم ہوتی ہے لیکن اس سے وہ گڑ جاتے ہیں کہ فلاں کو خبر ہو جاوے گی بالخصوص جب یہ معلوم ہو جاوے کہ ہمارا یہ جرم معاف بھی ہو جاوے گا تو اور بھی زیادہ عرق عرق ہو جاتے ہیں کیا خوب کہا ہے۔

تصدق اپنے خدا کے جاؤں کہ پیار آتا ہے مجھکو انشا
ادھر سے ایسے گناہ پیہم ادھر سے وہ دمبدم عنایت

تفسیر عجیب آیت اذ تصعدون

اسی بناء پر ایک آیت کی تفسیر یاد آ گئی وہ یہ کہ غزوہ احد کے قصہ میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے جو حضور کے حکم میں کچھ خطا واقع ہوئی تھی وہ یہ کہ جس ناکہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت اور قائم رہنے کا امر فرمایا تھا بوجہ خطا اجتہادی کے اس پر قائم نہ رہے اس کے بارہ

میں ارشاد ہے اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلاَ تَلْوٗنَ عَلٰی اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ یَدْعُوْکُمْ فِیْ اُخْرٰاکُمْ فَاَ ثَابَکُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّکَیْلاَ تَحْزَنُوْا عَلٰی مَافَاتَکُمْ وَلاَ مَا اَصَابَکُمْ وَاللّٰہُ خَبِیْرٌ بِمَاتَعْمَلُوْنَ یعنی اللہ تعالیٰ نے تم کو ایک غم دیا بہ سبب اس کے کہ ہمارے رسول کو تم نے غم دیا اور غرض اس غم دینے کی یہ فرمائی کہ تم لوگ غمگین نہ ہو تو بظاہر یہ فہم میں نہیں آتا اس لئے کہ غم تو اس لئے دیا جاتا ہے تاکہ حزن ہو نہ کہ اس لئے کہ غم نہ ہو اسی واسطے مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ لا زاید ہے مطلب یہی ہے کہ غم اس لئے دیا تاکہ تم کو حزن ہو لیکن الحمدللہ میری سمجھ میں اس کی تفسیر ایسی آئی ہے کہ اس تقدیر پر لا ماننے کی ضرورت نہیں ہے اور معنی بے تکلف درست ہیں وہ یہ کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم حق تعالیٰ سے نہایت شرماتے تھے جب ان سے یہ خطا واقع ہوئی تو ان کا جی چاہتا تھا کہ ہم کو سزا اس کی دنیا میں مل جائے تو ہماری طبیعت صاف ہو جاوے اور اپنے مالک حقیقی سے سرخرو ہو جائیں اگر سزا نہ ہوتی تو ساری عمر رنجیدہ رہتے اور یہ غم ان کے نزدیک نہایت جانکاہ و جان فرسا تھا اس بناء پر فرماتے ہیں کہ ہم نے تم کو اس خطا کی یہ سزا دے دی تاکہ تم کو غم نہ ہو کہ غرض کہ دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں ایک تو وہ جو سزا کا نام سن کر رکتے ہیں اور ایک وہ جو صرف اطلاع کی خبر دینے سے شرماتے ہیں اور اس کام کے قریب نہیں جاتے تو جو بے حیا تھے وہ تو یوں رکے کہ یعلم میں اشارہ کی سزا کی طرف بھی ہے چنانچہ مفسرین ایسے مقام پر فیجازیکم بہ فرماتے ہیں اور دوسرے مذاق والے اس لئے رکے کہ شرم سے گڑ گئے کہ اللہ اکبر وہ جانتے ہیں بہر حال یہ دونوں مذاق والوں کے لئے وعید ہے اس تمام تر تقریر سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ یہ مرض نہایت اہتمام کے قابل ہے۔

بدنگاہی سے بچنے کے اہتمام کی ضرورت

اب ہم کو اپنی حالت دیکھنا چاہئے کہ ہمارے اندر اس معصیت سے بچنے کا کتنا اہتمام ہے میں دیکھتا ہوں کہ شاید ہزار میں ایک اس سے بچا ہوا ہو ورنہ ابتلائے عام ہے اور اس کو نہایت درجہ خفیف سمجھتے ہیں جو جوان ہیں ان کو تو اس کا احساس ہوتا ہے اور جن کی قوت شہویہ ضعیف ہو گئی ان کو احساس بھی نہیں ہوتا وہ سمجھتے ہیں کہ ہم کو تو شہوت ہی نہیں اس لئے کچھ

حرج نہیں ہے سوان کو مرض کا بھی پتہ نہیں لگتا اور بعضوں کو اور دھوکہ ہوتا ہے وہ یہ کہ شیطان بہکاتا ہے کہ جیسے کسی پھول اچھے کپڑے اچھے مکان وغیرہ کو دیکھنے کو دل چاہتا ہے ایسے ہی اچھی صورت دیکھنے کو بھی دل چاہتا ہے سو یہ بالکل دھوکہ ہے۔

رغبت کی انواع

یاد رکھو کہ رغبت کی مختلف انواع ہیں جیسی رغبت پھول کی طرف ہے ویسی انسان کی طرف نہیں اچھے کپڑے کو دیکھ کر کبھی جی نہیں چاہتا کہ اس کو گلے لگالوں چمٹالوں انسان کی طرف ایسی ہی رغبت ہوتی ہے ایک دھوکہ اور ہوتا ہے وہ یہ کہ بعضے یہ کہتے ہیں جیسے اپنے بیٹے کو دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ گلے لگالوں اسی طرح دوسرے کے بچے کو دیکھ کر بھی ہمارا یہی جی چاہتا ہے صاحبو کھلی ہوئی بات ہے اپنے سیانے بچہ اور دوسرے کے سیانے لڑکے میں بڑا فرق ہے اپنے لڑکے کو گلے لگانا چمٹانا اور طرح کا ہے اس میں شہوت کی آمیزش ہرگز نہیں اور دوسرے کے لڑکے کی طرف اور قسم کا میلان ہے کہ اس میں گلے لگانے سے بھی آگے بڑھنے کو بعض کا جی چاہتا ہے محبوب کی جدائی میں اور طرح کا رنج ہوتا ہے اور لڑکے کی جدائی میں اور قسم کا اور لڑکوں کی رغبت تو اور بھی سم قاتل ہے نصوص میں تو اس کی حرمت ہے۔

بدنظری بڑی سخت بلا ہے

ہمارے بزرگوں نے بھی جو اس کے آثار لکھے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑی سخت بلا ہے ایک بزرگ مطلق نظر کے لئے فرماتے ہیں **النظر سهم من سهام ابليس** یعنی نگاہ ابلیس کے تیروں میں سے ایک تیر ہے حضرت ابوالقاسم قشیری دونوں امر کی نسبت فرماتے ہیں کہ سالک کے لئے امردوں اور عورتوں کی مخالطت رہزن ہے ایک بزرگ کا خاص امردوں کے حق میں قول ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو اپنی بارگاہ سے مردود کرنا چاہتے ہیں اس کو لڑکوں کی محبت میں مبتلا کردیتے ہیں غرض یہ نہایت مضرت کی چیز ہے۔

بدنظری سے سیری نہیں ہوتی

اور دوسرے معاصی اور بدنگاہی کی معصیت میں ایک اور فرق ہے وہ یہ کہ صدور کے بعد سب گناہوں کا اثر ختم ہوجاتا ہے اور دل بھر جاتا ہے مگر بدنگاہی ایسی شئے ہے کہ جب

صادر ہوتی ہے اور زیادہ تقاضا ہوتا ہے کہ اور دیکھو آدمی کھانا کھاتا ہے سیر ہو جاتا ہے پانی پیتا ہے پیاس بجھ جاتی ہے، مگر یہ نظر ایسی بلا ہے کہ اس سے سیری نہیں ہوتی اس حیثیت خاص سے یہ تمام گناہوں سے بڑھ کر ہے۔

شیطانی دھوکہ

بعضے لوگ اس کو سمجھتے ہیں کہ اس سے خدا کا قرب ہوتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ہم خدا کی قدرت دیکھتے ہیں مگر نرا شیطانی دھوکہ ہوتا ہے شیخ شیرازی نے ایسے ہی لوگوں کے جواب میں ایک حکایت تحریری فرمائی ہے فرماتے ہیں۔

یکے صورت دید صاحب جمال — بگر دیدش از شورش عشق حال
برا نداخت بیچارہ چنداں عرق — کہ شبنم برآرد بہشتی ورق
گذر کرد بقراط بروئے سوار — پرسید کیں راچہ افتاد کار
کسے گفتش ایں عابد پارساست — کہ ہرگز خطائے زدستش نخاست
ببرداشت خاطر فریبے دلش — فرو رفتہ پائے نظر در گلش
نہ ایں نقش دل می رباید زدست — دل آں مے رباید کہ ایں نقش بست

(ایک شخص نے ایک خوبصورت امرد کو دیکھا اور دیکھتے ہی اس کے عشق میں گرفتار ہو گیا اور وہ شخص پسینہ پسینہ اور بے خود ہو رہا تھا وہاں سے بقراط سواری پر گزرا، اس نے لوگوں سے اس کا ماجرا پوچھا، کسی نے بتلایا کہ یہ بزرگ عابد شخص ہے اس نے ایک حسین لڑکے کو دیکھا ہے اس میں حق تعالیٰ کی قدرت کا مظاہرہ کر رہا ہے، اور اس کو دیکھ کر اس کے دل کا حال متغیر ہوا ہے۔)

بقراط جواب دیتا ہے۔

نگارندہ راخود ہمیں نقش بود — کہ شوریدہ رادل بیغمار بود
چراطفل یک روزہ ہوشش نبرد — کہ درصنع دیدن چہ مانع چہ خرد
محقق ہماں بیند اندر ابل — کہ در خوبرویان چیںیں و چگل

(بقراط نے کہا کیا حق تعالیٰ نے صرف یہی لڑکا ہی اپنی قدرت کے اظہار کے لئے پیدا کیا ہے اور کوئی چیز پیدا نہیں کی ایک دن کا بچہ بھی تو اسی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اس کو دیکھ کر اس کا حال متغیر نہ حال ہو، حق تعالیٰ کی صفت دیکھنے میں تو دونوں برابر ہیں بلکہ طفل یک روزہ توجہ زیادہ عجیب ہونے کے اس میں قدرت حق کا ظہور زیادہ ہے جو شخص حقیقت میں ہے وہ اونٹ میں بھی وہی دیکھتا ہے جو چین وچگل کے خوبصورتوں میں دیکھتا ہے)

اگر کوئی دعویٰ کرے کہ مجھ کو اونٹ اور انسان صاحب جمال دونوں برابر ہیں وہ کاذب ہے آدمی اپنی طبیعت کا خود اندازہ کر سکتا ہے اور یہ میلان جس کو عشق کہتے نہیں ہے یہ شہوت ہے ایک صاحب فرماتے ہیں۔

این نہ عشق است آنکہ در مردم بود این فساد از خوردن گندم بود

(آج کل لوگوں میں جو ہوس ہے وہ عشق نہیں ہے، یہ سارا فساد گندم کھانے کے سبب ہے)

یہ سارا فساد روٹیوں کا ہے ایسے لوگوں کو چار روز تک روٹی نہ ملے اس کے بعد پوچھا جاوے کہ روٹی لاؤں یا لڑکا لاؤں یہ کہے گا کہ لڑکا اپنی ایسی تیسی میں جائے روٹی لاؤ۔

عشق مجازی

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ملا جامیؒ نے تو عشق مجازی کا امر کیا ہے اور حکایت لکھی ہے کہ کسی بزرگ کے پاس کوئی طالب گیا تھا انہوں نے کہا کہ عاشق ہو کر آؤ اور آگے لکھتے ہیں۔

متاب از عشق رو گرچہ مجازیست کہ آن بہر حقیقت کار سازیست

اگر اول الف با تا نخوانی زقرآں حرف خواند کے توانی

(عشق اگرچہ مجازی ہو اس سے رخ نہ موڑو یعنی اس کے ازالہ کی حاجت نہیں بلکہ اس کو محبوب حقیقی کی طرف مائل کر دو یعنی اس کا امالہ کر دو، اگر پہلے الف با تا نہیں پڑھو گے تو قرآنی حروف پڑھنے کی صلاحیت کس طرح پیدا ہو گی)

اس سے بعضے نادانوں نے سمجھا کہ جب تک کسی رنڈی کسی لونڈے کو قبلہ توجہ نہ بنایا جاوے اس وقت تک عشق حقیقی نہ میسر ہو گا بڑی غلطی اور سخت کم فہمی ہے میں اس کا مطلب عرض کرتا ہوں بات یہ ہے کہ اصلی مقصود طالب کا تو یہ ہے کہ جملہ تعلقات قطع کر کے خدا تعالیٰ کی

طرف توجہ ہوتو اس کے دو جز ہیں تعلقات مخلوق سے قطع کرنا اس کو تو اصطلاح میں فصل کہتے ہیں اور دوسری طرف تعلق پیدا ہونا اس کو وصل یعنی فصل و وصل کہتے ہیں اور یہ تعلقات ہی فاصل و حاجب بن رہے ہیں اگر یہ درمیان سے اٹھ جاویں تو وصل ہی وصل ہے شیخ فرماتے ہیں۔

تعلق حجابست بے حاصلی　　　چو پیوند ہا بگسلی واصلی

(تعلقات غیر اللہ حجاب اور لا حاصل ہیں جب ان تعلقات کو قطع کرلو گے تو تم واصل ہو جاؤ گے)

پس معلوم ہوا کہ مقصود انقطاع عما سوی اللہ ہے جب یہ ہو جاوے تو قصہ سہل اور اس انقطاع کی تحصیل کے لئے بزرگوں نے مختلف معالجے اور تدبیریں فرمائی ہیں۔

متقدمین کا طریق

مقصود ایک ہی ہے صرف طرق مختلف ہیں ان میں سے ایک طریق تو یہ ہے کہ جس جس مخلوق سے تعلق ہو اور جو جو مرض ہو اس کو قلب سے ایک ایک کر کے زائل کر دیا جاوے چنانچہ متقدمین کا یہی طریق تھا لیکن اس طریق کے اندر سخت مشقت تھی اس لئے کہ مثلاً کسی شخص کو دس چیزوں سے تعلق ہے مکان سے باغ سے اولاد وغیرہ سے اور دس ہی اس کو مرض ہیں کینہ، حسد، تکبر وغیرہ تو سب کا بالتفصیل علیحدہ علیحدہ معالجہ کیا جاوے اس کے لئے عمر نوح چاہئے اور پھر بھی بیخ کنی ان امراض کی نہ ہوگی اس مشقت کو دیکھ کر بالہام حق پچھلے بزرگوں نے ایک طریق ایجاد کیا ہے جیسے طبیب مشفق کی شان ہوتی ہے کہ مریض اگر کڑوی دوا سے ناک منہ چڑھاتا ہے تو وہ اس کو کسی اچھی تدبیر سے کھلا دیتا ہے یا بدل دیتا ہے ایسے ہی انہوں نے دیکھا کہ مثلاً ایک شخص کو ایک ہزار چیزوں سے تعلق ہے تو اگر ایک ایک شئے سے تعلق چھڑایا جاوے تو بہت مدت صرف ہوگی کوئی تدبیر ایسی ہونی چاہئے کہ ایک دم سے سب کا خاتمہ ہو جائے جیسے کسی مکان میں کوڑا بہت ہو تو اس کی صفائی کا ایک طریق تو یہ ہے کہ ایک ایک تنکا لیا اور پھینک دیا اسی طرح سب تنکے اور کوڑا مکان سے باہر پھینک دیا جاوے اس میں تو بڑا وقت صرف ہوگا اور ایک طریق یہ ہے کہ جھاڑو لے کر تمام تنکوں کو ایک جگہ جمع کر کے پھینک دیا تو ایسے ہی یہاں بھی کوئی جھاڑو ہونا چاہئے کہ سب تعلقات کو سمیٹ کر

ایک جگہ کر دیوے پھر اس کا ازالہ کر دیا جاوے چنانچہ ان کی سمجھ میں آیا کہ عشق ایک ایسی شئے ہے کہ سب چیزوں کو پھونک کر خود ہی رہ جاتا ہے چنانچہ اگر کوئی کسی کسبی وغیرہ پر عاشق ہو جاتا ہے تو مال بیوی بچے باغ مکان حتیٰ کہ اپنی جان تک اس کے واسطے ضائع کر دیتا ہے۔

عشق کی تاثیر

ایک رئیس کو بیلوں کا عشق تھا ہزار ہا روپیہ اس میں ضائع کر دیا ہمارے استاد حضرت مولانا فتح محمد صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو کتابوں کا شوق تھا خود نہ دیکھتے تھے مگر سینکڑوں کتابیں اس قسم کی خرید کر رکھ چھوڑیں تھیں غرض عشق وہ شئے ہے کہ سوائے معشوق کے سب کو فنا کر دیتا ہے۔

عشق آں شعلہ است کوچوں بر فروخت ہر چہ جز معشوق باشد جملہ سوخت

(عشق وہ شعلہ ہے کہ جب وہ روشن ہوتا ہے سوائے معشوق کے سب کو جلا دیتا ہے)

اس لئے ان بزرگوں نے تجویز کیا کہ طالب کے اندر عشق پیدا کرنا چاہئے خواہ کسی شئے کا ہو اس واسطے وہ اول دریافت کرتے تھے کہ کسی پر عاشق بھی ہو۔ پس معلوم ہوا اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی ہی کا عشق ہو بھینس کا عشق بھی اس کے لئے کافی ہے اس لئے کہ مقصود تو یہ ہے کہ تمام اشیاء سے توجہ منصرف ہو کر ایک طرف ہو جاوے تاکہ پھر اس کا امالہ عشق حقیقی کی طرف سہل ہو جاوے چنانچہ ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ ایک شخص ان کے پاس مرید ہونے آیا انہوں نے دریافت فرمایا کہ کسی شئے سے تم کو محبت بھی ہے اس نے کہا کہ مجھ کو اپنی بھینس سے محبت ہے فرمایا کہ جاؤ چالیس روز تک بھینس کا تصور کرو لیکن خدا کے لئے اور لوگ اس کا وظیفہ نہ کر لیں اس لئے کہ ہر شخص کی حالت جدا ہے کسی کے لئے کچھ مناسب ہے کسی کے لئے کچھ، کہیں طبیب اور اس کے احمق شاگرد کا سا قصہ نہ ہو جاوے وہ یہ ہے کہ ایک طبیب تھے وہ کسی مریض کو دیکھنے گئے پہلے روز کی حالت سے اس روز کچھ تغیر پایا تو کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے نارنگی کھائی ہے اس سے تم کو یہ تکلیف بڑھ گئی اس نے کہا حضور بے شک نارنگی کھائی ہے جب وہاں سے فارغ ہو کر آئے تو راستہ میں شاگرد

صاحب نے پوچھا کہ حضرت آپ کو کیسے معلوم ہوگیا کہ اس نے نارنگی کھائی حکیم صاحب نے فرمایا کہ بھائی بات یہ ہے کہ اس کے مزاج اور حالت دیکھ کر مجھ کو معلوم ہوگیا کہ کوئی بارد شئے اس نے کھائی اور نارنگی کی تعین اس سے معلوم ہوئی کہ اس کی چارپائی کے نیچے میں نے نارنگی کے چھلکے دیکھے شاگرد صاحب احمق تو تھے ہی جب طب پڑھ کر فارغ ہوئے تو کسی رئیس کو دیکھنے کے لئے بلائے گئے ان کی چارپائی کے نیچے نمدہ پڑا تھا فرماتے ہیں کہ بس معلوم ہوگیا کہ آپ کو جو یہ مرض ہوا آپ نے نمدہ کھایا ہے حاضرین سب ہنس پڑے اور طبیب کا حمق سب پر واضح ہوگیا تو خدا کے واسطے ایسا قیاس نہ کیجئو کہ آج سے نماز روزہ ذکر شغل چھوڑ کر بھینس کا تصور باندھ کر بیٹھ جاؤ کہ یہ اس شخص کی خصوصیت تھی ۔ الحاصل ان بزرگ نے فرمایا کہ جاؤ بھینس کے تصور کا چلہ کیجئو اور چالیس روز کے بعد ہم کو خبر دو چنانچہ پانچ وقت نماز سے فارغ ہوجاتے اور ایک گوشہ میں بیٹھ کر اسی بھینس کا تصور کیا کرتے ۔ جب چالیس روز پورے ہوگئے تو پیر صاحب تشریف لائے اور فرمایا کہ بیٹا باہر آؤ کہتے ہیں کہ حضور باہر کیسے آؤں بھینس کے سینگ اڑتے ہیں پیر نے شاباشی دی کہ مقصود حاصل ہوگیا سب روگ جاتے رہے اب صرف بھینس رہ گئی اس کا نکل جانا سہل ہے ۔

عشق مجازی کے خطرات

پس اس تقریر سے معلوم ہوا کہ اس کے لئے کسی عورت یا لڑکے کا عشق ضروری نہیں ہے بلکہ اس میں سخت خطرہ ہے کہ اس لونڈے یا عورت ہی میں نہ رہ جائے اور مقصود اصلی سے محروم رہے اس لئے قصداً ہرگز اس کو اختیار کرنا جائز نہیں ہے ہاں اگر اضطراراً بلا قصد اس میں ابتلا کسی کو ہوجائے تو وہ بھی وصول کے لئے خاص شرائط کے ساتھ بعض اوقات ذریعہ ہوجاتا ہے ۔

عاشقی گرزیں سروگرزاں سرست   عاقبت مارا بداں شہ رہبراست

مگر اس کی چند شرطیں ہیں اول تو یہ ہے کہ اس کے پاس نہ رہے نہ اس کو دیکھے نہ کلام کرے نہ اس کی آواز سنے حتی الوسع دل سے بھی اس کو زائل کرنے کی فکر کرے غرض حتی الامکان اس سے بچے اگرچہ اس طرح کرنا نفس کو بے حد شاق ہوگا لیکن ہمت نہ توڑے اور دل کو مضبوط کر کے اس

پر عمل کرے چند روز کے بعد ایسا کرنے سے اس کے قلب میں ایک سوزش پیدا ہوگی اور نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ جاہ مال اولاد سب کی محبت جاتی رہے گی اب اس میں مادہ تو محبت کا پیدا ہو چکا ہے شیخ کامل اس کو مائل الحق کر دے گا اس صورت سے عشق مجازی وصول الی الحقیقۃ کا ذریعہ بن جاوے گا اور اگر اس محبوب سے جدا نہ ہوا بلکہ اس سے اختلاط رکھا ہم کلام ہم نشین ہوا تو پھر اسی بلا میں پھنسا رہے گا اور کسی دن بھی اس کو اس سے خلاصی نہ ہوگی چنانچہ خود ملا جامیؒ جن کے کلام سے عشق مجازی کی تحصیل پر استدلال کیا جاتا ہے آگے چل کر فرماتے ہیں۔

ولے باید کہ در صورت نمانی وزیں پل زود خود را بگذرانی

(لیکن یہ چاہیے کہ صورت میں نہ لگا رہے بلکہ اس پل سے جلد گزر جائے)

مولانا اسی عشق کے بارے میں فرماتے ہیں۔

عشق با مردہ نباشد پائدار عشق را با حی و باقیوم دار

عشق ہائے گز پے رنگے بود عشق نبود عاقبت ننگے بود

(مردہ کے ساتھ عشق کی پائیداری نہیں ہے اس لئے اس حی وقیّوم کا عشق اختیار کرو جو ہمیشہ باقی ہے جو عشق محض رنگ وروپ پر ہوتا ہے اس کا انجام حسرت وندامت ہے وہ عاشق ہی نہیں ہے)

آگے فرماتے ہیں۔

غرق عشقے شو کہ غرق است اندریں عشق ہائے اولین و آخریں

(عشق حقیقی میں غرق ہو جاؤ اس میں غرق ہونا اولین وآخرین کا عشق ہے)

پھر یہاں پر شبہ ہوتا تھا کہ ہم جیسوں کو عشق حقیقی تک رسائی کہاں ممکن ہے اس کا جواب دیتے ہیں۔

تو مگو مارا بداں شہ بار نیست با کریماں کار ہا دشوار نیست

(تو یہ خیال نہ کر کہ بھلا ہماری پہنچ اس دربار تک کہاں ہے کیونکہ کریموں کو کوئی کام مشکل نہیں ہوتا)

یعنی ان کو کچھ مشکل نہیں تم کو مشکل نظر آتا ہے تم ذرا اس طرف متوجہ ہو کر تو دیکھو وہ خود تم کو اپنے قریب کر لیں گے وہ دنیا کے محبوبوں کی طرح نہیں ہیں کہ عشاق مرجاتے ہیں اور وہ نخرے کرتے ہیں۔

بدنظری اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے

یہ ہے غرض اس مسئلہ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خوب نظربازی کریں مزے اڑائیں اور سمجھیں کہ ہم صوفی ہیں ہم کو سب حلال ہے اور یہ فعل ہمارے قرب کا واسطہ ہے استغفراللہ قرب سے اس کو کیا واسطہ یہ تو بہت بعید کردینے والا ہے بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گناہ اللہ تعالیٰ کو بہت ناپسند ہے چنانچہ حدیث میں ہے انا غیور واللّٰہ اغیر منی و من غیرۃ حرم الفواحش ماظھر منھا وما بطن اور یہ سب فواحش ہیں آنکھ سے دیکھنا ہاتھ سے پکڑنا پاؤں سے چلنا کیونکہ ان سب کو شارع نے زنا ٹھہرایا ہے۔

آنکھ کا زنا

چنانچہ فرماتے ہیں العینان[1] تزنیان وزناھما النظر والاذنان ترنیان وزنا ھما الاستماع واللسان یزنی وزناہ النطق وایدان ترنیان وزناھما البطش الحدیث یعنی کہ آنکھیں زنا کرتی ہیں اوران کا زنا دیکھنا ہے اور کان زنا کرتے ہیں اوران کا زنا سننا ہے اور زبان بھی زنا کرتی ہے اوراس کا زنا بولنا ہے (یعنی کسی عورت ولڑکے سے شہوت کی راہ سے باتیں کرنا) اور ہاتھ بھی زنا کرتا ہے اوران کا زنا (غیرمحرم) کو پکڑنا ہے اور جب یہ فواحش ہیں اور فواحش پر غیرت حق اوپر معلوم ہوچکی ہے تو ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو یہ افعال نہایت ناپسند ہیں اور افسوس ہے کہ بعضے پیر بھی اس میں مبتلا ہوتے ہیں کہ عورتیں ان سے پردہ نہیں کرتیں اور کہتی ہیں کہ یہ تو بجائے باپ کے بلکہ باپ سے بھی زیادہ ہیں اور بے حیا بے محابا سامنے آتی ہیں اور بڑے بے حیا دیوث وہ مرد ہیں جو ایسے پیروں کے سامنے اپنی بیٹیوں بہوؤں کو آنے دیں بعض جگہ تو ایسا سنا گیا ہے کہ مریدنیاں تنہا مکان میں جاتی ہیں اور وہاں مرید ہوتی ہیں نعوذ باللہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون ہوگا حضور سے عورتیں پردہ کرتی تھیں ساری اُمت کی عورتیں آپ کی روحانی بیٹیاں ہیں اور حضور خود معصوم کسی قسم کے وسوسہ کا بھی شائبہ نہیں لیکن باوجود اس کے پھر پردہ کا حکم تھا اور

---

[1] مسند إمام أحمد ۲: ۳۴۳، إتحاف السادة المتقين للزبيدى ۷: ۳۳۴

ازواج مطہرات تمام اُمت کے مردوں عورتوں کی مائیں تھیں چنانچہ ارشاد ہے وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ (اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں ان کی مائیں ہیں) اور کسی کو ان کی نسبت تو بہ توبہ وسوسہ تک بھی شر کا نہ تھا لیکن باوجود اس کے ارشاد ہے وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ یعنی اپنے گھروں میں جمے رہو باہر نہ نکلو۔

عورتوں کی صفت حمیدہ

اور فرماتے ہیں وَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ یعنی نرم بات مت کرو کہ جس کے قلب میں روگ ہے وہ طمع کرے گا چنانچہ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ جیسے مردوں کے لئے خوش اخلاقی صفت حمیدہ ہے عورتوں میں بداخلاقی صفت حمیدہ ہے یعنی غیر مردوں سے نرمی اور میٹھی باتیں نہ کریں اور نہ تند مزاجی سے بلکہ ایسے انداز سے بات کریں کہ اس کو مضمون مفہوم ہو جائے اور کسی قسم کی طمع اس کے قلب میں نہ آوے نہایت خشکی وصفائی سے بات کریں البتہ اپنے خاوند اور دوسری عورتوں کے ساتھ خوش اخلاقی برتیں اللہ اکبر یہ خاندان نبوت کا انتظام ہے آج کون ہے وہ شخص کہ ان سے زیادہ اپنے کو مقبول کہے بلکہ یہ وقت چونکہ فتنہ کا ہے اس لئے نہایت سخت انتظام کی ضرورت ہے۔

ایک بزرگ کو خواب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد

ایک بزرگ تھے وہ اس میں احتیاط نہ کرتے تھے اس لئے کہ بوڑھے بہت تھے غیر اولی الاربہ میں داخل تھے اس لئے ان کو عورتوں سے زیادہ احتجاب نہ تھا ایک دوسے بزرگ نے ان کو نصیحت کی انہوں نے نہ مانا ان بے احتیاط بزرگ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا یہ مسئلہ پوچھا فرمایا کہ اگر مرد جنیدؒ ہو اور عورت رابعہ بصریہؒ ہو اور وہ دونوں ایک جگہ تنہا ہوں تو ثالث ان کا شیطان ہوگا اور آدمی خواہ کسی قدر بوڑھا ہو جاوے لیکن مادہ تو اس کے اندر باقی رہتا ہی ہے وہ فرشتہ تو ہے نہیں ہاں یہ اور بات ہے کہ کچھ نہ کر سکے لیکن نظر سے تو محفوظ نہیں رہ سکتا اور کیسے محفوظ رہ سکتا ہے مرد کے اندر تو عورت کی طرف میلان خلقۃً پیدا کیا ہے کوئی اس فطری جوش کو کیسے روک سکتا ہے۔

حکایت حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحبؒ گنج مرادآبادی

گنج مرادآباد میں ایک بزرگ تھے جناب مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ تقریباً ایک سو دس برس کی ان کی عمر ہوئی میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا جاڑے کا موسم تھا صبح کو اٹھ کر خادم کو آواز دی ارے فلانے مجھ کو کچھ شبہ سا ہوگیا ہے جی چاہتا ہے کہ نہالوں طبیعت صاف ہو جاوے گی چنانچہ خادم نے پانی رکھ دیا اسی جاڑے میں غسل فرمایا بتلایئے اگر کچھ نہ رہا تھا تو شبہ کیسا ایک مرتبہ کانپور میں ہمارے گھر بہت عورتیں آئیں اس میں اختلاف تھا کہ حضرت مولانا صاحب موصوف سے پردہ چاہئے یا نہیں میں نے یہ اختلاف سن کر یہ حکایت ان کو سنائی اور کہا کہ اب تم خود فیصلہ کرلو کہ پردہ ضروری ہے یا نہیں سب سن کر چپ ہو رہیں حضرت جب سو برس کی عمر میں یہ قصہ ہوسکتا ہے تو پچاس برس کی عمر میں اب کیا مشکل ہے اور بہت سے پیر جوان بھی ہوتے ہیں اور آج کل تو پیر بننا کچھ بھی مشکل نہیں ہے لمبے لمبے بال ہوں موٹے موٹے دانوں کی تسبیح ہو رنگا کرتا ہو بس پیر ہوگئے پھر وہ خواہ عورتوں کو گھوریں لونڈوں کو تکیں حرام حلال میں کچھ امتیاز نہ کریں ان کی پیری ایسی مضبوط ہے کہ وہ کہیں سے نہیں خالی بلکہ جس قدر کوئی خلاف شرع ہوگا اس قدر زیادہ مقبول ہے اور جس قدر حدود شرعیہ کے اندر ہوگا وہ پیری سے دور ہے وہ تو نرا ملا ہے یہ تو مردوں کی حالت تھی۔

بعض عورتوں کا مرض بدنگاہی

اب عورتوں کی کیفیت سنیئے بعض عورتیں ایسی بے حیا ہوتی ہیں کہ وہ خود مردوں کو دیکھتی ہیں یا پردہ وغیرہ اٹھادیتی ہیں کہ دوسرا مرد ان کو دیکھ لیتا ہے اور احتیاط نہیں کرتیں حدیث میں لعن[۱] اللّٰہ الناظر والمنظور الیہ اس کے متعلق جو یوں عورتوں سے کہا جاتا ہے نصیحت کی جاتی ہے تو کہتی ہیں کہ اٹھ ایک دفعہ دیکھ کر پھر کیا دیکھے گا ساری عمر ترسے گا جو بڑی پردہ نشین کہلاتی ہیں ان کی یہ حالت ہے کہ خاوند کے سامنے تو بھنگن ہی بنی رہیں گی اور اگر کہیں جاویں گی تو تمام زیب زینت ختم کر کے بیگم بن کر جاوے گی سخت بے حیائی کی بات ہے کہ خاوند جس کے لئے زیب و زینت کا حکم ہے اس کے سامنے تو زینت نہ کی جاوے اور

---

[۱] مشکوۃ المصابیح: ۳۱۲۵، کنز العمال: ۱۹۱۶۲، کشف الخفاء للعجلونی: ۵۷۰

دوسروں کے دیکھنے کے لئے جاوے چاہیے تو یہ کہ اس کا برعکس ہو بعض عورتیں دولہا دلہن اور بارات کو دیکھتی ہیں اور ان کے مرد بھی کچھ نہیں کہتے اسی طرح دوسری بے احتیاطی قابل نظر ہے وہ یہ کہ بعض مرد بڑے بے احتیاط ہوتے ہیں کہ گھر میں پکار کر نہیں جاتے ذرا کھنکارا اور فوراً اندر گھس گئے اور اکثر عورتیں بھی ایسی بے احتیاط ہوتی ہیں کہ ڈولی سے اترنے سے پہلے تحقیق نہیں کراتیں کہ کوئی مرد تو اندر نہیں ہے میں ایک دفعہ بیمار تھا بہت عورتیں ڈولی سے عیادت کے لئے آئیں اور بلا تحقیق اندر آ گئیں میں نے ان کو خوب برا بھلا کہا اور جب عورتیں ایک جگہ جمع ہوتی ہیں اس وقت اور زیادہ بے حیائی ہوتی ہے چنانچہ بسا اوقات بے کہے اس گھر کے مرد دروازے میں آ کر سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں اندر کسی نے منہ پھیر لیا کسی نے آنچل سے منہ ڈھک لیا کوئی کسی کے پیچھے ہو گئی اور طرفہ یہ کہ ہر ایک یہ جانتی ہے کہ مجھ کو نہیں دیکھا حالانکہ اس نے سب کو دیکھ لیا۔

بدنظری کا علاج

خلاصہ یہ کہ آنکھوں کا گناہ سخت ہے اور اس میں بہت ابتلا ہو رہا ہے اس کا بہت انتظام کرنا چاہیے اپنا بھی اور گھر والوں کا بھی اور اس کا علاج سہل ہے یہ ہے کہ راہ میں چلنے کے وقت نیچی نگاہ کر کے چلنا چاہیے اِدھر اُدھر نہ دیکھے ان شاء اللہ تعالیٰ محفوظ رہے گا۔ شیطان جب مردود ہوا تو اس نے کہا تھا **لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِنْ ۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ وَ عَنْ اَيْمَانِهِمْ وَ عَنْ شَمَآئِلِهِمْ** یعنی میں ان کے (گمراہ کرنے کے) لئے تیرے سیدھے راستہ پر بیٹھوں گا پھر ان کے پاس آؤں گا ان کے سامنے سے اور پیچھے سے اور داہنے اور بائیں سے چار سمتیں تو اس نے بتلائیں اور دو سمتیں باقی رہیں اوپر اور نیچے بزرگان دین نے اس میں ایک لطیفہ لکھا ہے کہ اوپر نیچے کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ اکثر گناہ چار سمتوں سے ہوتے ہیں پس بچنے کی دو صورتیں رہیں یا تو اوپر دیکھ کر چلو یا نیچے دیکھ کر مگر اوپر دیکھنے میں تو گر جانے اور آنکھ میں کچھ پڑ جانے کا اندیشہ ہے اس لئے نجات کے لئے یہی شق متعین ہوئی کہ نیچے دیکھ کر چلیں قال اللہ تعالیٰ **وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا** (ترجمہ) اللہ کے بندے وہ ہیں جو زمین پر تواضع سے چلتے ہیں۔ کسی نے اس کی وجہ پوچھی فرمایا کہ دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ جن کو

میں پہچانتا ہوں اور دوسرے وہ جن کو میں نہیں پہچانتا جن کو پہچانتا ہوں ان کو بلا دیکھے بھی آواز سے پہچان لیتا ہوں دیکھنے کی کیا ضرورت ہے اور جن کو نہیں پہچانتا ان کے دیکھنے سے کیا فائدہ ہے سبحان اللّٰہ من حسن اسلام المرأ ترکہ مالا یعنیہ[1] (انسان کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ لایعنی کو چھوڑ دے) پر عمل اس کو کہتے ہیں بعض بزرگوں نے اس نظر کے گناہ سے بچنے کے واسطے جنگل میں رہنا اختیار کر لیا ہے۔ شیخ شیرازی فرماتے ہیں۔

بزرگے دیدم اندر کوہسارے　　قناعت کرد از دنیا بغارے

چرا گفتم بشہر اندر نیائی　　کہ بارے بندے از دل برکشائی

بگفت آنجا پریرو یان نغزند　　چوگل بسیار شد پیلاں بلغزند

(میں نے ایک بزرگ کو پہاڑ کے ایک غار کے کونے میں بیٹھے دیکھا، میں نے اس سے کہا کہ آپ شہر کے اندر کیوں نہیں آتے وہاں بندہ کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ اس نے کہا کہ وہاں کے حسین نفرت کرتے ہیں جب پھول زیادہ ہو جاتے ہیں تو ریشم کے کیڑے گرتے ہیں)

بدنظری کی دنیا میں سزا

ایک بزرگ طواف کر رہے تھے اور ایک چشم تھے اور کہتے جاتے تھے اللّٰھم انی اعوذبک من غضبک کسی نے پوچھا کہ اس قدر کیوں ڈرتے ہو کیا بات ہے کہا میں نے ایک لڑکے کو بری نظر سے دیکھ لیا تھا غیب سے چپت لگا اور آنکھ پھوٹ گئی اس لئے ڈرتا ہوں کہ پھر عود نہ ہو جاوے حضرت جنیدؒ چلے جا رہے تھے ایک حسین لڑکا نصرانی کا سامنے آ رہا تھا ایک مرید نے پوچھا کہ کیا اللہ تعالیٰ ایسی صورت کو بھی دوزخ میں ڈالیں گے حضرت جنیدؒ نے فرمایا کہ تو نے اس کو نظر استحسان سے دیکھا ہے عنقریب اس کا مزہ تم کو معلوم ہوگا چنانچہ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ وہ شخص قرآن بھول گیا نعوذ باللہ بعضے سچے بزرگ حسن پسند ہوتے ہیں بعض کو اس سے دھوکہ ہو گیا ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ حسن پرست تھے تو ہم اگر ایسا کریں تو کیا مضائقہ ہے سبحان اللہ کیا استدلال ہے بات یہ ہے ؎

کارپاکاں را قیاس از خود مگیر　　گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

---

[1] مجمع الزوائد للھیثمی ۸:۱۸، مسند الامام أحمد ۱:۲۰۱، کنز العمال ۳:۸۲۹۱

(نیک لوگوں کو اپنے اوپر قیاس مت کرو اگر چہ دیکھنے میں تمہارا اوران کا کام یکساں ہو جیسے لکھنے میں شیر اور شیر (دودھ) یکساں ہے)

میں ان کی حسن پرستی کی حقیقت بتلاتا ہوں کہ وہ اس معنی کے حسن پرست نہ تھے جیسے کہ لوگ سمجھتے ہیں بلکہ ان کو ہر حسین شئے اچھی معلوم ہوتی تھی اور ہر بری بے قاعدہ شئے سے اس قدر نفرت تھی کہ ان کو بدصورت اور بے ڈھنگی شئے دیکھنے سے تکلیف ہوتی تھی۔

مرزا مظہر جان جاناںؒ کی نزاکت کی حکایت

چنانچہ حضرت مرزا صاحب کو جب کہیں جانا ہوتا تھا تو پالکی میں بیٹھ کر جاتے تھے اور پالکی کے پٹ بند کرادیا کرتے تھے کسی نے پوچھا کہ حضرت آپ پٹ کیوں بند کرادیتے ہیں فرمایا کہ راستہ میں بازار وغیرہ ملتے ہیں اس میں بعض دکانیں بے قاعدہ بنی ہوئی ہوتی ہیں مجھ کو دیکھ کر سخت تکلیف ہوتی ہے تھانہ بھون کے قاضی صاحب مع اپنے ایک ہمراہی کے مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اس ہمراہی کو ناک صاف کرنے کی ضرورت ہوئی تو مرزا صاحب کی نظر پیچھے سے اس کے پائجامے پر پڑ گئی سب چھینٹیں پائجامے کے پیچھے تھیں مرزا صاحب کے سر میں درد ہو گیا اور فرمایا کہ قاضی صاحب اس شخص کے ساتھ آپ کا کیسے گذر ہوتا ہوگا اکبر شاہ ثانی جو کہ بادشاہ وقت تھا ایک مرتبہ مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا بادشاہ کو پیاس لگی کوئی خادم اس وقت موجود نہ تھا خود اٹھ کر پانی پیا اور پانی پی کر صراحی پر کٹورا ٹیڑھا رکھ دیا مرزا صاحب کے سر میں درد ہو گیا اور طبیعت پریشان ہو گئی لیکن ضبط فرمایا چلتے وقت بادشاہ نے عرض کیا کہ حضرت آپ کے یہاں کوئی آدمی خدمت کے لئے نہیں ہے۔ اگر ارشاد ہو تو کوئی آدمی بھیج دوں اب تو مرزا صاحب سے نہ رہا گیا جھنجلا کر فرمایا کہ تم تو آدمی ہو کٹورا ٹیڑھا رکھ دیا میری طبیعت اب تک پریشان ہے۔ ایک شخص نے مرزا صاحب کی خدمت میں انگور بھیجے بہت نفیس اور وہ منتظر داد کے ہوئے مگر مرزا صاحب ساکت تھے آخر اس نے خود پوچھا کہ حضرت انگور بوئے گئے تھے وہ انگور وہاں سے آئے تھے۔ مرزا صاحب کے اندر حسن پسندی تھی تو وہ طبعی تھی طبیعت کی ساخت ہی ایسی واقع ہوئی تھی کہ ہر اچھی شے پسند فرماتے تھے ان کے نفس میں

برے خیال کا شائبہ بھی نہ تھا اور دلیل اس کی یہ ہے کہ بچپن میں بھی بدصورت کی گود میں نہ جاتے تھے بھلا اس وقت کیا احتمال ہوسکتا ہے۔ خواجہ میر دردؒ کی نسبت لوگوں نے آ کر مرزا صاحب سے عرض کیا کہ خواجہ صاحب راگ سنتے ہیں فرمایا کہ بھائی وہ کن رس میں مبتلا ہیں میں آنکھ رس میں یعنی ان کو کانوں کا مرض ہے مجھ کو آنکھوں کا آپ نے اس کو بھی مرض سے تعبیر فرمایا ایک بزرگ کی کیفیت یہ تھی کہ حسین لڑکے ان کی خدمت کرتے تھے اور گاہ گاہ ان کو پیار بھی کرتے تھے۔ ایک روز ان کے ایک مرید نے ایک لڑکے کو پیار کرلیا پیر سمجھ گئے کہ اس نے میرا اتباع کیا ہے ایک روز بازار میں گئے لوہار کی دکان پر دیکھا کہ لوہا سرخ انگارہ سا ہورہا ہے پیر صاحب نے فوراً جا کر اس کو پیار کرلیا اور اس مرید نے فرمایا کہ آیئے تشریف لایئے اس کو بھی پیار کیجئے پھر تو یہ گھبرائے اس وقت انہوں نے ان کو ڈانٹا کہ خبردار ہم پر اپنے کو مت قیاس کرو ایک بزرگ کو دیکھا گیا کہ ایک حسین لڑکے سے پاؤں دبوارہے ہیں ایک شخص کو وسوسہ ہوا کہ یہ کیسے شیخ ہیں لڑکے سے پاؤں دبواتے ہیں فرمایا کہ آگ کی انگیٹھی اٹھاؤ دہکتی آگ میں پاؤں رکھ دیئے اور یہ فرمایا کہ ہم کو کچھ حسن نہیں ہمارے نزدیک یہ آگ اور یہ لڑکا برابر ہے۔

بدگمانی کے موقع سے بچنا بھی سنت ہے

بزرگوں سے جن کا ظاہر خلاف شرع نظر آوے بیعت ہونا جائز نہیں محققین کی یہ شان ہے کہ جو لوگ مسند ارشاد پر متمکن ہوتے ہیں اور العلماء ورثة الانبياء[1] (علماء حضرات انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں) کے خطاب سے مشرف ہیں وہ بالکل متبع سنت نبویہ کے ہوتے ہیں ان کی ہر وضع سنت کے موافق ہوتی ہے اور تہمت اور بدگمانی کے موقع سے بچنا بھی سنت ہے۔ چنانچہ حضور کی شان اس باب میں یہ تھی کہ ایک مرتبہ حضور مسجد میں معتکف تھے۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا جو کہ ازواج مطہرات میں ہیں وہاں تشریف لائیں واپسی کے وقت حضور ان کے پہنچانے کے لئے ان کے ساتھ دروازے تک کہ وہ مسجد ہی کی طرف تھا تشریف لائے سامنے دیکھا کہ دو شخص آرہے ہیں فرمایا کہ علی سلکما یعنی اپنی جگہ

---

[1] سنن ابن ماجة: ۲۲۳، كنز العمال: ۲۸۶۷۹، تفسير قرطبي: ۴: ۴۱، ۱۳، ۱۶۴، کشف الخفاء للعجلوني ۲: ۶۴، ۸۳، الدر المنثرة: ۱۱۴، الأسرار المرفوعة لعلي القاري: ۲۳۰، ۲۴۷

ٹھہر جاؤ یہاں پردہ ہے اور اس کے بعد فرمایایا ایھا صفیہ یعنی یہ عورت صفیہ تھی اور کوئی اجنبیہ نہ تھی فکبر علیھما ذالک یعنی یہ بات ان دونوں پر بہت بھاری ہوئی اور عرض کیا کہ یارسول اللہ کیا آپ پر ایسا گمان ہوسکتا ہے فرمایا شیطان ابن آدم کے اندر بجائے خون کے دوڑتا ہے مجھے خیال ہوا کہ کبھی وہ تمہارے ایمان کو نہ تباہ کردے پس جو لوگ ارشاد کی شان لئے ہوئے ہیں وہ تو ابہام سے بھی بچتے ہیں۔ ایسے حضرت قابل بیعت ہیں باقی جن کا ظاہر شریعت کے موافق نہ ہو ان میں بعض تو ایسے ہیں کہ مکار ہیں باطن بھی ان کا موافق نہیں ہے وہ مردود ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ باطن ان کا بالکل شریعت کے موافق ہوتا ہے۔ لیکن ظاہر ان کا ہماری سمجھ میں نہیں آتا ان پر اعتراض نہ کرے اور نہ ان کا اتباع کرے غرض مرشد ایسے کو بنادے جو ظاہراً باطناً پاک صاف ہو۔

دل کی معصیت

خلاصہ یہ ہے کہ کسی کے پاس کوئی دلیل اور سہارا بدنگاہی کے متعلق نہیں بدنگاہی ہر پہلو سے حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔ آگے فرماتے ہیں وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ یعنی جس شئے کو سینے میں چھپاتے ہیں اللہ تعالیٰ اس کو بھی جانتے ہیں یہ پہلے سے اشد ہے یعنی معصیت صرف نگاہ ہی سے نہیں بلکہ دل سے بھی ہوتی ہے بہت لوگ دل سے سوچا کرتے ہیں اور عورتوں و امردوں کا تصور کرتے ہیں اور خیال سے مزے لیتے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ ہم متقی ہیں خوب سمجھ لو کہ یہ سب تلبیس لعین ہے

معصیت قلب اشد ہے

بلکہ بعض مرتبہ دل کے اندر سوچنے سے اور دل کے اندر باتیں کرنے سے اور زیادہ فتنہ ہوتا ہے کیونکہ نگاہ کرنے میں تو بعض مرتبہ قبیح و بدصورت ثابت ہوتا ہے اور دل کے اندر باتیں کرنے میں تو طبیعت کو زیادہ لگاؤ ہوجاتا ہے اور قلب سے کسی طرح وہ بات نہیں نکلتی بلکہ محض نگاہ نہ کرنے سے اپنے کو صاحب مجاہدہ سمجھ کر زیادہ مقرب سمجھتا ہے اور یہ نہیں دیکھتا کہ دل میں متمتع ہورہا ہوں تو مجاہدہ کہاں رہا غرض اس کا انسداد بھی بہت ضروری ہے اور

چونکہ قلب کے اندر کانوں کے واسطے سے بھی باتیں اس قسم کی پہنچتی ہیں اس لئے جس طرح آنکھوں کی حفاظت ضروری ہے کانوں کی نگہداشت بھی ضروری ہے کہ ایسے قصے اور حکایات نہ سنے نہ ایسے مقام پر جاوے جہاں گانا بجانا ہورہا ہو بعض مرتبہ خود قلب ہی سے معصیت صادر ہوتی ہے صدور کے وقت آنکھ کان کا واسطہ نہیں ہوتا مثلاً پہلی دیکھی ہوئی صورتیں یاد آتی ہیں اور ان سے التذاذ ہوتا ہے اور معصیت قلب کا معصیت عین سے اشد ہونا ایک اور وجہ سے بھی ہے وہ یہ کہ قلب سے سوچنے اور آنکھوں سے دیکھنے میں ایک فرق بھی ہے یعنی آنکھوں کے گناہ میں تو نفس فعل کو کوئی دیکھ بھی نہیں سکتا اس کی اطلاع سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو نہیں اس سے وہی بچے گا جس کے قلب میں تقویٰ ہو۔

ازالہ معصیت قلب کے تین درجات

اس کے بعد سمجھنا چاہئے کہ اس مرض کے ازالہ میں تین درجہ ہیں قلب کو باوجود تقاضے کے روکنا تقاضے کو ضعیف کر دینا اور قلع المقتضے یعنی مادہ ہی کا قلع قمع کر دینا ان میں سے قلب کو روکنا یعنی دل کو خود اس طرح متوجہ نہ ہونے دینا یہ امر تو اختیاری ہے کہ اگر آپ سے آپ جائے تو تم اس کو روکو اور اس کا سہل طریقہ یہ ہے کہ جب قلب کسی حسین کی طرف مائل ہو تو اس کا علاج یہ ہے کہ فوراً کسی کریہ المنظر بدشکل بدصورت بدہیئت کی طرف دیکھو اگر کوئی موجود نہ ہو کسی ایسے بدصورت کا خیال باندھو کہ ایک شخص ہے کالا رنگ ہے چیچک کے داغ ہیں۔ آنکھوں سے اندھا ہے سر سے گنجا ہے رال بہہ رہی ہے دانت آگے کو نکلے ہوئے ہیں ناک سے نکلتا ہے ہونٹ بڑے بڑے ہیں سنک بہہ رہا ہے اور مکھیاں اس پر بیٹھی ہیں گو ایسا شخص دیکھا نہ ہو مگر قوت متخیلہ سے تراش لو کیونکہ تمہارے دماغ میں ایک قوت متخیلہ ہے آخر اس سے کسی روز کام تو لوگے متخیلہ کا کام تو جوڑ کا ہے جب ایسا شخص فرض کیا جا سکتا ہے اس کا مراقبہ کرو ان شاء اللہ تعالیٰ وہ فساد جو حسین کے دیکھنے سے قلب میں ہوا ہے وہ جاتا رہے گا اور اگر پھر خیال آوے پھر بھی تصور کرو اور گر یہ مراقبہ کفایت کے درجہ میں نافع نہ ہو اور بار بار پھر اسی حسین کا تصور ستاوے تو یوں خیال کرو کہ یہ محبوب ایک روز مرے گا اور قبر

میں جاوے گا وہاں اس کا نازک بدن سڑگل جاوے گا کیڑے اس کو کھالیں گے۔ یہ خیال تو فوری علاج ہے اور آئندہ کے لئے تقاضا پیدا ہونے کا علاج یہ ہے کہ ذکر اللہ کی کثرت کرو دوسرے یہ کہ عذاب الٰہی کا تصور کرو تیسرے یہ کہ یہ تصور کرو کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور اس کو مجھ پر پوری قدرت ہے طول مراقبات اور کثرت مجاہدات سے یہ چور دل میں سے نکلے گا۔ جلدی نہ جاوے گا۔ جلدی نہ کرے اس لئے کہ ایسا پرانا مرض ایک دن یا ایک ہفتہ میں نہیں جاتا۔

شاہ محمود غزنویؒ کی حکایت

یہاں مجھ کو شاہ محمود غزنویؒ کی حکایت یاد آ گئی محمود نے جب ہندوستان پر حملہ کیا تو ایک ہمراہی سپاہی نے ایک مندر میں جا کر دیکھا کہ ایک بوڑھا برہمن پوجا پاٹ کر رہا ہے سپاہی نے تلوار دکھلائی کہ کلمہ پڑھ اور مسلمان ہو ورنہ اس تلوار سے دو ٹکڑے کر دوں گا۔ برہمن نے کہا کہ حضور ذرا ٹھہرئیے سپاہی نے پھر تقاضا کیا برہمن نے عرض کی حضور نوے برس کا رام تو دل میں سے نکلتے ہی نکلتے نکلے گا۔ ذرا سی دیر میں کیسے نکل جاوے خوب کہا ہے۔

صوفی نشود صافی تا در نکشد جامی بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے ہمت

ہمت ہارو مجاہدہ کرتے رہو رفتہ رفتہ یہ تقاضا ضعیف ہو جاوے گا۔ اور قابو میں آ جاوے گا کہ اپنے محل پر صرف ہوگا اور غیر محل کے لئے متحرک نہ ہوگا اور یہی مطلوب ہے۔

بدنظری مادہ کا زوال یہ مطلوب نہیں

تیسرا درجہ یہ کہ مادہ ہی منقطع ہو جاوے یعنی بالکل میلان ہی کبھی پیدا نہ ہو یہ وہ مرتبہ ہے کہ جس کو نادان سالک مطلوب سمجھتے ہیں اور اس کے حاصل نہ ہونے پر پریشان ہوتے ہیں یعنی جب اپنے اندر کسی وقت ایسا میلان پاتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ ہمارا سب شغل و مجاہدہ ضائع گیا حتیٰ کہ ایسے کلمات پریشانی میں ان کے منہ سے نکل جاتے ہیں کہ بے ادبی اور گستاخی ہو جاتی ہے مثلاً ہم اتنے زور سے طلب حق میں رہے مگر ہم پر رحم نہیں آتا کہ ویسے ہی محروم ہیں۔

شیطانی وسوسہ

یاد رکھو کہ یہ شیطانی وسوسہ ہے یہ ہرگز مطلوب نہیں کہ مادہ منقطع ہو جاوے اور اگر مادہ جاتا رہے تو گناہ سے بچنے میں کوئی کمال نہیں اندھا اگر فخر کرے کہ میں دیکھتا نہیں کون سی فخر کی بات ہے دیکھے گا کیا دیکھنے کا آلہ نہیں۔ عنین اگر عفت کا دعویٰ کرے تو کیا کمال ہے لطف اور کمال مطلوب تو یہ ہے کہ گناہ کر سکو اور پھر اپنے دل کو روکو جس کا میں نے فوری علاج اور تقاضا روکنے کی تدبیر دونوں بیان کر دیئے رہا مادہ زائل کر دینا یہ مطلوب ہی نہیں بلکہ اس کا زائل کرنا جائز ہی نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ مجھے اس گناہ پر متنبہ کرنا منظور ہے اس لئے کہ اس گناہ کا ابتلا عام تھا حتیٰ کہ جو نیک کہلاتے ہیں وہ بھی اس میں مبتلا ہیں خدا کے واسطے اس کا انتظام کرنا چاہئے افسوس منہ سے تو حق تعالیٰ کی محبت کا دعویٰ اور غیر پر نظر افسوس صد افسوس اس وقت مجھ کو ایک حکایت یاد آ گئی کہ ایک عورت جا رہی تھی کوئی ہوا پرست اس کے ساتھ ساتھ ہو لیا اس عورت نے پوچھا تم کون ہو اور میرے پیچھے کیوں آتے ہو کہا کہ تجھ پر عاشق ہو گیا اس لئے آتا ہوں عورت نے جواب دیا کہ پیچھے ایک میری بہن آ رہی ہے وہ مجھ سے زیادہ حسین ہے اس کے دیکھنے کو پیچھے چلا اس عورت نے اس کے ایک دھول دی اور کہا۔

گفت اے ابلہ اگر تو عاشقی — در بیان دعویٰ خود صادقی
پس چرا رہبر غیر افگندی نظر — ایں بود دعویٰ عشق اے بے ہنر

(اس نے کہا کہ اے احمق اگر تو عاشق ہے اور اپنے دعویٰ عشق میں سچا ہے پس کس واسطے غیر کی طرف متوجہ ہوا اے بے ہنر یہ محض دعویٰ عشق ہے)

بدنظری کا علاج

صاحبو اگر حق تعالیٰ سامنے کھڑا کر کے اتنا دریافت فرمالیں کہ تو نے ہم کو چھوڑ کر غیر پر کیوں نظر کی تو بتلایئے کیا جواب ہے یہ ہلکی بات نہیں اس کا بہت بڑا اہتمام کرنا چاہئے ایک اور تدبیر ہے جو مقوی ہے ان تدابیر کی وہ یہ کہ جب قلب میں ایسا خیال پیدا ہو تو ایسا کرو کہ

وضو کر کے دو رکعت پڑھو اور توبہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرو جب نگاہ پڑے یا دل میں تقاضہ پیدا ہو فوراً ایسا ہی کرو ایک دن تو بہت سی رکعتیں پڑھنا پڑیں گی۔ دوسرے دن بہت کم ایسا خیال آوے گا۔ اسی طرح بتدریج نکل جاوے گا۔ اس لئے کہ نفس کو نماز بڑی گراں ہے۔ جب دیکھے گا کہ ذرا سا مزا لینے پر یہ مصیبت ہوتی ہے یہ ہر وقت نماز ہی میں رہتا ہے پھر ایسے وسوسہ نہ آویں گے۔

اب اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو سب
آفات سے محفوظ رکھیں۔ آمین ثم آمین

مظاہر الاقوال

۱۰؍ جمادی الثانی ۱۳۳۶ھ ہجری کو جامع مسجد سہارنپور میں اڑھائی گھنٹہ تک منبر پر بیٹھ کر بیان فرمایا جو مدرسہ مظاہر العلوم کے سالانہ جلسہ کے موقع پر ہوا (زبان کی حفاظت کی تاکید اور بے تحقیق باتیں زبان سے نکالنے کی شدید ممانعت کی) تقریباً ۴ ہزار سامعین موجود تھے وعظ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے قلم بند کیا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمدللّٰہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ ونشھدان سیدنا و مولانا محمداً عبدہ و رسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ و بارک وسلم۔
اما بعد فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّ جِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّ حِیْمِ
اِذْ تَلَقَّوْنَہٗ بِاَلْسِنَتِکُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاھِکُمْ مَّالَیْسَ لَکُمْ بِہٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَہٗ ھَیِّنًا وَّ ھُوَعِنْدَاللّٰہِ عَظِیْمٌ ٥

(النور آیت نمبر ۱۵)

(جبکہ تم اپنی زبانوں سے اس افتراء کا تذکرہ کرتے تھے اور اپنے منہ سے ایسی بات نکالتے تھے جس کی تم کو تحقیق نہ تھی اور تم اس کو معمولی اور سرسری بات سمجھتے تھے حالانکہ خدا تعالیٰ کے نزدیک بہت بڑا جرم ہے)

عمل کلی

یہ آیت جس کی میں نے تلاوت کی ہے گو اس کا نزول ایک واقعہ خاص میں ہوا ہے مگر حق تعالیٰ نے جس عنوان سے اس کو ارشاد فرمایا ہے وہ عموم اور کلیت کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ منافقین نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے متعلق ایک افتراء و بہتان باندھا تھا جس کا لوگوں میں چرچا ہوا تو چند مسلمان بھی اس تذکرہ میں ملوث ہو گئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ سے سخت تکلیف پہنچی اور آپ وحی کے منتظر رہے مہینہ بھر کے بعد وحی نازل ہوئی اور حضرت صدیقہؓ کی براءت نہایت شدومد کے ساتھ ظاہر کی گئی اور جن مسلمانوں نے اس بہتان کا تذکرہ اپنی زبان سے کیا تھا ان کو بہت دھمکایا گیا ان آیات کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند مسلمانوں پر حد قذف جاری فرمائی انہی آیات میں سے ایک آیت یہ ہے جس کی میں نے تلاوت کی ہے۔ حق

تعالیٰ فرماتے ہیں جبکہ تم اپنی زبانوں سے افتراء کا تذکرہ کرتے تھے اور اپنے منہ سے ایسی بات نکالتے تھے جس کی تم کو تحقیق نہ تھی اور تم اس کو معمولی اور سرسری بات سمجھتے تھے حالانکہ خدا تعالیٰ کے نزدیک یہ بہت بڑا جرم ہے یعنی زبان سے بے تحقیق کے بات نکالنا۔ پس تَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ الخ (اور اپنے منہ سے ایسی بات نکالتے تھے جس کی تم کو تحقیق نہ تھی الخ) یہ ایک عمل کلی ہے جو مورد نزول کے علاوہ بھی بہت سے موارد کو عام ہے اس وقت میں عمل کلی ہی پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جس کے متعلق ایک قانون کلی ہے واقعہ جزئیہ کا بیان اس وقت مقصود نہیں۔ حاصل اس قانون کلی کا یہ ہے کہ زبان سے بدوں تحقیق کے کوئی بات منہ سے نکالنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑا جرم ہے۔

احتیاط زبان کی ضرورت

اور اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ زبان کی احتیاط نہایت ضروری ہے بدوں تحقیق کے زبان سے بات نکالنا ہرگز نہیں چاہیے اس وقت اس مضمون کے اختیار کرنے کی وجہ یہ ہوئی کہ اس سے قبل اسی جلسہ کے اندر چند سال میں کچھ مضامین بیان کئے گئے ہیں۔ چند بیان تو ایسے ہوئے کہ ان میں اغراض جلسہ سے مناسبت بھی تھی کسی میں علم کی ضرورت کا بیان تھا کسی میں حقوق علم کا ذکر تھا بعض میں اعانت علم و اہل علم کا مضمون تھا۔

قافیہ سے متعلق اصل تحقیق کا مذاق

پھر ایک دفعہ خیال آیا کہ عمل کے متعلق بھی بیان ہونا چاہیے کیونکہ علم سے مقصود عمل ہی ہے۔ چنانچہ ایک سال عمل کے متعلق بیان ہوا اس کا نام مظاہر الاعمال رکھا گیا۔ پھر خیال ہوا کہ اعمال وعلوم کی ضرورت تو کم وبیش اکثر لوگوں کو معلوم ہے مگر ایک اور چیز ہے جو ان کی روح ہے کہ اس کے بغیر علم وعمل کالعدم ہے جس کا نام حال ہے اس کا بیان بھی ہونا چاہیے۔ چنانچہ ایک سال اس کا بیان ہوا اور اس کا نام مظاہر الاحوال رکھا گیا پھر گذشتہ سال اعمال واحوال کے ثمرات پر گفتگو ہوئی اور اس کا نام مظاہر الآمال رکھا گیا اور یہ قافیہ اتفاقی ہے نہیں کہ قافیہ کی ضرورت سے یہ بیانات ہوئے جیسے ایک بادشاہ یا وزیر نے ایک قاضی کو لکھا تھا ایها القاضی

بقم قدعزلناک فقم۔(اے قم کے قاضی ہم نے تجھ کو معزول کر دیا تو اٹھ جا)اس شہر کا نام بھی قم تھا جہاں کے وہ قاضی مقرر تھے اور قم صیغہ امر بھی ہے قیام سے دونوں کا قافیہ مل گیا جب یہ خط قاضی صاحب کے پاس پہنچا تو وہ بڑے روشن دماغ تھے کہنے لگے واللہ ماعزلتنی الا ھذہ السبحہ خدا کی قسم مجھے تو اس قافیہ نے معزول کیا ہے یہ قافیہ ذہن میں آ گیا مجھ غریب پر جاری کر دیا۔ نہ معلوم بادشاہ نے مذاق میں ایسا لکھا تھا کہ اچھا ہے ذرا دو چار دن قاضی پریشان ہو یا عزم سے لکھا تھا واللہ اعلم پھر بعد میں رحم آیا یا نہیں۔ تو جیسے ان قاضی صاحب نے کہا تھا کہ مجھے تو اس قافیہ نے معزول کیا ہے اس طرح یہاں نہیں ہوا کہ قافیہ کی رعایت سے یہ بیانات ہوئے ہوں۔ چنانچہ خود ان بیانات کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ان کے مضامین ضروری تھے یا غیر ضروری اور بیان میں آمد تھی یا آورد تھا۔ محض قافیہ کی وجہ سے مضمون بیان کرنا فضول ہے اور اس صورت میں مضامین بھی فضول ہی آتے ہیں۔ حق تعالیٰ شانہ نے باوجود قدرت بالغہ کے قرآن میں قافیہ کا التزام نہیں کیا۔ کہیں قافیہ ہے تو دور تک چلا گیا ہے اور کہیں چھوڑ دیا ہے تو دور تک قافیہ نہیں ہے تو کیا عجب ہے کہ حق تعالیٰ نے قافیوں کو اس لئے چھوڑ دیا ہو کہ بندوں کو تعلیم کرنا مقصود ہو کہ کلام میں قافیہ کی پابندی نہ کیا کرو، جیسے علماء نے کہا ہے کہ حق تعالیٰ نے باوجود قدرت کاملہ کے آسمان و زمین کو چھ دن میں پیدا فرمایا ہے اس سے بندوں کو تدریج و تدبیر کی تعلیم فرمائی ہے کہ دیکھو باوجود یکہ ہم ایک کلمہ کن سے دفعۃً سب کچھ پیدا کر سکتے تھے مگر پھر بھی ہم نے آسمان و زمین کو چھ دن میں پیدا کیا ہے۔ تو تم کو قدرت ناقصہ کے ساتھ ضرور تدریج و تدبیر سے کام کرنا چاہئے۔ یہ ایک نظیر موجود ہے جس میں علماء نے حق تعالیٰ کے فعل کو تعلیم عملی پر محمول کیا ہے تو کیا عجب ہے کہ قرآن میں قافیوں کا چھوڑنا بھی عملی تعلیم ہو کیونکہ حق تعالیٰ کو خود اس کی ضرورت نہ تھی اگر وہ تمام قرآن کو مقفا نازل کرتے تو اس کی بلاغت وفصاحت میں ہرگز کمی نہ آتی اور کسی جگہ بھی تکلف کا نام نہ آتا جس کی دلیل وہ سورتیں ہیں جن میں اول سے آخر تک قافیہ کی رعایت ہے کہ ان میں کسی جگہ بھی کوئی قافیہ تکلف سے نہیں لایا گیا نہ کسی کو ان کی بلاغت وفصاحت پر حرف گیری کی مجال ہے تو ظاہر یہ ہے کہ باوجود اس قدرت کے جو قافیہ کی رعایت نہیں کی گئی اس سے بندوں کو تعلیم مقصود ہے کہ تم بھی قافیہ کی رعایت نہ کیا کرو کیونکہ تم کو اس میں تکلف ہوگا اور بعض دفعہ بے ضرورت باتیں محض قافیہ کی رعایت سے لانا پڑیں گی اسی واسطے علماء ادب نے مقامات حریری کی

عبارت کو پسند نہیں کیا کیونکہ اس میں قافیہ کی بے حد رعایت ہے جس سے بعض جگہ کلام بلاغت سے گر گیا اور حشو و زوائد کی وجہ سے معیوب ہو گیا ہے۔

زمانہ طالب علمی میں ہم لوگ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں عربی عبارتیں مقفا و مسجع لکھ کر پیش کرتے تھے۔ مولانا نے فرمایا کہ تم لوگ معانی کو الفاظ کے تابع کرتے ہو الفاظ کو معانی کے تابع نہیں کرتے اس کے بعد قافیہ کی رعایت سے منع فرمایا پھر قافیہ کی رعایت چھوڑنے کے بعد عبارت کا رنگ بالکل بدل گیا اب خود معلوم ہوتا تھا کہ پہلی مقفا عبارتیں اس کے سامنے بالکل ردی تھیں۔ قافیہ پر ایک حکایت یاد آئی۔ ایک شیخ صاحب نے کسی جاٹ سے کہا کہ جاٹ رے جاٹ تیرے سر پر کھاٹ اس نے جواب دیا کہ شیخ رے شیخ تیرے سر پر کولہو شیخ نے کہا واہ قافیہ تو ملا ہی نہیں تو وہ جاٹ کہتا ہے کہ بلا سے بوجھ میں تو مرے گا۔ دیکھئے اس جاٹ نے بھی قافیہ کے ضروری نہ ہونے کو سمجھ لیا۔ جو مضامین صحیح ہوتے ہیں وہ عام لوگوں کے دماغوں میں بھی آ جاتے ہیں۔ تو اس جاٹ نے جزالت مضمون کی رعایت کو قافیہ کی رعایت پر مقدم کیا اور واقعی ایسا ہی ہونا چاہئے کیونکہ مقصود تو مضمون ہی ہے الفاظ تو آلہ محضہ ہیں تو یہ غلطی ہے کہ مقصود کو اللہ کے تابع کیا جائے۔ اہل تحقیق کا مذاق تو یہ ہے کہ نثر تو نثر وہ نظم میں بھی قافیہ کے شدید اہتمام کو پسند نہیں کرتے جس کی ضرورت پر سب کا اتفاق ہے چنانچہ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ مثنوی میں بعض جگہ قافیہ میں قدرے تسامح فرماتے ہیں اور اس کی وجہ یہ بتلاتے ہیں۔

قافیہ اندیشم و دلدار من   گویدم مندیش جز دیدار من

کہ جب میں قافیہ سوچتا ہوں تو محبوب یوں فرماتے ہیں کہ ہمارے دیدار کے سوا کسی چیز کو مت سوچو۔ اس سے معلوم ہوا کہ مثنوی میں جس قدر قافیے ہیں وہ سب بے تکلف خود ہی آ گئے ہیں۔ سوچ کر نہیں لائے گئے۔

مثنوی کی بلاغت

مگر اس پر بھی مثنوی کی بلاغت کا یہ حال ہے کہ مومن خان دہلوی کا مقولہ حضرت مرشدی علیہ الرحمۃ نقل فرماتے ہیں کہ میں نے مومن خان سے پوچھا بعض لوگ کہتے ہیں کہ

مولانا کا کلام حجت نہیں مومن خان نے کہا کسی جاہل کا قول ہوگا مولانا کا استادانہ کلام ہے۔
غرض محققین تو وہاں بھی قافیہ کی رعایت نہیں کرتے جہاں اس کے استحسان بلکہ وجوب پر اہل کلام کا اتفاق ہے اس پر مجھے ایک ظریف کی حکایت یاد آئی وہ کہتے تھے کہ میں ایک مولوی صاحب کے ملنے کے لئے گیا جو ایک لیڈر بھی تھے اور اپنے آپ کو زبان دانی میں بہت کامل سمجھتے تھے آج کل بعض لوگوں کو اس کا خبط ہو گیا ہے کہ وہ عربی میں تقریر کر لینے کو بڑا کمال اور فخر سمجھتے ہیں۔ میں کہا کرتا ہوں کہ تم ابوالعلم ہو کر بھی ایسی عربی نہیں بول سکتے جیسی ابوجہل بولا کرتا تھا اگر عربی میں گفتگو کر لینا ہی علم ہے اور یہ کوئی بڑا علمی کمال ہے تو ابوجہل کو تم سب سے بڑا عالم ہونا چاہئیے حالانکہ وہ ابوجہل ہی رہا ابوالعلم تو کیا ہوتا ابن العلم بھی نہ ہوا۔

رسوم قبیحہ پر پابندی کی ضرورت

غرض ان لیڈر صاحب کو اپنی عربی دانی اور فارسی دانی اور شاعری پر بڑا ناز تھا وہ ظریف کہتے تھے کہ میں نے ان کے سامنے دیوان قاآنی پیش کیا وہ حضرت متکبر بہت تھے انہوں نے نہایت بے پروائی کے ساتھ پوچھا یہ کیا ہے کیا یہ آپ کا کلام ہے؟ انہوں نے اس بے پروائی سے جھلا کر کہاں ہاں صاحب یہ میرا ہی کلام ہے۔ کہا کیا آپ شاعر ہیں؟ کہا جی ہاں وہ بولے کیا آپ کچھ فی البدیہہ کہہ سکتے ہیں؟ کہا ہاں وہ بولے کچھ فرمائیے۔ کہا سنئے

گر مصور تیری تصویر اینچے

(تو اس کو اس کام کے لئے سوا دو مہینہ چاہئیں)

اب وہ لیڈر صاحب ان کا منہ تکنے لگے اور کہنے لگے صاحب یہ کیسا شعر ہے جس میں وزن و قافیہ بھی نہیں انہوں نے کہا جناب یہ ایک پرانی رسم تھی کہ شعر میں بحر و قافیہ کی پابندی کی جائے اور میں نے آپ کے ایک لیکچر میں سنا تھا کہ ہمارے علماء لکیر کے فقیر ہیں پرانی رسموں کے پابند نہیں علماء کو آزاد اور وسیع الخیال ہونا چاہئیے اور پرانی رسموں اور قیود کو چھوڑ دینا چاہئیے تو میں نے بھی شعر میں آزادی کا رنگ اختیار کر لیا ہے اور پرانی رسموں کی پابندی چھوڑ دی۔ اس پر وہ لیڈر صاحب بہت چپ ہوئے اور تو کچھ جواب بن نہ پڑا بس یہ جواب دیا بس جایئے جایئے کوئی ان سے پوچھے کہ آپ کے نزدیک رسوم شعر کی پابندی تو ضروری

ہے اور رسوم دین کی پابندی ضروری نہیں ہے (خوب ہی جواب دیا جس کا حاصل یہ تھا کہ اگر رسوم قدیمہ کی پابندی مطلقاً مذموم ہے اور آزادی مطلقاً محمود ہے تو رسوم شعر کی پابندی بھی مذموم ہونا چاہئے پھر اس کو ترک کر دے اس پر کیا اعتراض ہے اور اگر مطلقاً مذموم نہیں اور نہ آزادی مطلقاً محمود ہے بلکہ اس میں تفصیل ہے کہ رسوم قبیحہ کی پابندی ترک کی جائے اور رسوم حسنہ کو باقی رکھا جائے تو آپ کا علماء پر اطلاق کے ساتھ اعتراض کرنا غلط تھا آپ کو تفصیل کرنا چاہئے تھی کہ رسوم دو قسم کی ہیں قبیحہ اور حسنہ اور آزادی محمود یہ ہے کہ رسوم قبیحہ سے آزاد ہوں اور رسوم حسنہ کے پابند ہوں اور یہ بتلانا چاہیے تھا کہ علماء رسوم قبیحہ کے پابند ہیں پھر ان کی قباحت ثابت کرنا چاہئے تھی یہ کیا کہ محض لکیر کے فقیر ہونے سے ان پر اعتراض کر دیا گیا چاہے وہ لکیر خط مستقیم ہی کی ہو جس کا لازم پکڑنا عقلاً و شرعاً ضروری ہے وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْماً فَاتَّبِعُوْهُ وَلاَ تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (اور یہ کہ دین میرا راستہ ہے جو کہ مستقیم ہے سو اس راہ پر چلو اور دوسری راہوں پر مت چلو کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی اس کا تم کو اللہ تعالیٰ نے تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم احتیاط رکھو ۱۲ جامع) ان صاحب نے تو محض ظرافت سے قافیہ ترک کیا تھا مگر محققین نے حقیقت کے اعتبار سے اس کو پس انداز کر دیا ہے اس لئے یہ خیال نہ کیا جائے کہ میں نے محض ناموں کے قافیہ کی رعایت سے یہ بیانات کئے ہیں ان کے مضامین دیکھنے سے اس خیال کی غلطی ظاہر ہو جائے گی۔

موضوع وعظ

بہر حال چند سال تک جو بیانات ہوئے ہیں وہ ایک خاص سلسلہ کے ساتھ ہوئے ہیں تو آج یہ خیال ہوا کہ اسی سلسلہ میں جو مضمون ضروری رہ گیا ہو اس کو بیان کر دیا جائے پہلے سے تو کوئی خاص مضمون ذہن میں نہ تھا لیکن عین وقت پر یہ مضمون حفاظت لسان کا ذہن میں آیا کیونکہ اعمال و احوال سے جو نور قلب میں پیدا ہوتا ہے وہ اس زبان کی بے احتیاطی سے اکثر زائل ہو جاتا ہے اسی لئے بہت لوگ اس کے شاکی نظر آتے ہیں کہ ہم اعمال و اذکار بہت کچھ کرتے ہیں مگر قلب میں کیفیت اور نور پیدا نہیں ہوتا یا حال پیدا ہوتا ہے تو باقی نہیں رہتا اور

اس شکایت کا منشاء یہ ہے کہ وہ اسباب کو تو جمع کرتے ہیں مگر موانع کو رفع نہیں کرتے چنانچہ منجملہ یہ موانع کثیر ہیں جن میں سے کثیرالوقوع زبان کو بے جا صرف کرنا ہے اس لئے یہ مضمون اختیار کیا گیا اور چونکہ آج کل میری طبیعت خراب ہے چند روز سے بخار آ رہا ہے اس لئے مختصر بیان کروں گا اور اسی وجہ سے آج بیٹھ کر بیان کرتا ہوں اگر درمیان میں طبیعت میں نشاط قوت معلوم ہوئی تو کھڑا ہو جاؤں گا ورنہ استصحاب حال سے سمجھ لیا جائے کہ طبیعت میں اضمحلال ہی ہے گو یہ صورت بھی ممکن تھی کہ ابتداء کھڑے ہو کر کرتا اور درمیان میں اضمحلال زیادہ ہوتا تو بیٹھ جاتا مگر ہمت کے بعد کم ہمتی کو دل قبول نہیں کرتا اور کم ہمتی کے بعد ہمت دل پذیر ہے اور جب یہ معلوم ہو چکا کہ قافیہ کی ضرورت نہیں تو اسی عمل پر ربط وغیرہ کی بھی ضرورت نہیں اس لئے اگر مضامین میں اختصار کے ساتھ انتشار بھی ہو تو عجب نہیں اور احکام دینیہ کے بیان میں انتشار کچھ مضر بھی نہیں کیونکہ یہ تو امراض روحانیہ کے نسخہ کے اجزاء ہیں جو سامعین کے کانوں میں ڈال کر دل تک پہنچایا جاتا ہے۔

کانوں کی مثال

حدیث میں ہے کہ کانوں کی مثال قیف کی مانند ہے کہ مضامین ان کے ذریعہ سے قلب میں پہنچتے ہیں اور ظاہر ہے کہ قیف میں نسخہ کی دوائیں جس طرح چاہے ڈال دو اختیار ہے اس میں کسی ترتیب کی ضرورت نہیں جس کو چاہو پہلے ڈال دو جس کو چاہو پیچھے ڈال دو وہاں پہنچ کر سب مل جائیں گے اور اپنا اثر ظاہر کریں گے اگر کوئی حکیم یہ کہے کہ میں نے تو نسخہ ترتیب سے لکھا تھا تم نے ڈالنے میں ترتیب کی رعایت کیوں نہیں کی تو معلوم ہوگا کہ وہ طبیب نہیں بلکہ شاعر ہے جو شاعروں کی طرح نسخہ لکھتا ہے طبیب کا یہ کام نہیں کہ وہ نسخہ لکھنے میں ترتیب کی رعایت کرے نسخہ میں گل بنفشہ پہلے لکھ دیا تو کیا گاؤزبان پہلے لکھ دی تو کیا اسی طرح جوش دینے میں اس کو پہلے ڈالو یا اس کو سب برابر ہے چنانچہ اسی لئے قرآن شریف کے نزول میں ارتباط کی رعایت نہیں کی گئی کہ پہلے جو آیت نازل ہوئی ہے دوسری کو اس سے ربط ہونا چاہئے بلکہ حسب ضرورت جو حکم مناسب ہوا نازل کر دیا گیا چاہے پہلے سے ارتباط ہو یا نہ ہو کیونکہ قرآن کا نزول علاج کے واسطے ہوا ہے اور میں بتلا چکا ہوں کہ علاج کے وقت نسخہ کے اجزاء میں ترتیب لازم نہیں بس اس کی ضرورت ہے کہ

15 جملہ اجزاء مرض کے مناسب ہوں اور مریض کے مزاج کے موافق ہوں اگر میرے بیان کی تصدیق نہ ہوتو کسی معالج سے پوچھ لیجئے کہ کیا اجزاء نسخہ میں ترتیب کی رعایت ضروری ہے؟ ان شاء اللہ ہر طبیب یہی کہے گا کہ ضروری نہیں۔ ہاں جب سب نسخوں کو یکجا کرنا مدنظر ہوتو اس وقت ترتیب کی رعایت کی جاتی ہے کہ اول مقدمہ ہوتا ہے پھر اصول کا بیان کیا جاتا ہے پھر فروع کو اور فروع میں اعضاء رئیسہ کے علاج کو مقدم کرتے ہیں ان کے بعد دوسرے اعضاء کا علاج لکھتے ہیں اور اس کی ضرورت بھی اس شخص کو ہے جو مصنفوں کی طرح تصنیف کرے اور اگر تصنیف کا قصد نہ ہو بلکہ محض نسخوں کو جمع ہی کرنا مقصود ہوتو اس کے لئے بھی ترتیب کی ضرورت نہیں چنانچہ اطباء کی خاص بیاضات میں ترتیب ضروری نہیں چنانچہ نزول میں تو کوئی ترتیب نہ تھی مگر نزول کے بعد چونکہ جمع ہو جاتا تھا اس وقت جبرئیل علیہ السلام حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلا دیتے تھے کہ اس آیت کو فلاں سورت میں فلاں آیت کے بعد رکھ دیجئے تو ترتیب جمع میں ارتباط کا لحاظ کیا گیا ہے۔ جس کے وجوہ کو بعد میں علماء نے بیان کیا ہے اور یہ علم اچھا ہے گو زیادہ ضروری نہیں کیونکہ اگر بالفرض ترتیب نہ بھی ہوتو کچھ حرج نہیں۔

قرآن مطب روحانی ہے

کیونکہ میں بتلا چکا کہ قرآن مطب روحانی ہے اور مطب میں ترتیب نسخہ جات کی ضرورت نہیں قرآن کا طرز مصنفین کا نہیں ہے بلکہ معالجین کا سا طرز ہے اور یہیں سے ان لوگوں کی غلطی ظاہر ہوگئی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبوں کے اجزاء میں ارتباط ڈھونڈتے ہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں صرف ایک ہی حیثیت نہیں تھی بلکہ آپ خطیب ہونے کے ساتھ معالج بھی تھے اور ارتباط مضامین کا لحاظ وہ کرتا ہے جو محض خطیب ہو اور جو خطیب ہونے کے ساتھ طبیب بھی ہو وہ ارتباط ظاہر سے زیادہ مخاطبین کی حالت کا لحاظ کرے گا کہ اس وقت ان کو کن کن باتوں کی ضرورت ہے خوب سمجھ لو مگر یہ قاعدہ عام نہیں ہے کہ آپ ہر جگہ اس کو جاری کرنے لگیں کہ ترتیب کی کیا ضرورت ہے۔ بعض امور میں ترتیب کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ مثلاً علاج ہی میں دیکھ لیجئے کہ نسخہ نویسی اور دوا کی تیاری میں تو دواؤں کی ترتیب ضروری نہیں مگر استعمال میں ترتیب ضروری ہے کہ پہلے

اصلاح ظاہر-15

خاکی پھانک لو اس پر جوشاندہ پیو یا دوا پہلے کھاؤ غذا اس کے دو گھنٹہ بعد کھاؤ اگر کوئی غذا پہلے کھائے گا تو دوا سے نفع نہ ہوگا اسی طرح اعمال شرعیہ میں ترتیب ہے کہ پہلے ایمان لاؤ پھر نماز پڑھو پھر نماز میں ترتیب ہے کہ اول صبح کی نماز پڑھو پھر ظہر کی اگر کوئی اعمال میں بے ترتیبی کرنے لگے تو اس کی ایسی مثال ہوگی جیسے ایک ظریف نے رس کی کھیر کھانا چاہی تھی پوچھا کھیر کس طرح بنتی ہے لوگوں نے کہا چاول اور رس ملا کر آگ پر رکھتے ہیں جب چاول پک جاتے ہیں کھیر تیار ہو جاتی ہے کہنے لگا یہ تو بڑا جھگڑا ہے بس تو آپ نے کیا کیا کہ چاول کچے کھا کر اوپر سے رس پی لیا اور آگ کی طرف سرین کر کے جا کھڑا ہوا اور کہا رس چاول تو پیٹ میں جا کر مل گئے اور آگ کے سامنے ہونے سے وہ پک بھی جائیں گے تو کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس شخص نے کھیر کھائی اور اس کو کھیر کا مزا آ گیا ہرگز نہیں بلکہ اس کو تو ہیضہ کا مزا آیا ہوگا بہرحال یہ قاعدہ عام نہیں جس کو اعمال میں بھی آپ جاری کرنے لگیں بلکہ عدم ضرورت ارتباط صرف نصائح ہی کے ساتھ خاص ہے جن سے مقصود علاج ہے اس لئے اگر اختصار کے ساتھ انتشار بھی ہو تو مجھے معاف کیا جائے۔

حفاظت زبان کی اشد ضرورت

یہ تو تمہید سے معلوم ہو چکا ہے کہ میں اس وقت حفاظت لسان کا بیان کروں گا اور مضمون کی مناسبت سے اس بیان کا نام مطاہر الاقوال تجویز کرتا ہوں کیونکہ اس میں اقوال ہی کی پاکیزگی کے طریقے بیان کئے جائیں گے اس میں مطاہر تو مظاہر کا قافیہ ہے اور اقوال دوسرے اجزاء کا قافیہ ہے یہ مضمون اگرچہ پہلے مضامین کے اعتبار سے مہتم بالشان نہیں ہے مگر میں نے اس کو اسی لئے اختیار کیا ہے کہ عام لوگوں کی نظروں میں یہ مہتم بالشان نہیں ہے بظاہر اس میں اشکال ہوگا کہ عدم اہتمام بالشان علت اختیار کیونکر ہو گیا یہ تو علت ترک ہونا چاہیے مگر نہیں کبھی یہ علت اختیار بھی ہو جاتا ہے کیونکہ بعض دفعہ غیر مہتم بالشان میں عدم اہتمام کی وجہ سے زیادہ کوتاہی ہو جاتی ہے جیسے آپ نے کسی لڑکے کو ننگا پھرتے ہوئے دیکھا اس وقت اس سے کہا جاتا ہے کہ کرتہ پاجامہ پہنو ٹوپی کو اس لئے نہ کہا تھا کہ وہ کرتہ پاجامہ کے برابر مہتم بالشان نہیں مگر پھر دیکھا کہ وہ ہمیشہ ننگے ہی سر رہتا ہے ضرورت کے وقت بھی ٹوپی نہیں پہنتا تو اب اس سے کہا گیا یہ کیا بے تمیزی ہے جاؤ

ٹوپی پہن کر آؤ تو بات یہ ہے کہ غیر مہتم بالشان بھی کسی وقت مہتم بالشان ہو جاتا ہے جبکہ اس میں کوتاہی زیادہ ہونے لگے اور ابتداء میں اس پر اس لئے زور نہیں دیا جاتا کہ مخاطب کی عقل پر اعتماد ہوتا ہے کہ یہ ضرورت وعدم ضرورت کا خود لحاظ کرے گا مگر جب مخاطب کو عقل ہی نہ ہو تو پھر اعتماد نہیں کیا جاتا اور تصریح کے ساتھ ہر ہر بات کا حکم کیا جاتا ہے جیسے ایک شخص کا ملازم تھا بے وقوف وہ روز ایسی حرکتیں کیا کرتا جس سے آقا کو تکلیف ہوتی کبھی ایک کام کیا تو دوسرا کام چھوڑ دیا دوسرا کیا تو تیسرا چھوڑ دیا اس پر ہر روز خفگی ہوا کرتی تو ایک دن اس ملازم نے کہا حضور مجھے ایک فہرست لکھ کر دے دیجئے کہ مجھے اتنے کام کرنا ہوں گے میں اس کو دیکھ کر سب کام کر لیا کروں گا۔ آقا نے فہرست لکھ دی ایک روز آقا گھوڑے پر سوار ہو کر چلا اور ملازم پیچھے پیچھے چلا جب منزل کے قریب پہنچے تو آقا کی چادر غائب اس نے ملازم سے پوچھا کہ چادر کہاں ہے؟ آپ فرماتے ہیں حضور وہ تو راستہ میں گر گئی تھی اس نے کہا پھر تو نے اٹھا کیوں نہ لی اس نے فہرست سامنے رکھ دی کہ ان میں اس کے متعلق کوئی ہدایت نہیں بھلا یہ بات بھی ہدایت کے قابل تھی مگر جب مخاطب احمق ہو تو اس پر بھی تنبیہ کرنا پڑتی ہے چنانچہ آقا نے فہرست میں لکھ دیا کہ جب ہم سوار ہوں راستہ میں جو چیز گرے اس کو اٹھا لیا جائے اگلے دن چلے تو ملازم نے منزل پر پہنچ کر ایک کاملہ آقا کے سامنے لا کر رکھ دیا کہا یہ کیا ہے کہا حضور کے حکم کی تعمیل ہے آپ نے فرمایا تھا کہ جو چیز راستہ میں گرے اسے اٹھا لیا جائے تو چلتے ہوئے یہ لید بھی گر رہی تھی میں نے اٹھالی تھی واقعی تھا منطقی کیونکہ جو چیز کا لفظ عام ہے ہر چیز کو اس نے استثناء نہیں کیا تھا الا اللید غرض بعض دفعہ غیر مہتم بالشان مخاطب کے بدفہم ہونے کی وجہ سے مہتم بالشان ہو جاتا ہے اور تنبیہ کا محتاج ہوتا ہے یہ تو جب ہے کہ حفاظت لسان فی نفسہ مہتم بالشان نہ ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگوں نے اس کو غیر مہتم بالشان سمجھ رکھا ہے اور واقع میں مہتم بالشان ہے قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ حفاظت زبان کی بہت ضرورت ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس کو نہیں سمجھتے ہیں چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ (اور ہم اس کو معمولی اور سرسری بات سمجھتے تھے حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑا جرم ہے) اور اس کا راز یہ معلوم ہوتا ہے کہ زبان چلانے میں کچھ خرچ نہیں ہوتا نہ اہتمام کرنا پڑتا ہے اور جتنے کام ہیں سب میں کچھ نہ کچھ اہتمام کرنا پڑتا

ہے مثلاً چلنا پھرنا کھانا پینا سب میں کچھ نہ کچھ اہتمام ہوتا ہے وہاں سے یہاں آئے تو اٹھنا پڑا ارادہ کرنا پڑا کسی غرض کو سوچا گیا کہ وہاں جا کر کیا کام کرنا ہے آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ مہتم بالشان ہے چلنے کے وقت یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ سامنے سے کوئی چیز نہ آ جائے کہیں نیچے اوپر پیر نہ پڑ جائے کھانے میں خیال رکھتے ہیں کہ مکھی بال نہ آ جائے لقمہ ایسا بڑا نہ ہو جو گلے میں اٹک جائے پینے میں خیال ہوتا ہے کہ پانی کے اندر کچھ پڑا نہ ہو اگر گدلا پانی ہوا تو کپڑے میں چھان کر پیتے ہیں نیز پیتے وقت ہنستے بولتے نہیں تا کہ پھندا نہ لگ جائے ان آثار سے معلوم ہوا کہ کھانا پینا بھی مہتم بالشان ہے کتابت میں بھی احتیاط رکھی جاتی ہے کہ کہیں غلط نہ ہو جائے۔

چو قاضی بفکرت نویسد سجل — نہ باشد ز دستار بنداں خجل

(جب قاضی غور و فکر سے دستاویز لکھتا ہے تو وہ علماء سے شرمندہ نہیں ہوتا)

زبان سے بات کہہ کر تو مکر بھی جاتے ہیں مگر لکھے ہوئے کا انکار نہیں کر سکتے معلوم ہوا کہ لکھے ہوئے کو مہتم بالشان جان کر اس کا خیال رکھتے ہیں اسی لئے ہر بات کے لکھنے پر انسان آمادہ نہیں ہوتا مگر زبان کے آگے جھاڑ نہیں جو چاہے کہتے چلے جاؤ نہ اس کے چلانے میں کچھ خرچ ہوتا ہے پھر ہاتھ پیر تو چل کر تھک بھی جاتے ہیں مگر زبان بولنے سے دکھتی بھی نہیں نیز اس کے چلانے میں کچھ زیادہ قصد کی بھی حاجت نہیں اگرچہ بولنا فعل قصدی ہے مگر ہر کلمہ کے ساتھ قصد متعلق نہیں ہوتا۔ اگر ہر کلمہ کے ساتھ قصد متعلق ہوتا تو اس سے پہلے علم بھی ہوتا مگر ہم تو وجداناً دیکھتے ہیں کہ بہت سی باتیں اثناء کلام میں زبان سے ایسی نکلتی ہیں جن کا نہ پہلے سے قصد ہوتا ہے نہ علم ہوتا ہے بس یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک گونہ اجمالی علم ہوتا ہے اسی سے قصد بھی متعلق ہو جاتا ہے اس سے زیادہ فیصلہ سمجھ میں نہیں آتا بہرحال بولنا اتنا سہل ہے کہ عقلاً اس میں یہ تردد ہو سکتا ہے کہ یہ فعل قصدی ہے یا غیر قصدی اگر فعل قصدی ہے تو ہر کلمہ کے ساتھ قصد ہونا چاہئے اور یہ وجداناً منتفی ہے اگر غیر قصدی ہے تو اس پر مؤاخذہ کیوں ہے۔

امور اختیاریہ کی دو قسمیں

قواعد سے اس میں یہ فیصلہ ہے کہ امور اختیاریہ کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کا بقاء و حدوث دونوں قصد و اختیار کے محتاج ہیں اور دوسرے وہ جو حدوث میں قصد و اختیار کے

محتاج ہیں بقاء میں محتاج نہیں تو کلام اسی دوسری قسم میں داخل ہے جیسا کہ مشی (یعنی چلنا) بھی اور بھی بعضے افعال اس صفت میں کلام کے ساتھ شریک ہیں یعنی ایسے ہی امور اختیاریہ میں سے ہیں کہ ان کا حدوث محتاج قصد واختیار ہے گو بقاء میں اس کی ضرورت نہیں کہ مثلاً ہر ہر قدم پر ارادہ جدید متعلق ہو البتہ یہ ضرور ہے کہ بقاء میں گو تفصیلی علم وارادہ نہیں ہوتا مگر اجمالی ضرور ہوتا ہے یہاں تک تو اشتراک ہے مگر پھر تکلم میں ان سب سے یہ خاص امتیاز ہے کہ اور مشی (چلنا) وغیرہ سے زیادہ آسان بولنا ہے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا تو یہ کام اتنا آسان ہے کہ بظاہر اس میں قصد کی بھی ضرورت نہیں اسی واسطے کسی نے کہا ہے اللسان جرمه صغير و جرمه كبير (زبان کا (جرم) جسم چھوٹا ہے اور اس کا جرم (گناہ) بڑا ہے اور اس سہولت ہی کی وجہ سے لوگوں نے اس کو غیر مہتم بالشان سمجھ رکھا ہے دوسرے ہر فعل کا کچھ اثر ظاہر میں باقی رہتا ہے مثلاً اگر آپ کچھ لکھیں گے تو اس کا اثر باقی رہے گا اسی طرح سب افعال کا اثر چنانچہ تتبع سے معلوم ہو سکتا ہے مگر زبان کا اثر باقی نہیں رہتا اس لئے بھی لوگوں نے اس کو معمولی سمجھ لیا ہے مگر یاد رکھو کہ خدا تعالیٰ کے یہاں تو سب کچھ محفوظ ہے آپ سمجھتے ہیں کہ ہم زبان سے جو کچھ کہتے رہتے ہیں وہ معدوم ہوتا جاتا ہے اور یہ خبر نہیں کہ وہ سب ایک دفتر میں جمع ہو رہا ہے مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ (وہ کوئی لفظ منہ سے نکالنے نہیں دیتا مگر اس کے پاس ہی ایک تاک لگانے والا تیار ہے) حق تعالیٰ کے دفتر بہت سے ہیں سب سے چھوٹا دفتر انسان کا نامہ اعمال ہے قیامت کے دن ہر شخص کو اس کا نامہ اعمال دے دیا جائے گا اور کہا جائے گا اِقْرَأْ كِتَابَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْباً (اپنے نامہ اعمال کو پڑھ آج تو خود اپنا آپ ہی محاسب ہے) جس دن لوگ اس کتاب کو دیکھیں گے تو حیرت سے کہیں گے مَالِ هٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّا اَحْصٰهَا وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِراً وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَداً ٥ (اس نامہ اعمال کی عجیب حالت ہے کہ بے قلمبند کئے ہوئے نہ کوئی چھوٹا گناہ چھوڑا نہ بڑا گناہ اور جو کچھ انہوں نے کیا وہ سب لکھا ہوا موجود پائیں گے اور آپ کا رب کسی پر ظلم نہ کرے گا) (خفیہ پولیس والے کہاں تک لکھیں گے وہ تو تقریر کا خلاصہ ہی نوٹ کرتے ہیں اور یہاں تو بعینہ بجنسہ لکھا جاتا ہے پہلے تو یہ بات بعضوں کی عقل میں بھی نہ آتی تھی کہ فرشتے بعینہ کس

طرح لکھتے ہیں مگر خدا بھلا کرے یعنی ہدایت کرے گراموفون ایجاد کرنیوالوں کو کہ ان کی اس ایجاد سے ہم کو عقل پرستوں کے سامنے ایک نظیر پیش کرنے کا موقع مل گیا۔

نامہ میں جذب کلام واعمال کی خاصیت

گراموفون نے اس اشکال کو حل کر دیا سب جانتے ہیں کہ اس میں ساری گفتگو بعینہ محفوظ رہتی ہے اگر کسی دن قاری صاحب نے کوئی غلطی پڑھ دی تو گراموفون میں وہ بند ہو جائے گی اور ہمیشہ کے لئے ان کی غلطی کی یاددہانی گراموفون سے ہوتی رہے گی ممکن ہے کہ نامہ میں بھی جذب کلام واعمال کی خاصیت ہو پھر آدمی خود سوچ لے کہ جس طرح گراموفون میں کلام بند ہونے کے بعد اس سے انکار کرنا دشوار ہوتا ہے اور جس وقت وہ کلام جو ہماری زبان سے صادر ہوا تھا بعینہ گراموفون سے سنتے ہیں تو اس کو سن کر دل کو یقین ہو جاتا ہے کہ واقعی یہ وہی بات ہے جو ہم نے کہی تھی اور اس سے انکار کی ہمت نہیں ہوتی اور انکار کرنا بھی چاہے تو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اس صورت میں ذلت زیادہ ہوگی لوگ کہیں گے کہ اگر تم نے یہ بات نہیں کہی تھی تو گراموفون میں آپ سے آپ کس طرح یہ کلام بند ہو گیا اسی طرح نامہ اعمال کو دیکھ کر خدا تعالیٰ کے سامنے انکار کی کیسے ہمت ہوگی کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ انسان کو اپنے افعال واقوال کا سب سے زیادہ علم ہوتا ہے بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ (بلکہ انسان خود اپنی حالت پر خوب مطلع ہوگا گو (باقتضائے طبیعت اس وقت بھی) اپنے حیلے (حوالے) پیش لاوے)

کتابت اعمال کا نفع

پھر جب ان کو بعینہ بجنسہ نامہ اعمال میں درج پائے گا تو دل کو تو فوراً یقین ہو جائے گا کہ واقعی یہ اندراج بالکل صحیح ہے اور میں نے ان افعال واقوال کا ارتکاب کیا تو ہے اس کے بعد اگر حیادار ہے تو ان سے ہر گناہ کا انکار کرے گا اور اگر بے حیا ہے تو انکار کرتے ہوئے اس کے لب ولہجہ میں قوت نہ ہوگی بلکہ اس پر دیکھتے ہی ایسا پانی پڑ جائے گا کہ انکار کرتے ہوئے اس کے لب ولہجہ سے ہر شخص کو اس کا جھوٹا ہونا معلوم ہو جائے گا۔ پس اب فرقہ ضالہ (گمراہ فرقے) کے ان اشکالات کا جواب بھی معلوم ہو گیا جو انہوں نے کتابت اعمال پر

کیے ہیں مثلاً وہ یہ کہتے ہیں کتابت اعمال سے کیا نفع اس سے مخلوق پر حجت کیسے قائم ہوگی وہ تو خدا تعالیٰ کے لکھوائے ہوئے اور فرشتوں کے لکھے ہوئے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ نامہ اعمال کے لکھوانے سے نفع ہے کہ اس کو دیکھتے ہی ہر شخص کو فوراً اپنے افعال واقوال پیش نظر ہو جائیں گے اور دل سے تو یقیناً اقرار کرلے گا کہ ہاں واقعی یہ لکھا بالکل صحیح ہے پھر حیادار کو تو انکار کی ہمت ہی نہ ہوگی اور اگر کوئی بے حیا انکار کرے گا بھی تو حق تعالیٰ ان کا منہ بند کرنے کے لئے دوسرا طریقہ تجویز فرمائیں گے۔ اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰىٓ اَفْوَاهِهِمْ وَ تُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ یعنی آج منہ پر مہر لگا دی جائے گی اور ہاتھ پیر آنکھ کان وغیرہ جملہ اعضاء خود بخود سارے افعال کو ظاہر کر دیں گے کہ ہم نے یہ کیا تھا وہ کیا تھا اس وقت کفار اپنے اعضاء پر جھلائیں گے وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ (اس وقت وہ لوگ اپنے اعضاء سے متعجب ہو کر کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی وہ اعضاء جواب دیں گے کہ ہم کو اس اللہ نے گویائی دی جس نے ہر گویا چیز کو گویائی دی) اس پر شائد کسی کو شبہ ہو کہ اعضاء تو غیر ذی شعور ہیں ان کو افعال و اعمال کی کیا خبر اور وہ کس طرح بولیں گے؟ اس کا وہی جواب ہے جو اوپر گذر چکا کہ مونوگراف بھی تو غیر ذی شعور ہے اس میں آواز کیسے بند ہو جاتی ہے اور وہ کس طرح بولتا ہے اسی طرح ممکن ہے کہ حق تعالیٰ نے اعضاء انسان میں بھی یہ خاصیت رکھی ہے کہ سارے اعمال ان میں منقش ہو جاتے ہیں پھر جب حق تعالیٰ ان میں نطق کی قوت پیدا کریں گے تو مونوگراف کی طرح سب باتوں کو فر فر ظاہر کر دیں گے پس یہ مت سمجھو کہ ہمارے اقوال تو زبان سے نکلتے ہی معدوم ہو جاتے ہیں آپ کے ساتھ مونوگراف ہر دم موجود ہے جس میں سب اقوال و افعال منقش ہوتے رہتے ہیں نیز فرشتے بھی لکھتے رہتے ہیں باقی یہ شبہ کہ فرشتے تو خدا تعالیٰ کے ہیں یہ شبہ بے حیائی کا ہے فرشتے چاہے خدا تعالیٰ کے ہوں مگر اعمال و افعال تو ہمارے ہیں انسان کو اپنے اعمال جزئیہ کی معرفت بمعنی علم جزئی ضرور ہوتی ہے اور علوم جزئیہ میں احتمال غلطی کا بہت کم ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت

اسی لئے حق تعالیٰ بعنوان معرفت فرماتے ہیں اَمْ لَمْ یَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ کیا ان لوگوں نے اپنے رسول کونہیں پہچانا اس لئے ان کا انکار کرتے ہیں یہ سوال انکاری ہے مطلب یہ ہے بل قد عرفوہ کہ یہ لوگ رسول کو ضرور پہچانتے ہیں اور پہچان کر انکار کرتے ہیں منشاء انکار کا عدم معرفت نہیں بلکہ ضد وعناد ہے یا عار واستکبار ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت بھی امور جزئیہ کی معرفت سے ہے اور امور جزئیہ میں غلطی بہت کم ہوتی ہے کفار کے واقعات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت یقیناً حاصل تھی چنانچہ حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے جب آپ سجدہ میں گئے تو چند کفار نے آپ کی گردن پر گندگی رکھ دی حضور صلی اللہ علیہ وسلم تلویث ثیاب کے اندیشہ سے دیر تک سجدہ ہی میں رہے یہ حال دیکھ کر کفار ہنسی کے مارے ایک دوسرے پر گر رہے تھے کہ اتنے میں کسی نے حضرت سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو اطلاع دی یہ اس وقت بچی سی تھیں فوراً دوڑی ہوئی آئیں اور رؤساء کفار کو ان کے منہ پر برا بھلا کہا اور گندگی کو اٹھا کر پھینک دیا اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ سے سر اٹھایا اور ان کافروں کے نام لے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بددعا فرمائی حدیث میں آتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بددعا نکلی تو کفار کے رنگ فق ہوگئے کیونکہ جانتے تھے کہ یہ جو کچھ کہہ دیں گے ضرور ہو کر رہے گا حالانکہ مسلمانوں کا تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ارشاد سے یہ عقیدہ بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بددعا کا لگنا ضروری نہیں چاہے لگے یا نہ لگے مگر کفار کا تو یہی خیال تھا کہ آپ جو کچھ کہہ دیں گے ضرور پورا ہو کر رہے گا پس اگر یہ لوگ آپ کی رسالت کو نہ پہچانتے تھے تو آپ کی بددعا سے اتنے خائف کیوں تھے؟ معلوم ہوا کہ پہچانتے تھے مگر عناد وعار کی وجہ سے انکار کرتے تھے چنانچہ اسی عار کی بناء پر کہا کرتے کہ کیا رسالت کے لئے یتیم ابی طالب ہی رہ گئے تھے اگر خدا تعالیٰ کو رسول ہی بھیجنا تھا تو مکہ اور طائف کے کسی مالدار دولت مند کو رسول ہونا چاہیے تھا وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (اور انہوں نے کہا کہ خدا تعالیٰ نے اس قرآن کو دونوں مقاموں (مکہ و طائف) کے کسی بڑے مالدار پر کیوں نہیں اتارا) حق تعالیٰ جواب دیتے ہیں۔

اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَةَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ یعنی کیا یہ لوگ نبوت کو بانٹتے ہیں کیا اس کی تقسیم ان کے ہاتھ میں ہے جو اپنی طرف سے تجویزیں پاس کرتے ہیں ہم نے ایک ذلیل چیز معیشت دنیا کی تقسیم کا تو اختیار ان کو دیا ہی نہیں بلکہ اس کو بھی ہم نے خود ہی تقسیم کیا ہے پھر نبوت کو یہ لوگ کیا بانٹیں گے غرض ان کو محض عار مانع تھی ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت میں ان کو شبہ نہ تھا چنانچہ بعض نے مرتے ہوئے اقرار کیا کہ میں جانتا ہوں کہ آپ نبی ہیں اور آپ کا دین حق ہے مگر مجھے اسلام لانے میں اس کا خوف ہے کہ قریش کی بوڑھی عورتیں یہ کہیں گی کہ دوزخ کے خوف سے اپنے باپ دادا کا دین بدل دیا گویا کفر پر جمے رہنے کا منشا بہادری تھی کہ لوگ یوں کہیں بڑے بہادر ہیں کہ دوزخ سے بھی نہیں ڈرتے واقعی بڑا بہادر تو وہی ہے جو یوں کہے کہ میں دزخ سے بھی نہیں ڈرتا فَمَا اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ (سو دوزخ کے لئے کیسے باہمت ہیں) جیسے ایک شخص نے کسی اکھڑ قوم کے ایک بزرگ کی تعریف کی تھی کہ بڑے ولی ہیں پہنچے ہوئے ہیں تو ایک ظریف نے کہا میاں اس قوم میں بھی کہیں کوئی ولی ہوا ہے دیکھو میں ابھی ان کی قلعی کھولے دیتا ہوں وہ بزرگ صاحب جنگل میں رہتے تھے یہ ظریف اس شخص کو ہمراہ لے کر پہنچا اور جا کر ملاقات کی اول ادھر ادھر کی باتیں کر کے کہنے لگا کہ حضرت آپ کو جنگل میں اکیلے تو بہت ڈر لگتا ہوگا بزرگ صاحب کو اس کی کہاں تاب تھی جوش آ گیا تو کہتے ہیں کہ میاں میں خدا سے تو ڈرتا ہی نہیں (نعوذ باللہ) اور کسی سے تو کیا ڈرتا اس ظریف نے اس معتقد سے کہا کہ دیکھ لیا تم اس کو ولی اور بزرگ کہتے ہو تو جیسے اس نے بہادری ظاہر کی تھی ایسے ہی بعض کفار بہادری کی وجہ سے ایمان نہ لاتے تھے آخر اسی حالت پر مر گئے یہاں سے یہ سبق بھی حاصل ہوا کہ اپنے اسلام اور ایمان کو اپنا فعل مکتسب اور من کل الوجوہ (ہر طرح سے) اپنے اختیار میں کبھی نہ سمجھا جائے اور یہ اکتساب بھی جب ہی ہوا جب وہاں سے رحم ہوا انسان کو کبھی علم و عقل پر ناز نہ کرنا چاہیے آخر وہ رئیس عاقل بھی تھے اور تمام مقدمات سے واقف بھی تھا پھر کیوں نہ اسلام لے آیا اگر یہ سب مقدمات عقلیہ و علمیہ اسلام لانے میں مؤثر تام ہیں تو اس جگہ پر مقدمات کیا ہو گئے تھے اسی کو فرماتے ہیں ۔

نیاوردم از خانہ چیزے نخست　　　　تو دادی ہمہ چیز من چیز تست

(میں گھر سے کوئی چیز نہیں لایا آپ ہی نے سب چیزیں عطا کی ہیں میں بھی آپ ہی کا ہوں)

عنایت مستقلہ

اور حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَمَا بِکُمْ مِنْ نِعْمَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ جو کچھ بھی نعمتیں تمہارے پاس ہیں ظاہری یا باطنی سب خدا تعالیٰ کی طرف سے ہیں تم اپنی قوت پر کیا نازاں ہوتے ہو۔ تمہاری قوت کیا چیز ہے کچھ بھی نہیں اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ اس میں نفی اور استثناء کے ساتھ حصر کر دیا ہے کہ اعمال صالحہ کی قوت اور اعمال سیئہ سے بچنے کی طاقت اللہ ہی کی مدد سے ہوتی ہے آگے علی و عظیم اس لئے فرمایا کہ بتلا دیا کہ علو و عظمت حق تعالیٰ ہی کی شان ہے جس کا ظہور توفیق اعمال میں پوری طرح ہوتا ہے کہ ایک عاقل کو تو ایمان و اسلام کی توفیق نہیں ہوتی اور بعضے جاہلوں کو ہو جاتی ہے تو بس جس کو جو کچھ عطا ہوا محض عنایت ہی عنایت ہے اس کے بعد ثمرہ اعمال یعنی نجات بھی عنایت مستقلہ ہے اعمال کا ثمرہ نہیں ہے نہ کسی کے استحقاق کا نتیجہ ہے کیونکہ استحقاق کے لئے کوئی علت ہونا چاہئیے اور یہاں کوئی علت نہیں کیونکہ ہم جو کچھ بھی عمل کرتے ہیں حق تعالیٰ کی توفیق سے کرتے ہیں تو یہ خود ایک عنایت ہے یہ کسی اجزاء کے استحقاق کی علت کیونکر ہو سکتی ہے دوسرے اس اجزاء کے سامنے ہمارے اعمال اس قدر قلیل ہیں کہ جزا کو ان اعمال کی اجرت کہنا ہی صحیح نہیں بلکہ سب عنایت ہی عنایت ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک مزدور صبح سے شام تک کام کرے اور اس کو بجائے دو آنے کے ایک لاکھ روپیہ دیئے جائیں تو ہر شخص یہی کہے گا کہ یہ سب انعام ہے یہ کوئی نہ کہے گا کہ اس میں دو آنہ تو مزدوری کے ہیں اور دو آنے کم لاکھ روپیہ انعام ہے کیونکہ قاعدہ یہی ہے کہ بڑے احسان میں چھوٹے کام غائب ہو جاتے ہیں اب غور کیجئے کہ جنت کے سامنے ہمارے اعمال کیا چیز ہیں کچھ بھی نہیں اول تو ہمارے اعمال عموماً ناقص و مختل ہیں مثلاً ہم نماز پڑھتے ہیں تو ہر شخص خود سوچ لے کہ ہماری نماز کیسی ہوتی ہے بس حق تعالیٰ کی یہ بھی بڑی رحمت ہے جو مواخذہ ہی نہ فرمائیں اور یہ تو رحمت پر رحمت ہے کہ قبول فرمالیں اور اگر کسی کے عمل اچھے بھی ہوں تب بھی خدا تعالیٰ کی عظمت کے قابل تو ہرگز نہیں بلا تشبیہ اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک قوی پہلوان کے پیر ایک لڑکا دبائے ایک صورت تو یہ ہے کہ وہ دبائے ہی نہیں محض نام ہی کے لئے پیروں پر ہاتھ دھر دے یہ تو ناقص ہے کہ اس نے اپنی ہمت کے موافق بھی عمل نہیں کیا دوسری صورت یہ ہے کہ وہ خوب زور سے دبائے یہاں تک کہ سارا زور ختم کر دے اس نے اپنے نزدیک

تو بہت کچھ کیا مگر پہلوان کی قوت کے سامنے اس نے بھی کچھ نہیں کیا اس کو تو خبر بھی نہ ہوگی یہ ہمارے اعمال کاملہ کی مثال ہے ہم اپنے اعمال کو اسی وقت تک کچھ سمجھ سکتے ہیں جب تک اپنے اوپر نظر ہو اور جب خدا تعالیٰ کی عظمت پر نظر ہوگی تو ہر شخص اقرار کرے گا کہ میں نے خدا تعالیٰ کا کچھ بھی حق ادا نہیں کیا پھر استحقاق اجر کے دعوے کا کیا منہ ہے سعدی اسی کو فرماتے ہیں۔

بندہ ہماں بہ کہ ز تقصیر خویش　　عذر بدر گاہ خدا آورد

ورنہ سزا وار خداوند یش　　کس نہ تو اند کہ بجا آورد

(بندہ وہی بہتر ہے جو اپنی کوتاہی کا دربار خداوندی میں عذر لائے ورنہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ اس کی خداوندی عظمت کے لائق کوئی طاعت بجالاوے)

یہاں سے معتزلہ کی غلطی معلوم ہوگئی جو ان اعمال کو علت اجر قرار دیتے ہیں اور خدا تعالیٰ پر جزا کو واجب مانتے ہیں۔ ہمارے اعمال کیا چیز ہیں محض علامات میں سے ہیں کہ ان کو دیکھ کر ظنی طور پر یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کو نوازنا منظور ہے اور دوسرے کو نکالنا منظور ہے باقی یہ اعمال موثر بہ تاثیر حقیقی ہرگز نہیں ہیں اور قرآن میں جو جا بجا جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (یہ ان کے اعمال کا عوض ہے) فرمایا ہے یہ ہمارا جی خوش کرنے کے لئے ہے ورنہ ہم تو بہ کے مستحق نہ تھے پس کوئی اپنے علم و عمل پر ناز نہ کرے اور یہ نہ سمجھے کہ چونکہ ہم بڑے عاقل ہیں اس لئے اسلام و ایمان سے مشرف ہیں حضرت بڑے بڑے عاقل گمراہ ہیں اور بعضے جاہل راہ یاب ہیں۔

اسلام میں توحید کامل ہے

ایک جاہل ہندو فقیر سنیاسی اپنا واقعہ خود مجھ سے بیان کرتا تھا کہ اس کو خدا تعالیٰ کے دیدار کا شوق غالب ہوا اور یکے بعد دیگرے ہندو پنڈتوں سے اس شوق کو ظاہر کیا کہ مجھے خدا تعالیٰ کو دکھلا دو سب نے اس سے انکار کیا مگر ایک مہنت نے وعدہ کیا کہ فلاں دن سورج چھپے دریا کے کنارے پر دکھلاؤں گا اس کو شوق غالب تھا وقت پر پہنچا مہنت نے یہ حرکت کی تھی کہ ایک کچھوے کے اوپر گارا جما کر اس پر چراغ جلا کر رکھ دیا تھا جب آفتاب غروب ہوگیا تو اندھیرے میں دور سے روشنی نظر آئی مہنت نے کہا دیکھ وہ خدا ہے اس نے بھی دیکھا کہ روشنی تو نظر آتی ہے مگر اس کی یہ حالت ہے کہ اچھلتی ہوئی حرکت کر رہی ہے یہ تحقیق کے لئے

روشنی کی طرف دوڑا مہنت نے کہا ہا ئیں ہا ئیں وہاں مت جانا جل جائے گا مرجائے گا خدا کا دیدار دور ہی سے کرنا چاہیے اس نے کہا بلا سے اگر مرگیا تو کچھ پروانہیں میں تو خدا کو پاس ہی سے دیکھوں گا اگر اس کی جوت سے جل بھی گیا تو اس سے اچھا کیا جب نزدیک پہنچا تو دیکھا کہ ایک پھوے پر چراغ رکھا ہوا ہے اب تو اس نے مہنت کو خوب لتاڑا کہ یہ کیا حرکت تھی وہ کہنے لگا کہ بھائی خدا کو بھی کوئی دکھلا سکتا ہے مگر میں نے تیری تسلی کے واسطے یہ ایک ترکیب کی تھی یہ تو ہندو کا واقعہ ہے ایک مسلمان صاحب کا واقعہ سنئے کہ اس نے ایک ذاکر شاغل کے سامنے وہ دعویٰ کیا کہ میں خدا تعالیٰ کو دکھلا سکتا ہوں (نعوذ باللہ) وہ بے چارہ مشتاق دیدار آمادہ ہوگیا ہمارے قصبہ کے پاس ایک گاؤں ہے ''غوث گڑھ'' وہاں ایک مسجد کی عمارت بہت عالیشان ہے گو اب وہاں مسلمان کوئی بھی نہیں اور مسجد بھی ویران ہے مگر۔

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ آثار پدیدست صنادید عجم را

(نقش ونگار اور شکستہ دیوار سے شاہان عجم کے آثار کا پتہ چلتا ہے)

اس مدعی نے دیدار کے لئے اسی مسجد کو تجویز کیا اور ان صاحب کو رات کے وقت لے گیا اور مسجد میں پہنچ کر اس نے کچھ وظیفہ بتلا دیا کہ اس کو آنکھیں بند کر کے پڑھتے رہو اور جب میں ہوں کروں اس وقت آنکھیں کھول دینا چنانچہ تھوڑی دیر میں آپ نے ہوں کی اور اس شخص نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو واقعی ساری مسجد میں روشنی ہی روشنی تھی مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی دیکھا کہ روشنی کے ساتھ اپنا سایہ بھی ہے یہ پڑھے لکھے آدمی تھے ان کو فوراً خیال ہوا کہ نور حق کے ساتھ یہ سایہ کیسا اس کی تو یہ شان ہے۔

چو سلطان عزت علم برکشد جہاں سر بجیب عدم برکشد

(جب محبوب حقیقی کی تجلی قلب پر وارد ہوتی ہے سب چیزیں فنا ہوجاتی ہیں)

تجلی حق کے ہوتے ہوئے ظلمت کا نشان کہاں رہ سکتا ہے اس کے بعد اس نے پیچھے کو جو نظر کی تو دیکھا وہ مدعی دیا سلائی ہاتھ میں لئے کھڑا ہے اس وقت دیا سلائی اول اول چلی تھی دیہات میں نہ پہنچی تھی اس کمبخت نے دیہات میں دیا سلائی سے یہ کام لیا کہ لوگوں کے ایمان کو جلانے لگا۔ یہ دیکھ کر اس شخص نے جوتا نکال کے خوب مرمت کی کہ نامعقول آ اب

میں تجھے خدا دکھلاؤں تو مخلوق کے ایمان کو برباد کرتا ہے ایسے ہی اس مہنت نے کیا تھا کہ کچھوے پر چراغ جلا کر طالب کو دھوکہ دیا وہ ہندو کہتا تھا کہ پھر میں دیدار ہی کے اشتیاق میں مسلمان ہوگیا میں نے اس سے کہا کہ جب تو خدا تعالیٰ کے دیکھنے کے واسطے مسلمان ہوا ہے تو یہ بات تو اسلام سے بھی دنیا میں حاصل نہیں ہوسکتی ہاں ان شاء اللہ آخرت میں یہ دولت حاصل ہوگی تو جب تو دنیا میں خدا کو دیکھے گا نہیں تو مسلمان ہی کیسے رہے گا اس نے کہا مجھے اسلام میں ایک ایسی خوبی ثابت ہوتی ہے کہ چاہے دنیا میں خدا کا دیدار ہو یا نہ ہو مگر اسلام کو نہ چھوڑوں گا میں نے کہا وہ خوبی کیا ہے کہنے لگا کہ اسلام میں توحید بہت کامل ہے میں نے کہا تجھے اسلام کی توحید کا کامل ہونا کس بات سے معلوم ہوا کہا اس طرح معلوم ہوا کہ جب کوئی دوسرے مذہب کا آدمی اسلام لاتا ہے تو مسلمان اس کو اسی وقت سے اپنے سے افضل جاننے لگتے ہیں اور اس کے ساتھ کھانے پینے لگتے ہیں تو یہ اتحاد اسلامی توحید ہی کا اثر ہے یہ بات کسی مذہب میں نہیں۔ میں نے کہا شاباش تو نے خوب سمجھا۔

نومسلم کے ساتھ کھانا کھانا

صاحبو! اس پر ایک واقعہ استطراداً یاد آیا جس سے معلوم ہوگا کہ ہم ایسا کرلیں کہ کسی نومسلم کے ساتھ کھانا کھالیں تو کچھ مشکل نہیں مگر امراء و حکام کا ایسا کرنا نہایت کمال ہے وہ واقعہ منشی جمال الدین صاحب وزیر بھوپال کا ہے کہ ایک دفعہ ان کے یہاں کسی تقریب میں بڑے بڑے ارکان ریاست اور عہدہ داروں کی دعوت تھی دسترخوان بچھا ہوا تھا کہ ایک بھنگی آیا اور کہنے لگا میاں میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں آپ نے فوراً اسے مسلمان کیا اور خادم سے کہا اس کے کپڑے بدل کر ہمارے خاص لباس میں سے ایک قیمتی جوڑا پہنا دو اور ہاتھ دھلوا کر دسترخوان پر لاؤ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا جس وقت وہ دسترخوان پر آیا تو بعض لوگ ناک منہ چڑھانے لگے منشی جمال الدین صاحب نے فرمایا صاحبو! آپ بے فکر رہیں یہ آپ کے ساتھ شریک نہ ہوگا بلکہ اس کے ساتھ میں کھاؤں گا آپ اس نعمت کے قابل نہیں ہیں جو ایسے پاک بے گناہ کے ساتھ کھانا کھائیں جو گویا ابھی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے اس دولت کو میں نے اپنے لئے تجویز کیا ہے چنانچہ آپ نے ایک ہی پیالہ میں اس کے ساتھ کھانا کھایا ایک اور قصہ یاد آیا میں ایک بار کالپی گیا وعظ

کے بعد بعض دیہاتیوں نے بیان کیا کہ یہ ایک بھنگی مسلمان ہوا ہے مگر زمیندار اس سے اب تک پرہیز کرتے ہیں ان کو سمجھا دیجئے میں نے سوچا کہاں تک سمجھاؤں گا میں نے سب کے سامنے پانی منگوایا اور پہلے اس نومسلم کو پلا کر پھر اس کا جھوٹا خود پیا اور ان زمینداروں کو جو کہ میرے پاس بیٹھے تھے ان سب کو بھی پلایا اور کہا اب مت پرہیز کرنا۔ کہنے لگے کہ اب کیا خاک پرہیز ہوگا مگر میں نے تو ایسے نومسلم کا جھوٹا پیا تھا جو ایک عرصہ سے مسلمان تھا اسلام کے بعد اس کا مسہل بھی ہوگیا تھا اور منشی جمال الدین صاحب نے ایسے شخص کا جھوٹا کھایا جس نے اسلام کے بعد پیشاب بھی نہ کیا تھا آج کل بعض لوگوں میں یہ بڑا مرض ہے کہ نومسلموں سے پرہیز کرتے ہیں یہ نہایت لغو حرکت ہے مسلمانوں نے یہ چھوت چھات ہندوؤں سے سیکھی ہے اس کو چھوڑنا چاہیئے۔

عار و استکبار بڑی سد راہ ہے

خیر یہ قصے تو استطرادی تھے میں اس سنیاسی جاہل فقیر کی حکایت بیان کر رہا تھا جو شوق دیدار میں اسلام لایا تھا اور اسلام کی توحید کو سمجھ کر ثبات علی الاسلام (اسلام پر ثابت قدم رہنے) کا عزم کیے ہوئے تھا تو اس واقعہ میں غور کیجئے کہ ایسا جاہل تو مسلمان ہوگیا جس کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ خدا کا دیدار دنیا میں نہیں ہوسکتا بلکہ وہ اس کو ممکن سمجھ کر دیدار حق کا طالب تھا اور وہ رئیس مکہ باوجود عاقل ہونے کے فقط عورتوں کے خوف سے اسلام نہیں لایا میں یہ کہہ رہا تھا کہ کفار مکہ سے علمی غلطی نہ ہوئی تھی وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانتے تھے مگر اتباع سے عار آتی تھی اور یہ عار و استکبار بڑی سد راہ ہے بڑے بڑے اس میں دھوکہ کھاتے ہیں اسی واسطے میں کہتا ہوں کہ جو کچھ ہم کو عطا ہوا ہے محض عنایت ہے۔

نیاوردم از خانہ چیزے نخست   تو دادی ہمہ چیز من چیز تست

(میں پہلے سے ہی گھر سے کوئی چیز نہیں لایا تمام چیزیں آپ نے مجھ کو عطا کی ہیں میں بھی آپ ہی کا ہوں)

یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ امور جزئیہ میں غلطی نہیں ہوا کرتی جیسا کہ **ام لم یعرفوا رسولھم** (کیا وہ اپنے رسول کو نہیں پہچانتے ہیں) سے معلوم ہوا کہ کفار مکہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق علمی غلطی نہ تھی پھر امور جزئیہ اگر اپنے افعال و اقوال ہوں ان میں غلطی کیونکر ہوسکتی ہے۔

کتابت اعمال میں حکمت

پس ہر چند کہ ملائکہ خدا تعالیٰ کے ہیں مگر افعال واقوال چونکہ ہمارے ہیں اس لئے نامہ اعمال کو دیکھ کر انکار کی ہمت نہ ہوگی دل سے ہر شخص کو اس کی صحت کا یقین ہو جائے گا یہ فائدہ ہے کتابت اعمال میں تو ہم لوگ جو سمجھتے ہیں کہ زبان سے نکلی ہوئی بات کا ظاہر میں کچھ اثر نہیں رہتا اس لئے وہ غیر مہتم بالشان ہے یہ خیال غلط ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کے یہاں سب کچھ محفوظ رہتا ہے جو ایک وقت سب کے سامنے آ جائے گا اس کو یاد کر کے زبان کی حفاظت کرنا چاہیے اس پر شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ ہم تو اب تک زبان سے ہزاروں بے احتیاطیاں اور سینکڑوں گناہ کر چکے ہیں جو ہمارے نامہ اعمال میں لکھے گئے ہوں گے اب آئندہ کی لیپ پوت سے کیا ہوتا ہے تو سن لیجئے کہ ان کی تلافی اب بھی ہو سکتی ہے۔

توبہ کا حکم

کفر کے برابر تو کوئی گناہ نہیں مگر بندہ کو تلافی کرنا چاہیے تو اس کی بھی تلافی ہو سکتی ہے اور یہ خیال کفار کو بھی ہوا تھا کہ اگر ہم اسلام لے آئیں تو آئندہ کے لئے تو گناہوں کا انسداد ہو جائے گا مگر جو گناہ قتل وزنا وغیرہ کفر کی حالت میں ہم کر چکے ہیں ان کی تلافی کیونکر ہوگی چنانچہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی دعوت دی تو بعض کفار نے یہی عذر کیا کہ ہم جانتے ہیں اسلام حق ہے مگر ہم اسلام بھی لے آئیں تو ان گناہوں کی تلافی کیونکر ہوگی جو ہم نے اب تک کئے ہیں اسلام لانے سے ان کو کیا نفع ہوگا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعاً اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (آپ کہہ دیجئے کہ اے میرے بندو جنہوں نے کفر وشرک کر کے اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں کہ تم خدا کی رحمت سے ناامید مت ہو یقیناً خدا تعالیٰ تمام گذشتہ گناہوں کو معاف فرما دے گا واقعی وہ بڑا بخشنے والا بڑی رحمت والا ہے) اس میں بتلا دیا گیا کہ اسلام لانے سے کفر بھی مٹ جائے گا اور کفر کی حالت میں جتنے گناہ کئے ہیں وہ بھی سب مٹ جائیں گے اور اس واقعہ سے آیت کا مطلب بھی معلوم ہو گیا کہ مقصود اس آیت کا توبہ کی تعلیم ہے اور توبہ سے جو امر مانع تھا اس کو رفع کرنا

ہے اس میں گناہ پر دلیری کی تعلیم نہیں ہے جیسا کہ بعض جاہلوں کا خیال ہے کہ وہ جرأت علی المعاصی کے لئے اس آیت کو پیش کیا کرتے ہیں یہ بالکل غلط ہے اس آیت سے گناہوں پر دلیر نہ ہونا چاہئے ہاں جو شخص گناہ کر کے توبہ کرنا چاہے اور اس کو یہ خیال مانع ہو کہ میرے اتنے گناہوں کو توبہ سے کیا نفع ہوگا اس کو اس آیت سے کام لے کر توبہ کی ہمت کرنی چاہئے ایسے شخص کو اس آیت میں خطاب کیا گیا ہے کہ جب تم اپنے پہلے گناہوں سے توبہ کرلو گے تو وہ سارے گناہ معاف ہو جائیں گے اور نامہ اعمال میں سے بھی مٹ جائیں گے وہ ایسے لکھے ہوئے نہیں ہیں جیسے چھپی ہوئی روشنائی کے حروف ہوں بلکہ ایسے لکھے ہوئے ہیں جیسے سلیٹ پر پتھر کے قلم سے حروف لکھے ہوتے ہیں کہ لب لگا کر ان کو مٹا دیتے ہیں اسی طرح توبہ کے بعد حق تعالیٰ سب گناہوں کو مٹا دیتے ہیں پھر یہی نہیں کہ گناہوں کو مٹا کر ان کی جگہ خالی چھوڑ دیں بلکہ حق تعالیٰ اس جگہ کو بھی بھر دیتے ہیں اور نامہ اعمال کو مزین کر دیتے ہیں اس طرح کہ گناہوں کی جگہ نیکیاں لکھ دیتے ہیں۔ اُولٰئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِہِمْ حَسَنَاتٍ (یہی لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دیں گے) تمہارا کہا ہوا تو مٹ جاتا ہے مگر حق تعالیٰ کا کہا ہوا نہیں مٹ سکتا حق تعالیٰ وعدہ فرماتے ہیں کہ توبہ کے بعد ہم گناہوں کے عوض اپنے پاس سے بہت کچھ دیں گے سبحان اللہ کس قدر عنایت ہے۔

ہر گناہ کی توبہ الگ ہے

اب بھی اگر کوئی توبہ نہ کرے تو اس سے زیادہ محروم کون ہوگا مگر یہ یاد رکھئے کہ ہر گناہ سے توبہ کرنے کا طریقہ الگ ہے اگر جھوٹ بولا ہے تو اس کی توبہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ سے استغفار کرلو اور اگر غیبت کی ہے تو اس کے لئے صرف استغفار کافی نہیں بلکہ جس کی غیبت کی ہے اس سے معافی بھی چاہو مگر معافی چاہنے میں اس کی ضرورت نہیں کہ اس سے یوں کہو کہ میں نے تیری فلاں فلاں غیبت کی ہے اور تجھے یوں برا بھلا کہا ہے کیونکہ اس تفصیل سے خواہ مخواہ اس کو ایذا دینا ہے ممکن ہے کہ اب تک اس کو غیبت کی اطلاع بھی نہ ہوئی ہو تو تم خود کہہ کر اس کا دل کیوں دکھاتے ہو بلکہ اجمالاً معافی چاہ لو کہ میرا کہا سنا معاف کر دو اور اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جن لوگوں کے سامنے تم نے غیبت کی تھی ان کے سامنے اس کی

16 مدح وثنا بھی کرواور پہلی بات کا غلط ہونا ظاہر کردواور اگر وہ بات غلط نہ ہو سچی ہوتو یوں کہہ دو کہ بھائی میری اس بات پر اعتماد کر کے تم فلاں شخص سے بدگمان نہ ہونا کیونکہ مجھے خود اس پر اعتماد نہیں رہا (یہ توریہ ہوگا کیونکہ سچی بات پر بھی اعتماد قطعی بدوں وحی کے نہیں ہوسکتا) اور وہ مر گیا ہو جس کی غیبت کی تھی تو اب غیبت کے معاف کرانے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے لئے دعا واستغفار کرتے رہو یہاں تک کہ دل گواہی دے دے کہ اب وہ تم سے راضی ہو گیا ہوگا غرض حفاظت لسان کی سخت ضرورت ہے جتنے گناہ زبان سے ہوتے ہیں اور کسی عضو سے نہیں ہوتے ہیں سب کی تفصیل کہاں تک بیان کروں اگر تفصیل دیکھنے کا شوق ہو تو امام غزالیؒ کی کتاب ''احیاء العلوم'' میں باب آفات اللسان دیکھو اور ''ضمان الفردوس'' ایک رسالہ اردو میں ہے اس کا مطالعہ کرو۔ اس وقت زبان کے ان گناہوں کو بیان کرتا ہوں جن کو لوگ گناہ بھی نہیں سمجھتے یعنی زبان کے بعض گناہ تو ایسے ہیں جن کو سب جانتے ہیں کہ یہ گناہ ہے جیسے جھوٹ بولنا، غیبت کرنا، بہتان باندھنا، کوسنا وغیرہ۔

دروغ برگردن راوی کہنے سے بری الذمہ نہیں ہوسکتا

اور بعض گناہوں کا گناہ ہونا لوگوں کو معلوم نہیں جیسے بے تحقیق کسی بات کا نقل کرنا اور سنی سنائی بات کو بدوں تحقیق کے فوراً زبان سے نکال دینا اس کو بہت لوگ گناہ ہی نہیں جانتے حتیٰ کہ اتقیاء بھی اس میں مبتلا ہیں اور جو بہت محتاط ہیں وہ سنی سنائی بات کو نقل کر کے اخیر میں کہہ دیتے ہیں کہ دروغ برگردن راوی اول (جھوٹ کا گناہ اول راوی کی گردن پر ہے گویا اس کہنے سے وہ بری ہو گئے ہرگز بری نہیں ہوسکتے اگر یہ قاعدہ ہوتا کہ سارا گناہ راوی اول ہی پر ہو اور اس سے سن سنا کر جو لوگ بعد میں نقل کریں وہ بریٔ الذمہ ہوں تو واقعہ افک میں حق تعالیٰ کیوں لتاڑتے اور ان پر یہ جرم کیوں قائم کرتے اِذْتَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّالَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ (جبکہ تم اپنی زبانوں سے اس افتراء کا تذکرہ کرتے تھے اور اپنے منہ سے ایسی بات نکالتے تھے جس کی تم کو تحقیق نہ تھی) کیونکہ وہاں بھی تو ایک راوی اول تھا جس نے یہ بہتان تراشا تھا اور اسی سے یہ بات مدینہ میں پھیلی تھی کیونکہ اول منافقین نے اس بات کا چرچا کیا تھا پھر کچھ مسلمانوں نے بھی منافقین سے سن کر

تذکرہ شروع کیا تھا جس پر یہ آیات نازل ہوئیں جن میں یہ نہیں کہا گیا کہ دروغ برگردن راوی اول (جھوٹ کا گناہ پہلے راوی کی گردن پر ہے) بلکہ یہ فرمایا گیا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْا بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ (کہ جن لوگوں نے یہ بہتان باندھا ہے وہ تمہارے ہی میں سے ایک جماعت ہے تم اس واقعہ کو اپنے لئے برا مت سمجھو بلکہ اس میں تمہارے لئے خیر ہے ان میں سے ہر شخص کے لئے وہ ہے جو گناہ حاصل کیا ہے) کیونکہ ایک تو اس سے افتراء (یعنی حد قذف ۱۲) کا حکم معلوم ہو جائے گا دوسرے یہ معلوم ہو جائے گا کہ سنی سنائی بات کا نقل کرنا اور اس کا اعتبار کرنا جائز نہیں تیسرے آئندہ اگر کسی متقی پر اس قسم کا بہتان باندھا جائے گا تو حضرت صدیقہؓ کا واقعہ اس کے لئے تسلی کا باعث ہوگا کہ مجھ سے پہلے بھی بے گناہ آدمیوں کو متہم کیا گیا ہے وغیرہ ذلک من الفوائد ۱۲ (اس کے علاوہ اور بھی فائدے ہیں) اس کے بعد ارشاد ہے کہ ان میں سے ہر شخص کے لئے گناہ کا حصہ ہے اس میں حق تعالیٰ نے سب کو گنہگار قرار دیا راوی اول کو بھی اور ناقلین کو بھی اس کے بعد فرماتے ہیں وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ کہ جس شخص نے اس میں بڑا حصہ لیا ہے یہ راوی اول ہے اس کے لئے بہت بڑا عذاب ہے پس یاد رکھو کہ اس معاملہ میں حق تعالیٰ تمہارے قانون پر عمل نہ کریں گے کہ دروغ برگردن راوی اول (جھوٹ کا گناہ راوی اول پر ہے) بلکہ اپنے قانون پر عمل فرمائیں گے۔

بے تحقیق بات کا زبان سے نکالنا جرم ہے

جس کا بیان اگلی آیت میں ہے اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ اس میں مسلمانوں کو خطاب ہے کہ تم زبان سے اس بہتان کا تذکرہ اور چرچا کرتے تھے اور اپنے منہ سے ایسی بات نکالتے تھے جس کی تم کو تحقیق نہ تھی اس میں بتلا دیا کہ بے تحقیق بات کا زبان سے نکالنا جرم ہے اور یہ بھی بتلا دیا کہ تحقیق بھی ہو جائے تو اس کا چرچا کرنا اور خواہ مخواہ پھیلانا دوسرا جرم ہے اگر کسی بات کی تحقیق بھی ہو جائے تو اس کو زبان سے نکالنا اسی حد تک جائز ہے جس حد تک ضرورت ہو اور ضرورت سے زیادہ پھیلانا اور اس کا بے فائدہ چرچا کرنا پھر بھی

جائز نہیں مثلاً کسی کو کسی کے متعلق تحقیق ہو جائے کہ یہ فلاں جرم کا مرتکب ہے تو امر بالمعروف کے طور پر خود اس شخص سے کہے کہ میں نے تیرے متعلق ایسا سنا ہے اگر یہ بات سچ ہے تو تم کو توبہ کرنا اور اس سے باز رہنا چاہئے اگر اس سے نہ کہہ سکے تو اس کے کسی مربی سے کہہ دے جو اس کو روک سکتا ہو اور یہ بھی اس وقت ہے جب تحقیق ہو جائے اور تحقیق نہ ہو تو پھر کسی سے بھی کہنا جائز نہیں نہ خود اس شخص سے نہ اس کے مربی وغیرہ سے پھر تحقیق کا طریقہ ہر کام کے لئے جدا ہے بعض امور میں دو عادل گواہ ضروری ہیں بعض میں چار پھر ان گواہوں میں بھی مشاہدہ سے گواہی ضروری ہے یہ نہیں کہ سب تمہاری طرح سنی سنائی کہتے ہوں پس جو بات منہ سے نکالنا ہو اس کے متعلق اول نفس سے سوال کیجئے کہ اس کا منہ سے نکالنا جائز ہے یا نہیں؟ دو حال سے خالی نہیں یا تو آپ عالم ہیں یا جاہل ہیں اگر عالم ہیں تو قواعد شرعیہ سے جواب معلوم ہو جائے گا ورنہ کتابوں سے مراجعت کیجئے اور اگر جاہل ہیں تو آپ کو پہلے کسی عالم سے دریافت کرنا چاہئے یا بقدر ضرورت علم حاصل کرنا چاہئے بہر حال اگر آپ نفس سے یہ سوال کریں گے تو اکثر واقعات میں یہی جواب ملے گا کہ یہ جائز نہیں اور کمتر یہ جواب آئے گا کہ جائز ہے اس پر دوبارہ نفس سے سوال کیجئے کہ اس کے منہ سے نکالنے میں کوئی فائدہ اور مصلحت بھی ہے اس کا جواب بھی اکثر یہی آئے گا کہ کوئی نہیں تو پھر اس بات کو ہرگز منہ سے نہ نکالو اور جس کے متعلق یہ جواب آئے کہ اس کا منہ سے نکالنا جائز ہی نہیں اس کے تو پاس بھی نہ جاؤ مگر یاد رکھو کہ ناجائز باتوں سے اسی وقت بچ سکتے ہو جب اس کی عادت ہو جائے کہ مباح اور جائز باتیں بھی بے ضرورت نہ کرو۔

خاموشی کے فضائل

بس زیادہ تر سکوت اختیار کرنا چاہئے حدیث میں ہے من[1] سکت سلم و من سلم نجیٰ (جس نے خاموشی اختیار کی سلامت رہا اور جو سلامت رہا اس نے نجات پائی) اور ایک فارسی مصرعہ ہے ؏

خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید

---

[1] من صمت نجا: سنن الترمذی: ۲۵۰۱، مسند الإمام أحمد ۲: ۱۵۹، ۱۷۷، سنن الدارمی ۲: ۲۹۹، الترغیب و الترهیب ۳: ۵۳۶، إتحاف السادة المتقين ۷: ۴۴۹، ۴۵۹، ۵۷۸، مشکوة المصابیح: ۴۸۳۶

(خاموشی ایسے معنی رکھتی ہے جو کہنے میں نہیں آسکتے)

اس مصرعہ میں لطیفہ ہے یعنی مصرعہ ذو معنی ہے ایک معنی تو یہ ہے کہ خاموشی میں ایسی خوبی ہے جو بیان نہیں ہوسکتی دوسرے معنی یہ ہیں کہ خاموشی میں ایسی خوبی ہے جو بولنے میں ہرگز نہیں بزرگوں نے تو فضول باتوں سے یہاں تک احتراز کیا ہے کہ بعض ان اقوال سے بھی پرہیز کرتے تھے جو ظاہر میں مستحب معلوم ہوتے ہیں حضرت رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا (ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت نازل ہو) کا واقعہ ہے کہ وہ شیطان پر بھی لعنت نہ کرتی تھیں کسی نے اس کا سبب پوچھا فرمایا کہ محبوب کا ذکر چھوڑ کر میں دشمن کے ذکر میں کیوں مشغول ہوں سعدی خوب فرماتے ہیں ۔

گر ایں مدعی دوست بشناختے ۔ بہ پیکار دشمن نہ پرداختے

(اگر یہ مدعی دوست کا عارف ہوتا تو دشمن کے ساتھ لڑائی میں مشغول نہ ہوتا)

حضرت رابعہؒ ہی کا دوسرا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ ان کے پاس چند صوفی بیٹھے ہوئے دنیا کی مذمت کر رہے تھے آپ نے فرمایا قوموا عنی فانکم تحبون الدنیا میرے پاس سے اٹھ جاؤ تم دنیا سے محبت رکھتے ہو ان لوگوں نے کہا کہ حضرت ہم تو دنیا کی مذمت کر رہے ہیں اگر محبت ہوتی تو ہم مذمت کیوں کرتے فرمایا من احب شیئاً اکثر ذکرہ جس کو کسی چیز سے محبت ہوا کرتی ہے وہ اس کو بہت یاد کیا کرتا ہے چاہے کسی عنوان سے یاد کرے۔ ایک عنوان یاد کا یہ بھی ہے کہ برائی سے یاد کرے شاید اس پر کسی کو شبہ ہو کہ کثرت ذکر منشاء ہمیشہ محبت نہیں ہوا کرتی بلکہ کبھی عداوت نفرت بھی منشا ہوتی ہے اگر حضرت رابعہؒ محض مجذوب ہوتیں تو مجھے ان کے کلام کی توجیہ کی ضرورت نہ تھی مگر چونکہ وہ مجذوب عاقل تھیں اس لئے میں ان کے کلام کی توجیہ کرتا ہوں حضرت رابعہؒ اپنے زمانہ میں ایسی بزرگ تھیں کہ اس زمانہ کے بڑے بڑے علماء و اولیاء ان کی زیارت کو آتے تھے اور ان کی نصائح اور مواعظ سے مستفید ہوتے تھے حالانکہ یہ عورت تھیں مگر ۔

نہ ہر زن زن ست نہ ہر مرد مرد ۔ خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد

(نہ ہر عورت عورت ہے نہ ہر مرد مرد ہے خدا تعالیٰ نے پانچوں انگلیاں برابر نہیں کیں)

عورتوں کے بعض کمالات

خود رابعہ بصریہؒ فرمایا کرتی تھیں کہ عورتوں کو بعض کمالات ایسے عطا ہوئے ہیں جو مردوں میں نہیں منجملہ ان کے ایک کمال یہ ہے کہ ان میں مدعی الوہیت (خدائی دعویدار) کوئی نہیں دوسرے ان میں مخنث کوئی نہیں۔ یہ تو جملہ معترضہ تھا اب میں حضرت رابعہ کے کلام کی توجیہ کرتا ہوں تو سنئے کہ آپ جب مجلس میں بیٹھ کر اپنے اعداء کی مذمت کرتے ہیں تو اگر کوئی چمار بھنگی بھی آپ کا دشمن ہو تو اس کی مذمت آپ مجلس میں کبھی نہ کریں گے کہ میں اس سے نہیں ڈرتا وہ میرا کیا کرسکتا ہے ہاں تھانہ دار تحصیلدار یا ڈپٹی آپ کا دشمن ہو تو اس کی مذمت بڑے زور شور سے کریں گے کہ مجھے اس کی پرواہ نہیں وہ میرا کیا کرسکتا ہے ہم ان کی جڑیں اکھاڑ دیں گے اس سے معلوم ہوا کہ گو تذکرہ کبھی عداوت ونفرت سے بھی ہوتا ہے مگر اعداء میں سے بھی انہی کا تذکرہ کیا جاتا ہے جن کی کسی قدر دل میں عظمت ہو اور جو دشمن اس شخص کی نظر میں حقیر وناچیز ہو اس کا تذکرہ نہیں کیا جاتا کیونکہ حقیر سے استغناء ظاہر کرنے میں کچھ اپنی عظمت ظاہر نہیں ہوتی بخلاف اس کے کہ آپ ڈپٹی یا تھانہ دار سے استغناء وعدم مبالات ظاہر کریں تو اس میں اپنی بڑائی کا اظہار ہوتا ہے کہ ہم ایسے ایسے لوگوں کی بھی پرواہ نہیں کرتے جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو اب حضرت رابعہؒ کے قول پر کچھ اشکال نہیں رہا ان کا مطلب یہ تھا کہ اگر دنیا واقع میں تمہارے نزدیک حقیر وناچیز ہوتی تو تم اس کی مذمت کبھی نہ کرتے تمہارا اس کی مذمت کرنا اس کی عظمت پر دلالت کرتا ہے اور محبت سے مراد یہی عظمت ہے ممکن ہے کہ یہ مضمون ان کے ذہن میں بھی نہ آیا ہو مگر کلام کی توجیہ ہوگئی اور اس تقدیر پر یہ تاویل ایسی ہوگئی۔

مرچوں کا فساد

جیسے انبیٹھ میں ایک بزرگ تھے وہ اپنے وعظ میں فرمایا کرتے تھے کہ آج کل لوگ جھوٹ بہت بولتے ہیں گناہوں سے نہیں بچتے زنا کرتے ہیں نظر بد سے احتراز نہیں کرتے پھر اخیر میں فرمایا کرتے ہیں کہ یہ سب فساد مرچوں کا ہے میں نے اس کی یوں توجیہ کی کہ مرچوں سے کھانا لذیذ ہو جاتا ہے تو بہت کھایا جاتا ہے اور بہت کھانے سے قوئ بہیمیہ کو ترقی ہوتی ہے اس لئے گناہ زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ گناہ کا سبب قوئ بہیمیہ کا اشتداد اور قوئ ملکیہ کا

ضعف ہی ہے پھر میں یہ بھی کہہ دیا کرتا ہوں کہ یہ مضمون چاہے متکلم کے ذہن میں بھی نہ ہو جیسے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ متنبی کے بعض اشعار کا مطلب بیان کر کے فرمایا تھا کہ شعر کا مطلب تو یہی ہے چاہے خود متنبی نے بھی نہ سمجھا ہو اور وہ شعر یہ ہے۔

ولا فضل فیھا للشجاعۃ والندی وصبر الفتیٰ لولا لقاء شعوب

جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اگر موت نہ آیا کرتی تو دنیا میں شجاعت اور سخاوت اور ثبات و استقلال کی کچھ بھی فضیلت نہ ہوتی اس کی توجیہ عام شراح نے تو یہ کی ہے کہ انسان سخاوت سے اسی لئے رکتا ہے کہ اگر مال خرچ ہو گیا تو میں بھوکا مروں گا شجاعت و مقاتلہ سے اس لئے خوف ہوتا ہے کہ کہیں ہم مر نہ جائیں پس اگر موت نہ ہوتی تو ان اوصاف میں کچھ بھی فضیلت نہ ہوتی اس وقت تو ہر شخص شجاعت و سخاوت کے اختیار کرنے پر دلیر ہو جاتا کیونکہ موت سے تو بے فکری ہی ہوتی۔

بڑوں کی موت میں حکمت

مگر حضرت استاد علیہ الرحمۃ نے اس کا مطلب عجیب بیان فرمایا کہ اگر موت نہ ہوتی تو آج پہلے زمانہ کے اسخیاء حاتم وغیرہ اور پہلے زمانہ کے اتقیاء حضرات انبیاء علیہم السلام و صحابہ وغیرہ اور پہلے زمانہ کے بہادر حضرت خالدؓ بن ولید اور رستم وغیرہ سب موجود ہوتے پھر ان کے ہوتے ہوئے ہماری سخاوت و شجاعت و استقلال کی کیا خاک قدر ہوتی کچھ بھی نہیں اس وقت جو ہمارے کمالات کی قدر ہے وہ موت ہی کی برکت سے ہے کہ پہلے زمانہ کے اہل کمال اس وقت مفقود ہیں پس شعر کا حاصل یہ ہوا کہ کبرنی موت الکبراء بڑوں کی موت نے ہمیں بڑا بنا دیا ہے پھر فرمایا کہ مطلب تو یہی ہے چاہے متنبی نے بھی نہ سمجھا ہو واقعی اس وقت یہ شعر ایک علمی پاکیزہ مضمون پر مشتمل ہو گیا وھو کما قال ابو حنیفۃ فی جواب من مدحہ واثنیٰ علیہ (اور ایسا ہے جیسا کہ ابوحنیفہ نے اس شخص کے جواب میں فرمایا ہے جس نے آپ کی تعریف اور ثناء کی ہے)

خلت الدیار فسدت غیر مسود ومن الشقاء تفردی بالسودد

(کذا فی مناقب الامام للقاری ۱۲) (یہ شعر امام اعظم کے مناقب میں جو قاری نے لکھے ہیں مذکور ہے)

بلا ضرورت گفتگو سے بچنے کی ضرورت

اور اس مطلب کے سامنے عام شراح کی توجیہ بالکل پھس پھسی ہے۔ غرض بعض دفعہ دوسرا شخص کسی کے کلام کی توجیہ ایسی عمدہ کر دیتا ہے کہ خود مصنف اور متکلم کا ذہن بھی وہاں تک نہیں پہنچتا بہر حال بزرگوں نے تو بے فائدہ باتوں سے یہاں تک احتراز کیا ہے کہ حضرت رابعہؒ بے ضرورت شیطان پر بھی لعنت نہ کرتیں اور بے ضرورت دنیا کی مذمت کو بھی پسند نہ کرتی تھیں حالانکہ بظاہر یہ دونوں کام مستحب معلوم ہوتے ہیں مگر جب ایک مستحب ہے دوسرے اہم کام میں خلل پڑتا ہو تو وہ مستحب نہیں رہا کرتا بلکہ اس سے منع کیا جاتا ہے اس سے یہ اشکال بھی رفع ہو گیا کہ پھر حضرات انبیاء علیہم السلام نے دنیا کی مذمت تفصیل کے ساتھ کیوں کی ہے جواب یہ ہے کہ وہ ضرورت تبلیغ کے لئے تھی کیونکہ امت میں طالبان و محبان دنیا بھی ہونے والے تھے ان کی تنبیہ و تعلیم کے لئے حدیث میں دنیا کی مذمت کی گئی ہے اور انبیاء کے لئے تبلیغ احکام سب سے اہم ہے اس لئے وہاں اس مذمت سے کسی اہم کام میں خلل نہ ہوتا تھا بخلاف ان صوفیوں کے جو حضرت رابعہؒ کی مجلس میں دنیا کی مذمت کر رہے تھے کہ وہاں تبلیغ کا محل نہ تھا کیونکہ وہاں تو سب کے سب عابد و زاہد ہی جمع تھے بہر حال بے ضرورت بات کو منہ سے نہ نکالنا چاہئے۔

رواۃ حدیث پر جرح

اور اگر دینی ضرورت ہو تو پھر غیبت بھی مباح ہے جیسے محدثین نے رواۃ حدیث پر جرح کی ہے۔ محدثین نے کسی کو بھی نہیں چھوڑا نہ امام بخاریؒ کو نہ ترمذی کو نہ مسلم کو نہ امام ابو حنیفہ کو نہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہم کو سب میں کچھ نہ کچھ کلام ضرور کیا ہے بس وہی حال ہے کہ ۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانہ میں

بعض کم فہم کہتے ہیں کہ محدثین سے قیامت میں غیبت کی بہت پکڑ ہوگی یہ معترضین کی غلطی ہے اگر ان کی نیت میں فساد ہوگا تو پکڑ ہوگی ورنہ ان کو اجر ہوگا کیونکہ مقصود یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث صحیحہ کی تنقیح کی جائے اسی لئے وہ راویوں کا حال بیان کرتے ہیں کہ فلاں ثقہ ہے فلاں ضعیف ہے فلاں کذاب ہے اگر اس میں ان سے خطا بھی ہوگی ہو تو وہ خطا ایسی ہے ۔

گر خطا گوئی ورا خاطی مگو　　در شود پر خوں شہید آنرا مشو

خون شہیداں راز آب اولی ترست　　ایں خطا از صد صواب اولیٰ ترست

(اگر وہ خطا بھی کرے اس کو خطا کار مت کہو اگر شہید خون سے بھر جائے تو اس کو مت دھوؤ شہیدوں کا خون پانی سے بہتر ہے اور یہ خطا سو صواب سے زیادہ اولیٰ ہے)

غیبت محرمہ

غرض دینی ضرورت سے اگر کسی کی غیبت کرے تو جائز ہے مگر ضروری ہونے کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ وہ بات محقق ہوگئی جو تم بیان کرنا چاہتے ہو اگر دینی ضرورت نہیں بلکہ محض نفسانیت ہی نفسانیت ہے تو اس صورت میں امر محقق کا بیان کرنا بھی جائز نہیں کہ یہ غیبت محرمہ ہے اور بلا تحقیق کوئی بات کہی جائے تو بہتان ہے اسی کی نسبت حق تعالیٰ فرماتے ہیں اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّالَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّناً وَّهُوَ عِنْدَاللّٰهِ عَظِيْمٌ (جبکہ تم اپنی زبان سے اس افتراء کا تذکرہ کرتے تھے اور اپنے منہ سے ایسی بات نکالتے تھے جس کی تم کو تحقیق نہ تھی اور تم اس کو معمولی اور سرسری بات سمجھتے تھے حالانکہ خدا تعالیٰ کے نزدیک وہ بہت بڑا جرم ہے) یہ مختصر آداب ہیں کسی کے متعلق کوئی بات نقل کرنے کے۔ اب دیکھ لیا جائے کہ ہم لوگ ان کی کہاں تک رعایت کرتے ہیں عوام تو عوام بخدا اہل علم اور خواص بھی بہت باتیں بے ضرورت کہتے ہیں اور ان میں زیادہ تر بے تحقیق باتیں ہوتی ہیں اگر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ہوتا تو آج کل کے اکثر ثقہ سقے ثابت ہوتے عموماً عادت یہ ہے کہ جہاں کسی سے کوئی بات سنی اور اس کو نقل کرنے لگے اور جو ان سے پوچھا جائے کہ میاں اس کی تحقیق بھی کی تو کہتے ہیں۔

تا نباشد چیزکے مردم نگویند چیزہا

(جب تک کچھ اصل ہی نہ ہو لوگ اس کا چرچا نہیں کرتے)

اجی اس کی کچھ تو اصل ہے جب تو لوگوں میں چرچا ہے میں کہتا ہوں کہ دلائل شرعیہ میں سے یہ کونسی دلیل ہے یہ حدیث ہے یا قرآن ہے یا کسی مجتہد کا فتویٰ ہے کچھ بھی نہیں بلکہ یہ قول تو نص کے معارض ہے حدیث میں ہے کفی[1] بالمرء کذبا ان یحدث ماسمع آدمی

---

[1] إتحاف السادة المتقين للزبيدي ۵: ۲۰، ۹، ۶۲۱، كنز العمال: ۸۲۹، كشف الخفاء ۲: ۳۰۷

کے جھوٹا ہونے کو یہ بات کافی ہے کہ جو بات سنے اسے نقل کردے۔ نیز قرآن میں خود یہ آیت وارد ہے اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ (جبکہ تم اپنی زبانوں سے اس افتراء کا تذکرہ کرتے تھے اور اپنے منہ سے ایسی بات نکالتے تھے جس کی تم کو تحقیق نہ تھی) جس میں بے تحقیق کئے کسی بات کے تذکرہ سے منع فرمایا ہے پھر ان نصوص کے مقابلہ میں تانہ باشد چیز کے مردم نگویند چیزہا۔ (جب تک کچھ اصل ہی نہ ہو لوگ اس کا چرچا نہیں کرتے) سے استدلال کیونکر صحیح ہوسکتا ہے پھر اس کا یہ مطلب کہاں ہے کہ آدمیوں کے تذکرہ کرنے سے تم کو اس کا بیان کرنا جائز ہوگیا بلکہ اس میں تو صرف یہ بتلایا ہے کہ جب تک کسی بات کی کچھ اصل نہیں ہوتی اس وقت تک آدمی اس پر حاشیہ نہیں چڑھاتے اور وہ بھی اکثر یہ ہے نہ کہ کلیہ رہا یہ کہ تم کو اس کا نقل کرنا جائز ہے یا نہیں اس سے اس قول میں سکوت ہے اور یہ بات بھی پہلے زمانہ میں ہوگی کہ بدوں کسی قدر اصل کے حاشیہ نہ لگاتے ہوں۔

بے پر کی اڑانا

آج کل تو واللہ یہ حالت ہے کہ بعض دفعہ بالکل بے پر کی اڑاتے ہیں متن بھی خود ہی تصنیف کرلیتے ہیں اور خود ہی اس پر حاشیہ بھی چڑھا لیتے ہیں چنانچہ میری بابت ایک دفعہ شہر میں اڑادیا کہ وہ جمعرات کے دن شاہ ولایت میں گیا تھا اور وہاں طوائفیں ناچ گا رہی تھیں مجھ کو دیکھ کر رک گئیں تو میں نے ان سے کہا بھائی تم بھی خدا کی مخلوق ہو اپنا کام کرو۔ حالانکہ میں خود مزاروں پر ہی کبھی نہیں جاتا تا بحاشیہ چہ رسید (حاشیہ کی کیا ضرورت ہے) تو اب میں کیونکر نہ کہوں کہ آج کل بے پر کی خبریں اڑاتے ہیں اور ثقات وخواص بھی ان کو نقل کرنے لگتے ہیں اس لئے میں باب روایت میں اہل علم پر بھی بہت کم اعتماد کرتا ہوں مگر یہ نہیں کہ میں سب کو کاذب سمجھتا ہوں بلکہ اس کے لئے میں نے ایک قاعدہ مقرر کر رکھا ہے وہ یہ کہ جس کی ایک روایت بھی کبھی غلط پاتا ہوں میں اس کو عملاً کذابین کی فہرست میں شمار کرلیتا ہوں جن میں بعض تو ایسے ہوتے ہیں جو عمداً جھوٹ بولتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو بے تحقیق روایت کرتے ہیں وہ عمداً تو جھوٹ نہیں بولتے بلکہ کسی سے سن کر بیان کرتے ہیں مگر تحقیق نہیں کرتے کہ راوی کیسا ہے عادل ہے یا غیر عادل اور عادل ہے تو اس کو دوسرے

سے عداوت وغیرہ تو نہیں ہے شاید اس پر کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب وہ لوگ کبھی سچ بھی بولتے ہیں تو ان کو علی الاطلاق کاذب کیسے سمجھ لیا گیا تو سنئے مراد میری یہ ہے کہ ان کو قانوناً جھوٹا سمجھتا ہوں اب چاہے جھوٹ سمجھنا یقین کے درجہ میں ہو یا احتمال کے درجہ میں کیونکہ جس بات کا صدق و کذب مشکوک ہو وہ معاملۃً کذب ہی ہے اور جو لوگ بے تحقیق باتیں نقل کرتے ہیں یقیناً وہ شک سے خالی نہیں ہوتے۔

کذب کا مدار عدم تحقیق صدق پر ہے

اسی لئے حدیث بالا کفیٰ بالمرء کذباً (آدمی کے جھوٹ کے لئے یہ ہی کافی ہے) میں کذب کا مدار تحقیق کذب پر نہیں رکھا بلکہ عدم تحقیق صدق پر رکھا ہے تو اس قانون کے اعتبار سے میرا ان کو ہر بات میں جھوٹا کہنا صحیح ہے گو واقع میں ان کی کوئی روایت صادق بھی ہو مگر واقع کی ہم کو کیا خبر ہم تو قانون پر عمل کریں گے اور ایک اسی میں کیا انحصار ہے تمام امور کا قانون شرع ہی پر مدار ہے اگر واقع پر مدار ہوا کرے تو کسی کو مومن و کافر کہنا بھی جائز نہ ہوگا کیونکہ ایمان و کفر کا مدار قلب پر ہے اور دل کی کسی کو کیا خبر بس قانون شرع کے موافق جس کو اسلام کا مدعی دیکھتے ہیں اس کو مسلمان کہتے ہیں اور جس کو افعال کفر و اقوال کفر کا مرتکب دیکھتے ہیں اسے کافر کہتے ہیں۔

الولد للفراش

اسی طرح اگر واقع پر مدار رکھا جائے اور قانون شرع کی پابندی نہ ہو تو لڑکوں کو حلالی بھی نہ کہہ سکیں گے کیونکہ واقع کی کسے خبر ہے کہ یہ لڑکا ہمارے ہی نطفہ سے ہے اور بیوی نے خیانت نہیں کی میرا یہ مطلب نہیں کہ معاذ اللہ سب عورتوں کو خائن سمجھو بلکہ مطلب یہ ہے کہ یقینی طور پر واقع کا علم دشوار ہے تو اگر اولاد کا حلالی ہونا علم واقع پر موقوف ہو تو بہت کم ایسے ہوں گے جن کو حلالی کہا جائے مگر شریعت نے اس پر مدار نہیں رکھا بلکہ قانون مقرر کر دیا ہے الولد للفراش جس کے فراش اور جس کے نکاح میں عورت ہے اولاد اسی کی ہے بس اس قانون کے موافق اکثر لڑکے حلالی ہیں اور بہت کم ایسے ہیں جن کا حرامی ہونا ثابت ہو جب

معلوم ہوگیا کہ امور کا واقع پر مدار نہیں بلکہ قانون پر مدار ہے تو اب شریعت جسے کاذب کہہ دے ہمیں جائز ہے کہ اس کو کاذب کہیں حدیث تو میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔

قانون خدا میں جھوٹا

اب ایک آیت بھی سن لیجئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں لَوْلَا جَآءُوْ عَلَیْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاِذْلَمْ یَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰئِکَ عِنْدَاللّٰهِ هُمُ الْکَاذِبُوْنَ (یہ لوگ اس واقعہ پر چار گواہ کیوں نہیں لائے تو جب وہ گواہ نہیں لائے تو حق تعالیٰ کے نزدیک یہ جھوٹے ہیں) اسی واقعہ افک میں یہ ارشاد ہے کہ یہ لوگ اس دعوے پر چار گواہ کیوں نہ لائے تو جب یہ گواہ نہیں لائے تو حق تعالیٰ کے نزدیک یہ جھوٹے ہیں شاید کسی قاضی مبارک پڑھنے والے کو شبہ ہو کہ یہ آیت تو منطق کے خلاف ہے کیونکہ ممکن ہے کہ ایک شخص نے کسی کو ارتکاب کرتے ہوئے دیکھا ہو اور اس وقت کوئی دوسرا دیکھنے والا نہ ہو تو اب یہ شخص اگر اس واقعہ کی حکایت کرے گا تو واقع میں صادق ہوگا اور جب واقع میں صادق ہے تو عنداللہ بھی صادق ہے کیونکہ حق تعالیٰ کا علم مطابق واقع کے ہے۔ حالانکہ اس آیت کی بناء پر عنداللہ وہ کاذب ہے کیونکہ چار گواہ وہ نہیں لا سکا مگر ان معقولی صاحب سے کہا جائے گا کہ تم آیت کا مطلب نہیں سمجھے یہاں عنداللہ کے معنی فی علم اللّٰہ (اللہ کے علم میں) نہیں ہیں بلکہ فی دین اللّٰہ (اللہ کے دین میں) یعنی فی قانون اللّٰہ (اللہ کے قانون میں) مراد ہے مطلب یہ ہوا کہ جو شخص دعویٰ زنا میں چار گواہ نہ پیش کر سکے تو وہ قانون خدا میں جھوٹا ہے گو واقع میں سچا ہو یعنی اس کے ساتھ معاملہ کاذب کا سا کیا جائے گا تو اس آیت سے بھی معلوم ہوا کہ کسی شخص کا گو واقع میں کاذب ہونا متحقق نہ ہو مگر وہ قانون روایت کے موافق کاذب ہو تو اسے کاذب کہنا جائز ہے خواہ وہ عنداللّٰہ بمعنی فی علم اللّٰہ وفی الواقع (عنداللہ معنی فی علم اللہ کے ہے واقع میں) صادق ہی ہو۔

عوام کا طریقہ ثبوت

رہا یہ کہ روایت کا قانون کیا ہے اور ثبوت کا طریقہ کیا ہے اس کو علماء سے پوچھو اس میں تفصیل ہے جس کی اس وقت گنجائش نہیں لیکن عوام کا طریقہ ثبوت عجیب ہے چنانچہ ایک

دفعہ چاند کی گواہی کے لئے ایک مسلمان بالغ اور ایک بچہ اور ایک بھنگی میرے پاس بھیجا گیا کہ انہوں نے چاند دیکھا ہے بس عوام کے نزدیک ان لوگوں کی گواہی ثبوت ہلال کی کافی تھی مگر یہ تو عید میں کافی تھی اور رمضان کے چاند میں اگر گاؤں کے دو چار مسلمان بھی گواہی دیں تو اس پر یوں کہتے ہیں کہ میاں دیکھو لنگوٹہ باندھنے والوں کی گواہی پر فتویٰ دے دیا۔

غرض ان کے اصول سب سے نرالے ہیں کہیں تو کافروں کی بھی گواہی قبول ہے اور کہیں دیندار مسلمانوں کی بھی قبول نہیں سو یہ طریقہ ثبوت کے لئے کافی نہیں بلکہ شرعی طریقہ سے تحقیق کرنا چاہئے اور بدوں تحقیق کے کبھی کوئی بات نہ کہنا چاہئے چونکہ آج کل سارے گناہوں میں اس کا وقوع زیادہ ہے اس لئے میں نے اس کو اختیار کیا چنانچہ آپ دیکھ لیں گے کہ ہمارے اجابی جلسے عموماً دوسروں کے تذکروں سے بھرے ہوتے ہیں اور وہ بھی برائی سے بھرے ہوتے ہیں کسی کی بھلائی تو بہت ہی کم کرتے ہیں۔

خلاف احتیاط الفاظ

اور اگر کبھی بھلائی ہی سے تذکرہ کریں گے تو اس میں بھی احتیاط نہیں کرتے مثلاً مریدین کا مجمع ہوگا اور اپنے شیخ کی یا اور کسی بزرگ کی تعریف کریں گے تو عام طور پر یوں تعریف کی جاتی ہے کہ فلاں صاحب بڑے ولی ہیں اور مقبول بارگاہ الٰہی ہیں یہ نہایت سخت بات ہے تم کو کیا خبر ہے کہ اس شخص کو خدا نے قبول کیا ہے یا نہیں؟ تو بلا تحقیق خدا پر حکم لگاتے ہو اسی طرح ولی کہتے ہیں خدا تعالیٰ کے دوست کو تمہیں کیا خبر کہ یہ شخص خدا کا دوست ہے یا نہیں؟ یہ الفاظ خلاف احتیاط ہیں ہاں درویش اور شیخ یا عارف طریق اور صالح و متقی کہنا جائز ہے کیونکہ صلاح و تقویٰ کا مدار اعمال صالحہ ہیں اس کا علم ہم کو اعمال سے ہو سکتا ہے اسی طرح شیخ اور درویش اور عارف اسے کہتے ہیں جو امراض نفس سے واقف ہو اور ان کا علاج صحیح طور پر کر سکتا ہو یہ بھی اس کے طریق تربیت کو دیکھ کر معلوم ہو سکتا ہے لیکن ولایت یا مقبولیت کا حال نہیں معلوم ہو سکتا (اس لئے جزم کے ساتھ اس کا حکم نہ لگانا چاہئے اگر ایسا ہی شوق ہو تو یوں کہے کہ میرا خیال یہ ہے کہ یہ شخص ولی یا مقبول ہے یا میں اس کو ایسا سمجھتا ہوں یہی مضمون حدیث میں مصرح ہے ۱۲) اہل ورع نے کسی کو ولی یا مقبول کہنے سے نہایت احتیاط کی ہے اور اسی اصل پر کہ قانون شرعی ظاہر پر ہے۔

بعض بزرگوں کی احتیاط

بعض بزرگوں نے یہاں تک احتیاط کی ہے کہ تقریباً پچاس ساٹھ برس کی بات ہے کہ مکہ میں جب حرم میں اسلامی فوج کے لئے دعا کی جاتی اور اللّٰھم انصر عساکر الموحدین (اے اللہ مدد کر موحدین کے لشکروں کی) کہا جاتا تو اس وقت وہاں ایک بزرگ تھے وہ اس پر آمین نہ کہتے تھے کیونکہ موحد کہتے ہیں توحید کے قائل کو خواہ رسالت کا قائل ہو یا نہ ہو وہ فرماتے تھے کہ عساکر المسلمین کہنا چاہئے اس کی بناء یہی تھی کہ جب ایک شخص توحید ظاہر کرتا ہے تو موحدین میں داخل ہے خواہ توحید اس کی بوجہ انکار رسالت کے مقبول نہ ہو اس لئے وہ اس پر آمین کہنے سے احتیاط کرتے تھے۔ تو بزرگوں نے تو بھلائی میں بھی احتیاط کی ہے کہ غیر اہل کے لئے بھلائی کی بھی درخواست نہ ہو مگر افسوس کہ ہم لوگ برائی میں بھی احتیاط نہیں کرتے اگر آپ سے بھلائی میں احتیاط نہ ہو سکے تو برائی میں تو احتیاط بہت ضروری ہے کیونکہ تعریف یا دعا میں بے احتیاطی کرنے سے تو خدا تعالیٰ کا گناہ ہوگا تو وہ توبہ واستغفار سے معاف ہوسکتا ہے اور برائی میں بے احتیاطی کرنے سے حق اللہ کے ساتھ حق العباد بھی متعلق ہوگا جو بہت سخت ہے کیونکہ یقین غالب بندہ بدوں نیکیاں لئے کب معاف کرنے لگا میں زبان کے گناہوں کی کہاں تک تفصیل کروں امام غزالی نے زبان کے متعلق بیس گناہ لکھے جس کو تفصیل کا شوق ہو احیاء العلوم دیکھ لے۔

حضرات ائمہ مجتہدین پر اعتماد کا سبب

منجملہ ان گناہوں کے ایک بحث مباحثہ بھی ہے یعنی اپنی بات غالب کرنے کے لئے گو وہ حق بھی نہ ہو یہ مرض آج کل اہل علم میں بہت ہے کہ ایک دفعہ زبان سے کوئی بات نکل جائے تو پھر اس کی پچ ہو جاتی ہے اور مناظرہ مباحثہ کی نوبت آتی ہے پھر ہم نے کبھی نہیں سنا کہ فریقین میں سے کسی نے اپنی بات سے رجوع کیا ہو حالانکہ دونوں میں سے ایک ضرور ناحق پر ہوتا ہے بعض لوگ تو یہاں تک غضب کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غلط فتویٰ قلم سے نکل گیا تو عمر بھر اسی پر جمے رہے اور اس کی تاویلیں کرتے رہے چنانچہ ایک شخص نے رضاعت کے مسئلہ میں غلطی کی اور غلط مسئلہ چھاپ دیا علماء نے اس پر گرفت کی کہ جواب غلط ہے تو مفتی صاحب نے اپنے فتویٰ کی تائید میں ایک رسالہ لکھا اور اپنے استاد کے پاس دستخط کے لئے

لے گئے تو مفتی صاحب کے استاد نے بھی کہا کہ یہ جواب تو غلط ہے میں اس پر کیونکر دستخط کردوں تو آپ کہتے ہیں کہ حضرت واقعی غلطی تو ہوگئی مگر آپ دستخط کردیں تاکہ میری بات رہ جائے استاد نے انکار کردیا اور اس مفتی کو ملامت کی کہ بعد حق واضح ہونے کے بھی تو غلطی پر جما ہوا ہے مگر اس نے ایک نہ سنی اور وہ رسالہ غلط مسئلہ کی تاویل میں شائع کر ہی دیا ان کے استاد حالانکہ معقول اور پوربی اور مسلک میں ہمارے مخالف ہیں مگر ان کی طبیعت میں انصاف ہے ایک بار ایک شخص ان کے پاس ایک سوال لایا کہ اس پر جواب لکھ دیجئے کہنے لگے میں تو فتویٰ لکھتا نہیں کسی دوسری جگہ لکھوالو لیکن اگر ایمان کا مسئلہ پوچھنا چاہو تو گنگوہ تھانہ بھون سے منگاؤ اور بے ایمانی کا فتویٰ چاہو تو یہاں کے مولویوں سے پوچھ لو اور بے ایمانی فتویٰ میں یہی ہے کہ مفتی کو اپنی بات کی پچ ہو ایسے شخص کے فتوے پر کچھ اعتماد نہیں قابل اعتماد وہ شخص ہے جو ایک بچہ کے کہنے سے بھی اپنی رائے کو چھوڑ دے اگر وہ بچہ حق پر ہو۔

حضرات ائمہ مجتہدین پر جو امت کو اعتماد ہے وہ اسی لئے ہے کہ ان کو بات کی پچ نہ تھی وہ ہر وقت اپنی رائے سے رجوع کرنے کو تیار تھے جب بھی ان کو اپنی رائے کا غلط ہونا واضح ہو جائے چنانچہ امام ابوحنیفہؒ نے بہت سے مسائل میں رجوع کیا ہے (ایسے ہی امام مالک نے اور امام شافعی کا تو مذہب ہی مصر جا کر بدل گیا اسی لئے قریب ہر مسئلہ میں ان کے دو قول ہوتے ہیں جدید و قدیم کما ہو معلوم ۱۲) اور یہ مرض بات کی پچ کرنے کا تواضع سے زائل ہوتا ہے۔

تواضع حاصل کرنے کا طریقہ

اور تواضع محض کتابیں پڑھنے سے نہیں حاصل ہوتی بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس کو مولانا فرماتے ہیں۔

قال را بگذار و مرد حال شو　　　پیش مردے کاملے پامال شو

یعنی تواضع حال سے پیدا ہوتی ہے اور حال کسی کامل کی جوتیاں سیدھی کرنے سے حاصل ہوتا ہے پس تواضع حاصل کرو اور اپنی بات غالب کرنے کے لئے مباحثہ کبھی نہ کرو ایک گناہ زبان کے متعلق یہ ہے کہ کسی کو کوسا جائے یا کسی کو طعنہ دیا جائے یا اس کے عیب کو جتلایا جائے میں سب کی تفصیل کہاں تک بیان کروں بس۔

عامی کے لئے دستور العمل

آسان طریقہ یہ ہے کہ جو بات زبان سے نکالو اول اس کے متعلق فتویٰ لو اگر جواب یہ آئے کہ جائز نہیں تو مت کہو عامی کو تو زیادہ تر تردد ہی ہوگا اس کو چاہئے کہ تردد کی حالت میں رک جائے پھر پوچھ کر کہے اس میں دو نفع ہوں گے اول تو علوم بڑھیں گے دوسرے آسانی کے ساتھ زبان کے گناہ چھوٹ جائیں گے۔

گناہ کا اثر

یہ تدبیر تو صدور کے قبل ہے اور اگر اتفاق سے کوئی گناہ زبان سے صادر ہو گیا ہو تو اس کے تدارک میں غفلت نہ کرو اگر غفلت کی تو حدیث میں آیا ہے کہ ایک گناہ سے دل پر سیاہ داغ پیدا ہو جاتا ہے پھر اگر توبہ کر لی تو وہ مٹ جاتا ہے ورنہ بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ تمام دل سیاہ ہو جاتا ہے پھر ایسی بے حیائی بڑھ جاتی ہے کہ توبہ کی توفیق بھی نہیں ہوتی اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (ہرگز ایسا نہیں بلکہ (اصل وجہ ان کے تکذیب کی یہ ہے) کہ ان کے دلوں پر اعمال بد کا زنگ بیٹھ گیا ہے) اور مولانا فرماتے ہیں۔

ہر گناہ زنگے ست بر مرآة دل ‏ ‏ ‏ ‏ دل شود زیں زنگ ہا خوار و خجل

چوں زیادت گشت دل را تیرگی ‏ ‏ ‏ ‏ نفس دوں را بیش گردد خیرگی

(ہر گناہ دل کے آئینہ پر ایک زنگ ہے کہ اس زنگ کی وجہ سے دل ذلیل و شرمندہ ہے جب گناہوں کی دل پر سیاہی زیادہ ہو جاتی ہے تو نفس کمینہ میں خیرگی زیادہ ہو جاتی ہے۔

توبہ کی فضیلت

اس لئے اگر گناہ صادر ہو جائے تو غفلت نہ کرنا چاہئے فوراً توبہ کرو اور توبہ بھی اس قاعدہ سے کرو جو حدیث میں آیا ہے کہ اول دو رکعت نماز توبہ کی نیت سے پڑھو اس کے بعد توبہ کرے اس میں یہ مصلحت تو ظاہر ہی ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ نیکیاں گناہوں کو زائل کرتی ہیں دوسرا فائدہ یہ بھی ظاہر ہے کہ نماز کے بعد توبہ کرنے میں دل حاضر ہوگا اور قبول توبہ کیلئے حضور قلب نہایت ضروری ہے کیونکہ حدیث میں آیا اَنَّ اللّٰهَ لَا يقبل

---

[۱] الصحیح لمسلم ، المقدمہ باب:۳، رقم:۵ ، المصنف لابن أبی شیبة ۸:۴۰۸ ، مشکوة المصابیح:۱۵٦ ، شرح السنة للبغوی ۱۲:۳٦۲

الدعاء من قلب لاہ اللہ تعالیٰ غافل دل سے دعا قبول نہیں فرماتے تیسرا فائدہ عقلی یہ ہے
کہ اس طرح توبہ کرنے سے نفس گناہوں سے گھبرا جائے گا کیونکہ نفس کو نماز بہت شاق ہے
روزہ اتنا شاق نہیں چنانچہ اب رمضان قریب آ رہا ہے روزہ رکھنے والے تو بہت نظر آئیں
گے تراویح پڑھنے والے بہت کم ملیں گے کانپور میں ایک شخص تراویح پڑھ کر مسجد سے نکلا
تو کہنے لگا کہ تراویح کیا ہے قرنطینہ ہے اس لئے آج کل کے نئے حکماء عقلاء نے یہ ترکیب
نکالی ہے کہ امام جب تراویح کے لئے اللہ اکبر کہتا ہے اس وقت نماز میں شریک نہیں ہوتے
بلکہ بیٹھے رہتے یا لیٹے رہتے ہیں جب وہ رکوع میں جانے لگتا ہے اس وقت جلدی سے آ کر
شریک ہو جاتے ہیں پھر دوسری رکعت میں تو مجبوراً بندھے ہوئے کھڑے رہتے ہیں اگر ان
کے اختیار میں نماز ہوتی تو شاید دوسری رکعت میں بھی لیٹ جایا کرتے مگر اس طرح کرنے
سے نماز فاسد ہو جاتی ہے اس لئے مجبور ہیں غرض نماز نفس پر بہت گراں ہے تو جب ہر گناہ
کے بعد دو رکعت پڑھنا اپنے ذمہ لازم کر لو گے تو نفس گناہوں سے گھبرا جائے گا کہ یہ کہاں
کی علت سر لگی بلکہ شیطان بھی گناہ کرانا چھوڑ دے گا کیونکہ وہ دیکھے گا کہ میں اس سے دس
گناہ کراؤں گا تو یہ بیس رکعتیں پڑھے گا گناہ تو توبہ سے معاف ہو جائے گا اور یہ بیس رکعتیں
اس کے پاس نفع میں رہیں گی اس لئے وہ گناہ کرانا ہی چھوڑ دے گا کیونکہ وہ نقصان کے لئے
گناہ کراتا تھا جب گناہ میں بھی نفع ہونے لگا تو وہ ایسا بیوقوف نہیں کہ آپ کا نفع کرائے وہ
گناہوں کا خطرہ ڈالنا ہی چھوڑ دے گا تاکہ تم اتنی رکعتیں نہ پڑھ سکو۔

تفقہ بھی عجیب چیز ہے

اس پر مجھے امام صاحبؒ کا لطیفہ یاد آیا کہ آپ کے پاس ایک شخص آیا کہ میں نے گھر
میں روپیہ دفن کیا تھا مگر اب یہ موقعہ یاد نہیں آتا بہت پریشان ہوں سارے گھر کو کھودوں تو
اس میں مشقت ہے کوئی تدبیر بتلایئے کہ موقعہ یاد آ جائے امام صاحب نے اول تو انکار کیا
کہ بھائی یہ تو کوئی شرعی مسئلہ نہیں جس کا میں جواب دوں مگر اس شخص نے اصرار کیا تو آپ
نے فرمایا کہ آج رات کو یہ نیت کر لو کہ جب تک یاد نہ آئے گا اس وقت تک نفلیں ہی پڑھتا
رہوں گا چاہے صبح ہی کیوں نہ ہو جائے ان شاء اللہ یاد آ جائے گا چنانچہ اس نے اسی نیت
سے نماز شروع کی دوسری ہی رکعت میں موقعہ یاد آ گیا اور جلدی سے سلام پھیر کر روپیہ نکال

لیا صبح کو امام صاحب سے واقعہ بیان کیا کہ حضرت مجھے تو دوسری ہی رکعت میں یاد آ گیا کچھ زیادہ نفلیں بھی نہیں پڑھنا پڑیں فرمایا یہ شیطان نے بھلایا تھا یہ اس کو کب گوارا تھا کہ تم رات بھر نماز پڑھو اس لئے اس نے جلدی ہی یاد دلا دیا مگر تم کو چاہئے تھا کہ اس کے بعد بطور شکر یہ کے اور شیطان کو ذلیل کرنے کے لئے تمام رات نماز پڑھتے رہتے اور جو سہو طبعی ہو اس کا یہ علاج نہیں واقعی تفقہ بھی عجیب چیز ہے کسی کا بڑا پاکیزہ شعر ہے۔ 1

فان فقیها واحدا متورعا　　　اشد علی الشیطان من الف عابد

(ایک پرہیزگار عالم شیطان پر ہزاروں عابدوں سے زیادہ سخت ہے)

نماز اور بیت الخلاء میں ہجوم وساوس

شیطان کی چالوں کو عارفین خوب سمجھتے ہیں امام صاحب نے خوب سمجھا کہ یہ جو دفن کر کے بھول گیا ہے اس کو شیطان نے بھلایا ہے وہ اس کو پریشان کرنا چاہتا ہے اس لئے آپ نے ایسی تدبیر بتلائی جس سے شیطان جلدی سے بتلا دے کیونکہ اس کو نماز گوارا نہیں اسی لئے یہ نماز میں وساوس بہت زیادہ ڈالتا ہے دنیا بھر کی باتیں نماز ہی میں یاد دلاتا ہے واللہ بڑی شرم آتی ہے کہ دو جگہ بہت وساوس آتے ہیں ایک بیت الخلاء میں دوسرے نماز میں، بیت الخلاء شعراء کے لئے بہت مناسب جگہ ہے وہاں بیٹھ کر مضامین خوب ذہن میں آتے ہیں شاعروں کے لئے بیت الخلاء فرحت خانہ ہے جیسا کبھی ظالموں کے لئے جیل خانہ بھی ہو جاتا ہے چنانچہ ریل میں ایک عہدہ دار شخص نہایت بدخلق بدزبان سفر کر رہا تھا کئی آدمیوں کی جگہ گھیر رکھی تھی مسافروں کو اس سے بہت تکلیف تھی بے چارے کھڑے کھڑے جا رہے تھے کسی کو جگہ نہ دیتا تھا اتفاق سے اس کو بیت الخلاء جانے کی حاجت ہوئی جب اس نے اندر کی چٹخنی لگائی تو نہ معلوم کس طرح سے لگ گئی کہ پھر کھل نہ سکی اب آپ اندر قید ہو گئے جب نکلنے لگا تو کواڑ نہ کھل سکا اول تو زور لگاتا رہا مگر جب دیر ہو گئی تو مسافروں کی خوشامد کرنے لگا لوگوں نے کہا بس تمہاری یہی سزا ہے کہ اندر بند رہو تم لوگوں کو بہت تنگ کر رہے تھے غیب سے تم کو قید کیا گیا ہے آخر کار غریب نے منت سماجت کی کہ اب کسی کو کچھ نہ کہوں گا جب خوب پختہ عہد لے لیا تب کواڑ کھولا اس کے بعد بے چارہ شرمندہ ہو کر تختہ کے ایک کنارہ پر خاموش بیٹھ گیا۔

غرض ہم کو ایک تو پاخانہ میں بہت وساوس آتے ہیں اور ایک نماز میں اور اس کا ایک راز ہے ورنہ ظاہر میں تو اس حالت سے سخت افسوس ہوتا ہے کہ ہماری حالت نماز میں وہ ہے جو بیت الخلاء میں ہوتی ہے مگر راز معلوم کرنے کے بعد زیادہ وحشت نہ رہے گی گو حالت وہ بھی اچھی نہیں راز یہ ہے کہ وساوس اس کام میں آیا کرتے ہیں جس کے کرنے میں سوچ اور فکر کی ضرورت نہ ہو دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ جس کام کی خوب مشق ہو کیونکہ مشق کے بعد وہ کام تو خود بخود ہوتا رہے گا قلب کو ادھر متوجہ ہونے کی ضرورت نہ ہوگی اب لامحالہ وہ کسی دوسری طرف متوجہ ہوگا تو ہم کو جیسے پاخانہ کی مشق ہے کچھ سوچنا نہیں پڑتا ایسی ہی نماز کی مشق ہے جس میں کچھ سوچنا نہیں پڑتا بلکہ جہاں تکبیر کہی فوراً گھڑی کی سوئی کی طرح زبان چلنے لگی گویا تکبیر کہنا کوک بھرنا ہے اس کے بعد گھڑی خود چلتی رہے گی اسی لئے اکثر لوگ ہر نماز میں وہی چار سورتیں ہمیشہ پڑھتے ہیں کیونکہ وہ زبان پر چڑھی ہوئی ہیں جو قل ھو اللہ ، انا اعطینا ، لایلف والعصر ہی کے اندر اندر محدود ہیں اور یہ اس لئے تجویز کی ہیں کہ ان سے چھوٹی اور کوئی نہیں اگر کوئی سورت ان سے بھی چھوٹی ہوتی تو اسی کو تجویز کرتے چنانچہ ایک شخص ہر نماز میں صرف قل ہو اللہ پڑھا کرتا تھا کسی نے اس کا سبب پوچھا کہ ہر نماز میں قل ہو اللہ ہی کیوں پڑھتے ہو کہنے لگا اس لئے کہ اس سے چھوٹی کوئی سورت نہیں ورنہ اسے پڑھتا غرض نماز میں سب کام بے سوچے ہوتے ہیں اس وجہ سے نماز میں وسوسے زیادہ آتے ہیں۔

وساوس نماز کا علاج

اگر نماز کو بے فکری اور مشق سے نہ پڑھا جائے بلکہ ہر لفظ کو توجہ اور ارادہ سے نکالا جائے تو پھر وسوسے بہت کم آئیں بلکہ چند روز میں آنا ہی بند ہو جائیں۔ البتہ اس طریق میں گرانی ضرور ہے وجہ یہ کہ توجہ اور فکر سے کام کرنا نفس پر گراں ہوتا ہے اس لئے ایسی نماز بہت گراں ہے لیکن اگر اس ثقل کو دور کرنا چاہو تو اس کے متعلق سلوک قرآن سے سیکھو حق تعالیٰ فرماتے ہیں اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ نماز واقعی گراں ہے مگر خاشعین پر گراں نہیں خشوع کے معنی ہیں قلب کا یکسو ہونا سو ظاہر ہے کہ جس شخص کو یکسوئی قلب حاصل

ہوگی اسے نماز گراں نہ ہوگی کیونکہ گرانی کا منشاء تو یہی ہے کہ نفس آزاد رہنا چاہتا ہے اور نماز میں بہت پابندی ہے تو جس کا قلب پہلے سے پابندی اور یکسوئی کا عادی ہو اس پر گرانی نہ ہوگی۔

خشوع حاصل کرنے کا طریقہ

اب یہ سوال رہا کہ خشوع کیونکر حاصل ہو اس کا طریقہ بھی حق تعالیٰ نے اسی جگہ بتلایا ہے اَلَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ (جن لوگوں کو اس بات کا یقین ہے کہ وہ اپنے رب سے ملیں گے اور بلاشک وہ اس کی طرف لوٹنے والے ہیں) جس کا حاصل یہ ہے کہ لقاء رب کا اعتقاد حاصل کرو اس سے خشوع پیدا ہوگا مگر اعتقاد سے مراد یہ ہے کہ ہر وقت اس کا استحضار رکھو جب ہر وقت اس کا استحضار رہے گا تو قلب میں دوسرے خیالات کم آئیں گے کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ نفس ایک وقت میں دو باتوں کی طرف متوجہ نہیں ہوسکتا اور یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ کسی بات کی طرف بھی متوجہ نہ ہو اس لئے نفس کو ایسے خیال میں مشغول کرو جو نماز کے مناسب ہو منافی نہ ہو اور وہ یہی خیال ہے لقاء رب (اللہ کے ملنے) کا کیونکہ نماز میں بھی حق تعالیٰ کے سامنے حاضری ہوتی ہے تو جس کے دل میں یہ خیال جما ہوا ہوگا اس کو نماز گراں نہ ہوگی مگر ظاہر ہے کہ ایسے لوگ کم ہیں زیادہ حالت تو یہی ہے کہ لوگوں پر نماز گراں ہے خصوصاً نفل نماز کہ یہ تو فرض سے بھی زیادہ گراں ہے چنانچہ مجھے خود اپنا واقعہ یاد ہے کہ پہلے تو بہت نفلیں پڑھا کرتا تھا مگر جب سے منیۃ المصلی میں یہ پڑھا کہ نفل و مستحب کے معنی یہ ہیں کہ کرو تو ثواب ہے اور نہ کرو تو گناہ نہیں اس دن سے نفلیں کم ہوگئیں اب اگر ہر گناہ کے بعد دو رکعت نفل لازم کرلو گے تو بوجہ مؤنت نفل (نفل کی مشقت) کے نفس گناہ سے ایسا گھبرائے گا۔

ایک معقولی طالب علم کی حکایت

جیسا ایک معقولی طالب علم فرض نماز سے گھبراتا تھا یہ طالب علم مدرسہ دیوبند میں نیا نیا آیا تھا یہاں جو نماز کی پابندی دیکھی کہنے لگا کہ ہم نے تو یہ سنا تھا کہ نماز اول اول پچاس وقت کی شروع ہوئی تھی پھر بعد میں پانچ وقت کی رہ گئی مگر دیوبند کے مدرسہ میں تو پورے پچاس ہی وقت کی فرض ہے بس جہاں نماز پڑھ کے آئے تھوڑی دیر میں پھر تقاضا ہے کہ چلو نماز کو تو جیسے وہ نماز سے گھبراتا تھا ایسے ہی آپ گناہ سے گھبرا جائیں گے کہ یہ کہاں کی مصیبت سر پر پڑی کہ ہر

گناہ کے بعد دو رکعت پڑھ لیجئے میں آپ کو ایسا شیخ بتلاتا ہوں جو بہت جلد گناہوں کو چھوڑا دے گا جہاں تم نے اللہ اکبر کہا اور وہ شیخ حاضر ہو گیا نماز کا ناہی عن المنکر (برائیوں سے روکنے والی) ہونا اگرچہ بہت طریقہ سے ہے مگر اس طور سے بھی نماز ناہی عن المنکر (برائیوں سے روکنے والی) ہو جائے گی کہ تم ہر گناہ کے بعد دو رکعت لازم کر لو۔

گناہ سے بچنے کا آسان طریقہ

لیجئے میں نے ایسی بات بتلائی ہے جس میں نہ مجاہدہ ہے نہ کچھ مشقت ہے ایسا نسخہ ہے جس کو سب استعمال کر سکتے ہیں مگر بعض کا نفس بڑا شریر ہوتا ہے دو رکعت سے اس کو زجر نہ ہوگا سو اگر کسی کو دو رکعت کافی نہ ہوں تو وہ ہر گناہ کے بعد چار پڑھا کرے چار بھی کافی نہ ہوں تو آٹھ پڑھا کرو جیسے ایک حکیم صاحب کی حکایت ہے کہ وہ گاؤں میں گئے تو ایک دیہاتی کو دیکھا کہ وہ چنے کی چار روٹیاں موٹی موٹی کھا کے اوپر سے چھاچھ کا پورا لنبا پی گیا حکیم صاحب نے کہا ارے چھاچھ کو درمیان میں پیا کرتے ہیں اخیر میں نہیں پیا کرتے۔ دیہاتی نے اپنے لڑکے کو آواز دی ارے فلانے چار روٹ اور لا دے آ ۱۲ منہ) اس چھاچھ کو بیچ میں کر لوں چنانچہ چار روٹ اوپر سے اور کھا گیا حکیم نے کہا بھائی تیرے واسطے کچھ قاعدہ نہیں تو چاہے بیچ میں چاہے اخیر میں بتلایئے ایسے قوی المعدہ کو اگر کوئی مسہل دینا چاہے تو چھ ماشہ سنا کیا کافی ہوگی اس کو تو دو تولہ سنا دینا چاہئے ایسے ہی ہمارے نفس کو دو رکعت کہاں کافی مگر میں اس وقت یہ کہتا ہوں کہ آپ دو ہی رکعت پڑھنا شروع کیجئے ان شاء اللہ اس سے بھی گناہ چھوٹ جائیں گے ورنہ کم تو ہو ہی جائیں گے بتلایئے کتنا آسان نسخہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں ایسی ہیں کہ ان کو استعمال کر کے دیکھو خود ان کی قدر جان لو گے اتنی تفصیل تو میں نے بیان کی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو صرف اتنا فرمایا ہے کہ گناہ کر کے توبہ کرنا چاہو تو دو رکعت پہلے پڑھو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے منافع کی تفصیل نہیں بتلائی۔ کیونکہ جہاں شک ہو وہاں تفصیل بیان کیا کرتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پورا اعتماد تھا کہ عمل کر کے اس کا نفع لوگ خود ہی دیکھ لیں گے اس لئے تفصیل نہیں بتلائی اور میں نے جو تفصیل بھی کی ہے تو کیا کی ہے نام ہی ہو گیا تفصیل کا ورنہ پوری تفصیل ایسی چیز کی کون کر سکتا ہے جس کے حسن کی یہ شان ہو۔

نہ جنبش غایتے دارد نہ سعدیؒ راسخن پایاں   بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

(نہ ان کے حسن کی کوئی انتہا ہے نہ سعدیؒ کے کلام کی کوئی انتہا ہے جیسے جلندھر والا پیاسا مر جاتا ہے اور دریا باقی رہ جاتا ہے ایسے ہی محبوب حقیقی کا بیان باقی رہ گیا)

اور یہ شان ہو ۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم — کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

(سر سے قدم تک جس جگہ دیکھتا ہوں کرشمہ دامن دل کو کھینچتا ہے کہ یہی جگہ ہے)

اور یہ شان ہو ۔

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار — گلچیں بہار توز داماں گلہ دارد

(نگاہ کا دامن تنگ ہے اور تیرے حسن کے پھول بہت ہیں تیری بہار کا پھول چننے والا تنگی دامن کا شاکی ہے)

اسی لئے جن پر کچھ اسرار منکشف ہو جاتے ہیں وہ یوں کہنے لگتے ہیں ۔

قلم بشکن سیاہی ریز و کاغذ سوز دم درکش — حسن ایں قصہ عشق ست در دفتر نمی گنجد

(قلم توڑ روشنائی بکھیر کاغذ کو جلا اور خاموش رہ حسن یہ عشق کا قصہ ہے جو دفتر میں نہیں سما سکتا)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن و جمال

صاحبو! اگر کوئی حسین ایسا ہو جو قدرتی حسین نہ ہو بناؤ سنگھار سے حسین ہو گیا اس کے حسن کی تفصیل تو ہم بیان کر سکتے ہیں مگر جو شخص قدرتی حسین ہو اس کے حسن کی تفصیل نہیں بیان ہو سکتی بلکہ وہاں تفصیل کرنا تو لقد تحجرت واسعاً کا مصداق ہے قدرتی حسین کی تو شان یہ ہوتی ہے ۔

یزیدک وجھہ حسناً — اذا ما زدتہ نظراً

(اس محبوب کے چہرہ پر جس قدر زیادہ نظر کرو گے اسی قدر اس کے چہرہ پر حسن زیادہ معلوم ہوگا)

کہ جوں جوں نظر کرو اسی قدر حسن بڑھتا جاتا ہے پھر بناوٹی حسینوں کی خوبیاں بیان کر کے جب قدرتی حسین کا حال کوئی پوچھے گا تو یوں کہا جائے گا ۔

دلفریباں نباتی ہمہ زیور بستند — دلبر ماست کہ حسن خدا داد آمد

زیر بارند درختاں کہ ثمرہا دارند — اے خوشا سرو کہ از بند غم آزاد آمد

(دل فریبان نباتی زیور متعارف سے مزین ہیں ہمارے محبوب میں حسن خدا داد ہے
پھل دار درخت زیر بار ہیں سرو بہت اچھا ہے ہرغم سے آزاد ہے)

حضرت زلیخا نے جب زنان مصر کی باتیں سنیں کہ وہ ان کو عشق یوسف میں ملامت کرتی ہیں تو آپ نے ان کے سامنے یوسف علیہ السلام کا سراپا بیان نہیں کیا کیونکہ اس سے حجت قائم نہ ہوتی بلکہ یہ کیا کہ اول عورتوں کو دعوت دی اور یوسف علیہ السلام کو اندر رکھا جب وہ سب چاقو ہاتھ میں لے کر امرود و نارنگی وغیرہ کاٹنے میں مشغول ہوئیں اس وقت یوسف علیہ السلام سے کہا اُخْرُجْ عَلَيْهِنَّ باہر آجاؤ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ عورتوں کی ان پر نظر پڑی تو مبہوت ہوگئیں اور بجائے امرود وغیرہ کے اپنے ہاتھ کاٹ لئے اب زلیخا کی حجت تمام ہوئی اور فرمایا کہ دیکھ لو یہی ہے جس کے عشق پر تم ملامت کرتی تھیں اس مقام پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا عجیب شعر ہے فرماتی ہیں۔

لواحِی زلیخا لو ارین جبینه　　　لا ثرن بالقطع القلوب علی الایدی

یعنی اگر وہ عورتیں ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ دیکھ لیتیں تو بجائے ہاتھ کے اپنے دل وجگر کو پھاڑ ڈالتیں۔

شریعت کا حسن بناوٹی نہیں

اسی طرح شریعت کا حسن بناوٹی نہیں ہے بلکہ اس میں قدرتی حسن ہے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کے اسرار پوری طرح بیان میں نہیں آسکتے بس جس کو اسرار معلوم کرنے ہوں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر عمل کر کے دیکھے کیونکہ علم اسرار کے لئے نور قلب کی ضرورت ہے اور نور کے لئے عمل کی ضرورت ہے جب تم عمل کرو گے تو پھر یہ حال ہوگا۔

بینی اندر خود علوم انبیا　　　بے کتاب و بے معید و اوستا

(اپنے اندر بے کتاب اور بغیر معین و استاد کے انبیاء جیسے علوم پاؤ گے)

عمل کے بعد یہ علوم و اسرار خود اپنے اندر پاؤ گے کر کے دیکھو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کے اقوال میں کیا کیا حکمتیں ہیں جب تم ہر گناہ کے بعد دو رکعت پڑھنے کا التزام کرو گے اور اس کا نفع دیکھو گے اس وقت کہو گے کہ واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسی مفت دولت سے گناہ جیسی سنگین بیماری کا علاج فرمایا ہے بس اب زیادہ تفصیل کا وقت نہیں رہا میں اس قاعدہ کلیہ کو پھر دوہراتا ہوں جو درمیان میں بیان کیا تھا۔

زبان کے گناہوں سے بچنے کا طریقہ

اور اسی پر ختم کرتا ہوں وہ یہ کہ زبان کے گناہوں سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ بات سے پہلے سوچ لیا کرو بے سوچے بات نہ کیا کرو اور اگر غلطی سے گناہ ہو جائے تو فوراً دو رکعت نماز پڑھ لیا کرو اور یہ علاج کوئی زبان ہی کے گناہوں کے ساتھ خاص نہیں بلکہ تمام گناہوں کا علاج ہے اب میں یہ چاہتا ہوں کہ جہاں میں نے زبان کے گناہوں کو بیان کیا ہے وہاں کچھ مختصر طور پر عبادات لسان کو بھی بیان کردوں تاکہ علاج مکمل ہو جائے کیونکہ پرہیز کے ساتھ کوئی غذا ایسی بھی تو بتلانا چاہئے تو زبان کے گناہوں سے پرہیز کرنے کے ساتھ آپ کو چاہئے کہ زبان کو عبادت میں مشغول کریں جس کی دو قسمیں ہیں ایک عبادت لازمی جس کا اثر اور نفع اپنی ہی ذات تک رہتا ہے دوسرے عبادت متعدی جس کا اثر و نفع دوسروں کو بھی پہنچتا ہے زبان کی عبادت لازمی تو یہ ہے کہ اکثر اوقات اس کو ذکر اللہ اور تلاوت قرآن میں مشغول رکھو جس کو جو آسان ہو اور عبادت متعدی یہ ہے کہ دوسروں کو نیک کام کی نصیحت کیا کرو اگر کہیں کوئی دین کا کام ہو رہا ہو۔

لقاء مدارس دینیہ کی ہمہ وقت ضرورت

تو لوگوں کو اس میں شرکت و امداد کی ترغیب دیا کرو اس عبادت میں اس وقت میں بھی شرکت کرنا چاہتا ہوں اور آپ کو ایک نیک کام کی ترغیب دیتا ہوں وہ یہ کہ اس مدرسہ کے حالات آپ سن چکے ہیں یہاں دین کا کیسا بڑا کام ہو رہا ہے تو آپ کو مدرسہ کی امداد کرنا چاہئے اور اس کی ترقی کی طرف توجہ کرنا چاہئے ہماری حالت یہ ہے کہ جس کام کی طرف توجہ کرتے ہیں اس پر ایسا گرتے ہیں کہ دوسرے کاموں کو برباد کر دیتے ہیں پچھلے دنوں چندہ بلقان کی ضرورت تھی اور مقام شکر ہے کہ مسلمانوں نے اس پر توجہ کی مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہوا کہ دوسرے ضروری کاموں سے توجہ کم ہو گئی چنانچہ مدارس کی آمدنی میں بہت کمی ہو گئی یہاں تک کہ بعض مدارس تو

ٹوٹنے کے قریب ہوگئے اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ مسلمانوں میں جوش تو ہے ہوش نہیں ہے ہوش کے معنی یہ ہیں کہ وقتی ضرورت کے ساتھ دائمی ضرورتوں کا بھی لحاظ رہے۔ صاحب اگر مدارس نہ رہے تو پھر بتلائیے دینی ضرورتوں کا بتلانے والا آپ کو کہاں سے ملے گا بس پھر تو وہ حالت ہوگی جیسے ایک صاحب بلقان کا چندہ تو کرتے پھرتے تھے مگر بے ٹکٹ ریل میں سفر کرتے تھے اسی طرح چندہ بلقان میں بعض لوگوں نے بہت بے عنوانیاں کی ہیں جن کی تفصیل میں زیادہ نہیں کرنا چاہتا اگر مدارس نہ ہوئے تو بس ایسے ہی لوگ آپ کے مقتداء ہوں گے اس لئے ضرورت ہے کہ مدارس کی بقاء میں ہر دم توجہ رکھی جائے اور وقتی ضرورتوں کی وجہ سے اس کام میں بے توجہی نہ کی جائے افسوس غیر اقوام اس مسئلہ کو خوب سمجھتی ہیں یورپ کا قاعدہ ہے کہ وہ اپنے مشن اور اسکولوں کی امداد تو خاص رقموں سے کرتے ہیں اور وقتی ضرورتوں کے لئے یہ تدبیر کرتے ہیں کہ ہر شخص اپنے زائد اخراجات میں سے ایک خرچ کو بند کر کے اس کی آمدنی چندہ میں دے دیتا ہے پھر یہ نہیں کہ ایک دفعہ دے کر بند کر دے بلکہ جب تک وہ ضرورت رہے گی برابر اس فضول مد کی آمدنی چندہ میں دیتے رہیں گے مگر ہماری یہ حالت ہے کہ جو کام فوری جوش سے ہے وہ دو چار مہینہ کے بعد جوش کم ہوگیا تو کچھ بھی نہیں اور اس جوش میں ایسے بے ہوش ہوتے ہیں کہ پہلے سے جن کاموں میں امداد کرتے تھے اس کو بند کر دیتے ہیں سو یاد رکھو اس طرح کوئی کام بھی پورا نہیں ہوسکتا ہر کام کے لئے استقلال کی وحفظ حدود کی ضرورت ہے یہ مضمون وعظ کے اول میں تو ذہن میں تھا پھر وسط میں اس کا خیال نہ رہا اس لئے میں اس کی زیادہ تفصیل نہ کرسکا دوسرے اس وقت زیادہ مقصود زبان کے گناہوں پر تنبیہ کرنا تھی اس میں زیادہ وقت صرف ہوگیا بس اب میں ختم کرتا ہوں۔

خلاصہ وعظ

اور خلاصہ بیان کا پھر اعادہ کرتا ہوں کہ زبان کے گناہوں سے بچنے کا طریقہ سوچنا اور پوچھنا ہے کہ جو بات کرو سوچ کر کرو اگر جواز وعدم جواز میں شبہ ہو تو اس کو کسی عالم سے پوچھ لو پھر جو وہ کہے اس کے موافق عمل کرو اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہمیں اعمال صالحہ کی توفیق عطا فرمائیں اور ہماری کوتاہیاں معاف فرمائیں آمین۔ وصلی اللّٰہ علی سیدنا و مولانا محمد وعلیٰ آلہٖ و اصحابہٖ اجمعین۔

ازالۃ الغین عن آلۃ العین

حضرت تھانویؒ کے بڑے مکان پر ۲۲ ربیع الاول ۴۵ ہجری کو ۴ گھنٹے تک ہوا (آنکھیں اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں، اس موضوع پر یہ وعظ ہر طبقہ کے لئے مفید ہے) تقریباً ایک سو مردوں اور متعدد مستورات نے سنا، مولوی عبدالکریم صاحب متھلیؒ نے قلمبند کیا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمدللّٰہ نحمدہ و نستعینه و نستغفرہ و نومن به ونتوکل علیه ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یهدہ اللّٰہ فلا مضل له ومن یضلله فلا هادی له ونشهد ان لا اله الا اللّٰہ وحدہ لا شریک له ونشهدان سیدنا و مولانا محمداً عبدہ و رسوله صلی اللّٰہ تعالیٰ علیه وعلیٰ اله واصحابه و بارک وسلم.

اما بعد فَاَعُوۡذُ باللّٰہ مِنَ الشَّیۡطَانِ الرَّ جِیۡمِ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّ حِیۡمِ
لَآ اُقۡسِمُ بِهٰذَاالۡبَلَدِo وَاَنۡتَ حِلٌّ ۢبِهٰذَا الۡبَلَدِo وَ وَالِدٍوَّمَا وَلَدَ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡ کَبَدٍo اَیَحۡسَبُ اَنۡ لَّنۡ یَّقۡدِرَ عَلَیۡهِ اَحَدٌ o یَقُوۡلُ اَهۡلَکۡتُ مَالاً لُّبَدًا اَیَحۡسَبُ اَنۡ لَّمۡ یَرَهٗۤ اَحَدٌ o اَلَمۡ نَجۡعَلۡ لَّهٗ عَیۡنَیۡنِ وَلِسَانًاوَّ شَفَتَیۡنِ وَهَدَیۡنٰهُ النَّجۡدَیۡنِo

(النور آیت نمبر ۱ تا نمبر ۱۰)

ترجمہ: میں قسم کھاتا ہوں اس شہر (مکہ) کی اور آپ کو اس شہر میں لڑائی حلال ہونے والی ہے اور قسم ہے باپ کی اور اولاد کی کہ ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا ہے کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اس پر کسی کا بس نہ چلے گا اور کہتا ہے کہ میں نے اتنا وافر مال خرچ کر ڈالا کیا وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس کو کسی نے دیکھا نہیں)۔

تمام سورت کا مضمون

یہ چند آیتیں ہیں سورہ بلد کی اس سورت کا نام بلد ہے کیونکہ اس میں ایک بلد خاص کا ذکر ہے یعنی شہر مکہ معظمہ کا اور اس وقت ان آیات میں مقصود و بیان صرف اخیر کی ایک آیت ہے یعنی الم نجعل له عینین مگر یہ آیت مربوط ہے اول و آخر کے ساتھ اس لئے ساری آیتوں کی تلاوت کی گئی اور بیان سب کا کیا جاوے گا گو تمہید کے طور پر ہوگا اور یہ تمام سورت ایک ہی مضمون کے واسطے سوق کی گئی ہے (چلائی گئی ہے) باقی سب اجزاء کے متمم ہیں اور وجہ اس آیت کے اختیار کی جو کہ سبب ہے اس وعظ کا ایک خاص واقعہ ہے وہ یہ کہ میرے بڑے گھر میں میری بیوی کی بینائی جاتی رہی تھی اب بحمداللہ تعالیٰ بینائی عود کر آئی ہے ظاہراً اسباب ظاہری

سے اور حقیقۃً فضل خداوندی ہے۔ اور انہوں نے ارادہ کیا تھا کہ اس خوشی میں بیان کراؤں گی چونکہ دائی اس وقت ایک خاص نعمت ہے اس لئے بیان میں وہی آیت مقصود ہے جس میں اس نعمت کا ذکر ہے اور مربوط ہونے کے سبب سب آیتوں کی تلاوت کردی گئی اور مقصود سورت کا یہ ہے کہ انسان اکثر نعم ونقم سے متاثر نہیں ہوتا اور یہ مقصود نہایت ضروری ہے اور حقیقت میں مقصود معلوم ہو جانے سے کلام کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے اور ارتباط آیات بھی خوب واضح ہو جاتا ہے ورنہ چکر ہی میں رہ جاتے ہیں کہ اس آیت کا اس مقام سے کیا جوڑ ہے مگر مقصود کلام معلوم کرنے کے لئے ذوق سلیم اور نقل عن السلف کی ضرورت ہے یعنی دونوں امر جمع ہو کر کلام چلتا ہے اور میرے نزدیک یہ بڑا علم ہے کیونکہ جب تک مسوق لہ الکلام (جس کی وجہ سے کلام چلایا گیا ہے) نہ معلوم ہو جائے نہ تو لطف آتا ہے نہ پوری طرح تفسیر سمجھ میں آتی ہے اور یہ بات اہل علم کو اجمالاً تو معلوم ہی ہے مگر تفصیلاً ان تفاسیر کے دیکھنے سے معلوم ہو سکتی ہے کہ جن میں سیاق و سباق بیان کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے کہ اس کے بعد سب اشکال حل ہو جاتے ہیں۔

تفسیر کے لئے سیاق وسباق دیکھنے کی ضرورت

اس کی ایک مثال بیان کرتا ہوں وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (یعنی اللہ تعالیٰ مومنوں پر کفار کو ہرگز غالب نہ کرے گا) اس میں مصنفین نے اس اشکال کو خواہ مخواہ اپنے سر لے لیا ہے کہ حق تعالیٰ نفی تابیدی وتاکیدی کے ساتھ فرما رہے ہیں کہ کفار غالب نہ ہوں گے لیکن مشاہدہ اس کے خلاف ہے کیونکہ بہت امکنہ وازمنہ میں کافر غالب ہوئے ہیں چونکہ سباق (بالباءالموحدہ) پر نظر نہ کی اس لئے اس اشکال کو اپنے ذمہ لے لیا اور توجیہات شروع کر دیں اور زیادہ مشہور توجیہ یہ ہے کہ محاجہ باللسان (زبانی حجت) مراد لیا جاوے یعنی مسلمان ہمیشہ غالب فی الحجۃ (حجت میں غالب) رہیں گے اور غلبہ بالا بدان و بالسنان (بدنی غلبہ اور تلوار کا غلبہ) مراد نہیں اور گو یہ مسئلہ محاجہ باللسان میں غالب رہنے کا مستقل طور پر صحیح ہے اور دلائل سے ثابت ہے مگر گفتگو یہ ہے کہ یہ اس آیت کا مدلول بھی ہے یا نہیں سو سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کو اس مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ اوپر ذکر ہے کفار کا ان کی مذمت ہے پھر فرماتے ہیں فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ یعنی جو اختلاف مومن

اور کافر میں ہے حق تعالیٰ اس کا عملی فیصلہ قیامت میں کردے گا کہ مومنوں کو جنت میں اور کافروں کو دوزخ میں داخل کرے گا اس کے بعد فرمایا (لن یجعل اللّٰہ الخ ای فی ھذا الحکم یعنی اس فیصلہ مذکورہ میں مسلمان ہی غالب رہیں گے اس سے آیتوں میں ربط بھی ہوگیا اور معنی بھی صحیح اور لطیف ہوگئے اب فرمایئے کہ کیا اشکال رہا حاصل یہ کہ یہ آیت آخرت کے متعلق ہے اور کفار وہاں کبھی غالب نہ ہوں گے اس فیصلہ میں کفار کے غلبہ کا احتمال ہی نہیں بلکہ سب کے سب کافر ہاریں گے اور ضرور ہاریں گے اور دنیوی ہار جیت کی بابت یہ آیت ہے ہی نہیں جو کفار کو غالب دیکھ کر شبہ ہو اور جواب کی زحمت اٹھانی پڑے یہ نمونہ ہے اور تفصیل ان تفاسیر سے معلوم ہوگی جنہوں نے سیاق وسباق بیان کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ غرض اس سے سب اشکال رفع ہوجاتے ہیں اس لئے میں مشورہ دیتا ہوں کہ اس کو ضرور معلوم کیا کریں کہ مسوق لہ الکلام (جس کی وجہ سے کلام چلایا گیا ہے) کیا ہے (اور مطولات دیکھنے کی ہمت نہ ہو تو بیان القرآن ہی دیکھ لیں کہ اس میں باوجود مختصر ہونے کے ہر جگہ مسوق لہ الکلام بیان کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے) اور سیاق وسباق معلوم نہ ہونے سے یہ بھی کمی رہتی ہے کہ اکثر جگہ آیتیں غیر مربوط معلوم ہوتی ہیں چنانچہ یہاں سورہ بلد کی بھی آیتیں بظاہر غیر مربوط معلوم ہوتی ہیں مگر بیان سے معلوم جاوے گا کہ سب مربوط ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اول قسم کھا کر انسان کی حالت بیان فرمائی ہے اور پھر اپنی نعمتوں کا بیان کیا ہے کہ ان کو دیکھ کر اور سوچ کر اپنی حالت درست کرنی چاہئے۔

ربط آیات سے متعلق ایک علمی فائدہ

مناسبت مقام کے سبب ایک علمی فائدہ ربط آیات کے متعلق استطراداً بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ قرآن شریف میں وقوع ارتباط کی نفی کرنا تو بالکل غلط ہے اس باب میں کافی ذخیرہ موجود ہے چنانچہ خود میرا بھی ایک رسالہ ہے سبق الغایات فی نسق الآیات البتہ اگر لزوم ارتباط کی نفی کی جاوے تو صحیح ہے کیونکہ نسخوں کے بیاض میں ارتباط ضروری نہیں بلکہ ارتباط کتابوں میں ضروری ہے نسخہ کیف ما اتفق (جیسا اتفاق پڑے) کے مطابق لکھا جاتا ہے کیا مطب میں یہ ہوتا ہے کہ جب تک حکیم صاحب مرض سر کے متعلق تمام نسخے مریضوں کو

نہ دے لیں اس وقت تک کوئی دوسری قسم کا مریض نہ آوے یا آوے تو اس کا علاج نہ کیا جاوے اور کہہ دیا جاوے کہ ابھی تمہارے مرض کا نمبر نہیں آیا ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ مطب میں یہی ہوتا ہے کہ جو مریض آتا ہے اس کے مطابق نسخہ لکھ دیا جاتا ہے خواہ اس سے پہلے کسی نوع کے مرض کا نسخہ لکھا ہو اور کتابوں میں یہ ہوتا ہے کہ جب تک ایک مرض کی بحث ختم نہ ہولے دوسری بحث شروع نہ کریں پس اول تو یہ بات ہے کہ قرآن شریف حسب ضرورت تدریجاً نازل ہوا ہے اس میں ربط کی ضرورت ہی کیا ہے دوسرے ربط تو اسباب حسن میں سے ایک خاص سبب ہے اور جو اپنی ذات میں حسین ہو اس کو اسباب حسن کی ضرورت ہی کیا ہے بلکہ خود اسباب حسن محتاج ہیں اس کے ساتھ تلبس کے۔

دلفریباں نباتی ہمہ زیور بستند　　　دلبر ماست کہ با حسن خدا داد آمد

(ترجمہ: خودرو محبوبوں نے اپنے کو زیور سے آراستہ کر رکھا ہے ہمارا محبوب ایسا ہے کہ حسن خداداد سے مالا مال ہے)

نباشد اہل باطن درپے آرائش ظاہر　　　بنقاش احتیاجے نیست دیوار گلستاں را

(اہل باطل ظاہری زیب و زینت کے پیچھے نہیں پڑے دیوار گلستاں کو نقاش کچھ احتیاج نہیں ہے)

بس اول تو ضرورت ہی نہیں اسباب حسن کی پھر کسی خاص سبب پر حسن موقوف نہیں کسی نے اردو میں کہا ہے۔

نہ کچھ تیزی چلی بادصبا کی　　　بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی

دیکھو حسین شخص کے بالوں کی بے ترتیبی میں بھی ایک لطف ہے اور اس کا ناراض ہو کر منہ بگاڑ کر چل دینا بھی ایک ادا اور انداز شمار کیا جاتا ہے۔

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست　　　بسیار شیوہاست بتاں را کہ نام نیست

(حسن اسی کرشمہ ناز و خرام کا نام نہیں محبوبوں کی بہت ادائیں ہیں جن کا نام نہیں ہے)

بے جا تکلفات

لذیذ اطعمہ ہی کو لیجئے کہ ان کے رکھنے میں بھی کسی ترتیب کی ضرورت نہیں گو لوگ تکلف کرتے ہیں اور یہاں تک بڑھ گئے ہیں کہ ایک صاحب نے دستر خوان پر دائروں کے اندر نام

کھانوں کے لکھائے تھے کہ اس دائرہ پر پلاؤ ہو اس میں زردہ ہو اس میں فرنی وغیرہ وغیرہ تاکہ ملازم لوگ رکھنے میں گڑبڑ نہ کریں میں نے بطور لطیفہ کے جرح کیا کہ اگر ان لکھے ہوئے کھانوں میں ایک کھانا کم ہو تو یہ دسترخوان نہیں بچھ سکتا یا بچھے تو اس خالی جگہ میں غیر موجود کھانے کا نام دیکھ کر سب ترسا کریں شاید اس کو ڈھانک دیتے ہوں خیر یہ تو تکلفات ہیں کہ وضع اطعمہ میں ترتیب کا اہتمام کیا جاوے دراصل اس کی ضرورت نہیں اگر ترتیب کی کوشش بھی کی تو صرف رکھنے میں ہو سکتی ہے استعمال میں ترتیب کا رہنا ضروری نہیں کیونکہ ہر شخص اپنی رغبت کے موافق کھائے گا اور اسی میں لطف بھی ہے ورنہ یہ کیا کھانا ہوا کہ جی چاہتا ہے پہلے میٹھے کو اور کھایا جارہا ہے نمکین یا بالعکس یہ تو بڑی بدمزگی کی بات ہے اسی واسطے اہل دانش اجازت دے دیا کرتے ہیں کہ جس طرح رغبت ہو بلا تکلف کھائے اور واقعی روائد کے درپے ہونے میں کھانا دشوار ہو جاتا ہے اور سخت تکلیف ہوتی ہے پھر نفع کیا ہوا اس خرافات سے جبکہ مقصود اصلی حاصل نہ ہوا یعنی مہمان کا انبساط طبعی چنانچہ مجھ پر یہ قصہ گذرا ہے ایک صاحب سندیلہ کے رہنے والے تحصیلدار تھے کیرانہ میں انہوں نے دعوت کی وہاں جا کر مصیبت میں پھنس گیا کھانے تو نہایت لذیذ اور پرتکلف بلکہ بعض ایسے بھی کہ میں نے کبھی نہ کھائے ہوں گے لیکن انہوں نے بیٹھ کر انتظام شروع کیا یہ کھایئے یہ تناول فرمایئے یہ فلاں چیز ہے یہ ایسی ہے یہ ویسی ہے اول تو صبر کیا پھر میں نے کہا کہ آپ بلا تکلف کھانے میں مشغول ہو جایئے میں خود سب چیزوں میں سے کھالوں گا مگر وہ سمجھے کہ چپ چاپ کھلانے میں بے قدری ہے وہ خاموش نہ ہوئے برابر کچھ نہ کچھ کہتے ہی رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرا پیٹ بھی نہ بھرا ایک اور تہذیب زدہ کے ساتھ ایک کھانے میں شرکت ہوگئی وہ بندہ خدا تکلف کے مارے بچہ کا سا لقمہ لیتے اور جب اس کو چبا کر نگل لیتے تب دوسرا لیتے مجھ کو بے تکلف کھاتے ہوئے بڑی شرم آئی کہ اگر میں اپنی عادت کے موافق کھاتا ہوں تو یہ کہیں گے کہ کیسا گنوار آدمی ہے غرض ان کے ساتھ ایک گھنٹہ بھر کھایا مگر بھوکا آیا ایک قصہ اور یاد آ گیا۔

حکایت میزبانی حضرت امیر معاویہؓ

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بڑے اسخیاء میں سے ہیں اور بخل تو عرب میں بہت ہی کم ہے مثل بلاغت کے کہ اس سے بھی کم آدمی خالی ہوئے ہیں مگر حضرت معاویہؓ بڑے درجہ کے

سخی تھے گویا اس منظر کے مظہر تھے کہ ؎

ادیم زمین سفرہ عام اوست چہ دشمن بریں خوان یغما چہ دوست

(اے زمین اس کا دسترخوان ہے اس لوٹ کے دسترخوان دوست دشمن سب برابر ہیں)

اور آپ کی یہ عادت تھی کہ مہمانوں کی خود خدمت کرتے تھے حسب عادت ایک دفعہ کھانا کھلا رہے تھے ایک اعرابی بے تمیزی سے بہت بڑے بڑے لقمے کھانے لگا حضرت معاویہؓ نے شفقت سے فرمایا کہ بھائی چھوٹا لقمہ لو مبادا کہیں تکلیف ہو جاوے بس یہ سنتے ہی وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور کہا مہمانوں کے لقمے دیکھنا خلاف کرم ہے ایسے دسترخوان پر کوئی شریف نہیں کھا سکتا حضرت معاویہؓ نے ہر چند معافی چاہی اور اصرار کیا کہ بیٹھو کھانا کھالو مگر اس نے نہ مانا اور چل دیا۔ غرض مہمان پر مسلط ہو جانے سے وہ کھا نہیں سکتا شرما جاتا ہے اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ کھانے کے برتن میں کم از کم دو آدمی ضرور شریک کئے جاویں ورنہ پتہ لگ جاتا ہے کہ اس نے کم کھایا اس نے زیادہ کھایا اور یہ پردہ داری کے بالکل خلاف ہے البتہ جہاں پوری بے تکلفی ہو وہاں جس طرح چاہیں کریں اور اس قصہ سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بعض اعرابی ایسی باتیں جانتے ہیں کہ متمدن لوگ بھی نہیں جانتے۔

مہمان کو کھانا کھلانے کا ایک ادب

ایک اور ادب کھانے کے متعلق میں نے امام مالکؒ کے معمول سے معلوم کیا ہے یہ لوگ واقعی دین میں تو امام تھے ہی دنیا کے بھی امام تھے اور بلا خوف مخالفت کہتا ہوں کہ دنیا کا سلیقہ بھی سیکھنا ہو تو اہل اللہ سے سیکھو اہل دنیا کو سلیقہ کی ہوا بھی نہیں لگی گو دعویٰ کتنا ہی کریں میں نے امام شافعیؒ کا سفرنامہ دیکھا ہے اس میں مذکور ہے کہ جب وہ امام مالکؒ کے یہاں مہمان ہوئے تو خادم نے اول ان کے ہاتھ دھلوانا چاہا امام مالکؒ نے فرمایا اول ہمارے ہاتھ دھلواؤ۔ اسی طرح کھانا خادم نے پہلے امام شافعیؒ کے سامنے رکھنا چاہا امام مالکؒ نے پہلے اپنے سامنے رکھوایا اور خود کھانا شروع کر کے کہا آپ بھی کھائیے کتاب میں تو فقط یہ قصہ لکھا ہے اور وجہ نہیں لکھی کہ امام صاحب نے ایسا کیوں کیا جو بظاہر اکرام ضیف کے خلاف معلوم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ان بزرگوں کے فیض سے اور ان کی صحبت کی برکت سے میری سمجھ میں اس کی وجہ آ گئی اور بزرگوں کا فیض وفات کے بعد بھی ہوتا ہے۔

اہل اللہ کے الفاظ میں بھی تاثیر ہوتی ہے

برکت بڑی وسیع چیز ہے تجربہ کر کے دیکھ لیجئے کہ اہل ظلمت کی تصنیف میں ظلمت ہوتی ہے گو اس میں نوری ہی باتیں ہوں اور اہل اللہ کی تصنیفات سے ایک نور پیدا ہوتا ہے گو معمولی مضامین ہوں اور ذوق صحیح سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے اہل اللہ کے الفاظ میں ایک خاص اثر ہوتا ہے حضرت غوث اعظمؒ کے صاحب زادے نے وعظ کہا وہ علوم سے فراغت کے بعد تشریف لائے تھے بہت حقائق و معارف بیان کئے مگر مجمع میں کوئی اثر نہ دیکھا خیال ہوا کہ یہ لوگ رقیق القلب نہیں اور ان کو حیرت ہوئی کہ ایسے مضامین نے اثر نہ کیا حضرت غوث اعظمؒ کو یہ خیال مکشوف ہوا اور حاضرین سے خطاب کر کے فرمایا کہ ہم نے رات سحری کے لئے دودھ رکھا تھا وہ بلی نے پی لیا بس ہم نے بے سحری روزہ رکھا یہ سنتے ہی لوگ زار زار رونے لگے صاحبزادے دیکھنے لگے کہ یہ بھی کوئی رونے کی بات تھی بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ رونے کی بات نہ تھی مگر ان کے الفاظ میں تاثیر ہوتی ہے از دل خیزد بر دل ریزد (دل سے نکلے دل پر اثر کرے) بس جب یہ معلوم ہو گیا کہ اہل اللہ کے الفاظ میں بھی تاثیر ہوتی ہے اور ان کا یہ فیض باقی رہتا ہے اس لئے میں کہتا ہوں کہ ان کی برکت سے میں نے یہ سمجھا کہ اصل مقصود امام مالکؒ کا یہ تھا کہ امام شافعیؒ کو بے تکلف کر دیں کہ جتنا انبساط ہوگا اتنا سیر ہو کر کھاویں گے اور ذوق سلیم ہو تو بے تکلف کرنے کا طریقہ سب سے اچھا یہ ہے کہ پہلے خود شروع کر دے کیونکہ مہمان کو ابتداء کرتے ہوئے تکلف ہوتا ہے اور حجاب ہوتا ہے اور اصل مقصود تو امام مالکؒ کا اکل من تقدیم تھی مگر مقدمات تابع ہوتے ہیں اس لئے ان میں بھی تبعاً تقدیم کی۔

میزبانی کا ایک اور ادب

اب یہاں سے یہ ادب نکلا کہ مہمان کو تکلیف نہ دے اور اپنے طور پر کھانے وغیرہ کا خیال رکھے کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں لیکن اس پر ظاہر نہ ہو کہ یہ مجھ پر مسلط ہے اور مجھ کو تک رہا ہے بس سرسری طور پر دیکھنا کافی ہے ٹکٹکی باندھ کر نہ بیٹھ جائے خیر یہ قصہ درمیان میں آ گیا تھا۔ میں اصل میں یہ کہہ رہا تھا کہ اطعمہ میں کسی ترتیب خاص کی ضرورت نہیں ہاں اگر

طبّی ضرورت کسی کھانے کو مقدم مؤخر کرنے کی ہو تو طبیب کا منصب ہے کہ اس کو بتلا دے اور مریض یا حفظ ما تقدم کرنے والے کو اس کا اتباع کرنا چاہئے ورنہ اپنی رغبت کے موافق کھاوے کیونکہ کھانے کے بارے میں مذاق مختلف ہوتے ہیں۔

کھانے کے بارے میں مختلف مذاق

دیوبند میں مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ کو مٹھائی بہت مرغوب تھی اور مولانا فضل الرحمٰن صاحب کو کٹھائی کا بڑا شوق تھا۔ دونوں حضرات اپنی اپنی مرغوب شئے کے متعلق اشعار لکھتے تھے دلائل بیان کرتے تھے غرض اپنا اپنا مذاق ہے کسی کو کچھ مرغوب ہے کسی کو کچھ۔

قرآن شریف کی مثال

اور درحقیقت قرآن شریف کے واسطے اطعمہ مختلفہ کی مثال بھی پوری مناسب نہیں بلکہ وہ تو مصری کی ڈلی ہے کہ اس کے سب اجزاء متماثل ہیں اور جب اجزاء متماثل ہوں تو ترتیب کی ضرورت بالکل نہیں رہتی جس طرف سے اٹھاؤ یکساں لطف ہے البتہ کسی مصلحت کی وجہ سے اپنے سامنے سے کھانے کا امر کیا جاوے تو دوسری بات ہے اور وہ مصلحت بھی اسی پر مبنی ہے کہ جب سب طرف برابر ہے تو پھر اپنے سامنے سے چھوڑ کر دوسری جگہ سے اٹھانا ایک عبث فعل ہے بس اس مصلحت کا لحاظ نہ کیا جاوے تو فی نفسہ کوئی جزو مقصود بالتقدیم نہیں ہوتا اس سے بخوبی واضح ہو گیا کہ خود اجزاء میں ترتیب نہیں بلکہ خارجی وجہ سے ایک طرف سے کھانے کو مقدم کیا گیا ہے پس اسی طرح قرآن شریف کا اصل مقصود ہدایت ہے اس میں سب آیات برابر ہیں اور گو ظاہر میں ایک دوسرے سے مختلف مقاصد رکھتی ہیں مگر مقصود اصلی میں سب متحد ہیں۔

عبارا تنا شتّٰی و حسنک واحد   و کل الی ذاک الجمال یشیر

(عنوانات مختلف ہیں معنون ایک ہی حسن ہے اور ہر عنوان جمال کی طرف اشارہ کرتا ہے)

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوشی   من انداز قدت را می شناسم

(جس رنگ کا چاہو لباس پہن لو میں تمہارے قد کے انداز سے پہچان لوں گا)

بیان نعم و نقم

پس قرآن شریف کے اجزاء گو ظاہر میں متنوع ہیں مگر حقیقت میں کچھ اختلاف نہیں ہے سب سے مقصود ایصال الی المقصود ہے (مقصود تک پہنچانا) اور یہی وجہ ہے کہ سورہ رحمٰن میں بیان نقم (عذاب کے بعد بھی وہی فرمایا ہے جو بیان نعم کے بعد فرمایا ہے یعنی فبایّ الاء ربکما تکذبان یعنی خدا کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاتے ہو اس کی ضروری تفصیل اہل علم کے لئے بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ سورہ رحمٰن کے اول رکوع میں تکوینی نعم کا بیان ہے اور تیسرے رکوع میں نعم اخرویہ کا ان کے ساتھ فَبِاَیِّ اٰلَاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَانِ (اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاتے ہو) کا ربط ظاہر ہے لیکن دوسرے رکوع میں نقم کا بیان ہے ان کے ساتھ فبای الاء الخ کا بظاہر کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا نعم کے بعد تو فبای آلاء سے خطاب سب کے نزدیک برمحل ہے مگر اکثر لوگ نقم کے بعد فبای آلاء الخ پر تعجب کرتے ہیں کہ نقم کے بعد اس کا کیا جوڑ مثلاً جہنم کا ذکر فرمایا اس کے بعد فرمایا فبای آلاء الخ یعنی اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاتے ہو اس میں یہ سوال ہوتا ہے کہ کیا جہنم بھی نعمت ہے اس کا جواب یہ ہے کہ گو بظاہر مذکور کے درجہ میں جہنم نقمت ہے لیکن ذکر کے درجہ میں وہ نعمت ہے کیونکہ اس کا ذکر ہدایت کے لئے کیا گیا ہے اور نقمت کے ساتھ ظاہر کا لفظ اس واسطے کہا کہ واقع میں خود جہنم بھی نعمت ہے ان شاء اللہ اس کو بھی بیان کردوں گا اس وقت یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ جس طرح جنت کا ذکر کر کے ترغیب دینا نعمت ہے اسی طرح جہنم کا ذکر کر کے ترہیب کرنا بھی نعمت ہے جیسا کہ طبیب کا دوا بتلانا بھی نافع ہے اور قابل پرہیز اشیاء کی فہرست بتلانا اور ان کی مضرتیں بیان کرنا بھی نافع ہے سب جانتے ہیں کہ جس طرح حصول خیر میں کوشش کی جاتی ہے اسی طرح شر سے بچنے کا بھی اہتمام ہوتا ہے چنانچہ حضرت حذیفہؓ نے فرمایا کہ اساله الشر مخافة ان يدركني یعنی حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سے شر کے متعلق سوال کیا کرتا اس ڈر کے مارے کہ کہیں مجھ کو شر نہ پہنچ جائے ایک شاعر کہتا ہے ؎

عرفت الشر لاللشر ولكن لتوقيه   ومن لا يعرف الشر من الخير يقع فيه

(میں نے شر کو پہچانا نہ شر کی وجہ سے لیکن اس سے بچنے کی وجہ سے اور جو شخص شر کو خیر سے نہیں پہچانتا تو وہ شر میں واقع ہو جاتا ہے)

یعنی میں نے شر کو اس لئے پہچانا کہ اس میں واقع ہونے سے بچار ہوں حقیقت میں یہ بھی انعام ہے خدا کا فضل ہے کہ اس نے ہم کو جہنم سے ڈرایا تا کہ اس سے بچتے رہیں یہ اس مدعا کی تائید تھی کہ گو ظاہر میں مدلولات قرآن کے مختلف اجزاء ہیں مگر مقصود واحد ہے اب اس کا بیان کرتا ہوں جو میں نے کہا تھا کہ باطن میں دوزخ نعمت ہے اس کے واسطے یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ہر نعمت عام نہیں ہوتی جیسا کہ مشاہدہ خود اس کا شاہد ہے دلیل کی حاجت نہیں جب یہ بات مسلم ہے تو سنو کہ دوزخ مومنین کے واسطے نعمت ہے گو کفار کے حق میں عذاب ہے جیسا کہ خود جنت بھی کافر کے حق میں نعمت نہیں بلکہ عذاب ہے اور مومن کے حق میں رحمت و نعمت ہے اگر جنت پیدا نہ ہوتی تو کافر کو اتنی حسرت نہ ہوتی جتنی کہ اب جنت کو دیکھ کر ہوگی اس طرح سے وہ اس کے لئے آلہ تعذیب ہے، اس کی ایسی مثال ہے کہ پیاسے کے پاس پانی لے جا کر ہٹا لیجئے تو حسرت زیادہ ہوگی بہ نسبت اس کے کہ پانی نظر ہی نہ آوے بس جس طرح جنت کافر کے واسطے عذاب ہے یعنی زیادتی تکلیف کا باعث ہے اسی طرح دوزخ مومن کے واسطے مسرت کا باعث ہے مومن کو ایک تو یہ مسرت ہوگی کہ جو کفار ہمیں ستاتے تھے وہ سزا بھگت رہے ہیں دوسری ایک فرحت یہ ہوگی کہ خدا نے ہم کو اس عذاب سے بچالیا چنانچہ قرآن شریف میں اس مسرت کی خبر دی گئی ہے کہ جنتی یوں کہیں گے وَوَقٰنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ یعنی فرحت ظاہر کریں گے کہ ہم کو خدا نے عذاب سے بچالیا اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ حشر میں کافر کو جنت دکھا کر کہا جاوے گا کہ تیرا یہ ٹھکانا ہوتا اگر تو ایمان لے آتا اور مومن کو دوزخ دکھلا کر کہیں گے کہ تو ایمان کی بدولت اس سے بچ گیا ان سب امور سے اس دعویٰ کی تائید ہوگئی کہ دوزخ نعمت ہے گو خاص لوگوں کے واسطے یعنی فقط مومنوں کے واسطے ہے اور اس اعتبار خاص سے ہے بہر حال یہ ثابت ہو گیا کہ جہنم وغیرہ قسم کے بعد بھی فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (پس اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاتے ہو) کا خطاب موزوں ہے اب میں سابق کی طرف عود کرتا ہوں دراصل میں یہ بیان کر رہا تھا کہ قرآن شریف میں ربط و ترتیب بھی نہ ہوتی تب بھی کچھ حرج نہ تھا اس لئے ہم لزوم ترتیب کے قائل نہیں لیکن وقوع ترتیب کے قائل ہیں اور اس پر دلیل مجبور کرتی ہے کیونکہ نزول قرآن

اور تلاوت قرآن کی ترتیب ایک نہیں ہے اگر نزول کے مطابق تلاوت ہوتی تو ہم وقوع کے بھی قائل اور مدعی نہ ہوتے گو کوئی نہ کوئی وجہ ربط کی اس وقت بھی نکل سکتی تھی مگر تکلف ہوتا۔

تفنن کلام

اور یہ کمی کی بات ہے کہ تکلف سے قرآن شریف کی خوبیاں بیان کی جاویں کیا اس میں واضح خوبیاں کم ہیں جو تکلف سے نکالیں قرآن اس کا محتاج نہیں ہے اسی واسطے صاحب کشاف نے کہا ہے کہ ایک ہی مضمون میں کہیں واؤ اور کہیں فاء لانا تفنن عبارت ہے اور بعض نے کچھ کچھ نکات بیان کئے ہیں مگر ان نکات پر دلیل کوئی نہیں ہے اور بے دلیل نکالنا گو تفسیر بالرائے کی فرد نہیں ہے مگر مشابہ ضرور ہے اس لئے میرا وجدان پسند نہیں کرتا کہ اس کا دروازہ کھولا جاوے اور زمخشری کو تفسیر میں خاص دخل ہے اگر وہ معتزلی نہ ہوتے تو میں ان کو صاحب الہام کہتا مقطعات میں جو لطائف ونکات نکالے ہیں ان کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کہاں تک ذہن پہنچا ہے اور پچھلے سب لوگ مقطعات کے بیان میں ان ہی کے تابع ہیں جب وہ اتنے بڑے شخص ہیں تو ان کو ثم اور فا اور واؤ کا نکتہ بیان کرنا کیا مشکل ہے مگر انہوں نے تفنن کلام کہنے پر کفایت کی اور تفنن کلام خود ایک مستقل خوبی ہے اس کے ہوتے ہوئے کسی بے دلیل خوبی کی حاجت نہیں ہے مدرسین خیال کرلیں کہ درس کے وقت اگر دو بار تقریر کرنا پڑے تو پہلی اور دوسری بار کی تقریر کے عنوان میں قصداً فرق کیا جاتا ہے وہاں سوائے تفنن کلام کے اور کچھ مقصود نہیں ہوتا اور اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اگر ایک ہی تقریر ہو تو گویا آموختہ سا پڑھ دیا اگر مضمون پر قدرت ہے تو اس کی کیا ضرورت کہ وہی پہلے الفاظ ہوں اور دوسری وجہ یہ کہ تکرار تقریر سے فائدہ یہ ہے کہ مضمون ذہن نشین ہو جاتا ہے سامعین کے اور یہ جب ہی ہوتا ہے کہ طرز بدلا جاوے اور تقریر اول کو بعینہ دہرا دینے سے یہ نفع نہیں ہوتا۔

تکرار میں حکمت

جیسا کہ تجربہ شاہد ہے نیز حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْآنِ یعنی ہم نے اس قرآن میں ایک مضمون کو طرح طرح سے بیان کیا ہے اور اس کی حکمت یہ منفعت بیان فرمائی لیذکروا تاکہ اچھی طرح سے سمجھ لیں اور اس کے بعد شکایت فرماتے

ہیں وما یزیدھم الانفورا یعنی ان کو نفرت ہی بڑھتی جاتی ہے پس اس سے معلوم ہوگیا کہ تکرار سبب ہے ذہن نشین ہونے کا چنانچہ مشہور جملہ ہے اذا تکرر الکلام علی السمع تقدر فی القلب (جب بات چند مرتبہ گوش گذار ہوتی ہے تو قلب میں جم جاتی ہے) حاصل یہ کہ نزول اور تلاوت کی ترتیب اگر ایک ہوتی تو اس وقت وقوع ترتیب اور ربط بین الآیات والسور کے ہم قائل نہ ہوتے جیسا کہ احادیث میں قائل نہیں ہیں اور یہ بات میں نے اہل علم کے کام کی بتلائی ہے کیونکہ وہ حدیث کے جملوں میں ربط ڈھونڈا کرتے ہیں حالانکہ ان میں نہ ربط کی حاجت ہے نہ ہر جگہ ربط کا وجود ہے بلکہ واقعہ یوں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مثلاً چار باتوں کی نصیحت کرنا چاہا بس ان چاروں کو بیان فرما دیا اس میں ترتیب اور ربط کی کیا حاجت ہے تکلف نہ کیا کرو طلبہ کو یہی جواب دے دیا کرو کہ الگ الگ جملے ہیں ایک دوسرے سے مربوط نہیں اور گو اس جواب سے طلبہ خوش نہ ہوں گے مگر محقق تو ہو جائیں گے لوگ ایسی باتوں کی قدر نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ تحقیق سے جواب نہیں دیا یوں ہی ٹال دیا ہے یہ خبر نہیں کہ قعر تک پہنچ کر لوٹے یہ نہ سمجھو کہ وہ محقق نہیں وہ ساری مسافت کو دو مرتبہ طے کر چکے ہیں آنے میں اور جانے میں اور ان کی نظر واقع میں بہت عمیق ہے مگر جس طرز پر تم تقریر اور تحقیق چاہتے ہو وہ اس میں بھی کامل ہیں مگر وہ قصداً اس طرز کو اس واسطے اختیار نہیں کرتے۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ورنہ در مجلس رندان خبرے نیست کہ نیست

(مصلحت نہیں کہ راز ظاہر ہو ورنہ رندوں کی مجلس میں کہیں خبر ایسی نہیں ہے کہ نہ ہو)

ترتیب سور و ترتیب آیات

بس حدیث میں سوال عن الترتیب کا جواب یہ ہے کہ کچھ ترتیب نہیں اور قرآن شریف کی ترتیب نزول اور ترتیب تلاوت چونکہ جدا گانہ ہے وہاں جواب یہ ہے کہ کچھ ربط و مناسبت ضرور ہے گو ہم کو معلوم نہ ہو اور یہ ترتیب تلاوت توفیقی ہے کیونکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام تصریحاً فرما دیا کرتے تھے کہ اس آیت کو فلاں جگہ رکھ دیجئے بس یہ ترتیب توفیقی ہوئی البتہ ترتیب سور میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ توفیقی ہے بعض کہتے ہیں اجتہادی ہے اور

میرے نزدیک راجح یہ ہے کہ اجتہادی ہے لیکن ہے قطعی بوجہ اجماع کے اس لئے اس کا خلاف جائز نہیں فقط ایک صورت مستثنیٰ ہے اور وہ بھی بالا جماع کہ بچوں کو عم کا پارہ پڑھانے میں ترتیب کے بدلنے کی فقہاء نے اجازت دے دی ہے تاکہ چھوٹی چھوٹی سورتیں پہلے پڑھنے میں سہولت ہو اس کے سوا اور کسی جگہ اس ترتیب کی مخالف جائز نہیں کیونکہ اجماع کی مخالفت ممنوع ہے مگر کسی نص سے یہ ترتیب بین السور توفیقی نہیں ہے البتہ آیات کی ترتیب منصوص ہے اب میں کہتا ہوں کہ یہ فعل عبث تو ہے نہیں کہ ایک آیت نازل تو ہوئی کسی آیت کے بعد اور تلاوت کا حکم کیا گیا دوسری آیت کے بعد بس اس سے یہی معلوم ہوا کہ اس آیت سے اس کا تعلق زیادہ ہے اور گو احتمال اور بھی ہو سکتے ہیں مگر یہ زیادہ ظاہر ہے کہ زیادتی تعلق کی وجہ سے تلاوت کی ترتیب بدل گئی ہے یہ ہے وہ وجہ جس کے سبب آیات قرآن میں ربط کے قائل ہوئے ہیں باقی مسوق لہ الکلام کی تعیین کو کہیں آیت کے سیاق وسباق میں غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے اور کہیں ذوق صحیح سے اور ذوق صحیح پیدا ہوتا ہے اخلاق کے ساتھ عمل کرنے سے اخلاص اور عمل صالحہ ہی کی برکت سے محقق ہو جاتا ہے اسی کو کہا ہے۔

بینی اندر خود علوم انبیاء بے کتاب و بے معید و اوستا

(اپنے اندر بے کتاب و بے معین اور بغیر استاد کے انبیاء جیسے علوم دیکھو گے)

اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو عمل کرتا ہے اپنے علم پر اللہ تعالیٰ اس کو وہ چیز سکھاتا ہے جس سے کہ وہ ناواقف ہے جیسا کہ قرآن شریف میں ہے وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْماً یعنی ہم نے اس کو اپنے پاس سے علم دیا البتہ اتنا فرق ضرور ہے کہ انبیاء کے علوم قطعی ہوتے ہیں اور اولیاء کے علوم ظنی مگر ان ظنی علوم سے بھی ایسی تسلی ہو جاتی ہے کہ جانب مخالف کی طرف ذہن ہی نہیں جاتا ہاں تشکیک مشکک سے زائل ہو جاوے تو اور بات ہے۔

طبیعت کے مختلف رنگ

اب میں تلاوت کردہ آیات میں تعیین کرتا ہوں مسوق لہ الکلام کی اور وہی مقصود بالبیان ہے اور وہ صرف ایک چیز ہے یعنی انسان کی شکایت ہے کہ وہ سنگ دل ہے نہ نعم سے متاثر ہوتا ہے نہ نقم سے نہ مصیبتوں سے عبرت حاصل کرتا ہے نہ سامان راحت سے گرویدہ ہوتا ہے طبیعت کے رنگ مختلف ہیں بعض پر تو نعمتوں کا اثر ہوتا ہے اور بعض پر تکالیف سے

اثر ہوتا ہے جیسا کہ بعض نوکر انعام وغیرہ کی وجہ سے خوب خدمت کرتے ہیں اور سزا دینے سے چڑ جاتے ہیں اور بعض ملازمین جوتوں ہی سے سیدھے ہوتے ہیں اگر ان کو سزا نہ ملے تو دلیر ہو جاتے ہیں ان دو کے سوا اور کوئی چیز مؤثر عادی نہیں۔

قساوت کی حقیقت

اگر کسی طبیعت میں کسی طریق سے بھی اثر نہ ہو تو اس میں قساوت ہے کہ اثر ہی نہیں ہوتا اسی کی شکایت اس صورت میں کی گئی ہے مگر اثر سے مراد عقلی اثر ہے طبعی نہیں بس قساوت جب کہلاوے گی کہ عقلی اثر بھی نہ ہو فقط طبعی اثر کے فقدان پر قساوت کا حکم لگانا صحیح نہیں ہے خوب سمجھ لو۔ اس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بہت لوگ غلطی میں پڑ جاتے ہیں بعض لوگ میرے پاس خط لکھتے ہیں کہ قلب میں قساوت ہے اور جب میں ان سے قساوت کی تفسیر پوچھتا ہوں تو جواب میں لکھتے ہیں کہ عبادت میں مزا نہیں آتا پس مزا نہ آنے کو وہ قساوت سمجھ بیٹھے ہیں اور خواہ مخواہ پریشان ہوتے ہیں اور اس غلطی کی وجہ یہ ہے کہ مدارس میں کوئی ایسی کتاب داخل درس نہیں جس میں فن کے اصطلاحی کلمات کی تفسیر اور تعریف ہو کسی درسی کتاب میں عجب کی تعریف نہیں ریا کی تعریف نہیں اور تفسیر معلوم نہ ہونے سے دو غلطیاں ہوتی ہیں ایک یہ کہ مرض موجود ہوتا ہے اور اپنے آپ کو مریض نہیں سمجھتے دوسرے اس کا عکس یعنی باوجود تندرست ہونے کے اپنے کو مریض خیال کرتے رہتے ہیں جیسا کہ امراض جسمانی میں ہوتا ہے کہ ناواقف آدمی بعض دفعہ تو بدوں بخار کہہ دیتا ہے کہ بخار ہے اور بعض دفعہ بخار ہوتا ہے مگر یہی سمجھے جاتا ہے کہ بخار نہیں ہے یہاں تک کہ دق ہو جاتی ہے اور دق کرتی ہے اس لاعلمی کی وجہ سے بہت لوگ ایسے ہیں کہ ان کے مرض کی تشخیص کی جاتی ہے تو وہ مخالفت کرتے ہیں۔

حقیقت طریقت

جیسا کہ میں نے ایک شخص کے متعلق تشخیص کیا کہ تم میں کبر ہے ان کو برا معلوم ہوا پھر پانچ برس کے بعد اقرار کیا اور اصل وجہ اس کوتاہی کی یہ ہے کہ واقع میں تو طریقت نام ہے مجموعہ اعمال ظاہر و باطن کی اصلاح و تکمیل کا مگر اب طریقت نام رہ گیا ہے فقط وظائف و کیفیات کا حالانکہ کیفیات کا تو مقصود میں دخل ہی نہیں وہ خود مقصود ہو بترتیب غیر لازمی مرتب

ہیں اور وظائف کا درجہ عرق بادیان جیسا ہے اور اعمال کا درجہ مسہل جیسا ہے یعنی جس طرح اخراج مادہ کے لئے مسہل کی ضرورت ہے اور عرق بادیان اس کی اعانت کرتا ہے۔

ضرورت مجاہدہ

اسی طرح رذائل کا مادہ زائل کرنے کے لئے اصلاح اعمال ومجاہدہ کی ضرورت ہے بغیر اس کے کام نہیں چلتا محض ذکر سے اصلاح نہیں ہوتی ہاں ذکر سے امداد ہوتی ہے کہ اس پر رحمت ہوتی ہے اور سہولت ہو جاتی ہے نیز اعمال میں امتحان ہے ہماری طلب کا اور بلا طلب فضل فرمانے کی نسبت ارشاد فرمایا ہے اَنُلْزِمُکُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ کیا تم ہدایت سے نفرت کرتے ہو اور ہم اس کو تمہارے ساتھ چپکا دیں اجی وہ تو طلب کے بعد بھی عنایت فرما دیں تو محض ان کی رحمت ہے کیا تم نے حق تعالیٰ کو ایسا قرار دیا ہے کہ جیسے کسی کا کوئی خریدار نہ ہو اور وہ خواہ مخواہ لپٹتا پھرے غرض ہم کو طلب کرنا لازم ہے اس لئے اعمال کی پابندی کرنا ضروری ہے تاکہ طلب ظاہر ہو اور اب تو آرام طلبی چاہتے ہیں اور ذکر بہ نسبت اعمال کے آسان ہے اس کو کر لیتے ہیں مگر اعمال میں دقت ہوتی ہے اس لئے اس سے جان چھڑاتے ہیں مگر حقیقت میں طلب ضروری چیز ہے جس کا طریقہ یہ ہے کہ اصلاح اعمال میں کوشش کی جاوے مگر اب اعمال کی طرف توجہ نہیں نہ باطن کی اصلاح نہ ظاہر کی اور اعمال ظاہرہ کے احکام تو کچھ معلوم بھی کر لیتے ہیں مگر اصلاح باطن کے مسائل تک بھی نہیں معلوم کرتے تا بہ عمل چہ رسد اگر کسی نے اس حالت کو دیکھ کر کہہ دیا ع

در کنز و ہدایہ نتواں یافت خدارا

(کنز و ہدایہ میں خدا نہیں مل سکتا) تو اس نے کیا ظلم کیا اس کی مراد یہ ہے کہ نتواں یافت بعض احکام خدارا (بعض احکام خدا کے کنز و ہدایہ میں نہیں پاسکتے ہو) اور یہ بالکل سچ ہے ان کتابوں میں کبر کی تعریف کہاں ہے اور اس کا علاج کہاں ہے اس کے لئے قوت القلوب کی ضرورت ہے۔

صحبت اہل طریق کی ضرورت

اور اعمال کے متعلق ایک اور بات بھی قابل غور ہے وہ یہ کہ تصوف کی کتابوں میں معالجات نفس دیکھ کر ان پر عمل کر لینا کافی نہیں ہے کیونکہ یہ فن علم وعمل دونوں سے مرکب ہے نہ فقط جاننے

سے کچھ ہوتا ہے اور نہ بطور خود کرنے سے بلکہ مشق کی سخت ضرورت ہے اس لئے علم وعمل کے ساتھ صحبت اہل طریق بھی لازم ہے اور اہل طریق سے وہ مراد ہے جو علم کے ساتھ عمل کرنے والا بھی ہو اور جو محض علم رکھتا ہو وہ درحقیقت اس فہرست میں داخل نہیں ہے بس طالب اصلاح کو عالم باعمل کی خدمت میں رہنا ضروری ہے ورنہ ایسا ہوگا جیسا کہ ایک عورت گلگلے پکارہی تھی اس کے میاں کو کسی چیز کی ضرورت ہوئی جو اندر رکھی تھی۔ میاں نے اس سے فرمائش کی کہ تلاش کرکے لادو اس نے مشغولی کا عذر کیا وہ بولا تم لے آؤ گلگلے میں پکالوں گا وہ ان کو کڑاہی سپرد کرکے اندر چلی گئی آپ نے کھڑے کھڑے کڑاہی میں آٹا چھوڑ دیا چونکہ دور سے چھوڑا گیا چھینٹوں سے ہاتھ منہ پھونک لیا کیا رسالہ خوان نعمت میں یہ بات بھی لکھی جاتی کہ اس ہیئت سے بیٹھ کر آٹا چھوڑیں یہ بات تو استاد ہی سے حاصل ہونے کی ہے لکھنے سے سمجھ میں نہیں آسکتی پس اسی طرح ضرورت ہے کہ اصلاح باطن کے لئے کسی فن داں کے پاس رہے بدوں اس کے صدہا غلطیوں میں ابتلاء ہوجاتا ہے چنانچہ قساوت ہی کی حقیقت میں وہ غلطی ہوئی جو مذکور ہوئی جس کا حاصل یہ ہے کہ قساوت اصطلاحی لفظ ہے اور اصطلاح ہر وقت مستحضر نہیں رہتی ایسے نکتے صحبت سے حل ہوتے ہیں اس عدم استحضار سے خود اس کی یہ تفسیر کرلیتے ہیں کہ مزا نہیں آنا حالانکہ یہ غلط ہے کیونکہ مزا غیر اختیاری ہے اور قساوت پر وعید آئی ہے اور غیر اختیاری سے وعید متعلق نہیں ہوسکتی کہ اس میں تکلیف مالا یطاق (جس کی طاقت نہ ہو) ہے جو خلاف ہے **لایکلّف اللّٰہ نفساً الّا وسعھا** اللہ تعالیٰ وسعت سے زیادہ کسی شخص کو تکلیف نہیں دیتے کہ پس ثابت ہوا کہ قساوت اور شئے ہے اور مزا نہ آنا اور شئے ہے دراصل قساوت عدم تاثر قلب کا نام ہے اور اثر بھی وہ جس کا پیدا کرنا اس کے اختیار میں ہے اور اس قساوت پر وعید آئی ہے اس لئے اس کو دور کرنا ضروری ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے **انّ ابعد الشی من اللّٰہ القلب القاسی**[۱] یعنی سب چیزوں میں خدا سے زیادہ دور قلب قاسی ہے قرآن شریف میں ہے **فویل للقاسیۃ قلوبھم من ذکر اللّٰہ** یعنی ہلاکی ہے ان کے لئے جن کے دل خدا تعالیٰ کی یاد سے سخت ہیں۔

---

[۱] سنن الترمذی:۲۴۱۱، الدر المنثور للسیوطی ۵:۳۲۵، الترغیب والترھیب للمنذری:۵۳۸

لین دین کے دو درجے

خلاصہ یہ ہوا کہ قساوت مقابل ہے لین کے اور لین کے دو درجے ہیں ایک عقلی یہ اختیاری ہے اور یہی مامور بہ ہے اس میں خلل بھی اختیار سے آتا ہے اسی واسطے اس پر مواخذہ ہے اور دوسرا درجہ طبعی ہے اور اس میں کبھی اختلاف فطرت سے کبھی قلت و کثرت مزاولت سے کمی بیشی ہوتی رہتی ہے اور درجہ عقلی کی تدبیر تفکر ہے اور گو تفکر کے بعد اثر ہونا اور لین پیدا ہونا اختیاری نہیں ہے مگر حق تعالیٰ شانہ کی عادت ہے کہ اس کے بعد پیدا کر ہی دیتے ہیں پس یہ درجہ لین کا اختیاری اس معنی کے ہوا کہ اس کا سبب اختیاری ہے جیسا کہ بصر کو اختیاری کہتے ہیں حالانکہ براہ راست اختیاری نہیں کیونکہ آنکھ کھولنے کے بعد نہ دیکھنا اختیار میں کہاں ہے اور اختیاری وہی ہے کہ جس کا کرنا نہ کرنا دونوں قدرت میں ہوں اس سے معلوم ہوا کہ آنکھ کھولنا تو اختیاری ہے اور دیکھنا غیر اختیاری مگر چونکہ آنکھ کھولنے کے بعد دیکھنا لازم ہے اس لئے دیکھنے کو اختیاری کہا جاتا ہے بس اسی طرح لین بھی اپنی ذات میں غیر اختیاری ہے مگر اس کا سبب یعنی تفکر اختیاری ہے اور اس تفکر پر وہ ہمیشہ مرتب ہو جاتی ہے اس واسطے لین کو اختیاری کہا جاوے گا خوب سمجھ لو اور اس پر ایک تفریع بھی کرتا ہوں وہ یہ کہ کوئی مسلمان اپنے متعلق قساوت کا گمان نہ کرے کیونکہ کوئی مسلمان ایسا نہیں جو وعید سن کر فکر نہ کرے اور اس کے قلب میں مواخذہ اخروی کھٹکا نہ پیدا ہو جاوے گو ضعیف ہی ہو مگر ہوتا ہے ہر مسلمان کو ضرور اور اگر کوئی شخص ایسا ہو کہ اس کے دل میں معصیت کر کے اور وعید سن کر اندیشہ بھی پیدا نہیں ہوتا تو وہ اپنا علاج کرے اول تو اس کا مسلمان ہونا ہی مشکل ہے مگر میں اس سے بحث نہیں کرتا فقط علاج کے لئے کہتا ہوں اگر خدانخواستہ اس درجہ کو مرض پہنچ گیا ہے کہ ایمان بھی باقی نہیں رہا تو اس کے علاج کا ایک جزو تجدید ایمان بھی ہے اس لئے میں عام لفظ کے ساتھ کہتا ہوں کہ علاج کرے غرض یہ کہ لین اختیاری سب مسلمانوں میں ہے ہاں کلی مشکک ہے کسی میں کم کسی میں زیادہ اور کمی قابل شکایت بھی ہے لیکن صرف کمی ہی کی شکایت کی جاوے مطلقاً نفی نہ کی جاوے مثلاً کسی نے شرح ملا تک پڑھا ہے وہ یوں کہے کہ میں نے عربی نہیں پڑھی یوں کہے کہ تکمیل نہیں کی اگر کوئی مسلمان لین کا بالکل انکار کرے وہ ناشکرا ہے کہ خدا نے اس کو ایک نعمت عطا فرمائی ہے اور وہ اس کا اعتراف نہیں کرتا۔

ناشکرے کی حکایت

ناشکرے پر ایک حکایت یاد آئی الہ آباد میں ایک بزرگ ولایتی تھے ان کے ذکر کی تمام شہر میں آواز جاتی تھی اکثر حضرات مقدمہ کے لئے دعا کرانے کی غرض سے ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے بزرگ مختلف ہوتے ہیں بعض تعویذ گنڈوں کے واسطے ہوتے ہیں بعض دعا کے واسطے ہوتے ہیں اور بعض بزرگ بھی نہیں اور اپریشن کرتے ہیں چنانچہ الحمدللہ میں بھی ان میں ہوں ۔

نسازد عشق را کنج سلامت　　خوشا رسوائی کوئے ملامت

(عشق سلامتی کے گوشہ کی موافقت نہیں کرتا اس کو تو ملامت کے کوچہ کی رسوائی بہت اچھی معلوم ہوتی ہے)

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں　　کانمے خواہیم ننگ و نام را

(اگرچہ عقل مندوں کے نزدیک بدنامی ہے تو ہم ننگ و نام کے خواہش مند نہیں ہیں)

بدنام ہونے میں بھی مصلحت ہے کہ کسی کو دھوکا نہیں ہوتا بخلاف اس کے عکس کے اگر کوئی اچھا سمجھ کر آوے اور خلاف پاوے تو برا ہے خیر یہ قسم تو بزرگوں سے الگ ہے مگر خود بزرگوں کی بھی مختلف قسمیں ہیں۔ بہرحال ان ولایتی بزرگ کو لوگوں نے دعا کے واسطے منتخب کر رکھا تھا میں نے بھی والد صاحب کے ہمراہ ان کی زیارت کی ہے اس وقت میری عمر بیس سال کی ہوگی کتابیں ختم ہو چکی تھیں یہ تو اپنی ملاقات کا تذکرہ درمیان میں سنا دیا اصل میں ان کا قصہ سنانا مقصود ہے کہ حافظ عبدالرحمٰن بگھرے کے رہنے والے ایک نیک آدمی تھے وہ ان بزرگ کے ہاں گئے ایک اور شخص بھی حافظ صاحب کے ہمراہ تھے ان سے پوچھا یہ کون ہیں انہوں نے بتلا دیا کہ حافظ ہیں اس پر حافظ صاحب نے ازراہ تواضع کہا کہ میں تو کچھ بھی نہیں بس وہ بزرگ خفا ہو گئے اور فرمایا او ناشکرا تو چاہتا ہے کہ قرآن شریف تم سے چھین لیا جاوے پھر حافظ صاحب بڑے چپ ہوئے اور جب حافظ جی وہاں جاتے تو وہ ناشکرا کہہ کر پکارا کرتے میں کہتا ہوں کہ شرح ملا تک پڑھ کر یوں کہے کہ میں جاہل ہوں یہ تو ایسا ہے کہ کوئی اپنے کو گدھا کہنے لگے واہ صاحب اچھی تواضع ہوئی۔ بس خدا نے جس کو خشوع کی نعمت عطا فرمائی ہے وہ اس کا انکار کر کے ناشکرا نہ بنے مگر تکمیل کی تدبیر کرے۔

کسی مسلمان میں قساوت نہیں

پس جب معلوم ہوگیا کہ کسی مسلمان میں قساوت نہیں ہے اور یہاں قساوت کی شکایت ہے تو اس سے معلوم ہوگیا کہ یہ آیات کافر کی شان میں ہیں چنانچہ اس جگہ اور نیز دوسرے مواقع پر مفسرین تفسیر میں الکافر الکافر لکھتے ہیں اور اس کا قرینہ خود قرآن شریف میں ارشاد فرمایا ہے وَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَاهُمْ يُشْرِكُوْنَ لِيَكْفُرُوْا بِمَا اٰتَيْنٰهُمْ یعنی وہ لوگ جب کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خالص اعتقاد کر کے اللہ ہی کو پکارنے لگتے ہیں پھر جب ان کو نجات دے کر خشکی کی طرف لے آتا ہے تو وہ فوراً شرک کرنے لگتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ مومن کی شان نہیں ہوسکتی بس معلوم ہوا کہ ایسی شکایات کفار کے متعلق ہیں مگر یہ سن کر بے فکر بھی نہ ہوجانا کیونکہ مسلمان ہونے کی وجہ سے اگر ان آیات کا مصداق نہیں رہے تو کیا ہوا ان پر ایک اور مقدمہ اس سے بڑھ کر قائم ہوگیا وہ یہ کہ اگر مسلمان نہ ہوتے تو اس حالت پر اتنا افسوس نہ ہوتا کیونکہ حالت کفر میں یہ کیفیت ہونا بعید نہیں ہے اور اب ہیں تو مسلمان مگر حالت کفار کے مشابہ ہے جیسا چمار کا لنگوٹی باندھنا کچھ بھی تعجب نہیں اور مسلمان شریف آدمی لنگوٹی باندھ لے تو بہت معیوب بات ہے اور اس مشابہت پر یہ سوال ہوگا کہ جب قادر تھے تو ازالہ کیوں نہیں کیا اور لین و خشوع کامل کیوں حاصل نہ کیا۔

کفر دوں

اور اس تقریر مشابہت سے حدیث مَنْ[1] ترک الصلوٰۃ متعمدا فقد کفر (جس نے قصداً نماز کو چھوڑ دیا کافر ہوگیا) کی حقیقت بھی معلوم ہوگئی کہ یہ ایک محاورہ ہے اور اس جگہ محاورہ ہی کو حکم بنایا جاوے گا حقیقی معنی پر محمول نہ کیا جاوے گا اگر کسی سید نے اپنے بیٹے کو کسی نامناسب کام کی وجہ سے چمار کہہ دیا تو کیا وہ سچ مچ چمار بن گیا کیا اس کی قومیت میں فرق آ گیا نسب میں نقص آ گیا ہرگز نہیں اگر کوئی اس کو حقیقت پر محمول کرے اور جس گھر اس سیدزادہ کی منگنی ہوئی ہے وہاں جا کر کہہ دے کہ وہ لڑکا چمار ہے تم اپنی بیٹی اس کو کیوں دیتے

---

[1] کنز العمال: ۱۸۸۷۶،۵۰۰۸، إتحاف السادۃ المتقین ۳: ۱۰

ہو اور دلیل میں خود اس کے والد کا قول نقل کرے تو کیا لڑکی والا تسلیم کرلے گا اور امام بخاریؒ نے کفر دون اسی کو کہا ہے کہ محاورات میں کفر کہہ دیا جاتا ہے اور کفر حقیقی مراد نہیں جس طرح مشابہ چمار کو چمار کہہ دیا جاتا ہے اور یہ معنی بالکل بے غبار ہیں اب چاہے مشترک کہہ دیجئے چاہے مجاز حقیقت ظاہر ہوگئی جس طرح چاہے تعبیر کردی جاوے غرض قساوت کا کوئی شائبہ بھی مسلمان میں ہونا بڑی بے غیرتی کی بات ہے گو شدت اس میں زیادہ ہے مگر استنکار اس میں زیادہ ہے اس صورت میں اس عدم تاثر کی شکایت ہے یہ خلاصہ تھا مقصود سورت کا۔

ایک علمی نکتہ

اب ترجمہ کرتا ہوں ارشاد فرمایا ہے لاَ اُقْسِمُ بِھٰذَ الْبَلَدِ (اس شہر (مکہ) کی میں قسم کھاتا ہوں) اس میں لا زائد ہے اور لا بڑھانے میں نکتہ یہ ہوسکتا ہے کہ یہ بات قسم کھانے کی تو ہے نہیں مگر تمہارے فہم کی رعایت سے کھائی جاتی ہے اور یہ علمی نکتہ ہے مگر اہل ذوق اس سے متاثر ہوتے ہیں ہمارا ذوق صحیح نہیں ہے ورنہ ہمارے بھی ہوش اڑ جاتے اور اہل ذوق نے تو اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ الآية (اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو خرید لیا ہے) الآیۃ کو سن کر بھی گردنیں جھکا دیں اس آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنین سے جنت کے عوض میں ان کی جانیں اور مال خرید لئے ہیں اس خوشی سے گردنیں جھکا دیں کہ خدا خریدار ہوگیا ہماری جان اور ہمارے مال کا اور واقعی ہے بھی یہ کتنی خوشی کی بات۔

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را　　　　کہ بیک گل میخری گلزار را

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد　　　　آنچہ در وہمت نیاید آں دہد

(ایسا بازار کہاں مل سکتا ہے کہ ایک پھول کے بدلہ میں چمن ہی خرید لے نیم جاں یعنی حقیر وفانی جان لیتے ہیں جاں باقی دیتے ہیں جو تمہارے وہم وگمان میں نہیں آسکتا وہ دیتے ہیں)

اور یہ خوشی کی بات تو ہے ہی مگر بعض اہل ذوق پر ایک اور اثر ہوا کیونکہ اشتراء میں ایک چیز مشتری کی ملک ہوتی ہے اور ایک چیز بائع کی ملک ہوتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ جان و مال حقیقت کے اعتبار سے سب خدا ہی کے ہیں ہماری ملک تو برائے نام مجازاً کہہ دی جاتی ہے پس اہل ذوق کو لفظ اشتریٰ (خرید لیا) سے یہ خیال ہوا کہ حقیقت کو چھوڑ کر جو حق تعالیٰ نے مجاز کی بناء

پر اشتریٰ فرمایا ہے اس کی یہ وجہ ہے کہ ہم جان و مال کو اپنا سمجھتے ہیں گویا اس دعوے کی طرف اشارہ ہے یعنی ہم چونکہ ان کو اپنا کہا کرتے ہیں اس واسطے حق تعالیٰ نے ان کو ہماری طرف منسوب فرمادیا ان کو اس سے اپنا دعویٰ یاد آ کر ان کی گردنیں ندامت سے جھک گئیں اور ان ہی اہل ذوق نے یہ بھی کہا کہ حدیث میں جو ایک جنت کو اور اس کے سامان کو سونے کا فرمایا ہے اور دوسری کو چاندی کا یہ رنگ کا اختلاف اس واسطے ہے کہ ان اہل ندامت کو سونے کی جنت دی جاوے گی کیونکہ ندامت سے رنگ زرد ہو جاتا ہے اور سونے کا رنگ بھی زرد ہے اور جو اس بشارت سے خوش ہوئے تھے ان کو چاندی کی جنت دی جاوے گی اور یہ ذوقی علم ہے اسی طرح کا نکتہ لا اقسم میں (میں قسم کھاتا ہوں) لا کے زائد ہونے کا ہے اور قسم قرآن شریف میں بہت جگہ ہے مگر کہیں لا ہے کہیں نہیں مثلاً والصّافات العادیات والتین (وغیرہ میں لا نہیں ہے) اور جہاں اقسم ہے وہاں لا ہے مثلاً لَا اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ وغیرہ میں لا موجود ہے اور اس میں یہ نکتہ ہے اور قسم کی مناسبت سے ایک قصہ یاد آ گیا اصمعیؒ راوی ہیں قصہ ایک بدوی کا ہے بعض طبائع سلیم ہوتی ہیں گاؤں یا شہر میں رہنے پر موقوف نہیں بلکہ آج کل تو اکثر درسیات میں مقید ہونے سے اصلی مذاق خراب ہو گیا ہے چاہئے تو یہ کہ سب علوم کو اپنے درجہ میں رکھے مگر اب سادگی نہیں رہی لفظی چکر میں پڑ جاتے ہیں اور مشاہدہ ہے کہ علم اصول میں جو زیادہ غلو کرے گا وہ تفقہ سے جاتا رہے گا اور درسیات میں مقید نہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اس میں غلو نہ کرے یہ مطلب نہیں کہ اصول کا اتباع بھی نہ کرے یہ تو امر ضروری ہے۔

آثار غلبہ

القصہ اصمعیؒ کہتے ہیں کہ ایک جمال ہمارے ساتھ تھا میں تلاوت کرتے کرتے وفی السماء رزقکم (آسمان میں تمہاری روزی ہے) پر پہنچا تو اس جمال نے کہا مکرر پڑھو انہوں نے مکرر پڑھا جمال نے سنتے ہی کہا کہ جب رزق آسمان میں ہے تو زمین میں کیوں تلاش کریں یہ کہہ کر چل دیا اور اونٹ بھی چھوڑ گیا مدتوں کے بعد ایک دن ان کو وہ جمال طواف کعبہ میں ملا اور اس نے پہچان لیا اور بڑا خوش ہوا مگر اصمعیؒ نے نہیں پہچانا دریافت کیا تو بتلا دیا کہ میں وہی شخص ہوں جس کو تمہارے طفیل اس طرح ہدایت ہو گئی تھی۔

جزاک اللہ کہ چشمم باز کر دی　　　مرا با جان جاں ہمراز کر دی

(اللہ تعالیٰ تجھے اچھا بدلہ دیں کہ تو نے میری آنکھیں کھول دیں اور میرا محبوب حقیقی سے تعلق کرادیا)

دعائیں دیں اور خوب ملے بعد ازاں کہا کہ اس وقت موقع نہ ہوا اب مجھ کو سناؤ کہ اس آیت کے آگے بھی کچھ ہے اصمعیؒ نے فَوَرَبِّ السَّمَآءِ الآیۃ پڑھا (آسمان کے رب کی قسم کھائی یہ کہہ کر ایک چیخ ماری اور اسی وقت دم نکل گیا یہ ہوتے ہیں آثار غلبہ حقیقت کے طالب علم تو یہ کہہ کر فارغ ہوگیا کہ لا زائدہ ہے اور اسی پر نازاں ہیں کہ ہم محقق ہوگئے۔ صاحبو! آگے بڑھنا چاہئے کہ یہاں اس لا کو لایا کیوں گیا۔

ایک ذوقی نکتہ

جیسا میں نے ایک ذوقی نکتہ بیان کیا ہے جو خود مقصود نہیں مگر اس سے جس چیز کی طرف اشارہ ہے وہ ضرور مقصود ہے خواہ بواسطہ اس سے متاثر ہو خواہ بلاواسطہ اسی آگے بڑھنے کے متعلق کہا جاتا ہے۔

چند خوانی حکمت یونانیاں حکمت ایمانیاں راہم بخواں

علم چوں بردل زنی یار بود علم چوں برتن زنی مارے بود

علم رسمی سر بسر قیل ست وقال نے از و کیفیتے حاصل نہ حال

(یونانی حکمت کی کتابیں کب تک پڑھو گے کچھ دن حکمت یونانی یعنی معرفت کی کتاب تو پڑھو۔ علم کا اگر اثر دل پر پڑے تو وہ محبوب دوست ہے اور اگر علم کا اثر محض بدن پر پڑے تو وہ زہریلا سانپ ہے، رسمی علم سراسر قیل وقال ہے اس سے کیفیت اور حال کچھ حاصل نہیں ہوتا)

علم چہ بود آنکہ رہ بنما یدت زنگ گمراہی زدل بزدا یدت

(علم وہی ہے جو تم کو خدا کا راستہ دکھلا دے اور دل سے گمراہی کا زنگ دور کردے)

ایں ہو سہا از سرت بیروں کند خوف وخشیت در دلت افزوں کند

(حرص نہ ہوا سے چھڑا کر تمہارے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف وخشیت پیدا کردے ۱۲)

تو ندائی جز یجوز ولا یجوز خود ندائی کہ حوری یا عجوز

(تم کو یجوز (یہ جائز ہے) اور لا یجوز (یہ ناجائز ہے) کے سوا اپنی خبر نہیں کہ تم مقبول ہو یا مردود)

ایک اور صاحب کا قول ہے۔

ایّھا القوم الذی فی المدرسہ . کل ما حصلتموہ وسوسہ

(صاحبو! جو کچھ مدرسہ میں علم (لفظی) حاصل کیا تھا وہ وسوسہ تھا)

علم نبود غیر علم عاشقی . ماتبقی تلبیس ابلیس شقی

(علم عاشقی کے علاوہ جو علم بھی ہے وہ ابلیس شقی کی تلبیس ہے)

الفاظ ومعانی سے متاثر ہونے والوں میں تفاوت

ہم لوگ الفاظ ہی کی تحقیق کرتے رہتے ہیں اور وہ حضرات معانی سے متاثر ہوتے ہیں اس تفاوت کی ایک اور مثال یاد آئی وہ یہ کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اخیر شب میں حق تعالیٰ آسمان دنیا کی طرف نزول فرماتے ہیں۔ اہل الفاظ تو اس میں پڑ گئے کہ نزول کے معنی کیا ہیں۔ سلف نے تو بدوں کھود کرید کیے ہوئے کہا تھا آمنا اور ہم چکر میں پڑے گئے اور اہل تحقیق کو سنتے ہی یہ خیال غالب ہوا۔

امروز شاہ شاہاں مہماں شدہ است مارا . جبریل باملائک درباں شدہ است مارا

(آج بادشاہوں کا بادشاہ ہمارا مہمان ہے جبریل معہ فرشتوں کے ہمارے دربان ہوئے ہیں)

اور اس خیال سے کیا عمل پیدا ہوا۔ نیند اڑ گئی اس فکر میں کہ کہیں وہ مبارک وقت ہاتھ سے نہ جاتا رہے جس کو عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

بفراغ دل زمانے نظرے بماہروئے . بہ ازآنکہ چتر شاہی ہمہ روز ہائے ہوئے

بڑے مزے کا وقت ہے فراغ کیسا ہوتا ہے کہ کوئی دھندا نہیں ہوتا۔ حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قیام لیل کا جو امر فرمایا ہے اور اس کے بعد بھی ارشاد فرمایا ہے اِنَّ لَکَ فِی النَّھَارِ سَبۡحًا طَوِیۡلًا یعنی دن میں آپ کو بہت کام ہوتا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے فَاِذَا فَرَغۡتَ فَانۡصَبۡ یعنی جب (دوسرے مشاغل سے) فراغت ہوا کرے تو محنت کیا کیجئے۔

پوری فراغت کا تحقق

ان دونوں آیتوں کے ملانے سے معلوم ہوا کہ پوری فراغت کا تحقق رات کو ہوتا ہے۔

چہ خوش وقتے وخرم روزگارے . کہ یارے برخورد از وصل یارے

(کیا اچھا وقت اور کیا اچھا زمانہ ہے کہ کوئی محب اپنے محبوب کے وصال سے لطف اندوز ہو)

البتہ جس کے سر میں سحر کو اٹھنے سے درد ہو جاتا ہو وہ معذور ہے اس کو عشاء کے بعد نوافل پڑھنے سے فضیلت حاصل ہو جاتی ہے اور جس کو کوئی عذر نہ ہو وہ اٹھے اور اس وقت کی حلاوت حاصل کرے۔ الحاصل اہل ذوق کو یہ پیش نظر ہو گیا کہ اس وقت ہم کو کیا کرنا چاہئے جیسا کہ بادشاہ کی آمد کا خواستگار جب سنے کہ بادشاہ آرہا ہے تو وہ اگر واقعی خواستگار ہے تو بادشاہ کے لئے سامان کرے گا اور بے حس اسی گفتگو میں رہ جائے گا کہ فلاں فلاں وجوہ سے بادشاہ کا آنا مستبعد ہے مگر عاشق اس استبعاد کی فکر میں نہیں پڑتا اگر اس فکر میں پڑے تو وہ عاشق نہیں بلکہ بوالہوس ہے اس فرق کے متعلق ایک واقعہ یاد آ گیا کسی کا شعر ہے۔

تیرے کوچہ سے جب اٹھ اہل وفا جاتے ہیں   تا نظر کام کرنے روبقفا جاتے ہیں

ایک شخص نے اس کا خوب رد کیا۔

ترے کوچہ سے کب اٹھ اہل وفا جاتے ہیں   وہ ہوسناک ہیں جو روبقفا جاتے ہیں

عاشق کے سامنے یہ سب احتمالات رفو چکر ہو جاتے ہیں۔

عشق آں شعلہ ست کوچوں برفروخت   ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

تیغ لا در قتل غیر حق براند   درنگر آخر کہ بعد لاچہ ماند

ماند الا اللہ وباقی جملہ رفت   مرحبا اے عشق شرکت سوزفت

(عشق وہ شعلہ ہے کہ جب وہ روشن ہوتا ہے سوائے محبوب کے سب کو فنا کر دیتا ہے لا الہ کی تیغ غیر اللہ کے ہلاک کرنے میں چلاؤ لا الہ کے بعد دیکھو کیا رہ گیا یعنی الا اللہ باقی رہ گیا باقی تمام فنا ہو گئے اے عشق شرکت سوز تجھ پر آفریں کہ سوائے محبوب حقیقی کے سب کو فنا کر دیا)

اس کو تو اپنے کام ہی سے فرصت نہیں احتمالات کس وقت سوچے۔

محو ہونے کی ضرورت

مولانا رومیؒ نے لکھا ہے کہ ایک نحوی کشتی میں سوار تھا ملاح سے پوچھا کہ کچھ نحو بھی پڑھی ہے اس نے کہا نہیں نحوی صاحب بولے تو نے آدھی عمر ضائع کی اتفاق سے کشتی کسی بھنور میں پڑ گئی ملاح نے کہا مولانا کچھ تیرنا سیکھا ہے جواب دیا نہیں ملاح نے کہا کہ آپ

نے اپنی عمر ساری ضائع کی اس پر مولانا فرماتے ہیں۔

محوی باید نہ نحو ایں جابداں - گر تو محوی بے خطر در آب راں

(یاد رکھ اس جگہ محو چاہئے نہ نحو اگر محوی ہے تو بے کھٹکے پانی میں چل) یعنی یہاں محو چاہئے نحو کی ضرورت نہیں)

چند خبطیوں کی حکایات

ایسے ہی ایک معقولی خالی تھے حالانکہ ضرورت ہے عالی بلکہ حالی ہونے کی وہ معقولی صاحب ایک تیلی کے یہاں تیل لینے گئے دیکھا کہ بیل کے گلے میں گھنٹی بندھی ہوئی ہے آپ نے تیلی سے اس کا سبب دریافت کیا تو تیلی نے کہا کہ ہم غریب آدمی ہیں بہت سے کاموں میں لگے رہتے ہیں بیل کی نگرانی نہیں کر سکتے اس کی آواز سے معلوم ہو جاتا ہے کہ چل رہا ہے آواز نہ آوے تو ہم کو اطلاع ہو جاتی ہے کہ کھڑا ہو گیا ہے جا کر ہانک دیتے ہیں معقولی صاحب بولے کہ اگر بیل کھڑا ہو کر سر ہلاتا رہے گھنٹی تو جب بھی بجتی رہے گی پھر کیسے معلوم ہوگا کہ کھڑا ہے یا چل رہا ہے تیلی نے کہا ہمارے بیل نے منطق نہیں پڑھی آپ تشریف لے جائیے کبھی منطقی احتمال سن کر یہ نہ بگڑ جاوے ایک اور خبطی تھا معقولات سے فارغ ہو کر اپنے گھر گیا باپ کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھا باپ غریب تھا مگر دو انڈے پکوائے ان کو دیکھ کر کہا ابا ہم ایسا علم پڑھ کر آئے ہیں کہ دو انڈوں کو سو بنا دیں واہ واہ صاحبزادے انڈے دیتے آئے ہیں ابا نے کہا کیسے اس نے کہا دو تو یہ اور ایک ان کا مجموعہ تین ہوئے پھر تین یہ اور ایک ان کا مجموعہ مل کر چار ہوئے اسی طرح سو تک پہنچا دیا اور کہا ھلم جرا الی ما لا یتناھی (اور ایسے ہی بلا تناہی چلے جاؤ) مقولہ مشہور ہے لولا الا عتبارات لبطل الحکمۃ اگر اعتبارات نہ ہوتے تو حکمت باطل ہو جاتی) مگر بعض اعتبارات ایسے ہیں کہ ان کی بابت لولا الاعتبارات لبطل الحماقۃ (اگر اعتبارات نہ ہوتے تو حماقت باطل ہو جاتی صادق ہے۔ بڈھا تھا عقلمند آخر اس کا باوا ہی تو تھا اس نے کیا کیا کہ ایک انڈا تو اٹھا کر خود کھا لیا اور دوسرا اٹھا کر چھوٹے بیٹے کو دے دیا اور ان معقولی صاحب سے کہا کہ بیٹا باقی اٹھانوے جو تم نے بنائے ہیں وہ تم کھا لو اب وہاں تھا کیا کھانے کو وہ تو سب زبانی جمع خرچ

تھا جیسے حکایت ہے کہ ایک منیم حساب کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا ہاتھ لگے دو ہاتھ لگے چار ایک فقیر سنا تا رہا اور اس کے ساتھ لگوں کو جوڑتا رہا جب سو دو سو ہاتھ لگ چکے تو کہا منیم جی ایک پیسہ ہمیں بھی اس نے کہا بھئی اس وقت ہے نہیں فقیر کہنے لگا تم نے میرے سامنے اقرار کیا ہے کہ اتنے ہاتھ لگے منیم نے کہا وہ تو کاغذ ہی میں ہیں سچ مچ ہاتھ نہیں لگا ایک اور حکایت یاد آئی ایک بنیا محاسب تھا کہیں لالہ صاحب کنبے سمیت بہلی میں جا رہے تھے راستے میں دریا آیا تو آپ نے بانس لے کر پانی ناپا کہ کنارے پر دیکھا کتنا ہے اور درمیان میں دیکھا کتنا اس کے بعد آپ نے اوسط لگایا تو اوسط کمر تک نکلا بہلی بان سے کہا چل پانی کا اوسط کمر تک ہے وہ چل دیا جب ڈوبنے لگے تو پھر پوتھی نکال کر حساب جانچا کہ شاید غلط ہو مگر حساب صحیح تھا اس پر آپ فرماتے ہیں لیکھا جوں کا توں کنبہ ڈوبا کیوں۔

حضرت جہاں واقعیت کی ضرورت ہو وہاں اعتبارات سے کیسے کام چلے پس اہل رسوم الفاظ کے چکر میں رہتے ہیں اور اہل معانی دور پہنچ جاتے ہیں اور ہم ان پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ بات کو نہیں سمجھتے اور وہ ہمارے اعتراض کا جواب تک نہیں دیتے کہ اس میں مشغول ہو کر سفر کھوٹا ہو جاوے گا بلکہ اگر کسی کو اپنے ہمراہیوں میں سے جواب کے درپے ہوتا دیکھا تو اس کو خطاب کر کے کہتے ہیں۔

بامدعی مگوئید اسرار عشق دستی ۔۔۔ بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

مدعی کے سامنے عشق دستی کے اسرار نہ بیان کرو اس کو خود پرستی اور رنج میں مرنے دو چپ چاپ آگے چلے جاتے ہیں حتیٰ کہ باغ قدس میں جا پہنچے اور یہ الفاظ کے چکر میں پڑا رہا۔

اہل بصیرت کا حال

میں اس میں گفتگو کر رہا تھا کہ نزول کی حدیث میں ظاہرین تو لفظ کی تحقیق میں پڑ گئے اور اہل بصیرت نے اس کے مقتضا پر عمل کیا کہ اس وقت کی قدر کی۔ اس طرح ہم لا القسم۔ میں لا کو زائد کہہ کر نازاں ہو گئے اور اپنے آپ کو محقق سمجھنے لگے اول تو محقق ہی کیا ہوئے اور ہوئے بھی تو الفاظ کے مگر یہاں تو دوسری چیز کی ضرورت ہے یعنی عمل کی کسی نے خوب کہا ہے۔

مغرور سخن مشو کہ توحید خدا ۔۔۔ واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

(دھوکہ مت کھاؤ توحید خدا کو ایک ماننے کا نام ہے نہ ایک کہنے کا)

واقعیت حاصل ہونی چاہئے کہ نرے الفاظ سے کام نہیں چلتا بہرحال ترکیب میں جب لا زائد ہو تو لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ کے معنی ہوئے میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی یعنی مکہ کی میں ہر لفظ کے ساتھ مختصر علوم بیان کرنا چاہتا ہوں اس میں یہ بات بیان کرنا ہے کہ غیر اللہ کی قسم کھانا جائز نہیں رکھا گیا مگر حق تعالیٰ نے بہت جگہ غیر اللہ کی قسم کھائی ہے سو اول تو وہ حاکم ہے اس کے افعال میں چوں و چرا کی مجال نہیں اس لئے یہ سوال ہی بیکار ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حکمت اور غرض اصلی قسم کی تاکید کلام ہے اور تاکید کے دو طریق ہیں ایک تو معظم کی قسم کھانا اور دوسرا طریق ایسی چیز کا ذکر کرنا جس میں غور کرنے سے جواب قسم کی تائید جس سے یہ کلام بمنزلہ قضایا قیاسا تھا معہا کے ہو جاتا ہے یعنی ایک ایسی چیز کا پتہ دے دینا کہ اس میں غور کرنے سے صدق کلام معلوم ہو جائے جب یہ سمجھ لیا تو سنو کہ پہلی قسم میں لازم ہے کہ مقسم بہ غیر اللہ نہ ہو کیونکہ ایسی تعظیم بالغ صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور دوسری قسم میں غیر اللہ کی قسم بھی فی نفسہ جائز ہے اور اس کا مقتضا تو یہ تھا کہ مخلوق کے لئے بھی یہ قسم جائز ہوتی مگر چونکہ یہ غرض مشہور و متعارف نہیں ہے اس لئے ذہن سبقت کرے گا پہلی قسم کی طرف اس واسطے سدا للباب وصونا عن الایھام مطلقاً غیر اللہ کی قسم کو ممنوع کر دیا گیا کیونکہ اعتبار غالب احوال کا ہونا اور غالب یہی ہے کہ معظم کی قسم کھا کر کلام کی تاکید کرتے ہیں۔ اور حق تعالیٰ نے جو بعض مخلوق کی قسم کھائی ہے اس میں قسم اول کا تو شبہ بھی نہیں ہو سکتا اس لئے اس سے بڑا کون ہے اس لئے لامحالہ دوسری غرض کی طرف ذہن جاوے گا اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے اللہ کا شکر ہے کہ نئی بات سمجھا دی جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو یہ شبہ جاتا رہا کہ غیر اللہ کی قسم کیوں کھائی گئی بس اب غور کرنا چاہئے کہ مقسم بہ کو مقسم علیہ سے تائید کا کس طرح علاقہ ہے سو اس جگہ مقسم علیہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ (ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے) ہے یعنی ہم نے انسان کو سختی میں پیدا کیا ہے اب مقسم بہ میں غور کیا جاوے کہ اس سے اس مضمون کی تائید ہوتی ہے یا نہیں سو مقسم بہ مکہ معظمہ ہے اور اس کی شان فی نفسہ و نیز باعتبار اضافت کے سخت ہے کیونکہ وہ وادغیر ذی زرع (جنگل بلا کھیتی والا) ہے اور وہاں گرمی بھی بڑی سخت ہے بس اس سے خود مشقت کا پتہ لگتا ہے۔

علمی اور تاریخی توجیہ

بس صاف معلوم ہوگیا کہ اس مقسم بہ کو دخل ہے مقسم علیہ کے اثبات میں بطور اثبات النظیر بالنظیر کے یہ تو اس کی شدت تھی فی نفسہ اور اضافہ شدت یہ ہے کہ مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ بہت مشقت کا تھا تو اس کا ذکر مذکور ہوگیا مشقتوں کا خاص کر جبکہ حل کے یعنی نازل کے ہوں یعنی آپ کی اقامت مکہ کے زمانہ میں مکہ کی قسم کھائی یہ تو علمی اور تاریخی توجیہ ہے اور عشاق نے اس انت حل سے کچھ اور سمجھا اور قرآن مجید کی یہ حالت ہے۔

بہار عالم حسنش دل وجاں تازہ میدارد برنگ اصحاب صورت رابہو ارباب معنی را

(اس کے عالم حسن بہار ظاہر پرستوں کے دل وجان کو رنگ سے اور حقیقت پرستوں کے دل وجان کو بو سے تازہ رکھتی ہے) اور وہ کیا سمجھا ہے۔

جلالت شان رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم

عشاق نے یہ سمجھا ہے کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جلالت شان کی طرف اشارہ ہے کیونکہ مطلقاً مکہ کی قسم نہیں کھائی بلکہ جب آپ اس میں رونق افروز ہوں عشاق کے محاورہ میں گویا آپ کے خاک پا کی قسم کھائی ہے اور اس میں عربیت متروک نہیں ہوئی بلکہ نعمت سے متبادر ہے اس لئے یہ محض نکتہ نہیں ہے۔ بس عشاق کا ذہن اس طرف گیا کہ آپ کی ذات تو بہت بڑی ہے جبکہ آپ کے نزول سے مکہ قابل قسم ہوگیا۔ مگر اس عنوان محبت سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ خدا عاشق ہے نعوذباللّٰه منه (ہم اس سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں) اس کا دعویٰ لفظاً ومعنیً خلاف واقع ہے۔

عشق کے بارے میں ایک مختلف فیہ روایت

لفظاً تو اس طرح کہ یہ لفظ قرآن وحدیث میں عام طور سے نہیں آیا ہے یعنی بجز ایک روایت کے کہیں عشق کا مادہ مستعمل نہیں ہوا پھر وہ روایت بھی مختلف فیہ ہے وہ روایت یہ ہے من عشق فعف و كتم و مات فهو شهيد[1] (جو شخص کسی پر عاشق ہوگیا پس اس نے

---

[1] إتحاف السادة المتقين ۷:۴۳۹، الدر المنثورہ للسیوطی:۱۵۲

عفت اختیار کی اور عشق کو چھپایا اور مرگیا وہ شہید ہے) اور دوسری حدیث سے عفت کی تفسیر مفہوم ہوئی ہے العینان تزنیان و الرجلان تزنیان و الید ان تزنیان یعنی ہاتھ پاؤں اور آنکھ سب زنا کرتے ہیں پس معلوم ہوا کہ عفت میں ان سب کا محفوظ رکھنا لازم ہے نیز اسی حدیث میں القلب یزنی بھی فرمایا ہے اس سے معلوم ہوا کہ محبوب کا تصور بھی قصداً نہ کرے کہ یہ قلب کا زنا ہے اور اس تصور کا حدوث غیر اختیاری کو معاف ہے مگر اس کا بقائے اختیاری معاف نہیں جیسا کہ نظر فجاءۃ کا حکم ہے کہ اگر اس کو باقی رکھا جاوے تو معصیت ہے لوگ تصور کو ممنوع ہی نہیں سمجھتے حالانکہ یہ جڑ ہے سارے مرض کی اور اسی سے قلب میں گھر ہو جاتا ہے بس عف کے یہ معنی ہوئے کہ اس کا تصور تک نہ کرے اور اس کے بعد کتم و مات فرمایا کہ اسی مشقت میں مر گیا اور آخر تک عفیف رہا تو شہید ہوگا۔ اس حدیث کا مضمون تو قواعد سے صحیح ہے کیونکہ وہ شخص سخت مجاہدہ میں رہا اس واسطے شہادت کا درجہ ملے گا لیکن سند اس حدیث کی متکلم فیہ ہے بعض نے موضوع تک کہا ہے غرض یہ ہے کہ اگر اس روایت کو صحیح بھی مان لیا جاوے تب بھی یہ بات ظاہر ہے کہ یہ لفظ کثرت سے استعمال کرنے کا نہیں ہے۔ خصوصاً اللہ تعالیٰ کے تعلق کو جو بندہ کے ساتھ ہے عشق کہنا اور بھی برا ہے کیونکہ عشق کا لفظ محاورہ کے اعتبار سے دلالت کرتا ہے عاشق کے احتیاج و افتقار پر۔ اور جس لفظ سے احتمال ہو افتقار خداوندی کا وہ لفظ قابل ترک ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک اعرابی نے کہہ دیا تھا تستشفع باللہ علیک یعنی شفیع لاتے ہیں ہم آپ کے پاس خدا کو تستشفع باللہ (اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے) حضور صلی الہ علیہ وسلم سخت ناراض ہوئے اور اس کہنے سے بشدت منع فرمایا کیونکہ شفاعت کا لفظ بتلاتا ہے کہ جس کے ہاں شفاعت لائی جاوے وہ شفیع سے معظم ہے یہ خرابی معنوی ہے اس میں خلاصہ یہ ہے کہ عشق کا لفظ خدا تعالیٰ کی شان میں ہرگز نہ استعمال کرنا چاہئے کیونکہ اس میں لوازم مذکورہ کا ایہام ہے اور وہ جائز نہیں بعض شاعروں نے بہت ہی بے باکی کی ہے کہ لوازم قبیحہ کے ایہام سے تجاوز کر کے ان کی تصریح کر دی جیسا کہ بعض نے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دولہا دولہن بنایا ہے خدا کی پناہ یہ شخص قرآن کی صاف نفی کرتا ہے وَلَمْ تَكُنْ لَّهُ صَاحِبَةٌ (اس کی کوئی بیوی نہیں ہے)

---

[1] مسند الإمام أحمد ۲:۳۴۳، إتحاف السادة المتقين للزبيدي ۷:۳۳۴

بعض شعراء کی بے باکی

اور ایک شاعر نے کہا ہے۔

پئے تسکین خاطر صورت پیراہن یوسف

محمدؐ کو جو بھیجا حق نے سایہ رکھ لیا قد کا نعوذ باللہ (اللہ کی پناہ) یہ تو خدا تعالیٰ کو قیاس کرنا ہے بندوں پر اول تو یہی افتراء عظیم کہ اس کو دل بہلانے کی ضرورت ہو اور اگر اس محال کو فرض کر لیا جائے تو اللہ میاں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں نظر نہیں آتے تھے جو سایہ رکھنے کی ضرورت ہوئی مگر شاعروں کے ہاں تو نئی بات اور تک بندی کی قدر ہے چاہے مضمون کفر ہی ہو اکثر شاعر بے باکی کرتے ہیں۔ اور جہلاء کا کیا ذکر افسوس ہے کہ ایک عالم نے شعر ذیل کہا ہے اور عالم بھی محض نام کے نہ تھے بلکہ سچ مچ عالم تھے مگر شاعری کے خبط میں آپ کو کچھ نہ سوجھا اور یہ شعر لکھ مارا۔

طواف کعبہ مشتاق زیارت کو بہانہ ہے کوئی دہپ چاہیۓ رقیبوں کی خوشامد کا

اول تو مضمون خلاف ایمان دوسرے خلاف تاریخ کوئی ان سے پوچھے کہ کیا مدینہ کے ہر راستہ میں مکہ شریف آتا ہے شاعر نے شاید جغرافیہ نہیں پڑھا اور گو میں نے بھی نہیں پڑھا مگر اتنی بات تو سننے سے سب کو ہی معلوم ہے کہ مدینہ کے اور بھی راستہ ہیں پھر خود اہل مدینہ بھی کعبہ کا طواف کرتے ہیں شاعر صاحب ان کی نسبت کیا کہیں گے کچھ نہیں سب خرافات ہے یہ شاعر صاحب بہت بڑے علامہ تھے مگر بدعتی تھے شاعری کے نشہ میں ایسی جرأت کر بیٹھے۔

رسولؐ کا ادب ہمارا ایمان ہے

ان بدعتیوں کو بڑی جرأت ہوتی ہے یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں خدا تعالیٰ اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کی گستاخی سے بھی باک نہیں کرتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب تو ہمارا ایمان ہے مگر کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کے واسطے خدا کی بے ادبی کی بھی اجازت دے دی جاوے انبیاء کی توہین کی بھی اجازت دے دی جاوے کیا خدا تعالیٰ اور انبیاء علیہم السلام کی گستاخی مدح رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے خدا کی پناہ ان لوگوں کی عقلیں مسخ ہو گئی ہیں کہ جب ان کو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت اور گستاخی سے

روکا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و تعظیم سے روکتے ہیں۔ اگر کوئی بے وضو اور بے غسل نماز پڑھنے لگے اور اس کو روکا جائے کہ اس حالت میں نماز مت پڑھو بلکہ وضو غسل کر کے پڑھنا چاہئے تو کیا اس کو مانع صلوٰۃ کہا جاوے گا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ یہ ان لوگوں کا ذکر تھا جو محبت میں حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں لیکن اگر حدود میں رہ کر قسم کی یہ توجیہ کی جاوے کہ اس قسم میں وَاَنْتَ حِلٌّ بِھٰذَا الْبَلَدِ (آپ کو اس شہر میں لڑائی حلال ہونے والی ہے) کی قید سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جلالت شان و محبوبیت کی طرف اشارہ ہے اور گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خاک پا کی قسم کھاتا ہے تو یہ جمع بین الادب و العشق (عشق و ادب جمع کرنا ہے) یہ توجیہ تو اہل محبت کے مذاق پر تھی۔

اہل عقل کے مطابق توجیہ

اور ایک توجیہ اہل عقل کے مذاق پر یہ ہو سکتی ہے کہ اس قسم میں تو حسب تقریر سابق وہاں اس کی مشقتوں کا ذکر ہے اس کو سن کر یہ خیال ہوتا ہے کہ خدا جانے کب تک یہ مشقت رہے گی۔ اس لئے بطور جواب فرماتے ہیں کہ آپ اس میں نزول اجلال فرمانے والے ہیں یعنی آپ وہاں کے بادشاہ ہوں گے پس اس بشارت سے مشقت میں تخفیف ہوگئی کیونکہ اس مشقت کے زوال کی امید ہوگئی اور ممکن ہے کہ سورہ والتین میں بلد امین کی قسم اسی وجہ سے ہو کہ اس میں بھی جواب قسم میں ایک جزو مشقت کا مذکور ہے ثُمَّ رَدَدْنَاہُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ (پھر ہم اس کو پستی کی حالت والوں سے بھی پست کر دیتے ہیں) وہ جزو خاص اس قسم کے مناسب ہو جاوے گا اور دوسرے اجزاء دوسری قسموں کے مناسب ہو جاویں گے۔

حکایت بخلاء

والتین پر ایک قصہ یاد آ گیا کہ ایک بخیل کے پاس ایک بدوی آیا اتفاق سے بخیل صاحب انجیر کھا رہے تھے بدوی کو دیکھ کر انجیر کمبل کے نیچے چھپا دیئے اور بدوی سے بات ٹالنے کے واسطے دریافت کیا کہ تم کو کچھ قرآن یاد ہے اس نے کہا ہاں اور بسم اللہ کر کے پڑھنا شروع کیا وَالزَّیْتُوْنِ وَطُوْرِ سِیْنِیْنَ بخیل نے کہا این التین یا اخی کہ والتین کہاں گئی اس کو کیوں نہیں پڑھا بدوی نے جواب دیا ھو تحت کسائک یعنی وہ تیرے

کمبل کے نیچے ہے بخل پر ایک اور واقعہ ہے ایک بخیل کے ہاں مہمان آ گیا کھانے کا وقت آ گیا چاہا کہ بہانہ کرکے گھر جا کر کھانا کھالے اس طرح سے کہ مہمان کو خبر نہ ہو اس لئے پاخانہ کا بہانہ کرکے گھر گئے اور یہ بہانہ ایک معنی کو صحیح بھی تھا کیونکہ شمس بازغہ میں اکل کی ایک غایت تغوط بھی لکھی ہے پس اس نے اصل غایت کا بیان کردیا تو کیا برا کیا القصہ اس بہانہ سے چپ چاپ کھانا کھا کر واپس آیا اور اتفاق سے کھانے میں مونچھوں میں ایک چاول رہ گیا وہ مہمان صاحب دیکھ کر کہتے ہیں میاں صاحب آپ کی مونچھوں میں پاخانہ لگا ہوا ہے ذرا صاف کرلیجئے۔ یہ تو استطرادی مضمون تھا اب عود کرتا ہوں کہ یہ تو پہلی قسم کا بیان تھا بہرحال اثبات مشقت میں اس قسم کو دخل ہے جیسا کہ مفصل بیان ہو چکا۔

دوسری قسم وَوَالِدٍ وَّ مَا وَلَدَ کی ہے اور ولد میں صیغہ کی تذکیر سے موصوف کی تذکیر مقصود نہیں ہے بلکہ یہاں جنس مراد ہے اور شامل ہے ماں کو بھی ترجمہ یہ ہے کہ ماں باپ اور بچوں کی قسم اس میں بھی وہی اشارہ ہے مشقت کی طرف اور یہ مشقت والدہ کے ساتھ مخصوص نہیں کیونکہ والد بھی مشقت سے خالی نہیں ہے گو والدہ کی مشقت زیادہ ہے جس کو دوسری جگہ تفصیلاً فرمایا ہے حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰی وَهْنٍ اور والدہ کو اگر بالکل ہی مشقت نہ ہوتی تو لَاتُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ (نہ ضرر چاہے ماں اپنی اولاد کا اور نہ لڑکے والا اپنی اولاد کا) نہ فرمایا جاتا گو ولادت وغیرہ میں ماں کو بہت تکلیف ہوتی ہے لیکن روپیہ تو بیوی بچوں کی سب ضرورتوں میں باپ ہی دے گا اس بے چارے پر یہ کیا کچھ کم مصیبت ہے اور یہ مشقت چونکہ ثقیل تھی اس لئے مولود له (لڑکے والا) کہہ کر اس کی مشقت میں تخفیف کردی یعنی یہ تیرا ہی تو ہے اگر کچھ تکلیف ہوتی ہے تو کیا مضائقہ ہے قاعدہ ہے کہ اپنا ہونے کی وجہ سے گرانی نہیں ہوتی۔

تشدید میں کمی

اس تصور سے تشدید میں کمی ہو جاتی ہے مگر وہ تشدید مراد نہیں جو ابوداؤد پڑھاتے ہوئے ایک طالب علم نے گھڑا تھا۔ قصہ یوں ہوا کہ جب ابوداؤد میں تشدید فی البول (پیشاب میں شدت کرنا ہے) کا باب آیا تو میں نے دریافت کیا کہ بول میں تشدید تو کسی

حرف پر بھی نہیں پھر اس کو ترجمۃ الباب کیسے باندھا ایک صاحب بولے کہ یہ تو شرح وقایہ کا سوال ہے۔ خدا جانے یہ وہ کیا سمجھا ہوگا۔ اور یہ تو والد یعنی ماں باپ کی مشقت کا بیان تھا اب میں ماولد کے متعلق بیان کرتا ہوں کہ صاحبزادہ پر کیا مشقت گذرا کرتی ہے وہ مشقتیں یہ ہیں کہ اول تو وہ بے چارہ محتاج ہے بجز اس کے کہ روتا رہتا ہے خود کچھ کر نہیں سکتا کیا یہ مشقت نہیں دوسرے اکثر پٹتا ہے پھر بہ نسبت بڑی عمر کے بچہ بیمار بھی بکثرت ہوتا ہے اور اس سے گو والدین کو بھی تکلیف ہوتی ہے مگر معروض بالذات تو بھی صاحبزادہ ہے اور سب سے بڑی مصیبت بچوں کو مکتب جانے کی ہے۔

حکایت تعزیت مامون رشید

مامون رشید بادشاہ کا لڑکا اور اس کا ایک خادم پڑھنے جایا کرتے تھے خادم کا انتقال ہو گیا مامون نے یہ خیال کر کے کہ اس کا رفیق تھا اس لئے رنج ہوا ہوگا کلمات تعزیت کے کہے شہزادہ نے کہا کہ بہت اچھا ہوا جو مر گیا کیونکہ مکتب کی مصیبت سے چھوٹ گیا یہ یاد نہیں رہا کہ یہ قصہ مامون رشید کا ہے یا ہارون رشید کا کسی تاریخ میں دیکھا تھا۔ اور ایک قصہ زبانی سنا ہے کہ ایک شخص کو پھانسی دینے کے واسطے لے جا رہے تھے وہ بے چارہ رو رہا تھا لڑکوں نے اس کے رونے کا سبب پوچھا ان کو بتلا دیا گیا تو لڑکے کہتے ہیں بھلے مانس روتا کیوں ہے مکتب میں تو نہیں لے جاتے۔ اور روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ چھٹی کے بعد تو مکتب سے بھاگتے ہوئے جاتے ہیں اور آتے ہیں آہستہ آہستہ اور جمعرات کو دیکھئے تو خوش خوش کہ کل کو چھٹی ملے گی اور جمعہ کی شام کو پژمردہ کہ کل گرفتاری کا دن ہے یہ تو نفس مکتب کی مشقت ہے اور جو استاد صاحب کوئی قصائی مل گئے تو کچھ نہ پوچھئے صورت دیکھ کر کانپ اٹھتے ہیں اور جو کسی دن ان کا ہاتھ پڑ گیا تو خیر نہیں خاص کر اگر وہ استاد صاحب اندھے بھی ہوئے تب تو مصیبت بلکہ مصائب پر مصائب ہیں میں نے خود دیکھا ہے کہ ایک اندھے حافظ جی لڑکے کے سر کو ٹانگوں میں دبا لیتے تھے اور بے تحاشا کمر میں گھونسے مارا کرتے تھے میں تو اتنے مارنے کو حرام سمجھتا ہوں کیا یہ تھوڑی مشقت ہے پھر تھوڑے دنوں میں اونٹ کے گلے میں بلی باندھ دی جاتی ہے جس کو شادی کرنا کہتے ہیں اور شادی کو خوشی کی بات سمجھا جاتا ہے لیکن درحقیقت سخت تکلیف کی چیز ہے۔

شادی ایک ماہ کی خوشی کا نام ہے

حضرت علیؓ سے کسی نے دریافت کیا تھا کہ شادی کیسی چیز ہے تو حضرت علیؓ نے فرمایا سرور شھر یعنی ایک ماہ کی خوشی ہے سائل نے کہا ثم ماذا پھر کیا ہوتا ہے فرمایا لزوم مھر (مہر کا لازم ہونا) اس نے پوچھا ثم ماذا پھر کیا؟ فرمایا کسور ظھر (کمر کا ٹوٹنا) اس نے کہا ثم ماذا فرمایا غموم دھر یعنی عمر بھر کا غم لگ جاتا ہے۔

حضرت علیؓ کی وضاحت

حضرت علیؓ بڑے فصیح تھے کیا فصیح اور مقفّٰی جواب دیتے ہیں یہ جو مسئلہ ممبریہ فرائض میں معروف ہے اس سے بھی آپ کی غایت فصاحت وذکاوت ثابت ہوتی ہے اس کا قصہ یہ ہے کہ آپ خطبہ پڑھ رہے تھے جس کا قافیہ اس طرح تھا الحمدللّٰہ الذی الیہ الرجعی و تجزی کل نفس ماسعی (سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جس کی طرف لوٹنا ہے اور ہر نفس کو جو کچھ اس نے کیا ہے بدلہ دیا جائے گا) عین خطبہ میں ایک شخص نے صورت واقعہ بیان کر کے زوجہ کو آٹھواں حصہ نہ ملنے پر اشکال کیا آپ نے فی البدیہ جواب دیا صار ثمنھا تسعا (اس کا آٹھواں حصہ نواں ہو گیا) جواب میں قافیہ تک نہیں بدلا اور پھر خطبہ اسی قافیہ پر چلتا رہا۔ مطالب السول ایک کتاب ہے اس میں آپ کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ آپ کی مجلس میں ذکر ہوا کہ زیادہ تر دائر کلام میں کون سا حرف ہے سب نے اس پر اتفاق کیا کہ الف ہے اور اسی پر بطور تفریع یہ بھی کہا گیا کہ کوئی طویل کلام الف سے خالی نہیں ہو سکتا اور تو سب نے اس پر اتفاق کیا مگر حضرت علیؓ نے فرمایا کہ خالی ہو سکتا ہے اور فرمایا لکھو میں طویل کلام بغیر الف لکھواتا ہوں اس پر ایک خطبہ پڑھا جو تین صفحوں کا ہے اس میں الف کا نام نہیں ہے اور آپ کے اور فضائل بھی عجیب وغریب ہیں میں کہتا ہوں ایسے باکمال شخص نے جب صدیق اکبرؓ سے بیعت کی تو اس سے زیادہ اور کیا شہادت ہوگی افضلیت صدیقؓ پر خاص کر جب کہ اسد اللہ بھی ہوں سب کو معلوم ہے کہ وہ بڑے شجاع تھے پھر باوجود ایسی شجاعت کے مغلوب کیسے ہو سکتے تھے تو یہ کہنا کہ حضرت علیؓ دل سے بیعت نہیں ہوئے تھے درحقیقت حضرت علیؓ پر تہمت ہے اور ان کی تنقیص ہے بھلا یہ ہو سکتا ہے کہ ایسی شجاعت اور ایسے کمالات

اور پھر بھی تقیہ کی وجہ سے بیعت ہو گئے نعوذ باللہ منہ یہ واقعات اسطرادًا بیان میں آ گئے اصل مقصود شادی کے موقع پر جو حضرت علیؓ کا مقولہ تھا اس کا ذکر کرنا تھا جس کا مقصود یہ ہے کہ جو فرحت افزا واقعہ کہلاتا ہے وہ بھی سراسر کلفت ہے جس دن شادی ہو گئی تو گویا آج گاڑی میں جتے ہیں اور جو کہیں بال بچے ہو گئے تو پوری مشقت سر پر آ پڑتی ہے حضرت حاجی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے جب تک آدمی مجرد رہتا ہے انسان ہے اور جب شادی ہو جاتی ہے تو چار پایہ ہو گیا اور بال بچے ہو کر مکڑا بن جاتا ہے بہر حال سب مصیبت ہی مصیبت ہے۔

اور اس مقام پر اور اشیاء کی قسم بھی ہو سکتی ہے مگر خدا تعالیٰ نے ان چیزوں کی قسم کھائی ہے جو کہ ہمیشہ نظر میں رہتی ہیں تا کہ ان کے مشاہدہ و استحضار سے فائدہ عام اور تام ہو اور اسی بناء پر اَفَلاَ یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ (تو کیا وہ لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح پیدا کیا گیا ہے) میں اونٹ میں غور کرنے کو فرمایا کہ وہ اکثر پیش نظر رہتا ہے ہر وقت استعمال میں رہتا ہے نہ اس واسطے کہ وہ بحسن متعارف حسین ہوتا ہے کیونکہ آیات خداوندی کا انحصار اہل حسن ہی میں نہیں ہے عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

محقق ہماں بیند اندر ابل　　　　که در خوب رویان چین و چگل

(محقق اونٹ میں بھی وہی دیکھتا ہے چین و چگل کے حسینوں میں حسن پایا جاتا ہے)

گو جن کی نظر آ گے ہے وہ اونٹ وغیرہ کو بھی حسین کہتے ہیں مگر ایک خاص حیثیت سے جس کی تصریح اس شعر میں ہے۔

حسن خویش از روئے خوباں آشکارا کردہ　　　　پس بچشم عاشقاں خود را تماشا کردہ

(اپنے حسن کو حسینوں کے چہرہ سے ظاہر کیا ہے عاشقوں کی آنکھ میں اپنے آپ کو تماشا بنایا ہے)

اور میں اس کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں کہ اگر آئینہ میں سے محبوب کا عکس نظر آتا ہو مگر آئینے اپنے خواص میں مختلف ہوں تو کیا ان مختلف عکسوں میں سے کوئی عکس ایسا بھی ہے جو عاشق کو محبوب نہ ہو نہیں بلکہ اس کو تو سب میں یکساں نظر آتا ہے تو پھر کیا اونٹ مظہر صنع حق نہیں ہے کیا اس میں شان خداوندی نظر نہیں آتی مگر اس کے واسطے نظر چاہئے ہر ایک آنکھ سے یہ شان نظر نہیں آ سکتی امیر شاہ خاں صاحب نے ایک حکایت لکھوائی ہے ایک بزرگ کی

کہ وہ ہر حسین چیز پر عاشق ہو جاتے تھے لیکن یہ سن کر ہر شخص دعویٰ نہ کر بیٹھے کہ ہمارے نزدیک بھی ہر شئے آئینہ جمال الٰہی ہے اور پھر اس آڑ میں نفس پرستی کا اس کو خوب موقع ملے بلکہ اس کے واسطے کسی محقق کی تصدیق کی ضرورت ہے۔

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خودرا عیسیٰ نتواں گشت بہ تصدیق خرے چند

(اپنے جوہر صاحب نظر کو دکھلاؤ عیسیٰ چند احمقوں کی تصدیق کرنے سے عیسیٰ نہیں ہوتے ہیں)

کیونکہ غیر محقق کی تصدیق بھی کافی نہیں ہے تو پھر اپنی تصدیق تو کیسے کافی ہوگی اور اگر لوگوں کو دھوکہ بھی دیا تو کیا حق تعالیٰ سے بھی واقعہ کو چھپالے گا (ع) با خدا تزویر وحیلہ کے رواست۔ بس جب تک کوئی مبصر نہ کہہ دے اس وقت تک اعتبار نہیں ہے بہر حال جو شخص اپنے آپ کو خود ہی پارسا سمجھنے لگے اس کو حسین کی طرف نظر کرنا جائز نہیں ہے البتہ جو محقق ہیں ان کو ہر چیز میں جمال خداوندی نظر آتا ہے جیسا کہ وہ بزرگ کہ ہر عمدہ چیز کی طرف میلان رکھتے تھے حتیٰ کہ دو دو سو میل کا سفر کرکے عمدہ مکانوں کو دیکھنے گئے حصار کے علاقہ سے ایک شخص اونٹنی لے گیا ان کو خبر ہوئی اس کو دیکھنے گئے اور جا کر گلے سے لگا لیا اور کہا سبحان اللہ کہاں ظہور فرمایا ہے۔

بسکہ در چشم و جاں فگارم توئی ہر چہ پیدا میشود از دور پندارم توئی

(میری چشم وجاں میں تو ہی سمایا ہے جو کچھ دور سے ظاہر ہوتا ہے تجھی کو گمان کرتا ہوں)

حسن خویش از روئے خوباں آشکارا کردہ پس بچشم عاشقاں خود را تماشہ کردہ

(اپنے حسن کو حسینوں کے چہرہ سے ظاہر کرکے عاشقوں کی آنکھ میں اپنے آپ کو تماشا بنایا ہے)

مگر یاد رکھو کہ خوب کا لفظ فقط حسین ہی پر نہیں بولا جاتا بلکہ ہر چیز پر اس کا اطلاق ہوتا ہے خلاصہ یہ کہ سب مظاہر ہیں جمال خداوندی کے ان میں غور کرنا چاہئے تا کہ صانعیت خدا کا مراقبہ راسخ ہو جاوے اور ان میں بھی جو چیزیں ہر وقت پیش نظر رہتی ہیں وہ زیادہ قابل توجہ ہیں اور قسم کے لئے ایسی ہی چیزیں اختیار کی گئی ہیں۔

حاکمانہ جواب دینے کی ضرورت

اوران چیزوں کے ہروقت پیش نظر رہنے سے یہ خیال نہ کیا جاوے کہ متبذل درجہ کی قسم ہے کیونکہ ابتذال تو بے موقع ہونے سے ہوا کرتا ہےاورصرف عظیم الشان نہ ہونے کے سبب متبذل خیال کرنا بہت بڑی حماقت ہے جیسا کہ جاہلیت والوں کی حماقت تھی کہ قرآن شریف میں مکڑی کا ذکر آنے کو معیوب کہتے تھےاور کہتے تھے کہ مکڑی اور مکھی کا ذکر قرآن شریف میں کیوں آیا ہے یہ تو معمولی چیزیں ہیں ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّ اللّٰہَ لَایَسْتَحْیِیٓ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلاً مَّابَعُوْضَۃً فَمَا فَوْقَھَا یعنی اللہ تعالیٰ مچھراوراس سے چھوٹی چیز کی مثال دینے سے شرماتا نہیں کیونکہ مثال تو ممثل لہ کے مطابق ہوتی ہے پس ان مواقع پر یہ مثالیں بالکل مناسب ہیں اور جو بات بالکل ٹھیک ہواس میں کسی کے اعتراض سے دب جانا کیا معنی۔ میں اس جگہ مصلحین ومبلغین کو ایک ضروری بات بتلاتا ہوں۔ دیکھا جاتا ہے کہ ان کو یہ اہتمام ہوگیا ہے کہ ہرسوال کا جواب حکیمانہ دینا چاہتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اس سے اعتراض کی جڑ کٹ گئی مگر حقیقت میں جڑ پختہ ہوگئی کیونکہ اس سے تو وہ معترضین عادی ہوجاتے ہیں حکمت دریافت کرنے کے اور بدوں حکمت معلوم ہوئے ہر جگہ شبہ کرتے ہیں تو پھر جڑ کہاں کٹ گئی جڑ تو اس سے کٹتی ہے کہ حاکمانہ جواب دیا جاوے۔

اصل میں آپ نائب ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس لئے قرآن وحدیث کا طرز دیکھ کر اس کے موافق عمل کرنا چاہئے اور غور کیا جاوے تو قرآن میں کہیں تو حکمتیں بیان کی گئی ہیں گو اجمالاً سہی جیسا کہ تکوینیات میں ہے یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلاً (غور وفکر کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں) اے ہمارے پروردگار آپ نے ان کو بےکار نہیں پیدا کیا) الآیۃ اور تشریعیات میں ارشاد ہے کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ (اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا اس توقع پر کہ تم متقی بن جاؤ) اور کہیں حاکمانہ شان سے کام لیا گیا ہے جیسے کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ وَھُوَ کُرْہٌ لَّکُمْ (تم پر قتال فرض کیا گیا اور وہ تم کو ناگوار ہے) اوراس کے ساتھ جو

ارشاد ہے عَسیٰ اَنْ تَکْرَھُوْا (قریب ہے کہ مکروہ سمجھو) جو بظاہر حکیمانہ جواب ہے لیکن غور کر کے دیکھا جاوے تو سوال حکمت سے روکا ہے اور مطلب یہ ہے کہ زیادہ بک بک مت کرو جاؤ کام کرو ممکن ہے کہ کوئی مصلحت ہو جس کا تم کو علم نہ ہو۔ یہ بالکل حاکمانہ شان ہے اور دیکھئے شیطان نے سجدہ نہ کرنے کے عذر میں صغریٰ کبریٰ بیان کیا تو خدا تعالیٰ نے اس کی بکواس کا بقاعدہ مناظرہ جواب نہیں دیا نعوذ باللہ اس کا جواب مشکل تھا کچھ بھی مشکل نہیں ہم جواب دے سکتے ہیں مگر خدا نے صاف صاف جواب حاکمانہ طریق پر دیا اور فرمایا اُخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّکَ رَجِیْمٌ وَاِنَّ عَلَیْکَ لَعْنَتِیْ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ یعنی یہاں سے نکل تو مردود ہے اور قیامت تک تجھ پر لعنت ہے کیا غلاموں کے ساتھ فلسفہ کی گفتگو کی جاوے گی۔

شخصی سلطنت کی تعلیم

اور یہاں سے یہ بھی پتہ لگ گیا کہ اسلام میں شخصی سلطنت کی تعلیم ہے کیونکہ شخصی سلطنت حاکمانہ ہے اور جب وہ سلطان نائب رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے تو حاکمانہ شان زیبا ہے اور جب بادشاہ سے مباحثہ ہوتا ہو جیسا کہ سلطنت جمہوری میں دستور ہے تو حکومت کیا ہوئی۔ الغرض اہل علم کو چاہئے کہ معترضین کو ہمیشہ حکیمانہ جواب نہ دیا کریں بلکہ غالب اوقات میں حاکمانہ جواب دیا کریں اس سے شبہات کی جڑ کٹ جاتی ہے دیکھو حق تعالیٰ شانہ نے مکھی مچھر کے ذکر کی حکمت اور لم نہیں بیان فرمائی بلکہ حاکمانہ طور پر ارشاد ہے اِنَّ اللّٰہَ لَایَسْتَحْیٖٓ الخ (بلاشک اللہ تعالیٰ نہیں شرماتے) اور حکیمانہ جواب یہ ہے کہ مثال ممثل لہ کے مطابق ہوا کرتی ہے اور یہاں اِلٰہِ باطلہ کا ضعف بیان کرنا ہے اور وہ جبھی ہوگا کہ یوں کہا جاوے کہ اگر ان سے مکھی بھی کوئی چیز چھین لے تو کچھ نہیں کر سکتے اگر یوں کہا جاتا کہ اگر ان سے ہاتھی چھیننا چاہے تو کچھ نہیں کر سکتے تو اس سے غایت درجہ کا ضعف نہیں ثابت ہوتا گو اتنا ضعف بھی بطلان الوہیت کے لئے بالکل کافی ہے مگر پوری حقیقت تو واضح نہ ہوتی اسی طرح فرماتے ہیں کَمَثَلِ الْعَنْکَبُوْتِ (مثل مکڑی کے) یہاں بھی مقصود مکڑی کے گھر کی مثال ہی سے حاصل ہوتا ہے اور قوی شئی کی مثال دینا ہرگز صحیح نہیں مگر نادان کفار نے اعتراض کیا اور باوجودیکہ

تھیرانہ جواب نہایت واضح اور عام فہم موجود تھا مگر پھر بھی حق تعالیٰ حاکمانہ جواب فرماتے ہیں
اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیِیٓ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا۔ بے شک خدا نہیں شرماتا
مچھر کی مثال دینے سے یا اس سے چھوٹی چیز کی مثال دینے سے) گویا مطلب یہ ہے کہ کرلو کیا
کرتے ہو ہم ایسے لغو شبہات کی پروا نہیں کرتے یہ آزادی کا جواب ہے کسی سے دبنے والے
کا کلام نہیں اور یہ بھی ایک بڑی علامت ہے قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے کی مگر باوجود صفائی
اور آزادی کے قرآن شریف میں تہذیب کی کامل رعایت کی گئی ہے کسی مقام میں تہذیب کو
نہیں چھوڑا گیا اور بعض لوگوں نے جو احصنت فرجها (انہوں نے اپنے ناموس کو محفوظ
رکھا) کو تہذیب کے خلاف کہا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس جگہ فرج کے معنی گریبان کے
ہیں اور اس کا مفہوم قریب قریب پاکدامن کے مفہوم کے ہے میں نے ایک عالم کے سامنے
یہ مضمون بیان کیا تھا انہوں نے کہا کہ کئی سال سے یہ مضمون دل میں آتا تھا مگر تعبیر نہیں کرسکتا
تھا اللہ کا شکر ہے کہ آج تعبیر بھی معلوم ہوگئی۔

علماء حاکمانہ شان میں نائب رسول ہیں

خلاصہ یہ کہ کفار کے اعتراض پر حق تعالیٰ فرماتے ہیں اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیِیٓ اَنْ
یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا۔ کہ بے شک خدا نہیں شرماتا مچھر کی مثال دینے سے
یا اس کی جو اس سے بڑھ کر ہو یعنی صغر میں اور فرماتے ہیں فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا الآیۃ یعنی جو
ایمان لائے وہ بدوں کاوش کے حق سمجھتے ہیں اور کافر بے جا اعتراض کرتے ہیں محض عناد سے
یہ صاف حاکمانہ جواب ہے اور حاکمانہ جواب سے متاثر ہونے والوں کی مدح ہے اس پر ایک
واقعہ مجھ کو یاد آیا علی گڑھ میں کالج کے ایک فاضل پروفیسر نے مجھ سے سوال کیا کہ حدیث میں
آیا ہے جب فاحشہ پھیل جاوے تو وبا پھیلتی ہے یہ بات سمجھ میں نہیں آئی میں نے کہا کیا
حدیث کا مدلول سمجھ میں نہیں آیا یا سزا اور جرم میں ربط کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تحقیق سے اس
سے سوال کیا کہ انہوں نے حدیث عربی الفاظ میں پڑھی تھی انہوں نے کہا وجہ مناسبت وارتباط
سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے کہا تو اس سے ضرر کیا ہے سوچ کر جواب دیا کہ ضرر تو کچھ بھی نہیں
لیکن اگر معلوم ہو جائے تو نفع ہے میں نے دریافت کیا کہ کیا نفع ہے کہا اطمینان اس پر میں

نے سوال کیا کہ اطمینان مطلوب ہونے کی کیا دلیل ہے کہا اگر اطمینان مطلوب نہ ہوتا تو ابراہیم علیہ السلام یوں نہ فرماتے وَلَکِنْ لِیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ (لیکن تا کہ میرا دل مطمئن ہووے) میں نے کہا کہ یہ کیا ضروری ہے کہ جو چیز ان کو مفید تھی وہ آپ کو بھی مفید ہے بس خاموش ہو گئے۔ اب میں اس کی تفصیل بیان کرتا ہوں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اطمینان قطعیات سے حاصل ہوا تھا اور یہ ظنیات سے حاصل ہوتا ہے اور دونوں میں فرق ظاہر ہے اور جب وہ جانے لگے تو میں نے کہا جناب یہ نہ سمجھئے کہ مجھ کو وجہ ربط معلوم نہیں مگر۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(یعنی کوئی ضروری بات ایسی نہیں ہے جو ہمیں معلوم نہ ہو لیکن مصلحت نہیں کہ اس کو کھلم کھلا ظاہر کریں)

سو میں نے یہ جواب حاکمانہ دیئے میں یہی کہہ رہا تھا کہ علماء حاکمانہ شان میں نائب رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو ان کو چاہئے کہ اس شان کا بھی لحاظ رکھیں منادی کرنے والے کو اعلان کر دینا چاہئے کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ اس سے اعلان کی حکمتیں پوچھے کوئی ایسے کرے گا تو وہ جو ڈنڈا ڈھول پر مار رہا ہے ایک اس کے بھی رسید کرے گا ہاں اگر بھنگی ہوا تو اتنی جرأت نہ ہو سکے گی مگر کیا علماء بھنگی ہیں توبہ توبہ۔ پس جب کوئی حکمت دریافت کرے تو صاف جواب دے دو کہ یہ ہمارا کام نہیں ہے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ کا مذاق

ہمارے مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے کسی نے دریافت کیا کہ عورتوں کے معمولی ایام میں جو روزے فوت ہوں تو ان کی تو قضا ہے اور نمازوں کی قضا نہیں اس کی کیا وجہ فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر خلاف کرو گے تو اتنی جوتیاں پڑیں گی کہ سر پر بال نہ رہیں گے اور مولانا کا مذاق ان کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے فرماتے ہیں۔

الوعظ ینفع لو بالعلم و الحکم والسیف ابلغ وعاظ علی القمم

(وعظ نفع دیتا ہے اگر علم وحکمت سے ہو اور تلوار بہت بڑا واعظ ہے)

اور فرمایا کرتے تھے کہ وانزلنا الحدید فیه بأس شدید میں حدید سے نعل ارجوتہ

مراد ہے مجھ سے ایک شخص نے ایک مسئلہ کی نسبت دریافت کیا کہ اس میں کیا حکمت ہے میں نے جواب میں لکھا کہ سوال عن الحکمۃ میں کیا حکمت ہے بس قصہ ختم ہو گیا معلوم ہوتا ہے کہ اکثر ان چاپلوسی کرنے والوں کو مال یا جاہ مطلوب ہے ڈرتے ہیں کہ آزادی کا معاملہ کیا تو لوگ معتقد نہ رہیں گے۔ نہ رہیں مارو گولی تمہاری تو یہ شان ہونی چاہئے۔

ہر کہ خواہد گو بیاؤ ہر کہ خواہد گو برو دارو گیر وحاجب ودربان دریں درگاہ نیست

(جس کا دل چاہے آئے جس کا دل چاہے جائے ہماری درگاہ میں چوبدار دربان نہیں ہے)

احمد جامؒ فرماتے ہیں۔

احمد تو عاشق بمشیخت تراچہ کار دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد

(یعنی احمد تو عاشق ہے مشیخت سے تجھ کو کیا کام محبوب کا دیوانہ مسلسلہ ہو ہو نہ ہو نہ ہو)

بعض لوگ کہتے ہیں کہ لوگوں کے الگ رہنے سے لوگوں کو نفع کم پہنچے گا تو ثواب کم ملے گا۔ میاں اپنے کام میں لگو سنت کے موافق تھوڑا کام ہونے سے بھی تم کو اتنا ثواب ملے گا کہ تم لے بھی نہ سکو گے خواہ مخواہ کس جھگڑے میں پھنسے آزاد رہنا چاہئے اور آزدی کی یہ شان ہونا چاہئے۔

دلفریباں نباتی ہمہ زیور بستند دلبر ماست کہ باحسن خدا داد آمد

(خودرو پودے زیور سے آراستہ ہیں ہمارا محبوب حسن خداداد رکھتا ہے)

زیر بار اندر درختاں کہ ثمرہا دارند اے خوشا سرو کہ زبند غم آزاد آمد

(پھل دار درخت زیر بار ہیں سرو بہت اچھا کہ ہر غم سے آزاد ہے)

ان دونوں شعروں کو حضرت والا نے مکرر پڑھا یہ تعلقات اور شہرت حقیقت میں وبال ہیں سب سے الگ رہنا چاہئے۔

خویش را رنجور ساز و زار زار تا ترا بیروں کنند از اشتہار

(اپنے آپ کو رنجور و گمنام رکھو تاکہ لوگ تم کو شہرت سے باز رکھیں)

اشتہار خلق بند محکم است بند ایں از بند آہن کے کم ست

(مخلوق کی شہرت اللہ اور ان کے بندہ کے درمیان مضبوط بند ہے یہ بند لوہے کے بند سے کم ہے)

خشمہاؤ چشمہاؤ اشکہا برسرت ریزد چوں آب از مشکہا

(غصے اور آنکھیں اور اشک تیر سے سر پر اس طرح ٹپکتے ہیں جیسے مشکوں سے پانی ٹپکتا ہے) ہاں خدا تعالیٰ باوجود گمنامی کے شہرت کسی کو دے دیں تو دوسری بات ہے اور دینوی اغراض تو رہے الگ مخلصین کے نزدیک تو بقاء سلسلہ کا خیال کرنا بھی شرک طریقت ہے۔

طالب کی شان

ایک شخص نے شکایت کی اپنے شیخ سے کہ مجھ کو نفع نہیں ہوتا شیخ نے کچھ شغل بتلا دیئے پھر بھی وہی شکایت کی کئی بار کے بعد دریافت کیا کہ تمہاری نیت اس مجاہدہ ریاضت سے کیا ہے کہا یہ ہے کہ کچھ آوے تو دوسروں کو نفع پہنچاؤں۔ فرمایا یہ تو شرک ہے اس خیال باطل کو چھوڑو یہی سدراہ ہے طالب کی تو یہ شان ہونا چاہیے۔

باوجودت زمن آواز نیاید کہ منم

(تیرے ہوتے ہوئے مجھ سے آواز نہیں آتی کہ میں ہوں اور۔

افروختن و سوختن و جامہ دریدن — پروانہ زمن شمع زمن گل زمن آموخت

(روشن ہونا جلنا کپڑے پھاڑنا پروانہ شمع اور گل نے مجھ سے سیکھا ہے)

یہ سب چیزیں عاشق کا شعار ہوتی ہیں اسی کو ایک اور کہتے ہیں مگر الفاظ آزادی کے ہیں۔

عاشقی چیست بگو بندہ جاناں بودن — دل بدست دگرے دادن وحیراں بودن

(عاشقی کیا ہے کہہ دو محبوب کا بندہ ہونا دل دوسرے کو دے کر حیران رہنا ہے)

سوئے زلفش نظرے کردن وروئیش دیدن — گاہ کافر شدن وگاہ مسلماں بودن

(اس کے زلف کی طرف نظر کرنا اور اس کا چہرہ دیکھنا کبھی فنا ہونا ہے اور کبھی باقی رہنا ہے)

اور ان الفاظ سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ تصوف میں کفر بھی کھپ جاتا ہے بلکہ یہ ایک اصطلاحی لفظ ہے کافر کہتے ہیں اصطلاح میں فانی کو اور طالب فانی فی اللہ ہوتا ہے پس شعر کا مطلب یہ ہے کہ فنا اور بقا سالک کا نقد وقت ہوتا ہے جیسا کہا گیا ہے۔

کشتگان خنجر تسلیم را — ہر زماں از غیب جانے دیگر ست

(یعنی خنجر تسلیم کے کشتوں کو ہر زمانہ میں ایک اور جان عطا ہوتی ہے)

مگر خشک لوگ ان باتوں کو کیا جانیں۔

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست   حال شیرانے کہ شمشیر بلا برسر خورند

(تمہارے پاؤں میں کانٹا بھی نہیں لگا ہے تم ان لوگوں کی حالت کو کیا سمجھ سکتے ہو جن کے سروں پر بلا اور مصیبت کی تلوار چل رہی ہے) لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ آزاد لوگ بڑے عیش میں ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ ان کے ہر وقت بھالے لگتے ہیں غرض اپنے کام میں لگے رہو اپنے طرز میں فرق نہ ڈالو کوئی معتقد ہو یا نہ ہو اگر نہ ہوگا تو بلا سے۔ تم ایک سے تعلق کر لو باقی جھگڑا الگ کرو۔

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار   بگذارند خم طرہ یارے گیرند

(میں بڑی مصلحت یہ دیکھتا ہوں کہ دوست سب کو چھوڑ کر محبوب حقیقی کی طرف متوجہ ہو جائیں) تم تو حالت فقر میں بھی دل سے غنی رہو اور تمہارے پاس کچھ نہ ہو تب بھی بادشاہ رہو حافظ شیرازی نے خوب فرمایا ہے۔

مبیں حقیر گدایان عشق راکیں قوم   شہان بے کمر و خسرواں بے کلہ اند

(عشاق کو حقارت سے مت دیکھو کہ یہ لوگ بے تخت و تاج کے بادشاہ ہیں)

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی من   کہ ناز برفلک و حکم برستارہ کنم

(گدائے میکدہ ہوں مستی کی حالت میں دیکھو کہ فلک پر ناز اور ستارہ پر حکم کرتا ہوں)

ارے بھائی اگر چند لوگ الگ بھی ہو جائیں گے تو فکر کیوں کرتے ہو اہل سموات پر حکومت کرو گے۔

تعلق مع اللہ کا طریقہ

اور اصل تو یہ ہے کہ ایک قصہ سناتا ہوں اس کو اپنا مذہب بنالو۔ قصہ یہ ہے کہ ہارون رشید نے جشن کیا تھا اور یہ کہہ دیا تھا کہ جس کو جو چیز پسند ہو اس پر ہاتھ رکھ دے وہ اسی کی ہو جاوے گی ایک لونڈی نے خود ہارون رشید پر ہاتھ رکھ دیا انہوں نے عتاب آمیز لہجہ میں اس گستاخی کا سبب دریافت کیا تو جواب دیا کہ میں جو چیز بھی لیتی وہی ایک میری ہو جاتی اس لئے میں نے آپ کو لیا تاکہ سب چیزیں میری ہو جاویں خلیفہ نے اس جواب کو بہت پسند کیا اور اس لونڈی کو اپنی خواص میں داخل کر لیا صاحبو وہ تھی لونڈی مگر بات کتنی سمجھ کی کہی صاحبو! اسی طرح اس ذات پاک کو کیوں نہیں لیتے کہ جس کے لینے سے سب تمہارے ہو جاویں نیز مشاہدہ ہے کہ جتنے روکھے بزرگ

ہوتے ہیں ان کو لوگ زیادہ لپٹتے ہیں حتیٰ کہ مجذوب تو بالکل ہی روکھے ہوتے ہیں لوگ ان کو بے حد لپٹتے ہیں۔ مجذوب گالیاں دے کر نکالتے ہیں اور لوگ خوش ہو کر پاؤں پر گرتے ہیں بلکہ اگر وہ نرمی کرنے لگیں تو کہتے ہیں کہ جب شاہ صاحب سخت تھے تو کام ہو جایا کرتا تھا اب نرم بن گئے اس لئے کام نہیں ہوتا پس اس سے معلوم ہوا کہ دنیا داروں کی چاپلوسی کی جو ضرورت گھڑ رکھی ہے وہ بالکل غلط ہے۔ ہاں مخلوق سے قطع تعلق میں یہ نیت نہ کرنا چاہئے کہ اس ترکیب سے لوگ متوجہ ہوں گے اگر یہ نیت کرلو گے تو نہ یہ مقصود حاصل ہوگا نہ مقصود اصلی یعنی تعلق مع اللہ کیونکہ سب کچھ خدا کے حکم سے ہوتا ہے اور وہ نیت کو جانتا ہے نری تدابیر سے کام نہیں ہوتا اس کی مشیت کی ضرورت ہے اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسا بالغ قدرت سے ہوتا ہے اگر کوئی شخص کسی کم سن بچے کو مقویات کھلاوے تو اس سے کیا ہوتا ہے بلوغ تو اپنے وقت پر مشیت ایزدی سے ہوگا۔ اسی طرح یہ بلوغ باطنی بھی قدرت سے ہوتا ہے اور واقع میں حقیقی بلوغ یہی ہے جیسا کہ فرمایا ہے ؂

خلق اطفالند جز مست خدا   نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

(ساری مخلوق بچوں کی طرح ہے سوائے اس شخص کے جو حق تعالیٰ کا مست ہے بس بالغ وہی ہے جو ہوائے نفسانی سے چھوٹ جائے)

بس اس کی فکر کرو کہ تعلق مع اللہ نصیب ہو جاوے اس سے بالغ ہو جاؤ گے پھر غالب ہو جاؤ گے عوام کے مذاق کے تابع نہ بنو مثلاً اگر کوئی شخص داڑھی رکھنے کا حکم قرآن سے مانگے تو صاف کہہ دو کہ یہ حکم قرآن شریف میں نہیں ہے۔ حدیث شریف میں ہے بھلا چاہتے ہو تو مانو ورنہ دوزخ میں جاؤ اور میں جو حکمتیں بیان کر رہا ہوں یہ تبرع ہے میں ماولد (اولاد) وغیرہ کے متعلق جواب دے رہا تھا کہ قسم میں انکی تخصیص کیوں کی گئی سو قاعدہ مذکورہ پر اصل جواب تو یہی ہے کہ اس سوال کا حق نہیں ہے مگر تبرعاً کہہ دیا کہ یہ چیزیں اکثر پیش نظر رہتی ہیں اس لئے سہولت کیلئے یہ تخصیص کی گئی اسی پر یہ بحث طویل ہوگئی۔

مقسم علیہ کا بیان

اب میں مضمون کی طرف عود کرتا ہوں کہ یہاں تک قسم کا بیان ختم ہوگیا اب قسم کے بعد مقسم علیہ یعنی جواب قسم کا بیان ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ یعنی انسان کو ہم نے

بڑی مشقت میں پیا کیا ہے حاصل یہ ہوا کہ اس پر سختیاں گذرتی ہیں اور اس کا اثر یہ ہونا چاہئے تھا کہ اتباع کرتا۔ مگر اتنے واقعات ہو رہے ہیں اور وہ کچھ خیال نہیں کرتا چمار کی طرح کہ اگر اس کو کوئی مارے تو کہتا ہے اب کے مار آگے ارشاد ہے اَیَحۡسَبُ اَنۡ لَّنۡ یَّقۡدِرَ عَلَیۡهِ اَحَدٌ کیا اس کا اب بھی یہی خیال ہے کہ میں کسی کا ماتحت نہیں ہوں گا اول تو یہی سمجھنا حماقت ہے کہ اس پر کسی کو قدرت نہیں ہے لیکن آئندہ کسی کی قدرت ہونے کا انکار تو بہت ہی کھلی ہوئی حماقت ہے کیونکہ مستقبل کی تو کسی کو کچھ خبر نہیں۔ حق تعالیٰ نے مستقبل کی نفی پر نکیر فرمائی تا کہ اشد درجہ کی حماقت انسان کی ثابت ہو کیا ٹھکانا ہے بلاغت کا آگے اس کا بیان ہے کہ اخلال علمی کے ساتھ اخلال عملی میں بھی مبتلا ہے یَقُوۡلُ اَهۡلَكۡتُ مَالًا لُّبَدًا یعنی عجز و نیاز بھول گیا اور از راہ تکبر کہتا ہے کہ میں نے بہت سا مال خرچ کر ڈالا اور انفقت نہیں فرمایا کیونکہ انفاق منفعت میں ہوتا ہے اور اہلاک بلا فائدہ خرچ کرنے کو بھی کہتے ہیں پس اس میں ایک دقیق لطیفہ ہے کہ اھلکت (خرچ کر ڈالا ضائع کر ڈالا) کہہ کر اپنے خسارہ کا خود اقرار کر لیا تو گویا یہ فرماتے ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں جو خرچ کیا گیا وہ بالکل ضائع ہے پس اھلکت کے لفظ میں اس کو اقراری مجرم بتانا ہے یہ ایک طرز ہے کہ جس سے مخاطب اپنا جرم مان لے اس لئے صراحۃً مخالفت حق میں خرچ کرنے کو بیان نہیں کیا ایسا کہنے سے وہ اس کا انکار کرتا بلکہ اَهۡلَكۡتُ کے اقرار سے لطیف اشارہ کر دیا کیونکہ ملزوم کا اقرار لازم کا اقرار ہے آگے فرماتے ہیں اَیَحۡسَبُ اَنۡ لَّمۡ یَرَهٗۤ اَحَدٌ کیا وہ انسان یہ خیال کرتا ہے کہ اس کو کسی نے دیکھا نہیں یہاں تک شکایت کا حاصل یہ ہوا کہ انسان کو نقم اور تکالیف سے متنبہ نہیں ہوا آگے نعمتیں یاد دلاتے ہیں کہ معلوم ہو کہ اس کو نعم سے بھی تنبہ نہیں ہوا پس ارشاد فرماتے ہیں۔

اَلَمۡ نَجۡعَلۡ لَّهٗ عَیۡنَیۡنِ وَلِسَانًا وَّ شَفَتَیۡنِ وَهَدَیۡنٰهُ النَّجۡدَیۡنِ (کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں اور زبان اور ہونٹ نہیں دیئے اور ہم نے اس کو دونوں راستے بتلا دیئے اس استفہام میں نکیر شدید ہے ان نعمتوں کے بھلا دینے پر اور یہی آیت اس وقت مقصود بالبیان ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ مقصود مطول ہو۔ اور اس آیت کا ترجمہ یہ ہے کیا ہم نے اس

(انسان) کے واسطے دو آنکھیں نہیں بنائیں اور کیا ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں بنائے اور اس کو دونوں راستے بتلائے اور دو راستوں سے مراد خیر و شر ہیں سو خیر تو اس لئے بتلائی کہ اس کو اختیار کیا جاوے اور شر اس واسطے بتلایا کہ اس سے پرہیز کیا جاوے۔ پس شر کا بتلانا بھی نعمت ہے۔ بضدھا تتبین الاشیاء (اپنی ضد سے چیزیں ظاہر ہوتی ہیں) اور یہ تو بعد میں بتلاؤں گا کہ آیت میں کن کن نعمتوں کا بیان ہے پہلے یہ سمجھو کہ حق تعالیٰ نے سمع و بصر کو کہیں تو مفرد کے صیغوں سے بیان فرمایا ہے یعنی سمع و بصر اور کہیں جمع کے صیغوں سے یعنی ابصار و آذان بہرحال تثنیہ کہیں نہیں فرمایا گیا بجز اس جگہ کے سو اس میں کیا نکتہ ہے واللہ اعلم بحقیقۃ الحال مگر میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ مخاطب غبی کو خاص تنبیہ کر دی کہ آنکھ دی اور ایک پر اکتفا نہیں کیا بلکہ دو عنایت کیں ہیں اور دوسرا نکتہ یہ ہوسکتا ہے کہ اشارہ ہو ایک مسئلہ طبعیہ کی طرف۔ قرآن شریف کی یہ شان ہے۔

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ میدارد   برنگ اصحاب صورت را ببو ارباب معنی را

(اس عالم حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل و جاں کو رنگ سے دور حقیقت پرستوں کے دل و جان کو بو سے تازہ رکھتی ہے) وہ مسئلہ یہ ہے کہ دو ہیں مگر بمنزلہ ایک کے کیونکہ دونوں آنکھیں ایک وقت میں ایک ہی چیز کو دیکھ سکتی ہیں ایسے ہی شفتین کہ دونوں سے ایک ہی کلام ہوسکتا ہے یہ نہیں کہ آنکھ سے ایک چیز کو دیکھ لیں اور دوسری سے دوسری کو یا ایک ہونٹ سے ایک بات کرتے رہیں اور دوسرے سے دوسری بات کرنے لگیں۔ اور کوئی یہ نہ کہے کہ تم تو قرآن شریف میں حکمت طبعیہ کے مسائل نکالنے سے منع کیا کرتے ہو بات یہ ہے کہ قرآن شریف میں حکمت کے مسائل مقصود نہیں باقی کہیں نکل آویں تو اس سے مجھ کو انکار نہیں البتہ الضروری یتقدر بقدر الضرورۃ (ضروری بقدر ضرورت ہی ضروری ہوتا ہے) کا لحاظ ضروری امر ہے یہ تو نکتہ تثنیہ کا ہوا اس آیت میں۔

سمع کو مفرد لانے میں نکتہ

ایک دوسری آیت میں ایک اور نکتہ بیان کرتا ہوں ارشاد فرمایا ہے وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ (اور تم کو کان اور آنکھیں اور دل دیئے) اس میں ابصار و

افئِدہ کو جمع لایا گیا ہے اور سمع کو مفرد مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے فرمایا تھا کہ سمع ایسی چیز ہے کہ بہت سے سننے والے ایک دم سنتے ہیں اس لئے وہ سب مل کر مثل ایک کے ہیں۔ مجلس واحد میں عادۃً یہی ہوتا ہے کہ سب ایک دم سنیں یہ نہیں کہ علی التعاقب سنیں تو گویا سب اسماع جمع ہو کر سمع واحد کے حکم میں ہیں اور ابصار میں تعاقب ہوسکتا ہے اسی طرح قلوب کے فہم میں بھی تعاقب ہوتا ہے خلاصہ یہ کہ ادراک سمع کا واحد تھا اس لئے سمع کو مفرد لائے بخلاف ابصار وقلوب کے کہ ان کا ادراک علی التعاقب جدا ہوسکتا ہے اور اس نکتہ کی ضرورت اس مقام پر ہوگی کہ ابصار وقلوب بدوں اضافت الیٰ ضمیر الجمع آیا ہو ورنہ اضافت الی ضمیر الجمع (ضمیر جمع کی طرف مضاف ہونے کے وقت تو بوجہ مقابلہ جمع بالجمع کے ابصار وقلوب بھی حکم مفرد میں ہوجاویں گے۔

اب ایک نکتہ اور بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى سَمْعِهِمْ الآية (ان کے کانوں پر اللہ نے مہر لگادی) الآیۃ میں قلب اور سمع کے لئے ختم لائے اور بصر کے واسطے غشاوۃ لائے اس میں بھی ایک نکتہ ہے وہ یہ کہ قلوب اور سمع کا ادراک کسی ایک جانب کے ساتھ خاص نہیں تو ان کے ابطال ادارک کے لئے سب جوانب سے موانع کے احاطہ کی ضرورت ہے اور ختم میں ایسا ہی احاطہ ہوتا ہے جو سب جوانب سے مانع ہوتا ہے بخلاف بصر کے کہ اس کا ادراک صرف جہتہ مقابلہ سے ہوتا ہے سو اس کے مانع کا بھی ایک جانب سے ہونا کافی ہے اور غشاوۃ ایک ہی جانب ہوتا ہے اس لئے فرمایا خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ یعنی ان کے دلوں اور کانوں پر مہر کر دی وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ یعنی ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور یہ نکتہ جب ہے کہ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ کا عطف عَلٰى قُلُوْبِهِمْ پر ہو اور بعض مفسرین عَلٰى اَبْصَارِهِمْ کا عطف عَلٰى قُلُوْبِهِمْ پر نہیں کرتے بلکہ اس کو معطوف علیہ قرار دیتے ہیں وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ کا تو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ سمع وبصر دونوں پر پردہ ڈالا گیا ہے اور مجھے یاد نہیں کہ اس جگہ عطف میں کیوں اختلاف ہوا ہے میرے نزدیک تو شق اول متعین ہے کیونکہ دوسری جگہ احتمال اول کی تصریح ہے وَخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشَاوَةً (اس کے کانوں اور دل پر مہر لگادی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا) پس جب وہ وجہ محتمل ہی نہیں تو میں اس کی توجیہ میں دماغ کیوں تھکاؤں ناحق کے

نکتے اچھے نہیں معلوم ہوتے ورنہ پھر امام ابو یوسف رحمۃ اللہ کے شاگرد کی مثال صادق آوے گی کہ ان کا ایک شاگرد خاموش بیٹھا رہتا تھا انہوں نے فرمایا تم بھی کوئی سوال کیا کرو اس نے کہا بہت اچھا اب سے کیا کروں گا اس کے بعد جو سبق پڑھنے بیٹھے تو یہ حدیث آئی کہ جب آفتاب غروب ہو جاوے تو فوراً روزہ افطار کرلیا کرو۔ آپ نے دریافت کیا کہ اگر کسی روز آفتاب غروب نہ ہو تو کیا کریں امام ابو یوسف نے فرمایا کہ بس بھائی تم خاموش ہی رہا کرو اور اگر کوئی احتمال کی بناء پر سوال کرے اور کہے کہ آخر اس کا احتمال تو ہے ہی کہ عَلٰی سَمْعِهِمْ کا عطف عَلٰی قُلُوْبِهِمْ پر ہو تو میں کہوں گا کہ ایسے احتمالات کا اعتبار نہیں ہے کیا قرآن شریف دوبارہ نازل ہوگا جب دوسری جگہ قرآن شریف میں صراحۃً وَخَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشَاوَةً (اس کے کانوں اور دل پر مہر لگادی اور اس کے آنکھوں پر پردہ ڈال دیا) موجود ہے تو پھر اس جگہ بھی اس کے مطابق توجیہ کیوں نہ کی جاوے۔

مدرکات ثلاثہ

اب اس کا بیان کرتا ہوں کہ اس آیت میں ان مدرکات ثلاثہ میں سے کن مدرکات کا بیان ہے سو اول نظر میں تو معلوم ہوتا ہے کہ فقط ایک مدرک کا بیان ہے یعنی فقط بصر کا ذکر ہے مگر بعد تامل معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو کا ذکر ہے ایک بصر کا عینین میں دوسرے قلب کا گو اس کا ذکر منطوقاً نہیں کیا ہے مگر وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ میں مفہوماً ذکر کر دیا پس هدیناه النجدین میں نعمت قلب کا تذکرہ ہے کیونکہ فعل قلب کا ہے قلب ہی سے تو ہدایت کا ادراک ہوتا ہے اور یہی قلب مخاطب ہے امر و نہی کا اور یہی مدرک ہے کلیات و جزئیات کا گو بواسطہ آلات سہی اور وہ آلات عقل و حواس ہیں ظاہرہ بھی باطنہ بھی اور یہی قلب حافظہ ہے کلیات و جزئیات مدرکہ کا ظواہر نصوص سے مفہوم ہوتا ہے اور گو یہ حکماء کے خلاف ہے کہ انہوں نے اختلاف مدرکات (بصیغۃ المفعول) سے خود مدرکات (بصیغۃ الفاعل) میں بھی اختلاف کا دعویٰ کیا ہے۔

بناء الفاسد علی الفاسد

کلیات کے لئے عقل اور جزئیات کے لئے حواس پھر مختلف مدرکات کے لئے حافظات بھی جدا جدا مانے ہیں مگر متکلمین کو یہ مضر نہیں کیونکہ یہ قول حکماء کا سب بناء

الفاسد علی الفاسد ہے کیونکہ اس تغایر کی ضرورت ان کو الواحد **لا یصدر عنه الا الواحد** (واحد سے ایک ہی صادر ہوتا ہے) کی وجہ سے ہوئی ہے جیسا کتب فلسفہ میں مشہور ہے اور یہ قاعدہ خود غلط ہے اس پر کوئی دلیل نہیں ہے نیز اس قاعدہ میں خود حکماء نے تصریح کی ہے کہ یہ قاعدہ واحد حقیقی کے متعلق ہے اور قوی مدرکہ کی وحدت حقیقیہ خود باطل ہے۔ نہ معلوم یہ حکماء کہاں چلے جاتے ہیں اصل مسئلہ میں تو واحد کے ساتھ حقیقی کی قید لگاتے ہیں اور تحقیق فروع کے وقت اس قید کا خیال نہیں کیا جاتا کتنی بڑی غلطی ہے یہ تو ایسا ہوا کہ بچے کئے تبت کے اور رواں پڑھا بلغ البتہ آلات اور ان کے تغائر کا دعویٰ صحیح ہے جس کی سیدھی دلیل انی مشاہدہ ہے مگر حکماء نے دلیل لمی بیان کرنا چاہا اور مدرک (بالفتح) مختلف پائے گئے اس لئے قاعدہ مذکورہ کی بناء پر مختلف مدرکات کی ضرورت پڑی پھر جن جن مدرکات میں قابلیت جس جس کی ادارک کی سمجھے ایک ایک ادراک کو ان کے سپرد کر دیا جن میں سب مدرکات (بالفتح) حسیہ تو ادراکاً وحفظاً حواس کے متعلق ہو گئے مگر مدرکات کلیہ باقی رہ گئے ان کا مدرک عقل کو تجویز کیا مگر کوئی حافظ ان کلیات کا نہیں ملا تو عقلی گھوڑے دوڑائے اور عقل فعال کا نام لے دیا اور کوئی نہ تھا تو عقل فعال کو کھینچ لائے جیسا کہ ہمارے مدرسہ کے ایک طالب علم عیدو شاہ کا قصہ ہے وہ بہت بھولے طالب علم تھے میں نے ایک مہمان سے ان کے کچھ واقعات ظاہر کر کے کہا کہ یہ بہت سیدھا آدمی ہے ان کو تعجب ہوا میں نے ان کو مشاہدہ کرانے کے لئے ان کے سامنے ہی پکارا اور کہا عیدو شاہ بلا لاؤ وہ دوڑے میں نے بلا کر پوچھا کس کو بلانے جاؤ گے مولوی عبداللہ صاحب کو میں نے کہا تم نے کیسے سمجھا کہ میں ان کو بلا رہا ہوں جواب دیا کہ آپ اکثر ان کو بلایا کرتے ہیں۔ میں نے کہا تمہیں چاہیے تھا کہ تم مجھ سے پوچھتے کہ کس کو بلاؤں اور پھر بلانا چاہئے تھا یہ سب کچھ کہنے کے بعد میں نے کہا اچھا جاؤ بلا لاؤ وہ پھر چل دیئے اور مجھ سے پھر بھی نہ پوچھا میرے سوال پر پھر بھی کہا کہ مولوی صاحب کو بلا کر لاتا ہوں بس عیدو شاہ کے نزدیک جب کسی کو بلایا جاوے تو مولوی عبداللہ صاحب مراد ہوتے تھے اسی طرح حکماء کے ذہن میں کسی کام کے لئے جب کوئی نہ ملے وہاں عقل فعال کو مان لیتے

ہیں جیسے یہاں حفظ کلیات کے لئے اس کو تجویز کیا اور جیسے تدبیر عالم عنصری کے لئے اس کو تجویز کیا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ چونکہ اس کام کا سلسلہ دواماً جاری ہے اس لئے اس کام کے واسطے کوئی مستمر چیز ہونی چاہئے اور اشیاء مستمرہ میں سے فلک میں تو علوم کی استعداد نہیں اور خدا تو ان کے نزدیک عقل اول کو پیدا کر کے (نعوذ باللہ) معطل ہو گیا اور دوسرے عقول کے افعال منکشف نہیں ہو سکتے بس عقل فعال ہی ایسی چیز رہ گئی کہ اس حفظ کلیات کے بار کو اٹھا سکے اس لئے اس کے ذمہ ڈال دیا جیسے عمرو عیار کی زنبیل تھی کہ اس میں سب کچھ سما جاتا تھا اسی طرح حکماء کی عقل فعال ہے کہ اس میں ہر شے کی کھپت ہے۔

حکماء کی غلطی

حکماء کی اس غلطی کے ساتھ ان کی ایک اور مشہور مسئلہ کے متعلق غلطی بیان کرتا ہوں حکماء کہتے ہیں کہ محدد جہات کے بعد نہ خلا ہے نہ ملا ہے ظاہر بات ہے کہ ارتفاع نقیضین محال ہے پھر یہ حکم لا خلا و ملا کا کیسے صحیح ہو سکتا ہے اگر وہاں خلا و ملا دونوں نہیں تو اور کون سی چیز ہے۔ دراصل قدماء اتنے بیوقوف نہ تھے جو ایسے امر محال کے قائل ہوتے ہیں اس قول کو متاخرین نے بگاڑا ہے متقدمین کی یہ غرض نہ تھی بلکہ انہوں نے حکم کی نفی کی ہے تحقیق کی نفی نہیں تھی مطلب یہ تھا لا نحکم بخلاء و لا بملاء لانتفاء الدلیل (ہم نہ خلا کا حکم کرتے ہیں نہ ملا کا بوجہ اس پر دلیل نہ ہونے کے اور اس میں کوئی خرابی نہ تھی یہ متاخرین کی عقلمندی ہے کہ نفی حکم سے نفی تحقیق سمجھ بیٹھے یہ مشائین تو بالکل ہی عقل سے کورے ہیں غرض حکماء مدرکات و مدرکات کی تفصیل میں کتنے پریشان ہوئے اور ہم کو کتنی آسانی ہو گئی کہ جس کا مشاہدہ ہوا اس کے قائل ہو گئے مثلاً کہہ دیا کہ دیکھنے کی چیز آنکھ سے مدرک ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ تو مشاہدات کا فیصلہ ہو گیا۔ باقی رہے معانی جو مشاہد نہیں سو اس میں عقلی احتمالات بہت تھے کوئی ممتنع نہ تھا مگر تعیین کے لئے نقل کی ضرورت ہے چونکہ قرآن کے ادراک معانی کے مواقع پر قلب کا ذکر کیا ہے چنانچہ ارشاد اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَهٗ قَلْبٌ الآیۃ (بلاشک ایسی نصیحت کے لئے جس کا قلب سلیم ہو) الآیہ اس واسطے قلب کو مدرک معانی کہہ دیا گو بواسطہ عقل سہی اور اسی طرح هَدَیْنٰهُ النَّجْدَیْنِ (ہم نے اس کو دونوں

راستے بتلا دیئے) میں قلب کا ذکر ہے۔ سو مطیع قرآن کو کتنی آسانی ہے اور جو عقلی گھوڑے دوڑاتے ہیں ان کو سخت مشکلیں پیش آتی ہیں جن کی ضرورت نہ تھی چنانچہ حکماء نے جو مدرک حافظ کو الگ قرار دیا ہے مثلاً اس کی بھی ضرورت نہیں ہے ہم کہتے ہیں کہ جو مدرک ہوا گر وہی حافظ ہو تو کیا خرابی ہے اور ہم نے جو یہ کہا ہے کہ قلب مدرک ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم آلات کا انکار کرتے ہیں البتہ ان آلات کا فاعل ہونا کسی دلیل سے ثابت نہیں اور حکماء جو ان آلات کی فاعلیت پر دلیل بیان کرتے ہیں کہ مثلاً سر میں چوٹ لگنے سے بعض ادراکات میں فرق آ جاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ قوت ان آلات میں ہے نہ کہ قلب میں یہ دلیل صحیح نہیں ہے کیونکہ ممکن ہے کہ صحت دماغ شرط ہو ادراک قلب کی تو اس سے ان آلات کا مدرک ہونا ثابت نہیں ہوتا بفضلہ تعالیٰ ان آیات کی تفسیری تحقیق تو بقدر ضرورت ہو چکی اب میں خاص حاسہ بصر کے متعلق جو اس وقت خصوصیت کے ساتھ مقصود بالذکر ہے بعض مضامین بیان کر کے پھر وعظ کا خلاصہ بیان کر کے تقریر کو ختم کر دوں گا۔

حاسہ بصر

سو حاسہ بصر کے متعلق ایک مضمون تو یہ ہے کہ آنکھ کی بھی عجیب بناوٹ ہے خدا نے ایک نہر پیدا کی ہے اور دماغی تجویف میں نور بھرا ہوا ہے جو آنکھوں میں آتا ہے اس میں سب مبصرات منقش ہو جاتے ہیں جب اس تجویف پر کوئی خرابی آ جاتی ہے تو دماغ سے وہ نور آنا بند ہو جاتا ہے اس لئے عبرت چاہئے کہ آنکھ سے خدا کی نافرمانی کرتے ہیں اس کی ہی عطا کی ہوئی چیز اور اسی کے مقابلہ میں صرف کی جاوے یہ خیال نہیں کرتے کہ اگر وہ اس نعمت کو چھین لیں تو کیا ہوگا۔

ایک ملحد کو گستاخی کی سزا

ایک ملحد کی حکایت ہے کہ اس نے یہ آیت قُلْ اَرَئَیْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَاءُ کُمْ غَوْرًا فَمَنْ یَّاْتِیْکُمْ بِمَاءٍ مَّعِیْنٍ (آپ کہہ دیجئے کہ اچھا یہ بتلاؤ کہ اگر تمہارا پانی نیچے کو ہی غائب ہی ہو جائے سو وہ کون ہے جو تمہارے پاس سوت کا پانی لے آئے) سن کر گستاخی کی اور کہا ناتی بہ بالمعول والمعین۔ یعنی اگر پانی نیچے اتر جاوے تو کدال اور مزدور کے ذریعہ سے

کھود کر نکال لیں گے اس کو خواب میں سزا دی گئی کہ اس کی آنکھیں چھین لیں اور کہا گیا کہ ہم نے تیری آنکھوں کا پانی چھین لیا اس کو معمول و معین یعنی کدال و مزدور کی مدد سے واپس لے آ۔ خدا تعالیٰ کے ساتھ گستاخی کرنا معمولی بات نہیں ہے حق تعالیٰ نے اسی وقت اس کی گستاخی پر مواخذہ کیا کہ تو کنویں کے پانی نکالنے کا دعویٰ کرتا ہے ذرا اپنی آنکھوں کا تو پانی نکال لے جس کی زیادہ گہرائی بھی نہیں ہے اور درحقیقت زمین ہی کھودنے میں کیا رکھا ہے اگر حق تعالیٰ زمین میں پانی پیدا نہ کریں تو کتنا ہی کھودلو کچھ بھی نہیں نکل سکتا سب چیزیں خدا ہی کے قبضہ قدرت میں ہیں اور بعض مرتبہ اس قدرت کو اسی طرح ظاہر کر دیتے ہیں کہ انکار کی گنجائش ہی نہیں رہتی اور سوائے قدرت خداوندی کے اس میں کسی کے دخل کا احتمال ہی نہیں رہتا۔

قدرت خداوندی

گنگوہ کا قصہ ہے کہ ایام غدر میں ایک شخص کے کنپٹی میں گولی لگی اور اس کی طاقت ختم ہو چکی تھی اس لئے پار نہ جا سکی دماغ میں مجمع نور کے موقع پر بیٹھ گئی وہ شخص فوراً اندھا ہو گیا اب گولی کس طرح نکلے پار کس طرح کریں حق تعالیٰ شانہ کی ہستی ایسے واقعات سے بین طور پر معلوم ہوتی ہے واقعہ یہ ہوا کہ سب تو اسی سوچ میں تھے کہ کیا کریں دفعۃً ایک گولی اور آئی اور عین اسی جگہ کو ہوتی ہوئی پار ہو گئی اور پہلی گولی کو ساتھ لیتی گئی اور بینائی عود کر آئی۔ غیب سے علاج ہو گیا فقط زخم کی تکلیف باقی رہ گئی اس کا علاج کر لیا گیا یہ ترکیب کس سے ہو سکتی تھی اسی کو کہا گیا ہے۔

دردم نہفتہ بہ زطبیبان مدعی　　　　باشد کہ از خزانہ غیبش دوا کنند

(مدعی طبیبوں سے میرا مرض پوشیدہ رہا شاید خزانہ غیب سے اس کی دوا کریں)

اور امراض باطنی میں تو اکثر بلکہ ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ بے شان گمان تدبیریں ہوتی رہتی ہیں۔

صحبت اہل اللہ کی ضرورت

مگر سمجھنے کے لئے اول ضرورت ہے کہ صحبت اہل اللہ کی اختیار کی جاوے جس کی شان یہ ہے۔

آنا نکہ خاک را بنظر کیمیا کنند

(وہ لوگ ایک نظر میں خاک کو کیمیا بنا دیتے ہیں)

اس کے بعد ہر وقت یہ دیکھو گے۔

دردِ من نہفتہ بہ کہ طبیبان مدعی ۔۔۔۔۔ باشد کہ از خزانہ غیبش دوا کنند

(میرا مرض باطنی مدعی طبیبوں سے مخفی رہا ممکن ہے کہ خزانہ غیب سے اس کا علاج ہو)

مدعی طبیبوں سے خدا بچاوے ان سے دور رہنا لازم ہے لیکن سچے اور محقق معالج سے درد کو نہفتہ کرنا محمود نہیں اور خزانہ غیب کے مفہوم میں محقق بھی تو داخل ہے اور اس کا مل جانا بھی خزانہ غیب ہی سے دوا کرنا ہے اور بعض دفعہ ظاہری امراض میں بھی ایسا ہی ہو جاتا ہے جیسا کہ ایک واقعہ گولی کا گذر چکا ہے۔ اور ایک ایسا ہی واقعہ مولانا رومیؒ نے مثنوی میں لکھا ہے کہ کسی بادشاہ کی ایک کنیز بیمار ہو گئی تھی ہر چند دوا کی کچھ نفع نہیں ہوا۔

بیماری عشق

اولیاء اللہ میں سے ایک صاحب تشریف لائے اور حال دیکھا ان سے پہلے کنیز کی یہ حالت تھی۔

ہر چہ کردند از علاج و از دوا ۔۔۔۔۔ رنج افزوں گشت و حاجت ناروا

(جو کچھ علاج و معالج کیا سب بے کار ثابت ہوا) آگے ان اہل اللہ کا مقولہ فرماتے ہیں۔

گفت ہر دارو کہ ایشان کردہ اند ۔۔۔۔۔ آں عمارت نیست ویراں کردہ اند

(اطباء نے مرض نہیں پہچانا اس لئے علاج مرض کے خلاف ہونے سے مزاج میں درستی سے نادرستی بڑھ گئی)۔

بے خبر بودند از حال دروں ۔۔۔۔۔ استعیذ اللہ مما یفترون

(جن اطباء نے علاج کیا ان کو اندرونی حالت کا پتہ نہ چلا پناہ مانگتا ہوں اس بات سے جس کو وہ اطباء افتراء کرتے ہیں)

اور تشخیص کے متعلق فرماتے ہیں۔

دید از زاریش کو زار دل ست ۔۔۔۔۔ تن خوش ست اما گرفتاری دل ست

(میں اس کی گریہ وزاری یا اس کے زار و نزار ہونے سے معدوم ہوں کہ وہ بیماری دل

میں مبتلا ہے بدن اچھا خاصا ہے مگر دل کہیں پھنسا ہے)

عاشقی پیدا ست از زاری دل　　　نیست بیماری چو بیماری دل

(دل کے نڈھال ہونے سے عاشق ہونا معلوم ہو جائے گا بیماری عشق کے برابر کوئی بیماری نہیں ہوتی)

اس کے بعد نبض پر ہاتھ رکھا دریافت کرنا شروع کیا یہ کنیز کہاں کہاں بکی کہاں کہاں رہی اس کا پورا حال بیان کیا گیا جب سمرقند کا نام آیا تو نبض میں تغیر عظیم پیدا ہو گیا معلوم ہو گیا کہ بس اس کا تعلق عشقی وہیں سے ہے پھر تدبیر نافع ہوئی۔ اور اس کی بھی ضرورت نہیں کہ کوئی بڑا ہی کامل طبیب ہو بلکہ وہ جس سے چاہیں کام لے لیں۔

داد اورا قابلیت شرط نیست　　　بلکہ شرط قابلیت داد اوست

(اس کی داد و دہش کے واسطے قابلیت شرط نہیں ہے بلکہ شرط قابلیت اس کی داد و دہش ہی ہے)

اور ایک شعر جو اس کے خلاف ہے اور اس کو لوگ عام طور پر پڑھ دیتے ہیں اس کا اعتقاد جائز نہیں وہ یہ ہے۔

نقصان ز قابل ست و گرنہ علی الدوام　　　فیض سعادتش ہمہ کس را برابر ست

(قابل کی جانب سے کمی ہے ورنہ اس کا فیض سعادت سب لوگوں پر برابر ہے)

کیونکہ اس سے حق تعالیٰ کا علت موجبہ ہونا لازم آتا ہے حالانکہ انہوں نے اپنے اختیار سے سب کچھ دیا ہے اور برابر نہیں دیا بس یہ شعر بالکل غلط ہے اور بعض مضامین بعض درسیات میں ہونے سے ان کی صحت لازم نہیں آتی۔

مولانا شہیدؒ کا فتویٰ

بس درسیات میں بعض مضامین قابل درس بمعنی خواندن ہیں اور بعض مضامین قابل درس بمعنی محو کردن ہیں مولانا شہیدؒ نے بھی عرفی پر اس کے ایک شعر کی بناء پر کفر کا فتویٰ دیا ہے عرفی کہتا ہے۔

تقدیر بیک ناقہ نشانید دو محمل　　　سلمائے حدوث تو و لیلائے قدم را

(تقدیر ایک اونٹنی پر دو محمل تیری سلمائے حدوث و تیری لیلائے قدم کا نہیں رکھ سکتی)

کیونکہ اس میں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قدم کا قائل ہوا ہے اور قدم ذاتی و زمانی دونوں غیر اللہ کے لئے محال ہیں البتہ اگر قدم اصطلاحی نہ مراد لیا جاوے تو صحیح ہے یعنی قدم سے مراد سب مخلوقات سے سابقیت لیا جاوے کیونکہ آپ کا نور اس معنی کر قدیم ہے یعنی باوجود حدوث کے سب محدثات سے سابق ہے اور مخلوق ہونے کے اعتبار سے اصطلاحی معنی کے موافق آپ میں حدوث کی صفت ہے اور گویہ تاویل کرنے کے بعد عرفی کی تکفیر نہیں ہو سکتی مگر مولانا نے فرط جوش یا انتظام کی وجہ سے فتویٰ دے دیا ہوگا اور میں نے مولانا کا فتویٰ دیکھا نہیں سنا ہے نہ معلوم انتساب کیسا ہے اگر انتساب ثابت ہو جاوے تو یہی تاویل انتظام یا فرط جوش کی کی جائے گی کیونکہ عام طور سے سننے والے اصطلاحی ہی قدم سمجھیں گے غرض استعداد بھی انہیں کی دی ہوئی ہے استعداد کیا کسی اور کی دی ہوئی ہے جو یہ کہا جاوے۔

نقصان ز قابل ست وگر علی الدوام　　فیض سعادتش ہمہ کس را برابر ست

(یعنی قابل ہی کی جانب سے کمی ہے ورنہ اس کا فیض سعادت سب پر برابر ہے)

اور اس عطا شدہ استعداد پر بھی ناز نہ کرے یہ ان کی عنایت ہے بقول شاعر۔

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل　　نسیم صبح تیری مہربانی

سو اصل علت تو ان کی عطاء ہے باقی بعض مصالح کی بناء پر کچھ ظاہری اسباب بنا دیئے ہیں جن کی طرف مجازاً نسبت کر دی جاتی ہے جیسا کہا گیا ہے۔

کار زلف تست مشک افشانی اماں عاشقاں　　مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

(یعنی مشک افشانی درحقیقت تیری زلف کا کام ہے لوگوں نے مصلحت کی وجہ سے ہرن کی طرف منسوب کر دیا ہے)

مصلحت اسباب

اور میں متعین کرتا ہوں کہ اسباب کی وہ مصلحت کیا ہے وہ تسلیہ ہی طبائع ضعیفہ کا مثلاً کھانا پکنے کے لئے آگ پیدا کر دی ہے ورنہ فکر میں پڑ جاتے کہ کھانا کیسے پکے گا نفس کو بدوں اسباب کے تسلی نہیں ہوتی اس مصلحت سے اسباب پیدا فرما دیئے ہیں ورنہ حقیقت میں وہی دینے والے ہیں اسباب کا کوئی مستقل دخل نہیں اسباب کا محض نام ہی ہے۔

کار زلف تست مشک افشانی اماں عاشقاں　　مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

21

(مشک افشانی درحقیقت تیری زلف کا کام ہے مصلحت کی وجہ سے لوگوں نے ہرن کی طرف منسوب کردیا ہے)

اور جب اسباب کا درجہ معلوم ہوگیا تو یہاں سے غیر محقق واعظین کی ایک غلطی اور جہل ظاہر ہوگیا وہ یہ کہ یہ واعظین یوں کہا کرتے ہیں کہ لوگ باوجود وَمَامِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا (کوئی جاندار زمین پر ایسا نہیں جس کا رزق اللہ تعالیٰ کے ذمہ نہ ہو) فرمادینے کے بعد بھی رزق کی طرف سے فکر مند رہتے ہیں اور کوئی دعوت کردے تو اس پر بھروسہ کرکے مطمئن ہوجاتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بندہ کے وعدہ کو قابل اطمینان سمجھا اور حق تعالیٰ کے وعدہ کو قابل اطمینان نہ سمجھا اس نکتہ کو بیان کرکے بڑے خوش ہوتے ہیں مگر درحقیقت یہ مثال صحیح نہیں ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے وعدہ کے ساتھ سبب اور وقت رزق کے لئے متعین نہیں کیا یعنی ہم کو اس کی تعیین کی اطلاع نہیں کی کہ فلاں وقت اور فلاں طریقہ سے اس قدر رزق تم کو ملے گا اور دعوت کرنے والے نے وقت مقرر کردیا ہے اگر خدا تعالیٰ بھی بتلادیتے کہ فلاں وقت کھانا ملا کرے گا تو پھر کبھی بھی مسلمانوں کو تشویش نہ ہوتی اور اب جو تشویش ہے وہ مذموم نہیں ہے پس یہ تشویش دلیل عدم وثوق کی نہیں۔

خاصیت اسباب

بلکہ اثر ہے خاصیت اسباب کا جس کا درجہ اوپر مذکور ہی ہے بلکہ حقیقت میں یہ تشویش عین سنت اللہ پر عمل ہے کیونکہ وقت وسبب کے ابہام میں مباشرت اسباب کا اذن ہے مگر ان جاہل واعظوں نے فتویٰ ہی لگا دیا افسوس ان جاہلوں کے ایسے ایسے نکتوں نے ناس کردیا۔

وعظ کہنا دو شخصوں کا کام ہے

مولانا محمد قاسم صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ وعظ کہنا دو شخصوں کا کام ہے ایک محقق کا اور ایک بے حیا کا اور اپنی نسبت فرماتے تھے کہ میں بے حیا ہوں اس لئے وعظ کہہ لیتا ہوں اور صاحبو یہ تو آسان ہے کہ اظہار تواضع کے لئے ہر واعظ زبان سے کہہ دے مگر فرق یہ ہے کہ وہ بناوٹ سے ہوگا اور مولانا بے بناوٹ کہتے تھے کیونکہ ان کو کمالات حقیقیہ کا مبلغ معلوم تھا اس کے سامنے اپنے کمالات ہیچ نظر آتے تھے اور ہماری یہ حالت ہے۔

اصلاح ظاہر-21

چو آں کرمے کہ در سنگے نہاں ست زمین و آسمان وے ہمان ست

(پتھر کے اندر جو کیڑا ہے وہی اس کا زمین و آسمان ہے)

اس لئے ہم آپ کو محقق سمجھتے ہیں اور اگر کوئی تواضع کا کلمہ منہ سے کہتے بھی ہیں تو دل اس کا ساتھ نہیں دیتا غرض یہ اسباب پر ناز نہ کرے کیونکہ خدا چاہے تو اسباب کو یا اثر اسباب کو چھین لے۔ اس کی قدرت غیر متناہی ہے مگر افسوس کہ ہم اسباب پر نظر کر کے بے فکر ہو جاتے ہیں اور بے فکری سے ہم عمر بھر نافرمانی کرتے ہیں ہم کو حقیقت پر نظر کر کے شرم کرنا چاہئے کہ ان کی عطا کردہ اشیاء کو ان کی مخالفت میں صرف کیا جاوے اگر لڑنا ہے تو اپنے گھر سے سامان لا کر لڑو۔ خدا کی دی ہوئی قوتیں اور ان سے اسی کی نافرمانی غیرت نہیں آتی اگر نافرمانی ہی کرنی ہے تو خدا کی عطا کی ہوئی قوتوں سے کام نہ لو دیکھیں تو بھلا اور کہاں سے لاؤ گے واقعہ تو یہ ہے۔

نیا وردم از خانہ چیزے نخست تو دادی ہمہ چیز و من چیزے تست

(ہم اپنے گھر سے کچھ نہ لائے ہیں جو کچھ بھی ہے وہ سب آپ ہی کا عطیہ ہے)

وجود بین

اور دوسرا مضمون حاسہ بصر کے متعلق باشتراک قلب کے یہ ہے کہ اس آیت میں دو مدرکوں کا ذکر ہے اور دوسری آیتوں میں تین قویٰ کا ذکر ہے جیسے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (بند لگا دیا اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے) اور جیسے اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (بلاشک کان آنکھ دل ان میں سے ہر ایک سے دریافت کیا جائے گا) اس سورۃ میں سمع کا ذکر نہیں ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اس مقام پر ان چیزوں کا ذکر ہے جن کا وجود بین اور ظاہر ہے تا کہ شکایت میں قوت ہو اور کان کا حقیقت میں جو حاسہ ہے یعنی عصب خاص وخود صاحب سمع کو بھی مشاہد نہیں اور قلب کو مستور ہے مگر وہ اپنے جس مجموعی ہیئت سے مدرک ہے وہ مشہور ہے اور ممکن ہے کہ اور کوئی لطیفہ ہو ہماری سمجھ ہی کیا ہے اور تثنیہ کا نکتہ پیشتر بیان ہو چکا ہے جہاں اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ (کیا نہیں بنائیں اس کے لئے دو آنکھیں) کی تفسیر شروع ہوئی ہے جس کی تمہید میں یہ عبارت ہے کہ آگے نعمتیں یاد

دلاتے ہیں الخ باقی عین کی تقدیم کا نکتہ یہ ہوسکتا ہے کہ اس کے ادراک میں ایک خاص شان ہے کیونکہ اکثر افعال مشروط ہیں ابصار کے ساتھ کھانا پینا چلنا پھرنا وغیرہ سب میں دیکھنے کی حاجت ہوتی ہے اس سے انسان ہر چیز کا صحیح اندازہ کر لیتا ہے بخلاف سمع کے اور قلب سے تو کوئی صاحب دل ہی پہچانتا ہوگا سب کو معلوم ہے کہ بہت کم افعال ایسے ہیں جن میں ابصار کی حاجت نہ ہو اور یہ بات ہے کہ تجربہ کی وجہ سے بدوں ابصار کام چل جاوے۔

بصیر کو تنہائی میں وحشت نہیں ہوتی

دوسری یہ کہ بصیر کو تنہائی میں وحشت نہیں ہوتی کیونکہ ابصار میں مشغول رہتا ہے کہ رنگ برنگ کی چیزیں دیکھتا رہتا ہے کبھی ادھر دیکھا کبھی ادھر دیکھا پریشانی نہیں ہوتی بخلاف سمع کے کہ وہ اس وقت مشغول ہوسکتا ہے جب کہ دوسرا اس کے ساتھ ہو اور کلام بھی کرے اور قلب کے معلومات پرانے ہیں اس لئے ان میں بھی مشغولی نہیں ہوتی بس نشاط جتنا آنکھوں سے ہوتا ہے اتنا اور کسی شئی سے نہیں ہوتا پھر آنکھیں دو بنائیں کہ اس میں زینت ہے ورنہ ادراک ایک سے بھی ہوسکتا ہے دیکھو تو دو میں حسن کیسا ہے اگر ایک طرف آنکھ ہوتی اور ایک طرف خالی جگہ ہوتی تو بدزیب ہوتی اور اگر بیچ میں ہوتی تو اول تو وہ بھی ایسی حسین نہ ہوتی دوسرے یہ نفع کہاں ہوتا جواب ہے اگر ایک دکھنے آ جاوے تو دوسری سے دیکھ لو چنانچہ ایسا کم ہوتا ہے کہ دونوں آنکھیں ایک دم دکھنے لگیں غرض آنکھ بڑی نعمت ہے اس کے بدوں انسان سخت دشواری میں پڑ جاتا ہے۔

آنکھ بنوانے کی ممانعت نہیں

اسی واسطے تو حدیث شریف میں آیا ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ من سلبت کریمتیه فصبر عوضة الجنة اوکما قال یعنی میں جس کی دو پیاری چیزیں یعنی آنکھیں لے لوں اور وہ صبر کرے اس کو عوض میں جنت دوں گا۔ آنکھوں کے بغیر خاص شان کی تکلیف ہوتی ہے جبھی تو اس نابینائی کی حالت میں صبر کی اس قدر فضیلت ہے اور حدیث میں عینین نہیں فرمایا کیونکہ کریمتیں ہی سے سب سمجھ جاویں گے یہ ایسی چیز ہے کہ نام کی

ضرورت نہیں پیاری چیز کہنے سے خود بخود ہی ذہن میں آجاوے گی کیونکہ بعض وجوہ سے
اس سے بڑھ کر کوئی نعمت پیاری نہیں پس کریمتیں کے لفظ سے بھی اس نعمت کا دوسری نعمتوں
سے بڑھ کر ہونا معلوم ہوگیا۔ ایسے امور میں محاورہ کی ضرورت ہے منطق کافی نہیں ہے
قرآن وحدیث میں لطف اسی کو آوے گا جس کو محاورات پر بھی عبور ہو اور اس حدیث سے
کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ آنکھ بنوانے کی ممانعت ہے بلکہ جنت تو صبر کرنے سے مل چکی اب بنوالو
گے تو اللہ میاں جنت چھین نہ لیں گے وہ ایسے کریم نہیں ان کی رحمت بہت بڑی وسیع ہے
ہاں اگر تم آنکھ وغیرہ سے کام نہ لو اور خود جنت واپس دے دو تو اور بات ہے پس آنکھ کی
خصوصیت پر نظر کر کے اس کو مقدم لایا گیا اور گو بعض اعتبار سے قلب آنکھ سے بڑھ کر ہے مگر
اس جگہ مخاطب غبی ہے جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں کہ ایسے شخص کی شکایت مقصود ہے جو قم ونعم
سے متاثر نہیں ہوتا اس لئے ان خصوصیت پر نظر کی گئی جو زیادہ ظاہر ہیں اور دوسری یہ بات
بھی ہے کہ بہت باتوں کے سمجھنے میں آنکھ سے مدد ملتی ہے اس وجہ سے اس کو ادراک قلب کا
بھی موقوف علیہ کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ
فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ (کیا نہیں دیکھتے وہ اپنے اوپر آسمان
کی طرف کیسے بنایا ہم نے ان کو اور اس میں رخنہ درج نہیں ہے)
دیکھئے اول تو نظر کا حکم دیا پھر بناء وتزئین اور استحکام میں فکر کا حکم دیا اور یہاں معقولی نظر
مراد نہیں ہے اس لئے میں کہا کرتا ہوں کہ تفسیر وحدیث کو معقول سے پہلے پڑھنا چاہیے ورنہ
معقول کی اصطلاحات دماغ میں سمانے کے بعد قرآن وحدیث سمجھ میں نہیں آتے ایک
معقولی طالب علم دیوبند میں نئے نئے آئے تھے پھرتے پھراتے میرے حجرہ میں پہنچے میں لکھ
رہا تھا پوچھا کیا لکھ رہے ہو میں نے کہا تصور شیخ کا مسئلہ لکھ رہا ہوں آپ بولے شیخ بوعلی سینا
بس ان کے نزدیک بوعلی کے سوا کوئی شیخ ہی نہیں سب جولا ہے ہی ہیں اور گو یہ بات بعض
منقولیوں میں بھی ہے جیسا کہ ایک مولوی صاحب نے قطبی میں قال الامام (امام نے کہا) کا
ترجمہ کیا تھا امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا مگر یہ مضر تو نہیں ہے قطبی بھی انسان قطب بن سکتا ہے اور
جس کو دینیات نہ آویں نری معقول ہی آتی ہو تو وہ معقول نہیں عصف ماکول ہے۔

آنکھ کی سب سے بڑی نعمت

اور تیسرا مضمون یہ ہے کہ آنکھ کی ایک خصوصیت اور ذہن میں آئی وہ یہ کہ سب سے بڑی نعمت یعنی دیدار خداوندی کا ادراک اسی سے ہوگا (یہ خصوصیت حضرت والا نے وعظ کے بعد ارشاد فرمائی تھی اس لئے مختصر لفظوں میں لکھی گئی اگر اثنائے وعظ میں اس کا تذکرہ ہوتا تو غالباً مبسوط ہوتا اس کی خصوصیت میں مستقل بیان ہوسکتا۔ ہم کو چاہئے کہ آنکھوں کی قدر کریں اور جن آنکھوں سے نعمت دیدار کے متمنی ہیں ان سے ممنوعات کو نہ دیکھیں ۱۲ جامع) خلاصہ یہ کہ آنکھ بنوانے کا تو کوئی مضائقہ نہیں ہے مگر اس سے کام لینا چاہئے اگر کام نہ لیا تو کیا نفع ہوا یہ بینائی کس کام کی جب کام نہ لیا تو گویا اندھا ہی ہے بلکہ اصل میں نابینا وہی ہے جو آنکھوں سے کام نہ لے۔

آنکھوں کا شکر

چنانچہ حق تعالیٰ کام نہ لینے والوں کی بابت بطور شکایت فرماتے ہیں صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ (بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں سو اب یہ رجوع نہ ہوں گے) اور اس آیت اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَیْنَیْنِ (کیا نہیں بنائیں واسطے اس کے دو آنکھیں) میں بھی کام نہ لینے ہی پر ملامت ہے۔ غرضیکہ جن کی آنکھیں ہیں وہ شکر کریں اور جن کی بن گئی ہیں وہ زیادہ شکر کریں اور دونوں فریق ان سے کام لیں جن چیزوں کا دیکھنا مفید اور موجب ثواب ہے ان کو دیکھیں اور جن چیزوں کا دیکھنا مضر اور گناہ ہے ان سے بچیں یعنی اس کو ایسی جگہ استعمال نہ کریں کہ گناہ ہو حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے لَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْکَ اِلٰی مَا مَتَّعْنَا بِهٖ (الآیۃ) (اور ہرگز ان چیزوں کی طرف آپ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھئے جن سے ہم نے کفار کے مختلف گروہوں کو ان کی آرائش کے لئے متمتع کر رکھا ہے) الآیۃ پس کسی کی طرف تحقیر سے یا حرام نگاہ سے یا حرص سے نظر مت کرو آنکھوں کا شکر فقط یہی نہیں کہ زبان سے اللہ کا شکر کہہ دیا کھانا کھلا دیا بلکہ یہ بھی شکر کا جزو ہے بلکہ بڑا جزو ہے کہ آنکھوں سے وہ کام لو جو حق تعالیٰ کو پسند ہو جیسا کہا گیا ہے۔

افادتکم النعماء منی ثلثة　　　یدی و لسان والضمیر المحجبا

(میری نعمتوں میں سے جو تم کو عطاء ہوئے تین نعمتیں لوگوں کو فائدہ پہنچاتی ہیں دونوں ہاتھ زبان دل)

ایک بات بیان سے اور رہ گئی وہ یہ کہ ولسانا و شفتین (اور زبان اور دو ہونٹ) کو مدرکات کے درمیان میں بیان کیا گیا ہے حالانکہ ان سے ادراک نہیں ہوتا۔
اس سے افادہ کی طرف اشارہ ہے یعنی ادراک کے بعد لسان سے لوگوں کو فائدہ پہنچاؤ اور لسان کو دل اور آنکھ کے درمیان میں لانے سے زبان کا تعلق دونوں سے معلوم ہو گیا یعنی دونوں کے مدرکات کا اس سے افادہ ہو سکتا ہے۔

خلاصہ آیات

حاصل ان آیات کا یہ ہے کہ اے انسان تو نہ تو نعمتوں کی وجہ سے متوجہ ہوا اور نہ مشقتوں سے تو نے عبرت حاصل کی یہ بہت ہی بیجا بات ہے اس کا تدارک لازم ہے اب دعائے توفیق کیجئے کیونکہ یہ تو سب اسباب ہیں اور اصلی علت ان کی عنایت ہے اس لئے ان کی عنایت کا طلب کرنا لازم ہے۔

ایں ہمہ گفتیم لیک اندر بسیچ — بے عنایات خدا ہیچم و ہیچ

(یہ تمام جو کچھ ہم نے بیان کیا لیکن ارادہ بغیر عنایت خداوندی کے ہم ہیچ ہیں)

بے عنایات حق و خاصان حق — گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

(بغیر اللہ تعالیٰ اور خاصان خدا کی عنایات کے اگر فرشتہ بھی ہووے اس کا ورق سیاہ ہے)

البتہ ان کی رحمت وعنایت حاصل کرنے کی ظاہری تدبیر یہ ہے کہ کسی مصلح کی جوتیاں سیدھی کی جاویں خاصان حق سے اس مقام پر یہی مراد ہے۔
اب میں ختم کرتا ہوں دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں کے حقیقی شکر کی توفیق عطا فرمائے آمین ثم آمین اور اس وعظ کا نام ازالۃ الغین عن آلۃ العین رکھتا ہوں گو ازالہ اور آلہ کا وزن نہیں ملا مگر مطلب تو ٹھیک ہے کہ آنکھوں پر جو کوتاہیوں کا پردہ پڑا ہوا ہے اس میں اس کو دور کیا گیا ہے اور عین غین علاوہ ہم قافیہ ہونے کے مجانس خطی بھی ہیں اور بناء وعظ سے تو نام کی مناسبت بالکل ہی ظاہر ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العلمین والصّلوۃ والسّلام
علی رسولہ محمّد وعلی الہ واصحابہ اجمعین۔

الظاہر

۱۵۔ ربیع الاول ۱۳۳۶ ہجری کو چک دائرہ شاہ عبدالجلیل صاحب الہ آباد میں ۳۔ گھنٹے ۱۰ منٹ تک کھڑے ہوکر ارشاد فرمایا۔ ضرورت اصلاح ظاہر پر زور دیا۔ سامعین کی تعداد ۲۵۰۰ تھی، وعظ حکیم محمد مصطفیٰ بجنوری رحمۃ اللہ علیہ مقیم میرٹھ محلہ کرم علی نے قلمبند کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللّٰہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ ونشھدان سیدنا و مولانا محمداً عبدہ و رسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہٖ واصحابہٖ و بارک وسلّم.

اما بعد فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّ جِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّ حِیْمِ قال علیہ السّلام[۱] اِنَّ اللّٰہَ لاَ یَسْتَجِیْبُ الدُّعَآءَ عَنْ قَلْبٍ لاَہٍ ۰

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ قلب غافل سے دعاء قبول نہیں فرماتے)

ظاہر کی ضرورت

صاحبو! یہ وہی حدیث ہے جس کے متعلق میں پرسوں نماز جمعہ کے بعد بیان کر چکا ہوں چونکہ اس کے دو مدلول ہیں اور اس روز ایک کا بیان ہوا ہے اس واسطے ضرورت ہوئی کہ اسی کا بیان آج پھر ہو اور دوسرا مدلول جو رہ گیا ہے اس کو بیان کیا جاوے کیونکہ وہ بھی ضرورت ہے بلکہ بعض حیثیتوں سے یہ زیادہ ضروری ہے، البتہ دونوں مضمونوں کی مدلولیت میں تفاوت ہے، وہ یہ کہ وہ مدلول مطابقی تھا، اور آج کا مضمون مدلول التزامی ہے، وجود دلالت میں دونوں یکساں اور موثر ہیں، لہٰذا یہ خیال نہ کیا جاوے کہ اس کی وقعت اور ضرورت میں کچھ کمی ہے، البتہ ان دلالتوں میں فرق اس وقت کیا جاسکتا ہے جب کہ دونوں میں تعارض ہو، غرض ان دونوں مضمونوں میں باعتبار مدلولیت کے تفاوت معتدبہ نہیں، اور ضروری اور نوعیت کے لحاظ سے آج کا مضمون پرسوں کے مضمون سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے۔

---

[۱] المعجم الکبیر للطبرانی ۲:۳۲۳، إتحاف السادۃ المتقین ۶:۳۶۱، المغنی عن حمل الأسفار ۲:۳۳۵

عبادت کی روح

پرسوں کے مضمون کا خلاصہ شکایت تھی اس بات کی کہ اصلاح باطن کا اہتمام نہیں کیا جاتا ہے اور اس کا خیال نہیں ہے کہ عبادت میں روح بھی ہونا چاہئے یعنی ظاہر اور صورت کے ساتھ باطن اور روح کا ہونا بھی ضروری ہے، اول تو اعمال کی طرف توجہ نہیں اور کسی کو ہے بھی تو صرف ظاہر پر اکتفا ہے۔

آج دوسرے پہلو پر گفتگو ہے وہ اس کا عکس ہے، وہ تو غلطی تھی ہی کہ ظاہر پر اکتفاء کیا اور باطن کی ضرورت نہ سمجھی، اس سے بڑھ کر یہ غلطی ہے کہ بعض لوگ محض باطن کو مہتم بالشان سمجھتے ہیں، اور ظاہر کی ضرورت نہیں سمجھتے، اور میں نے جو دونوں غلطیوں کے بیان میں عنوان میں فرق کیا ہے، یعنی یہاں یوں نہیں کہا کہ باطن پر اکتفاء کرتے ہیں جیسا ظاہر کے بیان میں کہا تھا کہ صرف ظاہر پر اکتفاء ہے سو اس عنوان بدلنے کی وجہ یہ ہے کہ گو ان کا خیال ہے کہ باطن پر بھی بلا ظاہر کے عمل ہوسکتا ہے لیکن واقع میں یوں ہے اور اپنے محل میں ثابت بھی ہو چکا ہے چنانچہ وعظ روح الارواح میں ہے کہ یہ شق ثانی یعنی باطن پر اکتفاء بدوں ظاہر کے ممکن ہی نہیں اور وہ شق ممکن تھی کہ ظاہر پر اکتفاء بدوں باطن کے ہو پس چونکہ باطن پر اکتفا بدوں ظاہر کے ممکن ہی نہ تھا اس واسطے میں نے بجائے اکتفاء کے یہ لفظ اختیار کیا کہ محض باطن کو مہتم بالشان سمجھتے ہیں۔

غرض بہت لوگ اس خیال کے ہیں کہ باطن کا اہتمام کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اصلی چیز تو وہی ہے اور وہی روح ہے عمل کی اور جسد کی ضرورت نہیں سمجھتے اور مثال دیتے ہیں کہ ظاہر اور باطن میں نسبت مغز بادام اور قشر بادام کیسی ہے، کہ مقصود اور کارآمد چیز صرف مغز ہے، نہ کہ چھلکا، یہ سمجھا ہے ان لوگوں نے چنانچہ اس غلطی میں بہت لوگ مبتلا ہیں کہ باطن کو کافی سمجھتے ہیں اور ظاہر کی ضرورت نہیں سمجھتے اور اس حالت کو بدرجہا اکمل سمجھتے ہیں، ہاں ساتھ ہی اس کے جو جامع ہے ظاہر اور باطن دونوں کا اس کو یہ لوگ بھی افضل سمجھتے ہیں مگر نرے اہل ظاہر کو نرے اہل باطن سے گھٹا ہوا سمجھتے ہیں وہ بھی اور ان کے معتقدین بھی پس یہ کل تین شقیں ہوئی، نرے اہل ظاہر اور نرے اہل باطن اور جامع باطن وظاہر، انہوں نے دوسری شق کو اختیار کرلیا۔

طریقہ ملامتیہ

حالانکہ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے (جیسا کہ آگے ثابت بھی کردیا جاوے گا) کہ ظاہر باطن سے زیادہ مقصود ہے اور یہ کہ نرے اہل ظاہر نرے اہل باطن سے اچھے ہیں، اور ان لوگوں سے اکثر حالات میں ایک خاص غلطی ہوئی ہے وہ یہ کہ ایک مقدمہ ان کے ذہن میں آ گیا ہے وہ یہ ہے کہ اصلاح ظاہر سے عجب پیدا ہوتا ہے، کیونکہ تورع اور اتقاء ایک ظاہر چیز ہے اور عجب نہایت مذموم چیز ہے اس واسطے ظاہر کا موافق شرع بنانا اچھا نہیں سمجھا اور یہ اطمینان ہے کہ واقع میں متقی ہیں کیونکہ معاملہ مع اللہ ہے سونیت ہماری صحیح ہے اور اللہ میاں دل کو دیکھتے ہیں اور اس کا نام طریقہ ملامتیہ رکھا ہے، اور خیال ہے کہ جتنی ملامت زیادہ ہوگی درجات بڑھیں گے۔

یہ سمجھ کر ظاہر کو چھوڑ دیا کہ اس کی اصلاح کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ یہ لوگ بعض اوقات ان اعمال کے جو کہ اصلاح ظاہر کے متضاد ہیں یعنی معاصی ان کے بھی مرتکب ہو جاتے ہیں شراب پیتے ہیں عورتوں سے خلاملا رکھتے ہیں اجنبیات کے ساتھ خلوت کرتے ہیں قلندر بنتے ہیں چہار ابرو کا صفایا رکھتے ہیں ڈاڑھی کٹاتے یا منڈاتے ہیں اور دل کو سمجھا لیا ہے کہ ملامتی ہیں باطن کی اصلاح کی ضرورت تھی وہ کر ہی لی ہے اور ظاہر کی اصلاح کی ضرورت نہیں بلکہ وہ مخل فی اصلاح الباطن (باطن کی درستی میں خلل انداز) ہے کیونکہ اس سے عجب جیسا ذمیمہ باطنی پیدا ہوتا ہے اور گو اس طریقہ کے مباشرین کم سہی مگر ان کے معتقدین بہت ہیں جو اس طریقہ کو نہایت استحسان کی نظر سے دیکھتے ہیں اس واسطے اس کے بیان کی ضرورت ہوئی یہ بھی آج کل ایک مذاق ہے کہ بعض لوگ ایک معصیت کے مرتکب خود نہیں ہیں مگر اس کو کچھ برا نہیں سمجھتے بلکہ اس کو اچھی نظر سے دیکھتے ہیں جیسے ایک شخص نے جن کے خود ڈاڑھی موجود تھی مجھ سے گفتگو میں کہا ڈاڑھی ایک زائد چیز ہے میں نے کہا اگر تمہاری ڈاڑھی نہ ہوتی تو اس گفتگو کا تعجب نہ تھا اس وقت جواب بھی دیا جاتا اب سخت تعجب ہے اور اب کیا جواب دوں۔

نماز کسی مقام پر معاف نہیں ہوتی

یا جیسے بہت سے لوگ متقی ہیں نمازی ہیں مگر اعتقاد یہ رکھتے ہیں کہ ایک مقام پر پہنچ کر نماز فرض نہیں رہتی اسی خیال کے ایک شخص مجھ سے ملے میں نے کہا یہ ایک دعویٰ ہے اور ہر

دعویٰ کے لئے دلیل چاہیئے اس کی دلیل کیا ہے کہا شیخ عبدالقدوس نے اپنے مکتوبات میں لکھا ہے میں نے کہا دکھایئے کہاں لکھا ہے ہر چند تلاش کیا مگر نہیں ملا میں نے کہا دس برس کی مہلت ہے شیخ عبدالقدوس کے کلام میں تو کیا کسی شیخ کے کلام میں بھی نہیں مل سکتا اور شیخ کے مکتوبات میں تو ہر ایک مکتوب میں سخت تاکید ہے اتباع شریعت کی اور سب کے کلام میں یہی ملے گا سعدیؒ اتنے پرانے ہیں ان کے کلام میں ہے۔

مپندار سعدی کہ راہ صفا توان رفت جز برپئے مصطفیٰ

خلاف پیمبر کسے رہ گزید کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

(سعدی یہ مت خیال کر کہ سیدھا راستہ بغیر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طے ہوسکتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف راستہ اختیار کرنے والا کبھی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا)

وہ شخص اس وقت چپ رہے میں سمجھا شاید پھر جواب دیں گے اور کسی شیخ کے کلام سے ثبوت نکالیں گے اپنے دعویٰ کا مگر وہ پھر ملے ہی نہیں۔ غرض ایسے معتقدین کثرت سے ہیں کہ خود تو نماز روزہ کے پابند ہیں مگر پھر بھی ایسوں کے معتقد ہیں جو نہ نماز کے ہیں نہ روزہ کے یہ عجیب بات ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اجتماع ضدین کیسا اگر نماز روزہ ضروری چیز ہے تب تو ایسوں کا معتقد نہ ہونا چاہیئے جن میں اس کی کمی ہے، اور اگر ان میں اس کے نہ ہونے سے کچھ کمی نہیں آئی تو معلوم ہوا کہ یہ فعل عبث ہیں پھر خود بھی کیوں ان کا اہتمام کرتے ہیں، بس ایک جہالت ہے کہ اس نے عقل کو خراب کر رکھا ہے خود متقی اور پرہیزگار مگر غیر متقی اور غیر پرہیزگاروں کے معتقد اور ان کو اولیاء اللہ سمجھتے ہیں قرآن شریف میں تو اولیاء اللہ متقین کو فرمایا گیا ہے اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ۔ (اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کرتے تھے)

اور یہاں یہ حالت ہے کہ تقوے کی قید تو اڑائی ہی تھی ایمان کی قید بھی اڑادی، بہت سے مسلمان ہندو جوگیوں کے معتقد ہیں اور ان کو کامل سمجھتے ہیں ایک بابو ہندو ایک مقام میں تھے ان سے مسلمان مرید ہوتے تھے اور ان کو ولی اللہ کہتے تھے معلوم نہیں کیا حقائق بدل گئے ولایت کی حقیقت عداوت ہوگئی ہے تعجب ہے کہ مسلمان ہندو کو اس لئے مرید نہیں کیا کرتے تھے کہ

مرید ہونے کے لئے اسلام شرط ہے چہ جائیکہ پیر ہونے کے لئے بھی اسلام شرط نہیں رہا۔

ایسے لوگوں کو کوئی کہتا ہے مجذوب ہیں بعضے کہتے ہیں کہ مکہ میں جا کر نماز پڑھتے ہیں اس کے جواب میں کسی نے خوب کہا ہے کہ پیخانہ کے لئے تو ہندوستان اور نماز کے لئے مکہ بھلے مانس اس کی جگہ اگر یوں ہی کہہ دیتا کہ جہاں پیخانہ پھرتے ہیں وہیں نماز بھی پڑھ آتے ہیں تو کچھ لگتی ہوئی بات ہو جاتی۔

عارفوں کی بصیرت

بعضے کہتے ہیں کہ حضرت ہم کو نماز پڑھتے نظر نہیں آتے کیونکہ دوسرے جسد سے پڑھتے ہیں یہ جسم یہیں لوگوں کے سامنے رہتا ہے اور شاہ صاحب نماز دوسرے جسم سے پڑھ لیتے ہیں سو گو یہ امر ممکن ہے کہ ایک شخص دو جسم سے متجسد ہو جاوے مگر یہ کرامت ہوگی اور کرامت اختیار سے نہیں ہوتی بلا اختیار ایک کام خرق عادت حق تعالیٰ کی طرف سے ہو جاتا ہے سو اسی طرح تعدد جسد بزرگوں کے واسطے بطور کرامت ہوا بھی ہے چنانچہ ایک بزرگ ہیں قضیب البان، ان پر کوئی الزام لگا کر لوگوں نے قاضی کے یہاں چغلی پہنچا دی قاضی ان کو گرفتار کرنے چلے سامنے سے کیا دیکھتے ہیں کہ وہ ستر قالب سے چلے آ رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان میں سے اپنے مجرم کو پکڑ لو قاضی حیران رہ گیا۔

سو ایسے خوارق اکثر تو بلا اختیار ہوتے ہیں، اگر یہ ہے تو یہ توجیہ بالکل لغو ٹھہری اور کبھی ایسا تصرف بالاختیار بھی ہوا ہے مگر اس میں یہ ہے کہ جس دوسرے جسد سے نماز پڑھنے کا دعویٰ کیا جاتا ہے، وہ جسم مثالی ہے اور نماز فرض ہے اس جسم عنصری پر۔

چنانچہ ایک بزرگ تھے کہ مسجد میں جماعت ہونے لگی تو یہ نہ شریک ہوئے جہاں بیٹھے تھے وہیں بیٹھے رہے، ایک عالم نے اعتراض کیا کہ آپ نماز نہیں پڑھتے؟ انہوں نے صف کی طرف اشارہ کیا تو دیکھا وہ موجود ہیں اور جماعت میں شریک ہیں ان عالم صاحب نے فرمایا کہ جو جسد نماز میں شریک ہے وہ مثالی ہے اس پر نماز فرض نہیں وہ نفل پڑھ رہا ہے اس سے تمہارے ذمہ سے فرض ساقط نہ ہوگا۔

عارفوں کی بصیرت دیکھئے کہ پہچان لیا کہ جماعت میں جو شریک ہے وہ جسد عنصری نہیں ہے جسد عنصری وہ ہے جو بیٹھا ہے اور وہ جسد مثالی ہے ورنہ کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ بھی تو

ممکن ہے کہ جو جسم نماز میں شریک ہے وہ عنصری ہو اور جو بیٹھا ہے وہ مثالی ہو اور اس صورت میں فرض ادا ہو جاوے گا مگر انہوں نے پہچان لیا اور ان کا کہنا سچ نکلا ان بزرگ نے توبہ کی کہ ہاں بڑی غلطی ہے نماز اس طرح ادا نہیں ہوتی۔

تصرفات علامت کمال کی نہیں

ناحق ایسی حکایتیں بزرگوں سے منقول ہیں اور ایسا ممکن ہے مگر ہر شخص نہ ایسا تصرف کرسکتا ہے اور نہ یہ تصرفات ہر وقت اولیاء کے اختیار میں ہیں اور جو تصرف اختیاری بھی ہو وہ عارف ہونے کی وجہ سے ایسے تصرف نہیں کرتے کیونکہ ان کو شعبدے دکھلانا نہیں غرض یہ تصرفات ان کے نزدیک کچھ کمال نہیں کمال تو اور ہی چیز ہے۔

ان تصرفات کی نسبت خواجہ عبداللہ انصاریؒ فرماتے ہیں بر آب روی خسے باشی، بر ہوا پری مگسے باشی، دل بدست آر کہ کسے باشی، دل سے مراد اپنا دل ہے یعنی اصلاح قلب کرو کہ آدمی بن جاؤ پانی پر چلنا اور ہوا پر اڑنا تو جمادات اور حیوانات کا کام ہے پس جو ان تصرفات کو پسند کرتا ہے وہ بزرگ نہیں اور جو بزرگ ہے وہ پسند نہ کرے گا۔

سب سے بڑے اور بزرگ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں آپؐ نے کبھی ایسا نہ کیا کہ گھر میں بیٹھے رہے ہوں اور دوسرے جسم سے جماعت میں شرکت کی ہو۔

غرض چونکہ ان شعبدہ بازوں کے معتقدین بہت ہیں اگرچہ خود یہ شعبدہ باز بہت نہیں اس واسطے اس مضمون کے بیان کی ضرورت ہے اور گو اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ توجہ قلب کی بھی ضرورت ہے نرا عمل کافی نہیں چنانچہ فرماتے ہیں۔

ضرورت باطن

ان اللہ لا یستجیب الدعاء عن قلب لاہ (اللہ تعالیٰ قلب غافل سے دعا قبول نہیں فرماتے) دعاء سے مراد خواہ مطلق عبادت ہو خواہ معنی متعارف جو عبادت کا ایک فرد اکمل ہے اور اس لئے خاص دعاء کا لفظ یہاں آیا ہو اور مراد مطلق عبادت کا حکم بیان کرنا ہو تو معنی یہ ہوئے کہ عبادت کے واسطے توجہ قلب کی ضرورت ہے یعنی ظاہر کے لئے باطن کی بھی

ضرورت ہے اور اسی واسطے میں نے اس وعظ کا نام جو اس کے متعلق پرسوں ہو چکا الباطن رکھا تھا کیونکہ اس میں اس حدیث سے ثبوت دیا گیا تھا اس بات کا کہ نرا ظاہر کافی نہیں باطن کی بھی ضرورت ہے اور گو اس حدیث میں ظاہراً قلب لاہی یعنی غافل کی مذمت ہے ضرورت باطن ظاہراً مذکور نہیں مگر اس مذمت ہی سے یہ بات بھی نکل آئی کہ جب یہ فعل بُرا ہے تو اس کا خلاف اختیار کرنا چاہئے یعنی قلب کو غفلت سے بچانا چاہئے یعنی اگر دعا کی جائے تو اس میں زبانی دعاء کے ساتھ حضور قلب بھی ہونا چاہئے یا بہ لفظ دیگر یہ کہتے کہ عبادت میں ظاہر کے ساتھ باطن بھی ہونا چاہئے پس یہی حاصل ہے ضرورت باطن کا پس یہ مفہوم اس حدیث سے بہت ظاہر ہے غرض اس حدیث میں باطن کی ضرورت بھی مذکور ہے اور اسی کو تفصیل کے ساتھ گذشتہ وعظ میں بیان بھی کیا تھا مگر جس مضمون کو آج بیان کرنا ہے یہ جو کہ اس کا عکس ہے یعنی یہ کہ نرا باطن کافی نہیں ظاہر کی بھی ضرورت ہے وہ بھی اسی حدیث کا مدلول ہے اور گو اس کے ظاہری مدلول سے ظاہر کی ضرورت سمجھنا دشوار ضرور ہے، مگر ان شاء اللہ تعالیٰ اسی سے یہ بھی ثابت ہو جائے گا سو سنئے۔

اصلاح ظاہر کی ضرورت

اتنا تو حدیث کا مدلول مطابقی ہی ہے کہ توجہ قلب کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت کے لئے شرط قبول ٹھہرایا ہے اب اس کے ساتھ ایک دوسرا مقدمہ ہم ملائیں گے جس سے یہ دوسرا مضمون بھی جو آج بیان کرنا ہے اسی میں التزاماً نکل آئے گا وہ مقدمہ یہ ہے کہ کسی کام کے لئے اس کی شرط کی ضرورت من حیث الشرط ہوتی ہے اور مقصود دوسری چیز یعنی یہی کام ہوتا ہے مثلاً نماز کے لئے شرط وضو ہے تو یہی کہا جائے گا کہ وضو کی ضرورت بحیثیت شرطیت کے ہے اور اصل مقصود نماز ہے اور معلوم ہے کہ شرط شے اصل شے سے خارج ہوا کرتی ہے پس جب حدیث سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ قلب غافل سے عبادت قبول نہیں کرتا تو معلوم ہوا کہ حضور قلب شرط ہے عبادت کے لئے اور شرط مقصود سے خارج ہوا کرتی ہے تو معلوم ہوا کہ اصلی مقصود عبادت ظاہری ہے اور اس کے لئے شرط ہے توجہ باطنی۔

دیکھئے اس مقدمہ کے ملانے سے یہ مضمون پیدا ہو گیا اسی کو میں نے مدلول التزامی کہا تھا تو وہ مدلول یہ ہوا کہ ظاہر مقصود ہے بلکہ زیادہ مقصود ہے اور باطن بھی بہت ضروری ہے لیکن ظاہر اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔

مسلمانوں کی چار جماعتیں

خلاصہ یہ ہے کہ ایک کوتاہی محض اہل ظاہر میں ہے اور دوسری کوتاہی محض اہل باطن میں ہے بلکہ حالت یہ ہو رہی ہے کہ مسلمانوں کے ہر طائفہ میں کچھ نہ کچھ کوتاہی ضرور ہی ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ مسلمانوں میں چار قسم کے لوگ ہیں اول تقسیم یہ ہے کہ ایک عوام ہیں اور ایک خواص پھر خواص میں تین جماعتیں ہیں اس طرح چار قسمیں ہو گئیں خواص کی تین جماعتیں یہ ہیں علماء اور فقراء یعنی مشائخ اور امراء ان میں سے دو جماعتیں مذہبی حیثیت سے خاص ہیں وہ علماء اور فقراء ہیں خاص کے معنی ہیں ممتاز یعنی باا ثر پھر ان میں سے فقراء زیادہ خاص ہیں کیونکہ لوگ فقراء کو خدا تعالیٰ کا رشتہ دار سمجھتے ہیں اور اتنا اعتقاد ہے ان کی طرف کہ فقراء کو وہ دعویٰ ہے اس وقت جو نصاریٰ کا دعویٰ تھا نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّاۗؤُهٗ یعنی نصاریٰ کہتے تھے کہ ہم خدا تعالیٰ کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں۔

فقراء کا حال

یہی حالت آج کل فقراء کی ہو گئی ہے کہ وہ اپنا خدا تعالیٰ سے ایسا ہی تعلق سمجھتے ہیں جیسے نصاریٰ سمجھتے تھے، جس کا ذکر اس آیت میں ہے یہاں کوئی یہ نہ کہے کہ آج کل فقراء اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہاں کہتے ہیں جیسے نصاریٰ کہتے تھے اس واسطے کہ ہم کہتے ہیں کہ نصاریٰ بھی اپنے آپ کو خدا کا بیٹا بایں معنی نہیں کہتے تھے کہ ان سے اور خدا سے بنوت اور ابوت کا تعلق ہے کہ یہ حقیقی بیٹے ہیں اور حق تعالیٰ حقیقی اور متعارف باپ ہے ایسا تو کون ہے کہ حق تعالیٰ سے سلسلہ نسب کا قائم کرے بلکہ اپنے آپ کو بیٹا اور دوست خدا کا صرف بایں معنی کہتے تھے کہ خدا تعالیٰ سے ایسا گہرا اور ایسی خصوصیت کا تعلق ہے جیسے بیٹے کو باپ سے اور محب کو محبوب سے ہوتا ہے۔

اس پر شاید کوئی یوں کہے کہ اگر یہ معنی ان کے مراد تھے تو پھر اس پر حق تعالیٰ نے رد کیوں کیا، کوئی ایسا تعلق تو حق تعالیٰ کے ساتھ محال نہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ ان کی مراد صرف قرب ومحبت ہی نہ تھی بلکہ مراد ایسا قرب خاص تھا کہ اگر ہم نافرمانی بھی کریں تب بھی یقیناً بلا سزا معاف کردیئے جاویں گے اور یہ علاقہ قطع نہیں ہوسکتا جیسے بیٹے اور محبوب کا جرم بدوں عامیانہ سزا کے معاف ہو جاتا ہے اور اس سے علاقہ قطع نہیں کیا جاتا اسی لئے ان پر رد کیا گیا ہے **قل فلم یعذبکم بذنوبکم** (آپ کہتے پس کس کے لئے تم کو تمہارے گناہوں کی سزا دیں گے) اور علاقہ محال نہیں اگر کسی کو وہ بھی ہو تب بھی لفظ ابناء بیہودہ ہے اور گستاخی ہے جیسے باپ کو لکھیں برخوردار نور چشم کہ یہ الفاظ ایک معنی کے باپ پر صادق آسکتے ہیں لیکن اس وجہ سے کہ ان کا غالب استعمال اولاد کے لئے ہے نہ کہ باپ کے لئے باپ کے لئے بدتمیزی میں داخل ہیں۔

لفظ طول عمرہ کی تحقیق

یا اس سے زیادہ ایک ایسا لفظ جس کا استعمال چھوٹوں کے لئے اتنا غالب نہیں ہے جتنا برخوردار، اور باپ کے لئے بالمعنی الحقیقی واللغوی کسی طرح خلاف بھی نہیں یہ ہے کہ کوئی باپ کو لکھے راحت جان طال عمرہ (آپ کی عمر دراز ہو) (طال عمرہ پر یاد آیا کہ لوگ لکھتے ہیں طول عمرہ بروزن غول کوئی لفظ ہے ہی نہیں لکھنا تو صحیح ہے مگر پڑھنے میں یہ لفظ طول عمرہ ہے اس کے معنی ہیں درازی جائے عمر اس کی دستور الصبیان پڑھنے والے اس کو یاد کرلیں اور اپنی غلطی کو صحیح کرلیں طول عمرہ پڑھیں یا لفظ ہی بدل دیں طال عمرہ لکھیں)

غرض یہ لفظ باپ کے لئے بالکل صحیح ہے کیونکہ بیٹے کو باپ سے محبت ہوتی ہے جیسے کہ باپ کو بیٹے سے محبت ہوتی ہے، تو جیسا باپ کے لئے بیٹا راحت جان ہے اور وہ اس کی عمر کی درازی چاہتا ہے ایسے ہی بیٹے کے لئے باپ بھی راحت جان ہے اور وہ بھی اس کی عمر کی درازی چاہتا ہے تو لفظی اور لغوی معنی کے لحاظ سے تو یہ اطلاقات بالکل صحیح ہیں مگر سب جانتے ہیں کہ ایسا لکھنا گستاخی ہے اور اگر کوئی بیٹا ایسا کرے تو باپ کی طرف سے ضرور اس پر سرزنش کی جائے گی وجہ یہ ہے کہ عنوانات کو بھی دخل ہے۔

دورحاضر کے فقراء کا حال

اسی طرح نصاریٰ جو اپنے واسطے ابناء اور احباء کا لفظ استعمال کرتے تھے اس میں معنوی و لفظی دونوں گستاخیاں جمع تھیں ان کی مراد معنی حقیقی نہ ہوتے تھے مگر اس کا اطلاق بھی حق تعالیٰ کے مقابلہ میں بدتمیزی ہے یہی حالت آج کل فقراء کی ہے کہ اپنے آپ کو حق تعالیٰ کے یہاں اتنا دخیل سمجھتے ہیں کہ بیٹے اور محبوب کو بھی شاید اتنا دخل نہ ہو اگر زبان سے لفظ نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبّٰٓؤُهٗ نہ کہا تو کیا ہے قالاً نہ سہی حالاً تو یہ دعویٰ موجود ہے چنانچہ باوجود نافرمانی کے بدستور اپنے کو مقبول سمجھتے ہیں تو بس آج کل درویشی کی یہ حالت ہے کہ ایک دفعہ بزرگی کا لقب ملا اور رجسٹری ہوئی پھر نہ مارے مرے نہ کاٹے کٹے کسی طاعت کی ان کو ضرورت نہیں رہی کوئی معصیت ان کو مضر نہیں ہوتی ان کی بزرگی ایسی ہو جاتی ہے جیسے ہندوستان کا نکاح کہ جب ایک دفعہ بندھ گیا تو کسی طرح بھی نہیں ٹوٹتا حتیٰ کہ کفر سے بھی نہیں جاتا بہت سے نوجوان ایسے موجود ہیں (اور یہ برکات ہیں تعلیم جدید اور آزادی کے) کہ عقائد ان کے اسلام کے خلاف ہیں اور منہ سے بھی کلمات کفر بکتے ہیں اور نکاح ان کا جیسا ہوا تھا ویسے ہی موجود ہے برابر جھڑا جھڑ اولاد ہو رہی ہے اور سب حلال کی ہے۔

داماد کا اسلام تو دیکھ لینا چاہئے

خدا بچاوے آج کل تو ضرورت اس بات کی ہے کہ نکاح کے وقت یہ بھی دیکھ لیا جاوے کہ کافر سے نکاح کیا جا رہا ہے یا مسلمان سے پہلے زمانہ میں تو لڑکوں کے اعمال دیکھے جاتے تھے کہ نماز اور پرہیزگار بھی ہے یا نہیں اب وہ زمانہ ہے کہ ایمان پر آ بنی ہے اعمال کو چھوڑا اگر ایمان ہی داماد کا صحیح سالم ہو تو بڑی خوش قسمتی ہے ایسی نظیریں اس وقت کثرت سے موجود ہیں کہ ایک شریف اور پکے مسلمان دیندار کی لڑکی اور وہ ایک ایسے لڑکے کے تحت میں ہے کہ وہ ضروریات دین کا بھی قائل نہیں ہے مگر دونوں خاندان خوش ہیں اور اولاد بھی ہو رہی ہے اور علانیہ اس نے کلمات کفر بکے اور کسی کے کان پر جوں بھی نہیں رینگی اگر کوئی دوسرا آدمی کچھ کہے تو سب لوگ مارنے مرنے کو تیار ہو جاویں کہ ہماری لڑکی کو بدکار

بتلایا جاتا ہے مصیبت ایسی لڑکیوں کی ہے کیونکہ وہ اگر دیندار ہوئیں اور جانتی ہوئیں کہ نکاح باقی نہیں رہا تو ان پر کیا گزرے گی مگر ظالموں کے ہاتھ میں ہیں اور بے بس ہیں ماں باپ ہی نے اس کو کنویں میں دھکا دیا ہے تو دوسرا کون دادرسی کرے۔

نکاح سے متعلق ایک غلو

نکاح کے بارے میں ایک طرف تو یہ غلو ہے اور بعض جگہ دوسری طرف غلو ہے کہ ذرا ذرا بات میں نکاح رخصت ایک پیر صاحب تھے کہ وہ باہر ہفتہ مریدوں کا نکاح دوبارہ پڑھایا کرتے تھے ان کا دماغ خراب تھا بعض جگہ دماغ بھی خراب نہیں مگر شرارت سے نکاح کے زوال کا ڈر دکھاتے ہیں۔ چنانچہ ایک پیر صاحب گاؤں میں پہنچے اور کسی سے اجرت نکاح خوانی کی کمی پر خفا ہوئے تو کہا میں تیرا نکاح ادھیڑ دوں گا اور پڑھا وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ادھڑ بے نکاحا بس ان کے عمل سے نکاح ادھڑ گیا۔

تو نکاح بعضوں کے یہاں تو کچا تاگا ہے کہ بات بہانے ٹوٹتا ہے اور بعضوں کے یہاں لوہے کا ہے کہ توڑنے سے بھی نہیں ٹوٹتا لوہا تو کاٹنے سے کٹ بھی جاتا ہے مگر یہ نکاح اٹل ہے کہ کسی طرح بھی اس میں تغیر نہیں آسکتا۔

رضاعی بہن سے نکاح

ایک جگہ ہمارے قرب میں غلطی سے یہ ہوا کہ ایک لڑکی کا نکاح پڑھا گیا اور رخصتی بھی ہوگئی اس کے بعد معلوم ہوا کہ لڑکی اس کی رضاعی بہن ہے کہ وہ جس عورت کا دودھ پیتی تھی ایک روز اس لڑکے نے اس کا دودھ پی لیا تھا اب شرعی مسئلہ تو یہ ہے کہ جب معلوم ہوگیا تو اب دونوں میں تفریق کر دینی چاہئے جو ہوا سو ہوا مگر اس کو گھر والوں نے غیرت کے خلاف سمجھا اور کوشش کی کہ کسی طرح یہ نکاح صحیح ہی رہے جا بجا مسئلہ کسی کے باوا کی جاگیر تو نہیں ہے کہ اس میں تغیر تبدل کر سکے صاف کھلا ہوا مسئلہ ہے کہ رضاعی بہن بھی حقیقی بہن کے حکم میں ہے کہیں سے فتویٰ نہ ملا تو وہ کسی غیر مقلد کے پاس پہنچ گئے اور اس سے یہ مسئلہ سنا کہ بچہ جب تک پانچ گھونٹ نہ پیئے رضاع کا حکم ثابت نہیں ہوتا بس انہوں نے ایک سوال اسی قید سے بنایا حالانکہ آج کس کو یاد ہے کہ اس نے کتنے گھونٹ پیئے تھے اور اس سوال کا جواب

ایسے ہی شخص سے لکھوا کر فتویٰ حاصل کر لیا اور دل کو سمجھا لیا اور دونوں میں تفریق نہیں کی اور یہ مسئلہ گو اختلافی ہے مگر اول تو بلا ضرورت دوسرے کی تقلید کیسے درست ہوگی پھر یہ کیسے معلوم ہوا کہ پانچ گھونٹ نہیں پیئے تھے کچھ نہیں بس ایک آڑ ہاتھ آ گئی تعجب ہے کہ تفریق تو غیرت کے خلاف تھی اور تمام عمر کے لئے حرام میں مبتلا رہنا غیرت کے خلاف نہیں۔

لوہے کے نکاح

غرض بعضے نکاح ایسے پختہ ہیں، میرے پاس ایک مسئلہ آیا کہ خاوند طلاق دیتا ہے مگر عورت کہتی ہے کہ تو کتنی ہی طلاقیں دے میں لیتی ہی نہیں تو اس صورت میں طلاق ہوگی یا نہیں، ایسی موٹی بات میں بھی تامل ہے یہ لوہے کے نکاح ہیں اسی طرح بعض اس غلطی میں ہیں کہ عورت اگر خاوند کو باپ کہہ دے تو طلاق ہو جاتی ہے (باپ کہا اور باپ ہوا) غرض دونوں طرف غلو ہے، اور اکثر تو ہندوستان کے نکاح مضبوط ہی ہیں۔

ایسے ہی ہندوستان کی بزرگی بھی بڑی مضبوط ہے کہ ایک دفعہ نام لگ گیا پھر جا ہی نہیں سکتا، مریدوں کی یہ حالت ہے کہ ان کو بزرگ سمجھتے ہیں اور ان کے بُرے سے بُرے فعل کی بھی تاویل کرتے ہیں یہ تو ٹھیک ہے کہ خطائے بزرگان گرفتن خطاست (بزرگوں کی خطا پکڑنا خطا ہے) بزرگوں کے اقوال کی حتیٰ الامکان تاویل ہی کرنا چاہئے مگر پہلے بزرگی کا بھی تو ثبوت ہو جاوے جب ان کا کوئی فعل بھی اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حکم کے موافق نہیں تو وہ بزرگ کیسے ہوئے اور کس نے بزرگ بنایا اور اگر ایسی ہی تاویل کی ٹھیرے گی تو بت پرستوں کو بھی لڑکی دینا پڑے گی کیونکہ بری بھلی تاویل تو اس کی بھی ہو سکتی ہے مثلاً یہ کہ بمصلحت ملامت کے ظاہراً بت پرستی اختیار کر رکھی ہوگی جیسے کہ پیر صاحب کو کہتے ہیں کہ بمصلحت ملامت کے نماز وغیرہ نہیں پڑھتے اللہ بچاوے۔

ہر جگہ تاویل کرنے کی خرابی

اور اگر ایسی تاویلوں پر احکام کا دارومدار ہوگا تو نہ کوئی مومن مومن رہے گا نہ کوئی کافر کافر، کیونکہ مومن کو کہا جا سکتا ہے کہ بمصلحت مومن بنا ہوا ہے ممکن ہے کہ حقیقت میں مومن نہ ہو اور کافر بمصلحت کافر بنا ہوا ہے حقیقت میں کافر نہ ہو نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمان کا تو جنازہ نہ

پڑھو اور ہندو کا جنازہ پڑھو کیونکہ کوئی معیار تو حقیقت حال کے معلوم کرنے کا رہا ہی نہیں احتمال پر دار و مدار رہا یہ کیا خرافات ہے۔

اگر شریعت سے بھی قطع نظر کر لی جاوے تب بھی وہ کونسی عقل ہے جو اسی طریقہ کو جائز رکھتی ہو کہ ہر وقت تاویل سے کام لیا کرو ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ ایک شخص کے گھر میں کوئی اجنبی آدمی آدھی رات کو گھس آوے اور اس سے کچھ اندیشہ نہ کیا جاوے چور وغیرہ ہونے کا اس بناء پر کہ ممکن ہے کہ کسی کام سے اور کسی نیک ارادہ سے آیا ہو اس صورت میں تو یہ کریں گے کہ احتمال بھی وہی نکالا جاوے گا جس میں احتیاط کا پہلو ہو اور اپنے لئے مفید ہو یعنی اس کو پکڑ کر فوراً پولیس میں پہنچایا جاوے گا اور اس کا کافی انتظام کیا جاوے گا صرف اس بناء پر کہ ممکن ہے کہ چور ہو اور ظاہر کو اس کا قرینہ ہونے کے لئے کافی سمجھا جاوے گا وہ ظاہر یہ ہے کہ بلا سبب اور بلا وجہ کیوں آیا نہ کہ یہ چھوڑ دیا جاوے گا اس بناء پر کہ ممکن ہے کہ چور نہ ہو جب ہر کام میں اسی پر عمل ہے کہ ظاہر کو باطن کی دلیل سمجھا جاتا ہے تو دین ہی ایسی کیا زائد اور فضول چیز ہے کہ اس کیلئے تاویلوں ہی پر حکم کر لیا جاتا ہے اور کوئی کھلا کھلا بد دینی کے کام کرتا رہے تب بھی اس کو دیندار اور مقتداء ہی کہا جاتا ہے۔

اچھے اور بُرے کا معیار

خوب سمجھ لو کہ اچھے اور برے کا معیار یہی ہے کہ ظاہری حالت کو دیکھو اگر ظاہر دین کے موافق ہو تو دیندار سمجھو اور اگر ظاہر دین کے خلاف ہے تو بد دین سمجھو ہاں یہ ضرور ہے کہ کبھی کسی پختہ دیندار کا کوئی فعل اگر ایسا ہو کہ صورتاً دین کے خلاف معلوم ہوتا ہے تو اس وقت جلدی نہ کرنا چاہئے کیونکہ وہ واقع میں خلاف نہیں ہوتا مگر یہ شاذ و نادر ہوتا ہے اعتبار اکثری حالت کا ہے نہ یہ کہ بلا وجہ اور بلا ضرورت اور قصد و اختیار کے ساتھ ہر وقت کفریات کی بارش ہوتی رہتی ہے اور ان کی بزرگی میں ذرہ برابر فرق نہیں آتا بُرے سے بُرے فعل کرتے ہیں اور مرید صاحب سب میں تاویل کر لیتے ہیں۔

ایک زانی پیر کا قصہ

کانپور میں ایسے ہی ایک پیر صاحب تشریف لائے جو اس قدر آزاد تھے کہ ایک بازاری عورت سے منہ کالا کیا چاروں طرف سے اعتراض ہوئے تو ارشاد فرمایا کہ میاں کون کرتا ہے اور کون کراتا ہے ہمہ اوست (سب وہی ہے) بس مریدین و معتقدین کی تسلی ہو گئی

کہ شیخ پر وحدۃ الوجود کا غلبہ ہے اور بڑے عالی مقام شیخ ہیں۔ ہمہ اوست سے کیا اچھا کام لیا گیا ہے ایک طوفان بدتمیزی ہے کہ دینداری کی تو یہ حالت پھر ایسوں کو ولی اللہ کہا جاتا ہے۔ گویا ولی اللہ اور عدو اللہ ایک چیز ہے۔

غرض اس قدر پختہ اور رجسٹری شدہ ہے ہندوستان کی بزرگی کہ ایک دفعہ ایسی پکی مہر اس پر لگائی گئی ہے کہ کبھی وہ جا ہی نہیں سکتی بلکہ ایسی رجسٹری شدہ ہے کہ اگر ایک دفعہ قبالہ بھی جل گیا تو پھر عدالت سے اس کی نقل لے لی یہ اندھیر ہو رہا ہے۔

اس طول طویل سے میری غرض یہ ہے کہ فقراء بھی خواص میں سے ہیں اور با اثر ہیں حتیٰ کہ مشاہدہ ہے کہ ان کا اثر علماء سے بھی زیادہ ہے اور عوام تو درکنار خود علماء بھی زیادہ اثر ہے یہی وجہ ہے کہ بعض علماء بھی فقراء کے معتقد ہیں ایک فقیر صاحب جا رہے تھے اور ایک عالم صاحب ان کے پیچھے پیچھے حقہ لئے جاتے تھے یہ دلیل ہے اس کی کہ فقراء علماء سے بھی زیادہ با اثر ہیں کیونکہ ان کا اثر علماء پر بھی چلتا ہے۔

امراء بھی با اثر ہیں

غرض ایک با اثر گروہ تو فقراء کا ہوا اور علماء با اثر ہوتے ہی ہیں سب جانتے ہیں یہ دو گروہ ہوئے اور تیسرا گروہ امراء کا ہے یہ جماعت بھی با اثر ہے دینی اثر نہ سہی مگر دنیوی اثر بہت ہے اور ان کا کچھ اثر طبعاً زیادہ پڑتا ہے ایک امیر جس خیال کا ہو سینکڑوں اسی کے ساتھ ہو جاتے ہیں اگر نیک ہے تو نیک اور بد ہے تو بد نواب صاحب ڈھاکہ ہر وقت جماعت میں شریک ہوتے تھے اور عمامہ باندھتے تھے تو ان کی وجہ سے سینکڑوں آدمی جماعت کے پابند تھے اور عمامہ باندھتے تھے۔

امراء کے با اثر ہونے پر ایک لطیفہ یاد آیا ایک بزرگ بھوپال میں تھے بیگم صاحبہ ان کی زیارت کو آئیں جب بیگم صاحب واپس ہونے لگیں تو انہوں نے ان کی جوتیاں جھاڑ کر سیدھی کر دیں انہوں نے کہا توبہ توبہ آپ نے بزرگ ہو کر مجھ گنہگار کو شرمندہ کیا انہوں نے فرمایا تم مجھ سے زیادہ بزرگ ہو بیگم صاحبہ نے پوچھا کس طرح انہوں نے کہا کہ میں مدت سے کوشش کرتا ہوں کہ بیوہ عورتیں نکاح کر لیں مگر کچھ اثر نہیں ہوتا تم ایک دفعہ اعلان کر دو تو پھر دیکھو کیا ہوتا ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور بکثرت نکاح ہوئے سو یہ کاہے کا اثر ہے امیری کا۔

غرض امراض کا بھی اثر بہت ہے بلکہ بعض حیثیت سے امراء کا اثر علماء اور فقراء سے بھی زیادہ ہے کیونکہ علماء اور فقراء کی بڑی دوڑ یہ ہے کہ زبان سے فہمایش کر دیں اور امراء کو یہ بھی قدرت ہے کہ زبردستی کام کروالیں اور امیر ہونے کا یہ اثر ہوتا ہے کہ ایک ڈپٹی امداد علی صاحب تھے مولوی آدمی تھے وعظ بھی کہا کرتے تھے، ان کے وعظ میں منہ کے سامنے اور سب سے آگے وہ وکلاء بیٹھا کرتے تھے جو وعظ کو جانتے بھی نہیں تھے مگر ڈپٹی صاحب کی خوشامد میں سب سے آگے رہتے تھے بات یہ ہے کہ امراء کے ساتھ عام طور سے لوگوں کے کچھ اغراض ومنافع وابستہ ہوتے ہیں اور ان کی مخالفت کرنے میں ان کے فوت کا احتمال ہوتا ہے اس واسطے امراء کی خوشامد کرنا ہی پڑتی ہے اور جس طرف وہ چلیں اس طرف چلنا پڑتا ہے۔

میرے ایک دوست کہتے تھے کہ مردم شماری کے زمانہ میں میں نے اپنے ایک ملنے والے سے کہا جو اسی کام پر تعینات تھے کہ بڑا ثواب ہوگا اگر تم اس وقت میں ایک کام کر دو وہ یہ کہ جب کسی مسلمان کے یہاں مردم شماری کرنے جاؤ تو جہاں اور خانہ پُر یا کرتے ہو یہ بھی پوچھ لیا کرو کہ نمازی ہے یا نہیں انہوں نے ایسا ہی کیا حضرت صرف اس پوچھنے کا یہ اثر ہوا کہ ہزاروں آدمی نمازی ہوگئے حالانکہ کاغذ میں اس کے لئے کوئی خانہ نہ تھا اس سوال ہی سے لوگ یہ سمجھے کہ حکام کو اس کی طرف توجہ ہوئی ہے نماز نہ پڑھنے پر کوئی برا نتیجہ متفرع ہوگا صرف اس احتمال اور خیال کا وہ اثر ہوا کہ کسی وعظ اور فہمائش کا نہ ہوتا وجہ کیا ہے کہ حکومت کی طرف ہر شخص کے اغراض ومقاصد رجوع ہوتے ہیں ان پر اثر پڑنے کا احتمال ہوگیا۔

امارت اور حکومت کو بڑا دخل ہے

اسی طرح انہوں نے ایک سب انسپکٹر صاحب سے کہا تھا کہ آپ کوشش کریں تو نمازی بہت ہو جاویں انہوں نے کہا میں کیا کوشش کر سکتا ہوں قانوناً اس میں مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے کہا مداخلت کچھ نہ کیجئے صرف اتنا کیجئے کہ جو بے نمازی ملے جھوٹ موٹ اس کا نام نوٹ بک میں لکھ لیا کیجئے اور زبان سے کچھ نہ کہئے اس کا اثر یہ ہوا تھا کہ تمام علاقہ کے آدمی نمازی ہوگئے۔

غرض امارت اور حکومت کو بڑا دخل ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ملک شام میں ایک شخص نے متشابہات میں کچھ گفتگو کی تھی تو آپ نے اس کے درے لگوائے تھے اس کا یہ

اثر ہوا کہ تمام ملک میں اس کا انسداد ہو گیا اور آج کل یہ نوبت ہے کہ بچوں کی زبان پر بھی یہی گفتگو ہے متشابہات سے ادھر کوئی بات چیت ہی نہیں کرتا کیونکہ حکومت کا خوف نہیں ہے اسی معنی کر حضرت عمرؓ نے کہا یزع السنان اکثر مما یزع القرآن یعنی حکومت وہ انسداد کر سکتی ہے جو قرآن (یعنی وعظ و نصیحت) نہیں کر سکتا حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کا شعر ہے ۔

الوعظ ینفع لو بالعلم والحکم   والسیف ابلغ وعاظ علی القم

(وعظ نافع ہے اگر علم و حکمت کے ساتھ ہو اور سب سے بڑی واعظ تلوار ہے)

اور فرمایا کرتے تھے کہ یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے بطور امتنان فرمایا ہے وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ ''ہم نے لوہے کو پیدا کیا یعنی ہتھیاروں کو کہ اس سے بڑا خوف پیدا ہوتا ہے''

اہل سنان کا اثر

حاصل یہ کہ اہل سنان کا بڑا اثر ہوتا ہے اور مولانا فرمایا کرتے تھے کہ اس میں نعلدار جوتا بھی داخل ہے کیونکہ اس میں بھی حدید ہے اور مولانا نے نعلدار جوتے کا نام روشن دماغ رکھا تھا کیونکہ کیسے ہی کسی کے دماغ میں رعونت بھری ہو اور اس نے اس کو اندھا کر رکھا ہو اس سے ذرا دیر میں سب کافور ہو جاتی ہے اور دماغ میں روشنی پیدا ہو جاتی ہے اور خیالات صحیح ہو جاتے ہیں۔

غرض امراء کو یہ قدرت بھی حاصل ہے کہ یوں کسی کے سمجھ میں نہ آئے تو یہ جبراً اس سے کام کرا لیں بعض جگہ نماز نہ پڑھنے پر امراء نے لوگوں کو پٹوا دیا ہے بس پھر کوئی عذر کسی کو مانع نہیں رہا یہاں کوئی شاید یہ شبہ کرے کہ ایسی نماز سے کیا فائدہ جو بجبر و اکراہ پڑھی جاوے میں کہتا ہوں اس سے بھی فائدہ ہے اول تو یہ کہ بے نمازی کم ہو جاتے ہیں اور گناہ کی نحوست رفع ہو جاتی ہے دوسرے یہ کہ اس وقت تو وہ نماز بجبر ہے مگر نماز میں اثر یہ ہے کہ وہ خود دل میں گھر کر لیتی ہے پھر آدمی واقعی نمازی ہو جاتا ہے۔ اس کی شہادت صدہا واقعات سے ملتی ہے کہ نماز شروع تو کی گئی کسی کے ڈر اور دباؤ سے یا شرما حضوری سے یا دیکھا دیکھی یا کسی لالچ سے مگر چند ہی روز میں وہ اصلی اور واقعی نماز ہو گئی اور ڈر اور دباؤ وغیرہ جاتا بھی رہا مگر نماز بدستور رہی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی ایسا ہوا ہے کہ ایک شخص نے کہا کہ میں ایمان جب لاؤں کہ مجھے فلاں پہاڑوں کے درمیان جو بکریاں چرتی ہیں وہ دے دیجئے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً عطا فرمادیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ سخاوت تھی کہ یہ بکریاں کیا چیز تھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تو کچھ بھی مانگا جاتا وہ انکار نہ فرماتے فرزدق شاعر کہتا ہے۔

ما قال لاقط الا فی تشہدہ   لو لا التشہد کانت لاؤہ نعم

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لاتو کبھی کہا ہی نہیں سوائے کلمہ شہادت کے کہ اس میں تو **لا الہ الا اللہ** میں لا کہنا ہی پڑا، اس کے سوا کبھی کسی بات میں لا نہیں کہا، اگر تشہد نہ ہوتا تو لا کوئی لفظ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان میں نہ رہتا بلکہ اس کی جگہ نعم یعنی ہاں ہو جاتا لا سے عربی زبان کا لا مراد ہے جس کے معنی نہیں کے ہیں یعنی سوال کے جواب میں کبھی نا نہیں کی اور لا سے کوئی اردو کا لا نہ سمجھے کہ جس کے معنی ہیں لاؤ کچھ دلواؤ اگرچہ ہے یہ بھی صحیح کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی سے سوال بھی نہیں کیا (مسکرا کر)

غرض عربی کا لا لو یا اردو کا لا لو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں اس کا نام نہ تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ آج کل کے پیروں کا سا نہ تھا کہ ان کے یہاں لا سب سے پہلے رکھا ہوا ہے کہتے ہیں خالی آوے خالی جاوے۔

خالی کی دو قسمیں

صاحبو! اس جملہ کا بھی ایک صحیح مطلب ہو سکتا ہے وہ یہ کہ خالی کی دو قسمیں ہیں خالی عن الخلوص (خلوص سے خالی) اور خالی عن الفلوس (پیسوں سے خالی) تو مراد اول قسم ہے نہ دوم مطلب یہ ہے خلوص سے خالی نہ جاؤ پیر کے پاس اگر خلوص سے خالی جاؤ گے تو فیض سے بھی خالی آؤ گے یہ مضمون بالکل صحیح اور سچا ہے اور کھاؤ کماؤ پیروں نے دوسری قسم مراد لی ہے کہ جب تک نذرانہ نہ دو فیض نہیں ہو سکتا اور یہاں تک نوبت ہے کہ تقاضا کر کے نذرانہ وصول کیا جاتا ہے۔

ایک کھاؤ پیر کا قصہ

ایک شیخ صاحب سے مرید نے کہا کہ دعاء کر دیجئے فلاں نوکری مل جاوے کہا دعاء کریں گے مگر شرط یہ ہے کہ پہلی تنخواہ ہماری ہوگی خدا کی قدرت وہ نوکری مل گئی اور شیخ

صاحب کو خبر ہوئی کہا لاؤ پہلی تنخواہ بے چارہ غریب آدمی تھا کہا حضرت جی کچھ کم لے لیجئے کہا نیت بدلی ہے تو نوکری بھی کرلو گے وہ بے چارہ خواہ مخواہ ڈر گیا اور سمجھا کہ اللہ میاں کے یہاں ان کی چلتی ہے ایسا نہ ہو کہ نوکری جاتی رہے۔

صاحبو! یہ کیا طریقہ ہے کس قدر بے حیائی اور شوخ چشمی ہے کہ اول تو مطلق سوال ہی بے غیرتی کی بات ہے پھر اس بے باکی کے ساتھ کہ ڈراؤ بھی دیا جاتا ہے یہ تو اچھا خاصا ڈاکہ ہے اور نہ معلوم لوگ ایسے ڈاکوؤں سے کیوں ڈرتے ہیں کیا کوئی بات ان کے بس میں ہے یا خدا کے کارخانہ میں یا مشیر یا مدار المہام ہیں کہ ان سے پوچھ کر کوئی کام کیا جاتا ہے اصل یہ ہے کہ یہ ڈرنے والے لوگ خدا کو راضی نہیں رکھتے ورنہ کسی ڈاکو سے کیا ڈر تھا جب خدا کو راضی نہیں رکھا جاتا تب ہی قلب میں ضعف پیدا ہوتا ہے اور آدمی ایسے پیروں سے ڈرنے لگتا ہے اور درخت سے ڈرتا ہے اور بھوت سے ڈرتا ہے درخت اور بھوت اور ایسے پیر چیز کیا ہیں خدا کے سامنے۔

خوف مضرت

حضرت حاجی صاحب کا قول ہے کہ میں خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا اور اگر مخلوق میں کچھ ڈر ہے تو اپنے نفس کا ان میں ایک خوف عظمت کا ہے یعنی وہ خوف جس کی وجہ عظمت ہو تو یہ خدا سے چاہئے اور ایک خوف مضرت یعنی نقصان کا ہے یہ خوف نفس سے چاہئے بس اس کے سوا کوئی خوف مسلمان کے پاس نہیں آ سکتا اسی بارہ میں کہا ہے۔

موحد چہ درپائے ریزی زرش   چہ شمشیر ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نباشد زکس   ہمیں ست بنیاد توحید و بس

''موحد اور عارف کے قدموں کے نیچے خواہ سونا بکھیریں یا اس کے سر پر تلوار رکھیں امید و خوف اس کو بجز خدا کے کسی سے نہیں ہوتا توحید کی بنیاد بس اسی پر ہے''

اور جب خدا کا ڈر کسی قلب میں نہیں ہوتا تو پھر سب کا ڈر اس پر مسلط ہوتا ہے غرض بیچارے نے پوری تنخواہ نذر کی وہ تنخواہ کیا تھی اس کی تو جان خواہ تھی کہ دم نکل گیا اتنی رقم بلا وجہ دیتے ہوئے اور پیر کی تنخواہ تھی کہ خوب تن آسانی ہوئی۔

غرض آج کل کے پیروں کے پاس لا ہی لا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں اس کا نام نہ تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو وہ بکریاں دے دیں یہ تالیف قلب تھی یہاں بھی یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ وہ ایمان کیا ہوا جو بکریوں کے لالچ سے ہوا اصل یہ ہے کہ بکریاں صرف ابتداء میں اس کے لئے ایک ذریعہ ہیں پھر وہ ایمان خود ایسی چیز ہے کہ اس کے پاس پہنچنے کی دیر ہے وہ خود اڑ کر لپٹتا ہے اور آدمی اس سے پھر الگ ہو ہی نہیں سکتا جملہ طاعات کی یہی حالت ہے کہ جب تک آدمی ان سے علیحدہ ہے تب ہی تک وحشت ہے اور ایک دفعہ جبر سے اکراہ سے لالچ سے حتیٰ کہ بطور ہنسی دل لگی کے بھی کسی کے پاس آ جاوے پھر ممکن نہیں کہ اس کو چھوڑ سکے یہ اس شبہ کا حل ہے کہ ایسی نماز سے کیا فائدہ ہے جو پٹنے کے ڈر سے پڑھی گئی۔

بات اس پر چل رہی تھی کہ امراء کو ایک طرح سے وہ قدرت حاصل ہے کہ فقراء و علماء کو بھی نہیں۔

بااثر جماعتیں

خلاصہ یہ کہ امراء بھی ذی اثر جماعت ہے تو ذی اثر جماعتیں جن کو میں نے خواص کہا تھا تین ہوئیں علماء، فقراء، امراء اور ایک جماعت مسلمانوں میں عوام کی ہے، تو کل چار جماعتیں ہوئیں اور اس بارے میں ان چاروں میں کچھ نہ کچھ کوتاہیاں ہیں خواہ اصالۃً خواہ تبعاً چنانچہ عوام کی تو اصالۃً کوئی خاص حالت ہی نہیں بلکہ خواص کی تقسیم سے وہ بھی منقسم ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ لوگ تابع ہوتے ہیں جو حالت متبوع کی ہوتی ہے وہی ان کی ہوتی ہے سو عوام میں سے بعضے علماء کے ساتھ ہوتے ہیں اور بعضے فقراء کے ساتھ اور بعضے امراء کے ساتھ جو جس کے زیر اثر ہو تو ان کی کوئی الگ حالت قرار دینا فضول ہے پس تین ہی جماعتیں رہیں علماء فقراء امراء انہی کی حالت میں عرض کروں گا۔

جماعت محققین

ہاں ایک پانچویں جماعت محققین کی ہے مگر اس کے بیان کی ضرورت اس واسطے نہیں کہ یہ تو کامل مکمل ہیں اور اس وقت مقصود بالبحث وہ لوگ ہیں جن کی حالت کی اصلاح کی

ضرورت ہے پس ان تینوں میں سے ایک جماعت علماء کی ہے علماء کے ساتھ یہ قید ذہن میں رکھئے کہ مراد علماء اہل نقص غیر کامل ہیں جنہوں نے اپنی اصلاح پوری پوری نہیں کی کیونکہ میں محققین کی جماعت کو الگ کر چکا ہوں سوان میں تو یہ مرض ہے کہ ان کو صرف ظاہر کی اصلاح کا اہتمام ہے اور باطن کی اصلاح کا اہتمام نہیں ظاہر ان کا خود بھی درست ہے اور دوسروں کو بھی اس کی درستی کی تعلیم کرتے ہیں وعظ میں ان کے یہ مضامین ہوتے ہیں کہ سود نہ لو رشوت نہ لو شراب نہ پیو اور جوا نہ کھیلو اور جب کسی نے ظاہر درست کرلیا تو ان کی تعلیم یہ ہے کہ اب اس سے کچھ تعرض نہ کرو وہ کمال کو پہنچ گیا اور اس کے ثبوت کے لئے پڑھ دیتے ہیں۔

ہر کرا جامہ پارسا بینی   پارسا دان و نیک مرد انگار

(جس کی پارسائی کپڑوں میں دیکھو اس کو پارسا اور نیک آدمی سمجھو)

بس ان کی بری دوڑ یہ ہے ان کو باطن کی طرف بالکل نظر نہیں اول تو اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے اور اگر ضرورت بھی سمجھیں تو پروا نہیں اس ضرورت کو صرف عقیدہ کے مرتبہ میں رکھتے ہیں فعل میں نہیں لاتے حالانکہ باطن کے گناہ ظاہر کے گناہوں سے کہیں زیادہ بڑے اور شدید اور خطرناک ہیں یہ حیرت کی بات ہے کہ خفیف چیز کا اہتمام ہے اور شدید کا اہتمام نہیں ریا، حسد، حب دنیا، بخل، حرص، طمع، بغض، غضب کینہ وغیرہ بڑے بڑے امراض باطنی جن کی نسبت قرآن وحدیث میں نصوص موجود ہیں ان کی طرف توجہ نہیں مجالس میں جب کبھی ذکر ہوتا ہے تو صرف ظاہر کا مگر باطن کی اصلاح اور اس کے حقوق ودقائق کا کبھی ذکر نہیں آتا۔

علماء درویشوں کی طرف رجوع سے عار رکھتے ہیں

پھر ان مولوی صاحبوں سے کہے کون کیونکہ نائب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لقب پہلے ہی انہوں نے لے لیا ہے ذرا کسی نے ٹوکا اور مخالفت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا فتویٰ لگا (البتہ امام غزالیؒ ہیں ایسے جو کسی کو بھی کہنے سے نہیں چوکتے ان کی کتاب میں دیکھئے کیا گت بنائی ہے ایسے اہل ظاہر کی یہ لوگ بھی اگرچہ ان کے کہنے پر عامل نہ ہوں مگر معتقد ہیں ان کے اور ان کو برا نہیں کہتے مگر ان کی تعلیم پر عمل بھی نہیں کرتے اور کہتے ہیں یہ تو ایسے مجاہدے بتاتے ہیں کہ ان کے ساتھ زندگی محال ہے۔

غرض نہ کبھی کسی باطنی مرض کا بیان ہوتا ہے اور نہ کسی خلق محمود کا نہ خشوع کا نہ خضوع کا نہ تواضع کا غرض رذائل باطنی میں مبتلا ہیں اور فضائل باطنی سے محروم ہیں صرف ظاہر ہی ظاہر ہے اندر سے خالی بس لفافہ موجود ہے اور ان کو علم بھی ہو جاتا ہے اس کا کہ ہمارے اندر امراض موجود ہیں مگر کسی کے سامنے اپنے عیوب بیان نہیں کرتے کیونکہ اس کے معالج اور اہل فن ٹھہرے درویش اور درویشوں کی صورت ہی بالکل معمولی سی ہوتی ہے وہ ان کی نظر میں کہاں بچ سکتی ہے نہ جبہ ہے نہ عمامہ ہے نہ بڑا سا لٹھ ہاتھ میں ہے پھٹے کٹے کپڑے ہیں ویرانوں میں رہتے ہیں مجمعوں سے دور بھاگتے ہیں متعارف تہذیب اور خاطر داری ان کو آتی نہیں پھر نظر میں کسی کے آویں تو کیسے آویں۔

حکایت حضرت شیخ عبدالقدوس صاحب گنگوہیؒ

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ جیسے شیخ کا قصہ ہے کہ آپ ایک بار تھانے سے تشریف لے گئے وہاں آپ کا ایک مرید تھا جو قوم کا جولاہہ تھا مولانا جلال الدین تھانیسریؒ کے پاس بھی مسئلے پوچھنے جایا کرتا تھا ایک دن شیخ کی نسبت انہوں نے اس جولاہہ سے کہا کہ تمہارا انچینا پیر بھی تو آیا ہے شیخ پر شورش غالب تھی مطلق آواز پر حتیٰ کہ چکی کی آواز پر رقص کرنے لگتے تھے اہل محبت کی یہی حالت ہوتی ہے۔

کسانیکہ ایزد پرستی کنند　　بر آواز دولاب مستی کنند

(جو لوگ خدا پرست ہیں وہ تو راہٹ کی آواز پر بھی وجد کرنے لگتے ہیں)

آج کل لوگ ان کی نقل بناتے ہیں اور سماع کے لئے ان کے فعل سے استدلال کرتے ہیں اور ان کی سی حالت نہیں پیدا کرتے اور ان کو تو مطلق آواز سے حرکت ہو جاتی تھی یہ دلیل ہے شورش اور محبت کی اور جو شخص مقید ہے کسی خاص قسم کی آواز کا یعنی گانے بجانے کا کہ اس پر تو کودتا اچھلتا ہے اور معمولی آواز پر کچھ بھی نہیں تو یہ دلیل شورش اور محبت کی نہیں اس کے اندر تو چور ہے معلوم ہوتا ہے کہ مادہ فاسد اندر ہے جس کو حرکت اپنی لذت یعنی معصیت سے ہی ہوتی ہے کبھی قرآن سن کر ان کو وجد آتے نہ دیکھا۔

امام حسین رضی اللہ عنہ کا عاشق اور فدائی تو وہ ہے جس کے حضرت امام کا نام سنتے ہی آنسو آ جاویں اور غم کا ساز و سامان اور ڈھونگ بنانے سے تو دشمن کو بھی رونا آ جاتا ہے محبت کو اس میں کیا دخل ہے۔

بزرگوں کو رنج دینا نہ چاہئے

ایک بزرگ کو پنکھے کی آواز سے وجد آ جاتا تھا اور کواڑ کی آواز سے وجد آ جاتا تھا درد اس کو کہتے ہیں غرض شیخ پر شورش غالب تھی اور اکثر رقص کیا کرتے تھے مولانا جلال الدین تھا عیسری کا یہ لفظ جولاہہ کو سخت ناگوار ہوا اور شیخ سے اس کو روایت کیا (چاہئے نہیں ایسی روایت کیونکہ فضول رنج دینا ہے) اور عرض کیا کہ سخت مصیبت ہے نہ ہم وہاں جانا چھوڑ سکتے ہیں کیونکہ مسائل کی ضرورت ہے اور نہ یہ لفظ سن سکتے ہیں کہیں پھر وہ یہ لفظ نہ کہیں شیخ نے فرمایا اب کی مرتبہ اگر وہ یہ لفظ کہیں تو کہہ دینا کہ وہ ناچتے بھی ہیں اور نچاتے بھی ہیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ وہ جولاہہ وہاں گیا انہوں نے پھر وہ لفظ کہا جولاہہ نے کہا وہ ناچتے بھی ہیں اور نچاتے بھی ہیں یہ سنتے ہی مولانا جلال الدین پر حالت غالب ہوئی اور ناچنے لگے دور بیٹھے یہ اثر پہنچ گیا پھر مرید ہوئے اور خلیفہ ہوئے غرض جن کی حالت خاکساری کی یہ ہو ان کی طرف وضعدار لوگ کیسے رجوع کریں اس واسطے ایسے علماء درویشوں کی طرف کم رجوع کرتے ہیں یہ کوتاہی تو علماء ظاہر میں ہے اس کی اصلاح یہ ہے کہ ان علماء کو چاہئے کہ مجاہدہ و ریاضت کریں اور درویش بنیں تاکہ دوسرے علماء و طلباء کی اجنبیت اس طریق سے رفع ہو اور یہ لوگ بوجہ مجانست ان سے رجوع کریں کیونکہ ایسے درویش سے جو کہ شہرت سے دور بھاگتے ہیں علماء کو عار ہوتی ہے حالانکہ یہ غلطی ہے علم کا مقتضا تو یہ ہے کہ حقیقت کو دیکھیں نہ عنوان و صورت کو ۔

مبیں حقیر گدایان عشق را کیں قوم　　　شہان بے کمر و خسروان بے کلہ اند

(گدایان عشق کو حقیر نہ سمجھو کیونکہ یہ لوگ شاہان بے تخت تاج ہیں) اور ۔

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں　　　کہ ناز برفلک و حکم برستارہ کنم

(گدائے میکدہ ہوں لیکن مستی کی حالت میں دیکھو کہ فلک پر ناز اور ستارہ پر حکم کرتا ہوں)

عار نے کفار کو علوم وحی سے روکا

جو شخص طالب ہوتا ہے اس کو تو چیز ملنی چاہئے خواہ کہیں سے ملے اگر اشرفی کیچڑ میں پڑی ہوئی ملے تو جو شخص اشرفی کو جانتا ہے وہ کیچڑ کی پروانہ کرے گا کیونکہ اشرفی تو اشرفی ہی ہے اور جو کیچڑ کو دیکھ کر اشرفی اٹھانے سے رک گیا وہ جاہل ہے اور اس نے اپنا نقصان کیا۔

اس درویشوں کے فرقہ سے جن لوگوں نے فائدہ نہیں اٹھایا وہ ان کی ظاہری شکستگی ہی کی وجہ سے محروم رہے حتیٰ کہ علماء بھی، مگر یہ بھی معلوم ہے کہ یہ وہی خصلت بد ہے جس نے کفار کو علوم وحی سے محروم رکھا کفار نے بھی تو یہی کہا تھا **لو لا نزل هذا القرآن علی رجل من القريتين عظيم** یعنی کفار کا یہ اعتراض تھا کہ قرآن اگر منجانب اللہ ہوتا تو طائف یا مکہ میں سے کسی بڑے آدمی پر اترتا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے شکستہ حال پر کیوں اترتا کفار نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شکستگی ہی سے تو عار کی جیسے کہ آج کل کے علماء درویشوں کی شکستگی سے عار کرتے ہیں دیکھئے اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے کیا دیا **اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَةَ رَبِّكَ** یعنی کیا ان کا اجارہ آتا ہے اور خدا تعالیٰ کی رحمت یعنی نبوت ان کی مرضی کے موافق تقسیم ہوگی یعنی ان کے انتخاب کو اس تقسیم میں کیا دخل ہے نبوت تو بڑی چیز ہے وہ چیز جو بہت ادنیٰ درجہ کی ہے اس کی بھی تقسیم میں ان کا کچھ اختیار نہیں جس کا بیان اگلے جملہ میں ہے **نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيْشَتَهُمْ** الخ یعنی دنیا کی معاش اور روزی جو ادنیٰ درجہ کی چیز ہے یہ بھی ان کے اختیار سے تقسیم نہیں ہوئی جس کو ہم نے زیادہ دے دی اسی کے پاس زیادہ ہے ممکن نہیں کہ جس کو کم دی ہے وہ اس سے لے لے یہ اپنی حیثیت سے زیادہ چل نکلے کہ خدائی کاموں میں دخل دیتے ہیں جن کو وہ قریتین میں سے عظیم کہتے تھے اور ان کو مستحق قرآن کے اترنے کا بتلاتے تھے ان کو عظیم کس نے کیا یہ کس قدر موٹی بات ہے اس پر انہوں نے یہ سوال کیوں نہیں کیا کہ وہ عظیم کیوں کئے گئے ہم عظیم ہوتے ان کی بے عقلی کو حق تعالیٰ نے الزامی جواب سے ثابت کر دیا یہی عار ہے جو آج کل کے علماء کو اصلاح سے روکتی ہے انبیاء علیہم السلام ہمیشہ شکستہ حال رہے ہیں قرب خدا کو کچھ شکستہ حالی ہی سے زیادہ مناسبت ہے انبیاء کے نائب یعنی مشائخ اور اہل اللہ بھی ہمیشہ شکستہ حال ہی رہے ہیں اور انہی سے حاصل ہوا ہے جو کچھ کسی کو حاصل ہوا ہے۔

آج شکستہ حالتوں سے بڑوں کو عار آتی ہے علماء کو خصوصاً اور امراء کو عموماً حتیٰ کہ ایک رئیس اودھ کے اس بات کے شاکی تھے کہ مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی درویش تو بڑے کامل ہیں مگر ان کے یہاں طالبین کی عزت نہیں ہے شاید یہ تمنا ہوگی کہ جیسے ہماری رعایا کے آدمی ہم سے حضور حضور کر کے بولتے ہیں اور ہمارے سامنے ہاتھ جوڑتے ہیں یہی برتاؤ مولانا بھی کیا کریں رعایا تو کسی غرض سے ایسا کرتی ہے مولانا کو کیا غرض پڑی ہے بلکہ یہی اپنی غرض کو جاتے ہیں تو عقل وانصاف کا مقتضی تو یہ ہے کہ یہی حضور حضور کریں اور ہاتھ جوڑیں کیونکہ یہ رعایا کی طرح صاحب غرض ہیں مگر دماغ ایسے خراب ہوئے ہیں کہ الٹی ہی بات ذہن میں آتی ہے غور کرنے اور سمجھنے کی بات ہے کہ صاحب غرض کو لچنا چاہئے یا بے غرض کو؟ اور یہ بھی اس بات کو تسلیم کر کے کہا جاتا ہے کہ کسی کا برتاؤ واقع میں روکھا ہو ورنہ حقیقت حال تو یہ ہے کہ اہل اللہ بدتہذیب نہیں ہوتے بلکہ تہذیب اگر ہے تو انہی کے یہاں ہے ہاں کسی کی خوشامد نہیں کرتے بلکہ ہر شخص سے اس کے مناسب حال برتاؤ کرتے ہیں ان کی شکایت اپنے دماغ کا خلل ظاہر کرنا ہے جس کو خاطر داری اور عزت کہا جاتا ہے وہ خوشامد ہے کسی تحصیلدار اور مجسٹریٹ سے اس کی خواہش نہ کی ہوگی بلکہ اگر وہ سیدھے منہ سے بھی بول لیتے ہوں گے تو کہیں گے کہ فلانے حاکم بڑے اہل اور خلیق ہیں ورنہ بعضے حکام تو گالیاں دیتے ہیں اہل اللہ کے دربار میں کوئی ثابت کر سکتا ہے کہ کبھی گالی سنی ہو اور طالبین کے ساتھ برتاؤ ہوتا ہے اس کی کوئی شکایت نہیں ہو سکتی کیونکہ انہیں بعض وقت تشدد کی بھی ضرورت ہوتی ہے اس کی شکایت کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ کسی طبیب کی شکایت کی جائے کہ وہ مسہل دیتے ہیں اس واسطے ان کا علاج پسند نہیں کوئی ایسا طبیب بتاؤ جو بجائے مسہل کے حلوہ کھانے کو دے یہ بھی معلوم ہے کہ جہاں مسہل کی ضرورت ہے وہاں حلوے کا کام مسہل ہی دیتا ہے اور حلوہ اس موقع پر زہر کا کام دیتا ہے۔

شیخ کا ایک ادب

شیخ کو تعلیم کا طریقہ مت سکھلاؤ اس کو حق تعالیٰ نے سکھلا دیا ہے جب طبیب کے سامنے بولنے کی اجازت نہیں ہے تو شیخ کے سامنے کیسے ہو سکتی ہے اور اگر تم ایسے ہی طبیب

ے بچے ہو تو خود ہی علاج کرلیا کرو لوگ آتے ہیں اور فرمائش کرتے ہیں کہ فلا نا مراقبہ بتا دو تم ہو کون اس مراقبہ کو تجویز کرنے والے یہ وہی غلطی ہے کہ اپنا علاج خود کرنا چاہتے ہیں مریض کو چاہئے کہ حالات طبیب سے کہہ کر بس کہہ دے۔

سپردم بتو مایہ خویش را   تو دانی حساب کم و بیش را

(اپنی پونجی تجھ کو سپرد کر دی کم وبیش کا حساب تو جانے)

جیسے دن رات طبیبوں کے سامنے یہی کرنا پڑتا ہے اگر چہ بعض طبیب بھی نرم ہوتے ہیں کہ مریضوں کی فرمائش پر علاج کرتے ہیں مگر یہ طریقہ صحیح نہیں ہے اور نہ ہر وقت چل سکتا ہے حکیم محمود خان صاحب آن بان کے آدمی تھے بعضے اطباء امراء کی عادت بگاڑ دیتے ہیں اور خوشامد میں جس طرح وہ چاہتے ہیں علاج کرتے ہیں مگر محمود خاں صاحب کی یہ حالت تھی کہ جہاں کسی نے کہا کہ یہ دوا سرد ہے یا گرم کہہ دیتے گدھے ہو تم کیا جانو بات یہ ہے کہ وہ اہل کمال تھے اور کمال میں خاصہ ہے استغناء کا اسی واسطے کیمیا گر کسی کو منہ نہیں لگاتا گو فقیر ہو اور پھٹے حال میں ہو مگر کمال کا خاصہ یہی ہے۔

شیخ محقق کا شان

غرض کوئی فرمائش خود کرنا بدتمیزی ہے شیخ سے کوئی حالت اگر مخفی ہو وہ تو کہہ دے باقی طریقہ تعلیم اس کی رائے پر چھوڑ دے اول تو شیخ محقق خود ہی تحقیق فرمالیتا ہے اور طالب کے حالات کو پورے طور پر معلوم کرلیتا ہے تاکہ اس کے موافق علاج کرسکے چنانچہ ہمارے حضرت طالبین سے اتنے حالات معلوم کرتے تھے۔

فرصت کتنی ہے، آمدنی کیا ہے، اور کتنی ہے، صحت کیسی ہے، تعلقات کیا کیا ہیں، قوت کتنی ہے کیونکہ قوت سے زیادہ کام نہیں بتانا چاہئے۔

خستگاں راچوں طلب باشد وقوت نبود   گر تو بیداد کنی شرط مروت نبود

(کمزوروں کو جب طلب ہو اور قوت نہ ہو تو ان کی قوت سے زیادہ کام تم ظلم کرتے ہو جو شرط مروت کے خلاف ہے)

23 اور اسی طرح وہ عوام کو اشغال نہیں بتاتے اعمال بتاتے ہیں کیونکہ وہ اشغال کے ثمرات کے متحمل نہیں ہوں گے۔

چار پارا قدر قوت بار نہ — برضعیفاں قدر ہمت کار نہ

(چار پاؤں پر بقدر قوت بوجھ لادو کمزوروں کو بقدر ان کی ہمت کے کام بتاؤ)

طفل را گرناں دہی برجائے شیر — طفل مسکیں را ازاں ناں مردہ گیر

(طفل کو اگر بجائے دودھ کے روٹی دوگے بے چارہ طفل کی اس روٹی سے مردہ جان لو)

غرض وہ طالب کے تحمل کا اندازہ کر لیتا ہے اور تعلیم تمام شرائط کے ساتھ کرتا ہے پس اس کی اصول دانی کی یہ حالت ہے تو تم اس کو اصلاح مت دو بلکہ اگر اہمال بھی ہو جاوے شیخ سے تب بھی مضائقہ نہیں ہر وقت تمام باتوں کی طرف نظر پہنچنا مشکل ہے کسی وقت ایسا ہوتا ہے کہ فرصت نہیں ہے جیسے طبیب کے یہاں بھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی کے لئے نسخہ لکھا اور اس کی حیثیت کا اندازہ نہ ہو سکا بعد میں معلوم ہوا کہ اس کی حیثیت کے لحاظ سے نسخہ قیمتی ہے جس کا وہ متحمل نہیں ہو سکتا اس وقت بھی مریض کو چاہئے کہ اصلاح نہ دے بلکہ عرض حال کر دے کہ میری حیثیت اس کے استعمال کے قابل نہیں ہے مگر یہ استحقاق نہیں ہے کہ کوئی فرمائش کرے مثلاً یہ کہ بجائے مسہل کے حلوا لکھ دیجئے۔

اصلاح باطن کیلئے اہل علم کو توجہ کی ضرورت

بس شیخ کے سامنے تو اتباع کامل اور انقیاد محض کی ضرورت ہے جو بھی معالجہ وہ تجویز کرے اپنے علم اور تحقیق کو بالائے طاق رکھنا چاہئے بعض اہل علم کو یہی خیال ہوتا ہے کہ وہاں ہماری خاطر ہوگی مگر وہاں جا کر اس کا عکس ہوا کہ وہاں تو مولانا تھے اور اس نے پلہ داری اور کفش برداری وغیرہ کرائی بس ان کا دل ٹوٹ گیا اور بھاگ کھڑے ہوئے اب اس طرف جاتے بھی نہیں نتیجہ یہ کہ تمام عمر ویسے ہی رہتے ہیں حتیٰ کہ اکثر کی حالت تو یہ ہوتی ہے۔

از بروں چوں گور کافر پر حلل — واندروں قہر خدائے عزوجل

از برون طعنہ زنی بربا یزید — وز درونت ننگ میدارد یزید

(ظاہری حالت تمہاری تو گور کافر کی طرح آراستہ و پیراستہ ہے اور اس کے اندر خدا

اصلاح ظاہر-23

بزرگ و برتر کا قہر و غضب نازل ہے ظاہر ہے تو بایزید بسطامیؒ جیسے بزرگ پر طعنہ زنی کرتے ہو اور تمہاری اندرونی حالت سے شیطان بھی شرماتا ہے)

اہل علم کو خاص طور سے توجہ کی ضرورت ہے خدا نے علم دیا ہے تو عمل بھی حاصل کریں اور موانع کو نظر سے الگ کریں اور نری اصلاح ظاہر پر نہ رہیں بلکہ اصلاح باطن کو ظاہر سے زیادہ ضروری سمجھیں۔

نماز سے لوگوں کی وحشت کا حال

غرض اس جماعت میں تو اس کا غلبہ ہے کہ ظاہر کا اہتمام ہے اور باطن کا اہتمام نہیں اب دو جماعتیں رہیں فقراء اور امراء ان دونوں میں امر مشترک یہ ہے کہ باطن کا اہتمام زیادہ ہے اور ظاہر کا اہتمام نہیں ہے گو دونوں میں منشاء الگ الگ ہے امراء تو ظاہر کے قصوں میں اس لئے نہیں پڑتے کہ اس میں محنت زیادہ ہے بس دل کو اس طرح سمجھا لیتے ہیں کہ دل پاک چاہئے ظاہری اعمال میں اگر کمی بھی رہی تو چنداں حرج نہیں اور مشقت کی وجہ سے ان اعمال کو چھوڑ دیتے ہیں جیسے کہ ایک رئیس کے بچہ کے پڑھانے کے لئے ایک معلم رکھے گئے انہوں نے پانچوں وقت کی نماز پڑھوانا شروع کی نماز کے لئے سردی میں علی الصبح وضو بھی کرنا پڑتا اس سے بچہ کو زکام ہو گیا ماں کوستی تھی کہ خدا ناس کرے اس مولوی کا جب سے یہ آیا ہے میرے بچہ کو زکام ہی رہنے لگا۔

اسی طرح ایک بہت بڑے موقعہ کے سیکرٹری نے بیان کیا اور تحریر دکھلائی کہ دیکھو یہ خط موجود ہے ایک لڑکے کے باپ نے شکایت لکھی ہے کہ ہم نے لڑکے کو انگریزی پڑھنے کے لئے بھیجا ہے یا نماز پڑھنے کے لئے نماز ایسی مشقت کی چیز ہے۔

ایک زمانہ میں کان پور اور اس کے نواح میں نماز کا اس قدر چرچا پھیلا تھا کہ مسجدیں تنگ ہو گئیں لوگ سڑکوں پر نماز پڑھتے تھے اسی زمانہ میں اناؤ سے ایک صاحب نے اپنے کسی دوست کو لکھا کہ یہاں نماز کا ایسا چرچا پھیلا ہے جیسے وباء یہ لفظ ظاہر کرتا ہے کہ نماز سے لوگوں کو کس قدر وحشت ہے غرض اس میں تعب ہے کہ اٹھو بیٹھو اتنی دیر تک نہ کھاؤ نہ پیو نہ ہنسو نہ بولو نہ اِدھر اُدھر دیکھو اس مشقت سے گھبراتے ہیں۔

خلقی موٹاپا مذموم نہیں

ایک صاحب موٹے بہت تھے وہ اس وجہ سے نماز نہیں پڑھتے تھے کہ اٹھنے بیٹھنے میں تکلف ہوتا ہے اس کا علاج یہ ہے کہ موت کا مراقبہ کروائے موت کی یاد دبلا کر دیتی ہے واللہ اسی موٹے پن کی نسبت حدیث میں ہے ان اللّٰہ لا یحب الحبر السمین یعنی اللہ تعالیٰ موٹے عالم کو پسند نہیں کرتا موٹے آدمی اس سے متوحش نہ ہوں کیونکہ موٹاپا جو خلقی ہو وہ برا نہیں کیونکہ اس میں اختیار کو دخل نہیں بُرا وہ موٹاپا ہے جو خوش عیشی اور آرام طلبی اور بے فکری سے پیدا ہوا ہو کہ پڑے ہوئے لوٹ مار کر رہے ہیں نماز تک کے لئے نہیں اٹھتے یہ موٹاپا اختیاری ہے اور یہ جب ہی پیدا ہوتا ہے کہ آدمی کو کچھ فکر نہ ہو اور مشقت نہ کرنا پڑے اور بے فکر ہونا اور آرام سے پڑا رہنا مسلمان کی شان سے نہایت بعید ہے کیونکہ مثلاً ہر شخص سے کچھ نہ کچھ گناہ ہو ہی جاتے ہیں پھر جو شخص آخرت پر یقین رکھتا ہے ان گناہوں کی سزا اس کے پیش نظر کیسے نہ ہوگی اور سزا ایسی ہے کہ اس کا تصور بھی خلقی موٹاپے کو بھی ڈھول ہونے لگے نیز آرام سے مسلمان کیسے پڑا رہ سکتا ہے دن میں نماز اس کو پانچ مرتبہ پڑھنی ہے وضو کرنا ہے صبح کو نیند چھوڑ کر اٹھنا ہے سال میں ایک مہینے کے روزے رکھنے ہیں جن میں موٹاپا باقی رہ ہی نہیں سکتا اور حج کا بھی سفر کرنا ہوتا ہے اس میں ہر قسم کی مشقت ہے مسلمان کو تو زیادہ موٹا ہونا مشکل ہی ہے تو یہ عذر کس قدر لغو ہے کہ موٹاپے کے مارے نماز پڑھی نہیں جاتی ایسے موٹے ہی کیوں ہوئے حضرت یہ سب روٹیاں ملنے اور بے فکری کی باتیں ہیں فکر میں آدمی موٹا ہو ہی نہیں سکتا آزمانے کے طور پر طبیب کسی سے کہہ دے کہ تم دو مہینہ میں مر جاؤ گے اور طبیب بھی معمولی ہو کوئی حاذق طبیب نہ ہو تب بھی موٹے سے موٹا آدمی دبلا ہو جائے اور سب بادی تحلیل ہو جاوے یہ بے فکری ہی ہے جس نے موٹا کر رکھا ہے کہ غم نہیں ہے دنیا کا نہ دین کا انسان کو تو بڑے مرحلے طے کرنے ہیں غم نہ ہونا کیا معنی آخرت کا ذرا سا بھی غم ہو تو موٹاپا تو پاس کو بھی نہ آئے غم ہی نہیں ہے جس سے آپ اس قدر موٹے ہیں کہ نماز پڑھنے میں تکلف ہوتا ہے غرض کوئی کچھ عذر کرتا ہے کسی کو نماز جماعت کے ساتھ پڑھنے میں یہی عذر ہوتا ہے کہ دھوپ تیز ہے اس عذر کی سنئے۔

غرباء میں بھی مرض حب جاہ ہوتا ہے

ایک سب انسپکٹر صاحب تھے ان کے یہاں کوئی تقریب تھی تو انہوں نے تمام برادری کو جمع کیا ایک شخص برادری میں اندھے اور بہت ہی غریب تھے وہ نہیں آئے وہ دل کے بھی اندھے ہی تھے حسد ان پر غالب ہوا اور شرکت سے انکار کر دیا بعضے آدمیوں میں یہ ایسی بدخصلت ہوتی ہے کہ ہیں تو دو کوڑی کی حیثیت کے مگر ایسے موقعوں پر بڑی آن بان دکھاتے ہیں اور ایسے موقعوں کے منتظر رہتے ہیں ویسے تو ان کو کوئی پوچھتا نہیں جب ایسے مجمعوں میں نہیں آتے تو خواہ مخواہ غل مچتا ہے اور شہرت ہو جاتی ہے (گو بدنامی اور برائی کے ساتھ ہو) بس اسی کی اصلیت حب جاہ و شہرت ہے حب جاہ کچھ بڑے ہی آدمیوں کے ساتھ خاص نہیں ایک فقیر میں بھی ہو سکتی ہے جب وہ نہ آئے تو سب انسپکٹر صاحب جیٹھ بیساکھ کی دھوپ میں دوپہر کے وقت ان کو منانے کو گئے اور مسجد دروازہ پر تھی کبھی مسجد میں آنے کی توفیق نہ ہوئی۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ جس کام کی ضرورت آدمی کے ذہن میں ہو اس میں دھوپ مانع نہیں ہوتی اگر دھوپ واقعی مانع ہے گھر سے نکلنے کو تو اس میں مانع کیوں نہ ہوئی یہ سب عذر بارد ہیں اور حیلے ہیں دنیا کے کاموں میں بھی یہ حیلے چل جاویں تو جانیں اس کا کسی کے پاس کیا جواب ہے دین کے لئے ذرا سی بھی مشقت کسی سے نہیں اٹھتی۔

حظ اور کیفیت مطلوب نہیں

بعض لوگ اعمال سے اس وجہ سے قاصر ہیں کہ دو چار دن مثلاً نماز پڑھی یا ذکر کیا اور کوئی حظ اور کیفیت نہ پیدا ہوئی تو کہتے ہیں ہماری کیا نماز ہے نماز جیسی چاہئے ویسی ہم سے ہو نہیں سکتی (اور اس کی دلیل یہی ہے کہ کوئی کیفیت نہ پیدا ہوئی اگر نماز کچھ ہوتی تو کیفیت پیدا ہوتی) پھر ناحق مشقت اٹھانا ہے۔

میں کہتا ہوں اول تو حظ اور کیفیت چیز نہیں نہ نماز سے یہ مقصود ہے اور اگر وہ کوئی چیز ہے بھی تو وہ پیدا ہوگی نماز سے تو ضرور نماز کے بعد ہی ہوگی سو ابھی نماز کے دن پڑھی ہے جو اس کا انتظار ہونے لگا یہ عجیب بات ہے کہ حظ تو پیدا ہوگا نماز سے اور تمنا کی جاتی ہے اس کی نماز سے پہلے کہ حظ ہو تو نماز پڑھیں حظ موقوف ہے نماز پر اور انہوں نے نماز کو موقوف رکھا ہے حظ پر یہ

تو دور ہے جو محال ہے لوگ انہیں خرافات میں رہتے ہیں اور ساری عمر بے کار چلی جاتی ہے۔

اعمال ظاہرہ میں مشقت ہے

غرض ایسے ہی حیلے بہانے چھانٹ رکھے ہیں وجہ یہی ہے کہ اعمال ظاہرہ میں مشقت ہے نماز جو اعمال ظاہرہ میں سب سے ہلکی چیز ہے اس کی بھی مشقت گوارا نہیں کی جاتی اسی واسطے حق تعالیٰ نے فرمایا ہے وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ یعنی نماز بھاری ہے مگر ان پر جن کے دل میں خوف ہے اور جن کو خدا کے سامنے جانے کا خیال ہے۔

جب نماز کی یہ حالت ہے تو روزہ کا تو کیا پوچھنا ہے وہ تو جس قدر بھی بھاری ہو تعجب نہیں (عمل ظاہری ہے نا) اس میں تو کھانا پینا بھی بند کیا جاتا ہے جو مدار ہے دنیا کی زندگی کا اور ہر کام کا تو گویا سارے ہی کام بند کئے جاتے ہیں، نماز میں تو صرف ایک قسم کی پابندی ہی تھی اور تھوڑی دیر کے لئے بعض کاموں کی بندش ہو جاتی تھی۔

کانپور کے ایک وکیل صاحب کا قصہ ہے کہ ان سے بعض مصاحبین نے کہا روزہ رکھنے کی کیا ضرورت ہے حضور سے روزہ کا تحمل ہرگز نہیں ہو سکتا دوسرے روزہ میں وکالت کا کام نہ ہوگا جس کی آمدنی سے سینکڑوں پلتے ہیں ان کو دینے سے جتنے روزے یہ لوگ رکھیں گے ان سب کے روزوں کا ثواب آپ ہی کو مل جاوے گا ویسے تو آپ تمیں ہی روزے رکھتے اور اس طرح سینکڑوں روزے ہو جاویں گے۔

سبحان اللہ حیلہ تو نکالا مگر ان کا دل خود ہی اندر سے کہتا ہوگا کہ یہ حیلہ کس قدر کار آمد ہے لالچ اور خوشامد بھی عجیب چیز ہے۔

ایک اور صاحب تھے کانپور میں جنہوں نے کبھی ساری عمر روزہ رکھا ہی نہیں تھا اور ڈرتے تھے کہ روزہ رکھوں گا تو خدا جانے کیا ہو جاوے گا جب کوئی کہتا کہ روزہ رکھا کیجئے تو کہتے اجی صاحب کہیں میرے بس کا ہے روزہ اگر ایک دن بھی روزہ رکھوں گا تو دم ہی نکل جاوے گا میں تو معذور ہوں رکھ ہی نہیں سکتا کیا کیا جاوے۔

ایک مشفق ناصح بھی مل گئے اور کہا کہ آپ ایک دن امتحان کے لئے رکھ کر دیکھیں اگر بالفرض ایسی حالت ہونے لگے تو اسی وقت توڑ دیجئے گا چنانچہ انہوں نے کہنے سننے سے روزہ

رکھا اور خدا خدا کر کے شام تک ختم کر ہی دیا اور خیریت رہی دم نہیں نکلا اگلے دن انہوں نے کہا آج اور رکھیے وہ بھی رکھا اور اگلے دن بھی رکھوا دیا پہلا روزہ تو کچھ مشکل بھی معلوم ہوا دوسرا اس سے کم مشکل ہوا اور تیسرے میں تو عادت پڑ گئی کہنے لگے میاں یہ تو کچھ بھی مشکل نہیں ڈر ہی ڈر تھا بس روزہ کے پابند ہو گئے۔

نفس پرستی اور شہوت پرستی

حضرت جملہ اعمال میں یہی حالت ہے کہ قبل از مرگ واویلا دور سے دور ہی نفس کی دھمکی میں آجاتے ہیں اور احتمالات نکال نکال کر ڈرا دیتا ہے چاہے کہ ایسے احتمالات کی وجہ سے وہ شخص جس نے کبھی پلاؤ نہ کھایا ہو پلاؤ بھی نہ کھائے کیونکہ نئی چیز ہے خدا جانے گلے میں اٹک جاوے اور معدہ ہضم کرے نہ کرے مگر ہم نے پلاؤ میں یہ شبہات نکالتے کسی کو نہیں دیکھا بہت دفعہ ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ کہیں دعوت ہوئی اور اس میں کوئی کھانا نیا سامنے آیا جو پہلے کبھی نہیں کھایا ہے اس میں کبھی یہ بات دل میں نہیں کھٹکتی کہ خدا جانے کیا ہو لہٰذا اس کو نہ کھانا چاہئے بلکہ اس کھانے کو قصداً کھاتے ہیں کیونکہ کچھ معلومات بڑھیں گی اور ایک نئی لذت حاصل ہوگی اس میں کوئی شبہ نہیں ہوتا اور نماز میں شبہات ہوتے ہیں بس یہ بات ہے کہ مشقت سے گھبراتا ہے نفس اور اس سے بچنے کے لئے ایسی ایسی بجھاتا ہے اور چاہتا ہے کہ تمام عمر نفس پرستی اور شہوت پرستی میں گذر جاوے اور جب نماز سے گھبراتا ہے تو روزہ کے پاس تو کیوں ہی آنے لگا۔

حج نہ کرنے کے حیلے

علیٰ ہذا حج میں بھی یہی حالت ہے کہ سینکڑوں حیلے کھڑے ہو جاتے ہیں کبھی فرصت نہیں ہے کہ کبھی رستہ کا امن نہیں ہے کبھی صحت اچھی نہیں ہے اور فرصت کاہے سے نہیں ہے تقریبات اور لایعنی رسوم سے جب روپیہ خدا نے دیا اور ہاتھ چلتا ہوا ہے تو کہتے ہیں بیٹے بیٹی کی شادی کر دیں تو حج کو چلیں شادی میں سب روپیہ خرچ کر بیٹھے اب اتنا ہے ہی نہیں جس سے حج کریں لہٰذا اور کچھ دنوں کے لئے ملتوی ہوا جب تک کہ روپیہ پھر جمع ہو کر پھر جب تک روپیہ جمع ہوا اپنے آپ بڈھے ہو گئے اور اتنی قوت نہ رہی کہ اس سفر کی صعوبات کی برداشت ہو سکے نتیجہ یہ کہ ایک

فرض خدا کا اور ایک رکن اسلام رہ گیا سارے کام تو ہو گئے مگر اس کا ہی موقع کبھی نہ ہوا اور حیلے حوالوں سے نفس نے اپنا کام پورا کر ہی لیا واللہ اگر ڈاکٹر کسی کے لئے تجویز کر دے کہ چھ مہینہ شملہ رہو ورنہ مر جاؤ گے تو سب کاموں کو اور بیاہ شادی کو اور گھر بار کو آگ لگا کر اس کا انتظام کریں اور شملہ بمقدار جہل ہو جاوے اس صورت میں اگر کوئی کہے بھی کہ فلاں فلاں کام باقی ہیں جائیداد کا انتظام بگڑ جاوے گا اولاد جوان ہے شادی بیاہ ہونا چاہئے اس وقت جانے میں بڑے بڑے حرج ہوں گے تو جواب ملے گا کہ جان سے زیادہ کیا ہے جان رہے گی تو سب کچھ ہوگا بیٹا، بیٹی اور جائیداد اور سب کچھ سکھ میں اچھے لگتے ہیں جب ہم ہی نہ ہوں گے تو ان کا لطف کون اٹھاوے گا ہاں صاحب جان ایسی ہی چیز ہے اور ایمان کا کیا ہے اس کی تو کچھ بھی قیمت نہیں ہمارے نزدیک واقعی اس کی کچھ قیمت نہیں کیونکہ بے مشقت اور سستا مل گیا ہے۔

ہر کہ اوارزاں خرد ارزاں دھد گوھرے طفلے بقرص ناں دھد

(جو شخص ارزاں خریدتا ہے ارزاں ہی دیتا ہے طفل ایک روٹی کے بدلے گوہر دے دیتا ہے)

مگر میں کہتا ہوں کہ ارزاں تو جان بھی ہے آپ نے کونسی قیمت اس میں لگائی ہے بے قیمت ہی تو آئی ہے آج کل فلسفی بہت ہیں ذرا اس کی وجہ تو بتائیں کہ جان کا تو اتنا خیال کیا جاتا ہے اور ایمان کا نہیں کیا جاتا، اس بات میں تو دونوں برابر ہیں کہ ہم کو ارزاں ملے ہیں اور کوئی کوڑی ہم کو نہیں خرچ کرنا پڑی پھر اس پر خدا تعالیٰ کی رحمت دیکھئے کہ جان ہم سے نہیں مانگی ایمان کے اعمال وہ رکھے ہیں جن میں عام اصول یہ ہے لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْساً اِلَّا وُسْعَھَا (اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) بلکہ تکلیف فوق الوسع تو کیا دین میں حرج بھی نہیں رکھا وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ (اللہ تعالیٰ نے تم پر دین میں کوئی حرج ہی نہیں رکھا اس سے اور زیادہ متاثر ہوا اور ایسے رحیم پر تو فدا ہو جاؤ نہ یہ کہ حیلے بہانے کرو بھلا اگر زیادہ نہیں تو دین کے لئے برابر تو مشقت اٹھا لو حالانکہ دین میں ایسا ہے بھی نہیں دین کے جس کام کو اٹھا کر دیکھ لو اس میں اتنی مشقت نہ ہوگی جتنی دنیا کے کام میں ہوگی بلکہ اس کی عشر عشیر بھی نہ ہوگی ہاں کچھ مشقت ضرور ہے تو کچھ مشقت سے تو کوئی بھی کام حتیٰ کہ کھانا پینا بھی خالی نہیں ہو سکتا۔

مشقت سے بچنے کے بہانے

غرض مشقت سے بچنے کے لئے اعمال میں طرح طرح کے بہانے نکالے جاتے ہیں زکوٰۃ کی نوبت آوے تو کہتے ہیں ہم مقروض ہیں ہمارے پاس رکھا کیا ہے جس کی زکوٰۃ دیں صاحبو! شرعی قانون مکمل ہے اس میں کوئی صورت نظر انداز نہیں ہوئی ہے مقروض کے واسطے زکوٰۃ کا قانون یہ ہے کہ رقم قرض کی منہا کر کے باقی کی زکوٰۃ دو رقم قرض کی زکوٰۃ شریعت خود نہیں مانگتی اور خدا جانے زکوٰۃ سے کیوں جان چرائی جاتی ہے زکوٰۃ کی تو مقدار اس قدر تھوڑی ہے کہ برائے نام ہی کا مرتبہ ہے چالیسواں حصہ بھی کوئی چیز ہے اور یاد رکھو کہ اللہ میاں اپنا حساب پورا کر ہی لیتے ہیں کوئی بیماری بھیج دی یا کوئی مقدمہ لگا دیا، ایک دفعہ ڈاکٹر کو بلانا پڑا سولہ روپے فیس میں نکل گئے، زکوٰۃ میں اتنے شاید خرچ بھی نہ ہوتے ایسی ہی نماز کی مشقت سے بدن کو بچایا دھوپ کی سہار نہ ہوئی حق تعالیٰ نے کوئی مقدمہ پیچھے لگا دیا کہ دورہ میں مارے مارے پھرتے ہیں وہاں دھوپ بھی ہے اور راستہ کا گرد و غبار بھی ہے روپیہ بھی خرچ ہو رہا ہے تیری میری خوشامد بھی کرنی پڑتی ہے راستہ میں چوروں اور ڈاکوؤں کا بھی خوف ہے کہیں ڈاکوؤں نے پیٹ دیا تو خوب اس نماز کی مشقت کا بدلہ ہو گیا۔

صاحبو! اس طرح حساب پورا ہونا اچھا ہے یا اپنے اختیار اور خوشی سے طاعت کے بقدر مطلوب ادا کر دینا اگر کوئی کہے کہ کیا یہ باتیں بیماری مقدمہ وغیرہ نمازیوں کو پیش نہیں آتیں ہم تو دیکھتے ہیں کہ نہ بیماری میں کوئی تخصیص نمازی اور غیر نمازی کی ہے نہ مقدمہ میں نہ کسی اور مصیبت میں۔

میں کہتا ہوں مصائب پیش بیشک آتے ہیں ان کو بھی اور ان کو بھی مگر فرق ہے دونوں میں ان کے واسطے مصائب سزا ہیں اور ان کے لئے باعث رفعت مراتب اور موجب قرب ہیں اس پر شاید کہا جاوے کہ یہ تو دل کو سمجھا لینے کی بات ہے اور من گھڑت ہے اس کا عکس بھی تو ممکن ہے جب صورۃً دونوں جگہ یکساں ہیں تو وہ بھی اپنا دل اس طرح خوش کر سکتے ہیں کہ مصیبت جو آئی ہے تو کچھ برا نہیں ہمارے درجے بلند ہوں گے جیسے نمازیوں نے اسی طرح دل کو سمجھا لیا تھا۔

مصیبت کی حقیقت

میں کہتا ہوں کہ واقعیت کسی چیز کی من سمجھوتہ کرنے سے نہیں بدلتی دعویٰ دونوں فریق اس کا کر سکتے ہیں کہ مصیبت ہمارے لئے رحمت ہے لیکن کسی علامت سے امر واقعی کا پتہ چل جائے تو بات طے ہو سکتی ہے کہ حق کسی کی طرف ہے وہ علامت یہ ہے کہ خاصہ ہے کہ مطیع پر جب مصیبت آتی ہے تو اس کو پریشانی نہیں ہوتی اور رحمت کی حقیقت یہی ہے اور مصیبت کی حقیقت پریشانی ہے اس کو کان میں رکھو اور دونوں منظر دیکھ لو ایک ہی واقعہ جس کو مصیبت کہا جاوے نمازی پر یعنی مطیع پر آوے تو اس کا اس کے قلب پر کیا اثر ہوتا ہے اور وہی واقعہ عاصی پر آوے تو کیا ہوتا ہے زمین آسمان کا فرق ملے گا دونوں میں اور ذرا سے غور کرنے سے نزاع رفع ہو جاوے گا عاصی کا دل ٹوٹ جاتا ہے مصیبت میں اور مطیع کو ڈھارس رہتی ہے کیونکہ اس کے دل کو خدا تعالیٰ سے تعلق ہے اور عاصی کے دل کو یہ تعلق خدا حاصل نہیں تعلق خدا مقوی قلب ہے اور خدا سے تعلق میں یہ اثر کیوں نہ ہو ایک کلکٹر سے جس کو تعلق ہوتا ہے وہ کسی سے نہیں ڈرتا پھر جس کو تعلق خدا سے ہو وہ کیسے ڈرے گا اور اس کا دل کیوں ٹوٹے گا اور عاصی کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اس کا کوئی سہارا نہیں ہوتا ڈرتا ڈرتا رہتا ہے۔

عاصی اور مطیع میں فرق

یہی تو فرق ہے پولیس میں اور ڈاکوؤں میں مقابلہ کے وقت میدان میں دونوں موجود ہیں اور مارنے مرنے میں دونوں شریک ہیں ظاہری نظر سے دیکھنے والا کہہ سکتا ہے کہ دونوں فریق ایک مصیبت میں گرفتار ہیں یہ بھی مر رہے ہیں اور وہ بھی مر رہے ہیں تو کسی کو حق پر اور کسی کو ناحق پر کیسے کہیں لیکن ذرا غور کیجئے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے پولیس مر ضرور رہی ہے مگر دل ان کے مضبوط ہیں اور ان کی ڈھارس بندھی ہوئی ہے اور ڈاکو ہمت پولیس سے بھی زیادہ کر رہے ہیں مگر دل اندر سے ٹوٹے ہوئے ہیں اور پاؤں نہیں جمتے اور موقعہ دیکھتے ہیں کہ آنکھ بچے تو بھاگ جاویں یہ اثر اسی کا ہے کہ پولیس مطیع ہے اور اس کو حاکم سے تعلق ہے اور ڈاکو عاصی ہے اس کے دل کو کسی کا سہارا نہیں۔

اس مثال سے عاصی اور مطیع کی حالتوں کا فرق بہت وضوح کے ساتھ معلوم ہو سکتا

ہے نمازی اور مطیع پر جب مصیبت آتی ہے تو وہ صبر وسکون کے ساتھ رہتا ہے اور کوئی بیہودہ کلمہ تک اس کے منہ سے نہیں نکلتا اور عاصی پر جب مصیبت آتی ہے تو پوری قیامت ہوتی ہے چیخ پکار رونا پیٹنا مچ جاتا ہے زبان سے بیہودہ کلمات بکتا ہے اور دل میں شکایت ہوئی ہے یہ ہے مصیبت جس کو مصیبت کہنا چاہیئے یہ کھلی ہوئی علامت ہے اس بات کی کہ تعلق مع اللہ باقی نہیں اور مطیع کا تعلق باقی ہے گو جسمانی تکلیف ہے اور باقتضاء طبعی اس کا احساس کرتا ہے اور رنج پاتا ہے مگر دل اندر سے تازہ ہے۔

تعلق مع اللہ کی برکت

ایک پادری نے لکھا ہے کہ مسلمان اپنے خدا سے شرمندہ نہیں ہے اس واسطے شگفتہ رہتے ہیں عاصی اور مطیع کی حالت میں ضرور فرق ہوتا ہے بلکہ ادنیٰ مسلمان کی حالت میں بھی کافر سے فرق ہوتا ہے کیونکہ تعلق مع اللہ کچھ نہ کچھ ہر مسلمان کو حاصل ہے جس کی وجہ سے اس کی حالت کو اس شخص کی حالت سے ضرور فرق ہوتا ہے جس کو بالکل تعلق نہیں یعنی کافر آپ کو نسبت حق تعالیٰ سے ضرور حاصل ہے گو آپ کو خبر نہیں۔

یک سبد پرناں ترابر فرق سر تو ہمی جوئی لب ناں در بدر

تابزا نو غرق ہستی اندر آب وزعطش و زجوع گشتستی خراب

(ایک ٹوکرا روٹوں کا تیرے سر پر رکھا ہے اور تو ایک روٹی کے ٹکڑے کے لئے دربدر مارا پھرتا ہے تو زانو تک پانی میں کھڑا ہے اور بھوک اور پیاس سے خراب ہوتا ہے)

ہماری وہ حالت ہے کہ ساری دولتیں حاصل ہیں مگر عادت ہوگئی ہے بھیک مانگنے کی ان کی طرف توجہ نہیں اور اِدھر اُدھر ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ غیروں کی تقلید کرتے ہیں عقائد میں خیالات میں معاشرت میں صاحبو! تمہارے پاس تو اتنی دولتیں ہیں کہ دوسرے یہیں سے لے گئے ہیں افسوس ہے کہ ہم اس سے متمتع نہیں ہوتے اور ان سب دولتوں کی اصل تعلق مع اللہ ہے اگر ہم اس سے کام لیں تو کبھی پریشانی نہ ہو۔

اللہ والا کبھی بھی پریشان نہیں ہوتا دیکھئے سب سے بڑھ کر حادثہ موت کا ہے اور دیگر مصائب جو مخوف عنہ (جن سے ڈرا جاتا ہے) ہیں تو اس وجہ سے ہیں کہ مقدمہ موت ہیں مگر

اہل اللہ کی حالت خود موت کے متعلق یہ ہے کہ بجائے پریشانی کے الٹی مسرت ہوتی ہے انہوں نے اس کو بھی ایک کھیل سمجھ رکھا ہے جس کے نام سے دنیا بھاگتی پھرتی ہے ایک صاحب موت کی آرزو میں کہتے ہیں۔

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم　　راحت جاں طلبم وز پے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے　　تادر میکدہ شاداں و غزلخواں بروم

(وہ دن مبارک ہے جس دن ہم اس دنیائے فانی سے کوچ کریں راحت جاں طلب کریں اور محبوب حقیقی کے لئے جائیں میں نے نذر کی ہے کہ جس دن یہ غم تمام ہو جائے یعنی موت کا وقت آئے تو محبوب کے دربار تک خوش وخرم اور شعر پڑھتا ہوا جاؤں)

غرض جب ان کے نزدیک موت ہی کوئی چیز نہیں تو اور مصائب تو کیا چیز ہیں یہ ثمرات ہیں تعلق مع اللہ کے کہ اس کے ہوتے ہوئے مصیبت کا نام ہی نہیں رہتا۔

اہل اللہ کا کامل توکل

میرے ابتدائی کتابوں کے ایک استاد تھے ان کا قصہ ہے کہ طالب علم ان کے پاس مثنوی پڑھنے گئے انہوں نے پوچھا کھانے کا کیا انتظام کیا ہے کہا کھانے کی کیا فکر جس نے جان دی وہی روٹی بھی دے گا نہ دے گا تو اپنی جان لے لے گا اور کیا ہو گا استاد نے کہا تو مثنوی ضرور پڑھ لے گا۔

ابھی مثنوی شروع بھی نہیں ہوئی عمل پہلے شروع ہو گیا ان کو کھانے کی مطلق فکر نہ تھی ہمہ تن متوجہ ہو کر مثنوی پڑھی ہر چیز کی کنجیاں خدا تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں پھر کچھ طبعی بات ہے کہ مستغنی کی طرف لوگوں کو میلان ہوتا ہے اور طامع سے نفرت ہوتی ہے ان کا یہ جملہ سن کر لوگوں کو میلان پیدا ہوا ایک شخص آیا کہ مولانا آج آپ کی دعوت میرے یہاں ہے ایک دن کا انتظام تو ہوا اگلے دن ایک اور جگہ دعوت ہوئی ایک دن بھی تکلیف نہیں ہوئی اور اس مست اور خدا کے شیر کو اس طرف التفات بھی نہیں ہوا اپنے کام سے کام مثنوی پڑھنا اور وقت پر پکی پکائی مل جانا خدا نے مخلوق کو رام کر دیا بھوک سے زیادہ کیا مصیبت ہو سکتی ہے تمام دنیا پیٹ ہی کے لئے ماری پھرتی ہے مگر اہل اللہ کے نزدیک یہ بھی کچھ نہیں کس اطمینان

سے فرماتے ہیں کھانے کا کیا فکر، اسی طرح ایک شخص قاری عبدالرحمن صاحب پانی پتی" کے
یہاں پڑھنے کو گئے کھانے کا کوئی انتظام نہ تھا متفرقاً اِدھر اُدھر سے مل جاتا تھا، اتفاق سے محلّہ
میں ایک موت ہوگئی اور وہاں دستور تھا میت کے لئے چالیس دن کھانا ایک محتاج کو دینے کا
وہ کھانا ان کے واسطے مقرر ہوا ایک چلہ کا سامان ہوگیا چلہ کے اندر ہی ایک اور مر گئے، ایک
چلہ کا کھانا اور مقرر ہوا اب یہ بے فکری سے پڑھنے لگے ابھی یہ چلہ بھی پورا نہ ہوا تھا کہ ایک
اور مر گئے قاری صاحب نے کہا اس کا کھانا مقرر کردو ورنہ یہ اسی طرح تمام محلّہ کو کھا جاوے گا
لوگوں نے ڈر کر کھانا مقرر کر دیا اور خدا کی قدرت کہ اس کے بعد کوئی موت نہیں ہوئی
خدا سے کون جیتے جب محتاج کے دینے میں کمی کی جاتی ہے تو اس کا حساب یوں پورا کر لیتے
ہیں یہ ان کے حالات ہیں جو خدا کا نام لینے والے ہیں پیٹ کی مار سے وہ نہیں گھبراتے
موت سے وہ نہیں ڈرتے پھر اور کسی مصیبت سے ان کو کیا پریشانی ہوگی اللہ والے بن جاؤ
پھر ناکامی میں بھی کامیابیوں سے لطف زیادہ آوے گا اللہ والے کے لئے تو ہر حالت خوشی
ہی خوشی کی ہے، رنج اور پریشانی کا اس کے پاس کام بھی نہیں اس کو تو موت میں بھی خوشی ہے
اسی کو عارف شیرازی کہتے ہیں۔

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بردم　　　راحت جاں طلبم وز پئے جاناں بردم

(یعنی وہ دن مبارک ہے جس روز ہم اس دنیا فانی سے کوچ کریں، راحت جان
طلب کریں اور محبوب حقیقی کے لئے جائیں)

جب موت ان کو پریشان نہیں کرتی تو اور کوئی مشقت کیا پریشان کرے گی)

اہل طاعت اور اہل معصیت کی مصیبت میں فرق

یہ فرق اہل طاعت اور اہل معصیت کی مصیبت میں کہ واقعات دونوں پر ہوتے ہیں
مگر پھر بڑا فرق ہے اول تو اہل طاعت پر واقعات کم ہوتے ہیں اس کا امتحان یہ ہے کہ
واقعات شمار کر لیجئے ایک اہل طاعت کو لیجئے اور ایک اہل معصیت کو اور دونوں کی سوانح لکھئے
اس میں واقعات کی شمار کیجئے اہل طاعت پر واقعات کی شمار ضرور کم نکلے گی غرض مطیع پر
مصائب کم آتے ہیں اور جو کچھ آتے بھی ہیں تو ان میں اور غیر اہل اطاعت کے مصائب

میں فرق ہوتا ہے ان کی صرف صورت مصیبت کی ہوتی ہے اور حقیقت میں رحمت ہوتی ہے اس کی علامت یہ ہے کہ ان کے قلب کو پریشانی نہیں ہوتی جس کو مصیبت کہنا چاہئے وہ عصیان ہی سے آتی ہے اور یہ مصائب اس وقت بھیجے جاتے ہیں جب کہ طاعات سے اور حقوق الٰہی سے جان چرائی جاتی ہے جان کو یا مال کو جب خدا سے بچا کر رکھا جاتا ہے تو اس وقت اس طریق سے اس کا حساب پورا کر لیا جاتا ہے کہ زکوٰۃ سے بخل کیا حق تعالیٰ نے ایک مقدمہ سر کر دیا اس میں سب اگلی پچھلی جمع نکل گئی۔

اعمال ظاہرہ میں کچھ مشقت ضرور ہے

روزہ سے یا حج سے جان چرائی تو ایک ایسی بیماری لگا دی کہ سب جسم تحلیل ہو گیا اعمال ظاہری میں کچھ نہ کچھ مشقت ہے ہی مشقت سے جان چرائی جاتی ہے امراء میں اسی وجہ سے اعمال ظاہری کا اہتمام کم ہے بس دل کو سمجھا لیتے ہیں کہ میاں دل پاک چاہئے اگر ظاہری طاعات میں کمی بھی رہی تو خدا معاف کرنے والا ہے بڑا گناہ تو دل کا پاپ ہے۔

حضرت یہ سب پیٹ بھرنے کی باتیں ہیں یہ باتیں اسی وقت سوجھتی ہیں جب کہ پیٹ اندازہ سے زیادہ بھرا ہوا ہوتا ہے۔

ہمارے یہاں ایک طالب علم آیا دیہاتی آدمی تھا مگر فارغ البال تھا اس نے کچھ پڑھنا شروع کیا اور اس میں آثار صلاحیت پیدا ہو گئے اور بہت نیک ہو گیا اس نے اعتکاف کیا اور ایک دن وہ دعاء مانگ رہا تھا تو یہ خبر سن کر اس کے ایک عزیز صاحب فرماتے ہیں ابے سوھرے کیا دعاء مانگے ہے تجھے کس چیز کی کمی ہے روٹی تیرے پاس کپڑا تیرے پاس مکان تیرے پاس بیہ بھی کچھ لت ہے کہ مانگے جاؤ کس قدر بیہودہ کلمہ ہے یہ مستی پیٹ بھرنے سے پیدا ہوئی ہے کہ اللہ میاں سے دعاء مانگنے کی بھی ضرورت نہیں رہی۔

اہل بطن

یہاں ایک عمل ظاہری جو چھوڑا گیا جس کو دعاء کہتے ہیں کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ باطن ان کا درست ہے اس واسطے ظاہر کی چنداں ضرورت نہیں یاد رکھئے کہ یہ مستی اہل باطن کی نہیں بلکہ اہل بطن کی ہے ابھی کوئی آفت ایسی آ جاوے کہ پیٹ تھوڑا خالی

ہو جاوے تو پھر ایسے کلمات منہ سے نہ نکلیں دیکھا ہوگا کہ اہل کار لوگ رعایا پر ظلم و تعدی کرتے ہیں اور نماز روزہ کے پاس نہیں جاتے مگر جب کسی مقدمہ میں پھنس گئے تو اس وقت نماز بھی ہے اور روزہ بھی ہے بلکہ کھٹا کھٹ تسبیح بھی چلتی رہتی ہے اسی کو کسی نے کہا ہے۔

اھلکاراں بوقت معزولی شبلی وقت و بایزید شوند
بازچوں می رسند برسرکار شمر ذی الجوشن ویزید شوند

(اہلکار برخاست ہوتے وقت شبلی اور بایزید بسطامی بن جاتے ہیں اور پھر جب بحال ہوجاتے ہیں تو شمر لعین اور یزید بن جاتے ہیں)

پیٹ بھرے میں حق تعالیٰ کی یاد مشکل ہے خدا کی یاد تو خالی پیٹ میں خوب ہوتی ہے بانسری جب اندر سے خالی ہو تب ہی آواز دیتی ہے اور جو نے اس کے اندر سے ٹھوس ہو تو کہاں بج سکتی ہے اور یوں دعاء مانگنے والے پیٹ بھرے میں بھی دعاء مانگتے ہیں مگر جو دردناک آوازیں دعاء کی خلو میں پیدا ہوتی ہیں وہ امتلاء میں کہاں ہوتی ہیں بزرگوں نے تو خلوئے بطن کا اہتمام قصداً اختیار سے کیا ہے اور زیادہ پیٹ بھرنے کو خاص طور سے منع کیا ہے شیخ سعدی کہتے ہیں۔

تہی از حکمتی بعلت آں کہ پری از طعام تابینی
اندروں از طعام خالی دار تادرو نور معرفت بینی

(دانائی اور معرفت سے اس سبب سے تم خالی ہو کہ کھانے سے ناک تک بھرے ہوئے ہو پیٹ کو کھانے سے خالی رکھو تاکہ اس میں نور معرفت دیکھ سکو)

حضرات انبیاء علیہم السّلام کا مجاہدہ

حضرت یوسف علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسّلام ایام قحط میں بھوکے رہتے تاکہ بھوک کی قدر رہے اور بھوکوں پر رحم آوے انبیاء علیہم السّلام نے کبھی تنعم اختیار نہیں کیا بلکہ مشقت کو پسند کیا تاکہ اس کا احساس رہے اور اُمت پر رحم رہے اور تنگ گیری نہ پیدا ہو وہ حضرات قصداً بھوکے رہتے اور ہم لوگوں کا طریقہ یہ ہے کہ بھوکے رہنا تو دور ہے بھوک نہیں ہے جب بھی کھاتے ہیں اور خصوصیت سے امراء میں یہ مرض ضرور ہوتا ہے اور اس میں زیادہ تر عنایت خوشامدی لوگوں کی ہوتی ہے کہ صبح کو دربار میں آئے اور خواہ مخواہ بھی وفاداری اور

جاں نثاری جتانے کے لئے کہتے ہیں کہ نصیب اعداء حضور کا مزاج کیسا ہے آج چہرہ اداس معلوم ہوتا ہے کہا ہاں رات کچھ کھانا ہضم نہیں ہوا (ہضم کہاں سے ہوا ناڑی کی سی بندوق بھری تھی اور نقل و حرکت اور ریاضت ہے ہی نہیں سوائے لوٹ مارنے کے کچھ شغل نہیں)

مصاحب صاحب بولے حضور کھاتے ہی کیا ہیں یہ اداسی سوہضمی کی نہیں بلکہ نہ کھانے کا ضعف ہے برائے خدا کچھ کھایا کیجئے جہاں دو چار آدمیوں نے متفق ہو کر ایسا کہا تو خواہ مخواہ اثر ہوتا ہے اور زیادہ کھانے کی تدابیر کی جاتی ہیں کھانے قسم قسم کے پکوائے جاتے ہیں کیونکہ انواع کثیرہ میں سے قلیل قلیل بھی لیں گے تو کافی مقدار ہو جاوے گی اور دن بھر میں کئی بار بدفعات کھلاتے ہیں اس وقت ناشتہ ہے اس وقت کھانا ہے تیسرے وقت فواکہ ہیں غرض منہ چلتا رہے خواہ پیٹ بھی چلنے لگے وجہ یہ ہے کہ ان خوشامدیوں کا پیٹ اس حیلہ سے چلتا ہے ان کا پیٹ چلے یا مریں یا کچھ بھی ہو ان کی بلا سے یہ تدبیریں ان کے کھانے کی ہیں کیونکہ جب امیر صاحب کھاویں گے تو مصاحبین کو بھی ملے ہی گا بس اصل غرض اپنا پیٹ ہے (امراء کے حواشی کھاتے کھاتے مواشی بن جاتے ہیں)

حکایت نیبو نچوڑ

جیسے ایک نیبو نچوڑ کا قصہ ہے کہ ایک شخص سرائے میں جاتے اور تاڑ لیتے کہ مسافروں میں سے آج موٹی چڑیا کون ہے جب کھانا لایا گیا تو آپ بھی پاس بیٹھ گئے ایسے موقع پر آدمی خواہ مخواہ مجوب ہوتا ہے اور تواضع کرنا ہی پڑتی ہے اگر اس نے جھوٹ موٹ بھی کہا کھانا کھا لیجئے تو کہا بسم اللہ حضرت میں تو بے تکلف آدمی ہوں مجھے کیا انکار ہے بس ساتھ بیٹھ کر کھا لیا اور اگر اس نے تواضع نہ کی تو جیب میں آپ کی نیبو رہتا تھا جیب سے نکالا اور سالن میں نچوڑ دیا کہ حضرت ذرا اس سے کھانا مزہ دار ہو جاتا ہے اب تو ایسا کون ہے کہ تواضع نہ کرے خواہ مخواہ کہنا پڑا حضرت آپ بھی تو کھائیے بس ان کی غرض حاصل ہوگئی روزمرہ ان کی یہی عادت تھی اور اچھے اچھے کھانے اڑاتے تھے (یہ نسخہ اچھا ہے مگر خدا کے لئے کوئی سیکھ نہ لے)

یہ میں نے اس واسطے کہہ دیا کہ ایسا ہوا بھی ہے کہ ایک بات کو بیان کیا گیا اور منع کرنے کے لئے زیادتی تحقیر کے لئے اس کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا بعض فاسد المذاق لوگوں نے

بجائے اس کے کہ اس عمل کو چھوڑتے اس پر عمل شروع کر دیا اور تفصیل بیان سے جزئیات کا علم
ہوگیا اس سے اس پر عمل کرنے میں اور سہولت ہوگئی غرض یہ حالت ہے ان خوشامدی حضرات کی
کہ میاں کو بھوک ہو یا نہ ہو کھانے اقسام اقسام کے ان کو پکوانا ضرور ہے اور بار بار تقاضا کر رہے
ہیں حضور کچھ کھالیں ضعف ہو جاوے گا برائے نام ہی دستر خوان پر بیٹھ جاویں ورنہ تمام گھر میں
کوئی بھی نہ کھاوے گا بس خوان سامنے لاکر رکھ دیا اس میں پلاؤ ہے کباب ہیں بریانی ہے
مصاحب صاحب فرماتے ہیں حضور ان چاولوں کو چکھیں آج ایک نیا کاری گر آیا ہے اور خاص
طور سے نرم پکوائے گئے ہیں یہ نقصان ہرگز نہیں کر سکتے کبابوں میں آج باورچی نے کمال ہی
کر دیا ہے ایسا نمک مصالحہ درست ہے کہ کم ایسے بنتے ہیں اب جبکہ خوان عمدہ عمدہ نعمتوں کا
سامنے ہے تو کچھ نہ کچھ کھایا ہی جاوے گا کچھ اپنی طبیعت سے کچھ ان کی فرمائش سے کھالیا اور
تھوڑا تھوڑا کر کے بھی اچھی خاصی اناڑی کی سی بندوق بھر گئی امتلاء پہلے سے موجود تھا اب
تداخل ہوگیا اور طبیعت زیادہ خراب ہوئی کہتے ہیں کھانا سامنے آ گیا کھانا ہی پڑا اور فلاں
صاحب نے ایسا محبت سے اصرار کیا کہ انکار نہ ہو سکا۔

شعر گفتن چہ ضرور شعر کہنا کیا ضرور ہے) کیا کھانا آپ سے آپ سامنے آ گیا ان
خوشامدیوں کو ایسا کیوں منہ چڑھایا ہے کہ گو مصلحت کے خلاف ہو مگر کھانا لے ہی آتے ہیں
اور محبت بھی ان کی معلوم ہے وہ تو اپنا بھلا کر رہے ہیں آپ کے بھی خواہ نہیں ہیں ان کا کھانا
موقوف کر دیجئے پھر دیکھیں یہ کیسے تقاضا اور اصرار کر کے کھلاتے ہیں۔

دورِ حاضر کے اہل وجد

غرض امراء میں کھانے کا بڑا مرض ہوتا ہے اور پھر بنتے ہیں اہل باطن اہل باطن کی
حالت تو یہ ہے کہ بھوک میں بھی نہیں کھاتے اور یہ بے بھوک بھی کھاتے ہیں تو یہ اہل بطن
ہوئے یا اہل باطن ان کو پیٹ ہی نے خراب کیا زیادہ کھانے اور خوش عیشی کی وجہ سے مشقت
نہیں ہو سکتی اور اعمال ظاہری میں ہے مشقت، اس واسطے نفس نے یہ ایک عمدہ تاویل سمجھا
دی ہے کہ ظاہر کو ہم اس واسطے اختیار نہیں کرتے کہ باطن اصل ہے اور باطن ہمارا دوست
ہے تو ظاہر درست ہوا نہ ہوا چنداں حرج نہیں اس سے ظاہر کی مشقت سے بھی بچ گئے اور
اچھے کے اچھے بنے رہے کہ ہم اہل باطن ہیں کچھ بھی نہیں اہل بطن ہو، یہ غلطی ایسی عام ہوئی

24 ہے کہ امراء میں تو ہے ہی فقراء میں بھی ہے کہ اہل وجد کو بھی دیکھا کہ سماع اڑ رہا ہے اور وجد آرہے ہیں اور ناک تک پیٹ بھر رکھے ہیں۔

محققین فن نے لکھا ہے کہ چار وقت کسی کو بھوکا رکھا جاوے پھر اس کے سامنے سامان پیش کیا جاوے اگر اس وقت بھی بھوک پر سماع کو غلبہ ہو تب یہ مسئلہ اختلافی ہے ورنہ بالاتفاق حرام ہے کسی نے خلاصہ کر دیا ہے اس مسئلہ کا۔

زندہ دلاں مردہ تناں را رواست   زندہ تناں مردہ دلاں را خطاست

(زندہ دل مردہ تن لوگوں کے لئے جائز ہے اور زندہ تن مردہ دل لوگوں کے لئے گناہ ہے)

آج کل کے وجد سب پیٹ بھرے کی مستی ہیں ایک ہی وقت کھانے کو نہ ملے تو کچھ بھی نہ رہے۔ (میں سب کو نہیں کہتا ہوں سچے اہل وجد بھی ہیں)

اہل تنعم

تنعم چھوڑ یئے اور پیٹ نہ پالئے پھر وجد کیجئے خالی پیٹ میں اور دولت نصیب ہوگی جس کے سامنے آپ ان وجدوں کو بھول جائیں گے مگر یہ بھی میں کہے دیتا ہوں کہ وہ دولت بعد چندے حاصل ہوگی یہ نہ ہوگا کہ آج کام شروع کیا اور آج ہی اس کے حصول کی تمنا ہونے لگی۔

خلاصہ یہ کہ ایسے لوگ یعنی متنعمین اور امراء اور ان کے مقلدین جو اہل باطن بنے ہیں وہ اہل باطن نہیں ہیں بلکہ بطن کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں کیونکہ تنعم کو چھوڑنا نہیں چاہتے خوش عیشی کی وجہ سے موٹے ہوگئے ہیں مشقت ان سے ہو نہیں سکتی اعمال ظاہری سے جان چراتے ہیں بس اہل باطن بن گئے ہیں اور دل کو سمجھا لیا ہے کہ باطن یعنی قلب ہمارا درست ہے اس کے سامنے ظاہر چنداں معتد بہ چیز نہیں ہوا ہوا نہ ہوا نہ ہوا۔

درستی باطن کا خلاصہ

صاحبو! باطن کی درستی کا خلاصہ ایک لفظ میں ہے یعنی محبت الٰہی باطن کی درستی کے مدعی ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ان کے قلب میں محبت الٰہی موجود ہے اس بے فکری اور موٹاپے پر یہ دعویٰ کس قدر بے محل ہے خدا جانتا ہے کہ محبت تو وہ چیز ہے کہ آدمی کو کانٹا بنا دیتی ہے موٹاپا تو بے فکری سے پیدا ہوتا ہے اور محبت میں بے فکری کہاں اہل محبت کی حالت تو یہ ہوتی ہے۔

داما دم شراب الم درکشند وگر تلخ بیند دم درکشند

(ہر دم رنج والم کی شراب پیتے ہیں اور جب اس میں رنج کی کڑواہٹ دیکھتے ہیں تو خاموش ہو رہتے ہیں)

ہر وقت الم پاتے ہیں اور ہر وقت تلخ بیند ہوتا ہے گو دیکھنے والے کو معلوم نہ ہو اسی واسطے ایک اہل محبت نے اس کیفیت سے غافل کی نسبت کہا ہے۔

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست حال شیرانے کہ شمشیر را برسر خورند

(تمہارے پاؤں میں تو کانٹا بھی نہیں لگا تم کو ان لوگوں کی حالت کی کیا خبر ہے جن کے سروں پر بلا اور مصیبت کی تلواریں چل رہی ہیں)

یہ شمشیر خورند کچھ مبالغہ نہیں ہے واللہ ہر وقت ان پر تلواریں چلتی ہیں اسی کو کہا ہے۔

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگر ست

(خنجر تسلیم کے کشتوں کو ہر زمانہ میں ایک اور جان عطا ہوتی ہے)

کشتہ کی اصلیت

کوئی بات تو ہے جس کی وجہ سے کشتہ کہا ہے معنی حقیقی نہ ہوں مجازی ہی ہوں تب بھی کچھ تو اصلیت ہوگی کوئی مصیبت تو ان پر ہے جس کو مبالغہ کشتہ شدن سے تعبیر کر سکیں کیا اس قدر فراغ وتنعم کے ساتھ وہ جمع ہو سکتی ہے اگر وہ موجود ہے تو یہ بے فکری اور تنعم نہیں ہو سکتا اور اگر فراغ وتنعم موجود ہے تو وہ نہیں ہے لیکن ظاہر ہے کہ فراغ وتنعم موجود ہے تو اس نتیجہ کو یقینی سمجھئے کہ وہ چیز موجود نہیں ہے ان کی تو حالت بتلا رہی ہے کہ فکر ومصیبت کی ہوا بھی ان کو نہیں لگی پھر کشتہ شدن کا اطلاق کس معنی کر ہو سکتا ہے اہل محبت کے تو حالات ہی دوسرے ہوتے ہیں جس کو انہوں نے آڑ بنا رکھا ہے یعنی باطن کہ ہم اہل باطن ہیں اگر وہ ہوتا یعنی بلفظ دیگر محبت الٰہی باطن میں ہوتی تو یہ حالت ہوتی۔

عاشقی چیست بگو بندہ جاناں بودن دل بدست دگرے دادن وحیراں بودن

(عاشقی کیا ہے؟ محبوب کا بندہ بن جانا دل دوسرے یعنی محبوب کے قبضہ میں دے دینا اور حیران رہنا)

جب دل کسی کا دوسرے کے قبضہ میں ہو تو کوئی فعل اس کا اپنا اختیاری نہیں ہوتا یہ تھوڑی مشقت ہے نہ معلوم لوگوں نے کیا سمجھ رکھا ہے محبت کو محبت والا تو کسی کام ہی کا نہیں رہتا سوائے ایک کام کے۔

ہر قوم کی اصطلاح

سوئے زلفش نظرے کردن درویش دیدن　　　　گاہ کافر شدن وگاہ مسلماں بودن

(محبوب کی زلف کی طرف نظر کرنا اوراس کے چہرہ انور کو دیکھنا کبھی فانی ہونا ہے کبھی باقی رہنا)

کافر شرعی مراد نہیں کافر اصطلاحی مراد ہے ہر قوم کی ایک اصطلاح ہوتی ہے کفران کی اصطلاح میں فنا کو کہتے ہیں اوراس کے مقابل اسلام سے مراد بقا ہوتی ہے اور یہی مراد ہے اس میں کہ ہر زماں از غیب جانے دیگر است، اول مصرعہ میں فنا مراد تھی۔

کشتگان　خنجر　تسلیم　را　　　ہر زماں از غیب جانے دیگرست

(تسلیم ورضا کے خنجر لگے ہوؤں کو ہر آن غیب سے نئی زندگی ملتی ہے)

عاشق پر ہر وقت یہ تقلبات رہتے ہیں بتایئے یہ بے فکری ہے یا مشقت حضرت عاشق کے دل میں تو ہر وقت آرے اور بھالے چلتے ہیں ان کا تحمل اہل تنعم کہاں کر سکتے ہیں تنعم تو ان کی ہوا سے ہی اڑ جاوے یہ جو اہل باطن اور اہل محبت بنے ہیں صرف دھوکہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ اعمال ظاہری سے بچنے کے لئے یہ من سمجھوتہ کر لیا ہے کہ ہم اہل باطن ہیں باطن ہمارا درست ہے ظاہر کی درستی کی چنداں حاجت نہیں باطن کی درستی کی حالت آپ نے سن لی ان کو یہی معلوم نہیں کہ باطن درست کاہے سے ہوتا ہے باطن درست ہوتا ہے محبت سے اوراس کا کہیں پتہ بھی نہیں۔

بس سب کی اصلیت یہ ہے کہ مشقت سے گھبراتے ہیں اعمال کون کرے اس سے تو تنعم اور لذات دنیا میں فرق آتا ہے۔

قلب کو مشغول بحق رکھنے کی ضرورت

کہتے ہیں اصل چیز تو قلب ہے جس کی نسبت کہا ہے۔

دل　گذر　گاہ　جلیل　اکبر　ست

(دل اللہ تعالیٰ کی گذرگاہ ہے)

یہ ٹھیک ہے مگر اس کے معنی تو یہ ہیں کہ تجلی گاہ ہے حق تعالیٰ کا لہٰذا اس کو غیر کی آلودگی سے بچاؤ اپنے گھر میں دوسرے کے آنے کو کون پسند کرتا ہے اور یہ معنی کیسے ہوئے کہ ان کا دل گذرگاہ بن گیا یعنی حق تعالیٰ کی تجلی کے قابل ہو گیا ہے یہ تو کرنے سے ہوتا ہے اور کرنے ہی سے یہ گھبراتے ہیں آپ سے آپ تو کوئی کام بھی نہیں ہو جاتا جھوٹا ہے مدعی اگر اس کا قلب ان کا گذرگاہ ہوتا تو یہ اعمال ظاہری سے گھبراتا اس صورت میں تو اس کے اعضاء خود بخود ان کے منقاد ہو جاتے کیونکہ اعضاء تابع قلب کے ہوتے ہیں جب قلب مشغول بحق ہے تو اعضاء کیسے مشغول بحق نہ ہوں گے گھبرانا کیا معنے۔

تو بیک زخمے گریزانی زعشق تو بجز نامے چہ میدانی زعشق

(تو ایک چرکہ ہی سے عشق سے بھاگتا ہے تو بجز نام کے عشق کی حقیقت سے ناآشنا ہے)

نہ محبت ہے نہ تجلی ہے نہ اصلاح ہے اصل بات وہی ہے کہ مشقت سے گھبراتے ہیں اور اسی کے لئے یہ آڑ بنالی ہے کہ ہم اہل باطن ہیں یہ تو بہت ہی موٹی بات ہے کہ ہر باطن کا اثر ظاہر میں ضرور پیدا ہوتا ہے مثلاً کسی کو خوشی ہوتی ہے تو اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے رگیں پھول جاتی ہیں بات کے لہجہ میں فرق آ جاتا ہے یا جب آدمی کسی ایسے کے سامنے جاتا ہے جس کی عظمت اور ادب قلب میں ہوتی ہے تو ممکن نہیں کہ اس کے سامنے سر نہ جھک جاوے اگر ان کے دل میں محبت ہوتی تو اس کے آثار کہاں ہیں کیسے مان لی جاوے یہ بات کہ دل میں محبت ہے محبت ہوتی تو کیوں گردن سجدہ میں نہیں جھکتی اور نماز کے نام سے کیوں موت آتی ہے بس جھوٹے کذاب ہیں یہ مدعی اور یہ سب باتیں ہی باتیں ہیں ان سے کچھ کام نہیں چلتا یہاں تو۔

قدم باید اندر طریقت نہ دم کہ اصلے ندارد دم بے قدم

(طریقت میں قدم رکھنا یعنی عمل کرنا چاہئے اس لئے کہ بغیر قدم رکھے عمل کئے دعویٰ کی کچھ اصل نہیں) اور۔

کارکن کار بگذار از گفتار کاندریں راہ کار باید کار

(عمل کرو دعویٰ کو ترک کرو اس طریق میں عمل اور کام ہی کی ضرورت ہے)

ترک ظاہر کا منشاء

ہماری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ باطن ہو اور ظاہر نہ ہو بات یہی ہے کہ باطن بھی نہیں ہے اور اہل باطن بننا فقط آڑ ہے اور پھر مکرر عرض کیا جاتا ہے کہ اصل اس سب کی مشقت سے گھبرانا ہے یہ منشاء تو ترک ظاہر کا امراء میں تھا اور فقراء میں اس سے بدتر ہے یعنی فساد اعتقاد اور شریعت کو بے وقعت سمجھنا اور دین میں تحریف کرنا جیسا کسی قدر آگے آوے گا اور پھر خود اس فساد عقیدہ کا منشاء بھی اکثر وہی سستی اور آرام طلبی کہ آرام کے لئے نفس نے ایک بہانہ تجویز کیا ہے غرض دو فرقے مشقت سے گھبراتے ہیں جھوٹے فقراء اور امراء غرض مقصودیت دین کا دعویٰ کر کے دین کا اختصار دونوں نے کیا ہے اور دین کا ست نکالا ہے آج کل صنعت اور ایجادات کا زمانہ ہے ہر چیز کے جوہر اور ست نکالے گئے ہیں لہٰذا انہوں نے دین کا بھی ست نکالا ہے تاکہ اس کی مقدار کم ہو جاوے اور زیادہ بوجھ نہ رہے۔

صاحبو دین تو خود ہی ست ہے اس کا ست نکالنے کے معنی یہ ہوں گے کہ ست کا بھی ست نکالا جاوے اگر صنعت کا اتنا غلبہ ہوگا تو خدا خیر کرے اس کا انجام یہ ہوگا کہ مقاصد ہی معدوم ہو جاویں گے کیونکہ اس ست کے ست کا بھی ست ہوگا اور اس کا بھی ست ہوگا آخر کہیں یہ سلسلہ ضرور ختم ہوگا کیونکہ ہر مرتبہ میں اس کا اختصار ہوتے ہوتے معدوم ہو جانے ہی کی نوبت آوے گی پھر اس صنعت کا عمل کس چیز میں ہوگا۔

مگر ہم دوسرے مطلوبات میں دیکھتے ہیں کہ صنعت کی دوڑ کہیں ضرور ختم ہوتی ہے اور ایک حد پر پہنچ کر اس کا ست نہیں نکالتے پس بعض چیزیں ایسی بھی نکلیں جن میں اختصار نہیں ہو سکتا پس اس جنس سے دین کو بھی سمجھ لیا ہوتا۔

غرض فقراء اور امراء دونوں نے باطن کو مقصود قرار دیا ہے مگر درویشوں کے اس دعوے کا منشاء اور ہے اور امراء کے دعوے کا اور، اور ان امراء سے مراد میری تعلیم جدید والے ہیں کیونکہ دین میں تلاش خراش اور ست اور جوہر نکالنا ان ہی کے یہاں ہے پرانے خیال کے امراء کا مذاق یہ نہ تھا وہ گناہ سب طرح کے کرتے تھے اور سب کے سب دیندار نہ تھے مگر اپنے آپ کو گنہگار سمجھتے تھے اور اپنے افعال کو دین کے اندر داخل نہیں کرتے تھے اور آج کل

کا مذاق یہ ہے کہ گناہ کریں اور پھر پاک کے پاک اور دیندار بھی رہنا چاہیں اس طرح کہ یہ فعل ہمارا دین کے خلاف ہے ہی نہیں بلکہ جزو دین ہے۔

نماز کی خاصیت

غرض چھوٹے فقراء اور ان امراء نے دونوں نے اختصار کیا ہے دین کا جَعَلُوْا الْقُرْاٰنَ عِضِیْنَ قرآن کو بوٹی بوٹی کرلیا اور پھر یہ فقراء اور امراء دونوں علماء محققین اور عارفین سے الجھتے ہیں اور ثابت کرنا چاہتے ہیں دین وہی ہے جس کو ہم دین سمجھتے ہیں پھر باوجود ان دونوں فرقوں کے اشتراک فی دعویٰ مقصودیت بالباطن (باطن کے مقصود ہونے کے دعوے میں اشتراک) کے چونکہ دونوں کے نزدیک خلاصہ دین کا الگ الگ ہے اس واسطے علماء پر اعتراض بھی دونوں کے الگ الگ نوع کے ہوتے ہیں چنانچہ فقراء نے دین کا ست اس طرح نکالا ہے کہ ہر عمل کا ایک باطن تجویز کیا ہے مثلاً نماز کا باطن ذکر اللہ ہے اور روزہ کا باطن انکسار نفس اور حج کا باطن عشق و محبت ہے اور باطن ہی مقصود اعظم ہے تو کہتے ہیں کہ خدا کو ہم ہر وقت یاد رکھتے ہیں پس یہی نماز ہے ظاہری اٹھ بیٹھک کی یا نہ کی اور اس پر غضب یہ کہ استدلال قرآن سے کیا جاتا ہے قرآن شریف میں ہے وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ (اللہ کا ذکر بڑا ہے) اس جملہ سے پہلے ہی اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ (نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے) اس میں نماز کا ذکر ہے اور اس کی ایک خاصیت کا بیان ہے اور آگے یہ جملہ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ تو یہ معنی ہوئے کہ ذکر اللہ نماز سے بھی زیادہ بڑی چیز ہے پس مدعاء ثابت ہے کہ بڑی چیز اور مقصود اعظم ذکر اللہ ہے پس نماز اس کے سامنے کوئی چیز نہیں اور اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

سو اس میں مفضل علیہ انہوں نے صلوٰۃ کو لیا ہے جس کے معنی یہ ہوئے ذکر اللہ افضل من الصلوٰۃ (اللہ کا ذکر نماز سے بڑا ہے) سو اول تو اس کی کوئی دلیل نہیں بلکہ یہ معنی محتمل ہیں کہ اس میں نہی کی علت بیان کی گئی ہے کہ نماز میں یہ خاصیت اس لئے ہے کہ وہ ذکر اللہ پر مشتمل ہے اور ذکر اللہ بڑی چیز ہے پھر اگر بالفرض ایسا ہو بھی کہ اکبر کا مفضل علیہ صلوٰۃ ہو جس سے یہ معنی پیدا ہوں کہ نماز سے بھی بڑی چیز ذکر اللہ ہے تو اس سے یہ کیسے لازم آیا کہ صلوٰۃ کا چھوڑ دینا جائز ہے کیونکہ یہ اس مقدمہ کے ثبوت پر موقوف ہے کہ اکبر کے ہوتے ہوئے اصغر کی

ضرورت نہیں سواگر یہ مقدمہ تسلیم کیا جاوے تو بڑے بیٹے کے ہوتے ہوئے چھوٹے کو ذبح کر دینا چاہئے مگر کسی شاہ صاحب کو یہ کرتے یا اس کی تعلیم دیتے نہیں دیکھا بلکہ چھوٹے بیٹے سے تو اور بھی محبت زیادہ ہوتی ہے حضرت مفسر ہونا ان کا کام نہیں تفسیر ایک مستقل فن ہے اس فن کے محققین جو کہیں وہ تفسیر ہے اردو کے ترجمے دیکھ لینے اور سنی سنائی باتوں سے آدمی مفسر نہیں ہوسکتا اور اس کے اقوال سوائے بکواس ہونے کے کوئی درجہ نہیں رکھتے مگر آزادی کا زمانہ ہے جو جس کا جی چاہے بک دے کوئی پوچھنے والا نہیں جیسے ایک اندھے کی حکایت ایک طالب علم بیان کرتے تھے کہ وہ خدائی کا دعویٰ کرتا تھا اور اس کی طرف بھی کچھ لوگ تھے (باطل سے باطل اور بری سے بری بات کو بھی کوئی شروع کرے تو کچھ نہ کچھ ہم خیال اس کے پیدا ہو ہی جاتے ہیں) کسی نے اس اندھے سے پوچھا کہ آپ کیسے خدا ہیں جو آنکھوں سے بھی اندھے ہیں کہا بندوں کا امتحان کرنے کے لئے ہم نے یہ صورت اختیار کی ہے سبحان اللہ بس یہ جواب کافی ہو گیا۔

آزادی کے نتائج

اسی طرح ایک جاہل فقیر خدائی کا دعویٰ کرتا تھا ایک شخص نے اس کا علاج کیا کہ جا کر ایک آیت کی تفسیر پوچھی وہ تو ایک جاہل محض تھا وہ کیا بتاتا کہا میں تو جاہل ہوں (کیا اچھے خدا ہیں جن کو اپنے ہی کلام کے معنی معلوم نہیں) پھر اس شخص نے یہ کیا کہ سوکھی روٹیاں لے کر اس کے پاس پہنچے کہ میں حضور کے لئے کھانا لایا ہوں دیکھا سوکھی روٹیاں ہیں بہت بگڑے کہا حضور اس میں میری کیا خطا ہے آپ خدا ہیں آپ ہی کے دینے سے مخلوق کو ملتا ہے جیسی روٹی ہمیں آپ نے دی ویسی ہی ہم نے آپ کے سامنے پیش کر دی آپ اچھی مرغن روٹی دیجئے تو ہم وہی سامنے لاکر رکھ دیا کریں۔

یہ آزادی کے نتائج ہیں کہ خدائی کا دعویٰ کرتے ہیں تو مفسریت کا دعویٰ تو پھر سہل ہے اور قولی آج کل کے شاہ صاحبوں کی عجیب حالت ہے بجز آزادی آ گئی ہے کہ قرآن وحدیث میں بھی تحریف کرتے ہیں عجب کیا ہے کہ اس کے آگے جو جملہ ہے وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ یعنی خدا تعالیٰ کو خبر ہے جو کچھ تم کرتے ہو اور اس میں شاہ صاحب کو دھمکایا ہی ہو کہ آیتوں میں تراش خراش نہ کرنا ہم کو سب خبر ہے مگر جو شاہ صاحب ہیں ان کو ڈر بھی نہیں کیونکہ خشیت تو علم

سے پیدا ہوتی ہے ان کو علم نہیں تو خشیت بھی نہیں اور اگر علم ہوتا تو ایسی تفسیر ہی کیوں کرتے کہ اس سے نماز کی ضرورت ہی اڑا دی جس سے قرآن وحدیث بھرے پڑے ہیں۔

دورِ بے باکی

اس بے باکی پر یاد آ گیا کہ یہ حالت ہے کہ ایک اکھڑ قوم کے ایک شاہ صاحب تھے اور جنگل میں رہتے تھے ان کے ایک معتقد کسی مجمع میں ان کی تعریف کرنے لگے کہ ایسے بزرگ ہیں ایک ظریف بولا کہ جناب اس قوم کا آدمی تو بزرگ نہیں ہوسکتا اگر وہ اس قوم کے ہیں تب تو شاہ صاحب نہیں ہیں اور اگر شاہ صاحب ہیں تو اس قوم کے نہ ہوں گے لوگوں نے کہا واہ تم ایسا ہی کہا کرتے ہو کہا چلو میں دکھلا دوں۔

چنانچہ ان کے پاس جنگل میں گئے اور بڑے تپاک سے اور معتقد بن کر ملے اثناء گفتگو میں عرض کیا کہ حضور نے قیام ایسی جگہ کیا ہے جہاں بہت قسم کے خطرے ہیں جنگل ہیں درندوں کی جگہ ہے یہاں تو بڑا ڈر لگتا ہوگا تو شاہ صاحب جوش میں آ کر فرماتے ہیں کہ میں درندوں سے تو کیا ڈرتا میں خدا سے تو ڈرتا ہی نہیں۔

پس وہ شخص کھڑے ہوگئے اور کہا دیکھ لی شاہ صاحب کی بزرگی ایک شاہ صاحب کے پاس لوگ دعاء کرانے کے لئے گئے بارش کی یا اور کہیں کی ضرورت تھی تو شاہ صاحب فرماتے ہیں مجھ سے دعاء نہ کراؤ میری اور اس کی تو لڑائی ہے دیکھو میرے باپ کو ماردیا میری ماں کو ماردیا۔

آج کل کی درویشی

یہ آج کل کی درویشی ہے اور لوگ ان واہیات بکواسوں کو کہتے ہیں اسرار ہیں خدا جانے فقیر کیا ڈالتا ہے کیا نکالتا ہے یہ اسرار نہیں اشرار ہیں۔

ایک اور صاحب کا قصہ ہے یہ ابھی زندہ موجود ہیں ایک روز فرماتے ہیں کہ آج اللہ میاں کی ناک دکھ رہی ہے کسی نے کہا توبہ کرو تو کیا فرماتے ہیں کہ دیکھو سب چیز اللہ میاں کی ہے تو میری ناک بھی اللہ میاں کی ہے اور وہ دکھ رہی ہے خدا بچاوے جہالت سے یہ درویشی رہ گئی ہے۔

ایک صاحب نے سورہ والضحیٰ واللیل اذا سجیٰ (صحیح ترجمہ قسم ہے دن کی

روشنی کی اور رات کی جبکہ وہ قرار پکڑے) کا ترجمہ کیا کہ اے نفس تیری یہی سجا (سزا) ایک فقیر صاحب ہمارے ماموں صاحب سے پوچھتے ہیں بتاؤ محمد بڑے ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم) یا رزق بڑا ہے ماموں صاحب نے کہا کہ اول تو اس خصوصیت سے یہ کوئی ضروری مسئلہ دینی نہیں لیکن تاہم ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا مرتبہ بڑا ہے آپ فرماتے ہیں نہیں رزق کا مرتبہ بڑا ہے اور دلیل یہ ارشاد فرمائی کہ دیکھو اذان میں کہا جاتا ہے اشھد ان محمد الرسول اللہ اس کو نخا گھما کر بڑے زور سے ادا کیا اشھدان اور کہا دیکھو اس میں ان مقدم ہے (ان بمعنی نان) محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر لہٰذا رتبہ رزق کا زیادہ ہوا۔

گردن زدنی مشائخ

یہ تو علوم ہیں آج کل کے شاہ صاحبوں کے اور اعمال یہ ہیں کہ ایک صاحب فتح پور بارہ بنکی کے علاقہ کے قصہ کہتے تھے کہ ایک بزرگ کے سامنے ایک عورت نے جو کہ ان کی مریدنی تھی گایا آپ ایسی مستی میں آئے کہ عین سماع میں اس کو کوٹھری میں لے گئے اور منہ کالا کیا اور نکل کر فرماتے ہیں جب آ گیا جوس نہ رہا ہوس (سین مہملہ سے) بس یہ عذر معتقدین کے نزدیک کافی ہو گیا اور کسی کے اعتقاد میں بھی فرق نہ آیا بلکہ اس کو شاہ صاحب کا کمال سمجھا ہوگا کہ اس قدر شورش عشق ہے کہ ہوش نہیں رہتا اس قدر بے ہودگیاں ہوتی ہیں اور لوگ پھر بھی ایسوں کے معتقد ہیں یہ تاویل تو ایسی ہی ہے جیسے گوالیار کا قصہ میرے ایک عزیز بیان کرتے تھے کہا یک بت پر ایک بت پرست نے پانی چڑھایا جب وہ چلا گیا تو ایک کتا ٹانگ اٹھا کر اسی بت پر موتنے لگا انہوں نے اس کو بلا کر دکھایا کہ دیکھو یہ کیا ہو رہا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میاں یہ بھی پانی دے رہا ہے۔

ایک مقام پر ایک شاہ صاحب کا یہ طرز عمل تھا کہ مرید اور مریدنیاں سب جمع ہیں جس مریدنی کو جی چاہا پیار کر لیا اور اس پر ان کے مرد کہتے ہیں اب تو پیر کا منہ تمہارے منہ کو لگ گیا اب ہم منہ لگانے کے قابل نہیں ہیں۔

گردن زدنی ہیں یہ مشائخ اور یہ لوگ دیوث ہیں میرے ماموں صاحب ایک ایسی ہی

جگہ کی نسبت فرمایا کرتے تھے کہ وہاں کے فقراء تو دوزخی ہیں اور امراء جنتی ہیں کیونکہ فقراء تو یہ حرکات نفس پرستی کے لئے کرتے ہیں اور امراء خدا پرستی کے لئے ایسوں کے بھی معتقد ہیں۔

آج کل کی درویشی کا معیار

غرض یہ کیفیت ہے آج کل درویشوں کی یہ کیا اہل باطن ہیں آج کل تو درویشی کا معیار یہ ہے کہ جتنا کوئی شریعت سے دور ہے اتنا ہی بڑا فقیر ہے یہ لوگ ملامتی بنتے ہیں ان لوگوں نے ملامتی کے معنے یہ لئے ہیں جو ایسا کام کرے جس پر ملامت کی جاوے خواہ وہ گناہ ہی ہو حالانکہ یہ سراسر غلطی ہے اصل یہ ہے کہ ملامتی ایک اصطلاحی لفظ ہے اس کے معنی اہل فن کے نزدیک یہ ہیں کہ جو شخص اعمال نافلہ کو چھپا کر کرے اور طاعت نافلہ کی وہ صورت اختیار کرے جس سے پتہ نہ چلے کہ اس نے طاعت کی نہ یہ کہ گناہ کرے یعنی طاعت کو ایسی طرح کرے کہ ظاہر میں گناہ معلوم ہوتا ہو جیسے آج کل لوگوں نے اختیار کیا ہے یہ تعریف عوارف المعارف میں موجود ہے اور بعض لوگ ملامتی کے معنے وضع بری بنانے کے لیتے ہیں یعنی ایسی وضع بنانا جس سے لوگوں کی نظروں سے گر جاوے اور اس کی طرف نگاہیں نہ اٹھیں بزرگوں نے ہضم نفس کے واسطے ایسا کیا ہے لیکن آج کل اگر کوئی ایسا کرنا چاہے تو یہ دیکھے کہ ایسی وضع کون سی ہے سو یہ وضع آج کل مولویانہ وضع ہے اس سے دنیاداروں کو آج کل پوری نفرت ہوتی ہے اور اس وضع کی طرف نگاہیں نہیں اٹھتیں بلکہ اس سے اور بھی شان مٹ جاتی ہے عام لوگ ان کو درویشی سے بالکل ہی ناواقف سمجھتے ہیں پس آج کل جس کو ملامتی بننا ہو وہ یہ وضع اختیار کرے تو جو درویش ملامتی بنتے ہیں چاہئے گیروا کپڑے چھوڑ کر مولویوں کیسی صورت بنا دیں باقی ڈاڑھی منڈا کر اور چہار ابرو کا صفایا کرا کر تو آج کل آدمی ملامتی نہیں بنتا بلکہ اس کی طرف عام نظریں اٹھتی ہیں کہتے ہیں قلندر ہیں اور صاحب سکر ہیں اور مست ہیں اور اس کے ساتھ اگر ذرا حرف شناس بھی ہوئے اور آیتوں میں واہی تباہی نکات بیان کرنا شروع کر دیئے تب تو کیا کہنا ہے عارف بھی ہو گئے اور نکات بھی ان کے عجیب ہی ہوتے ہیں۔

ایک درویش پڑھے لکھے تھے انہوں نے حٰمٓ عٓسٓقٓ کی تفسیر میں یہ نکات بیان کیئے کہ حٰم مخفف ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اور عسق اشارہ ہے عشق کی طرف چونکہ حضور

(صلی اللہ علیہ وسلم) اُمی تھے اس واسطے شین کی جگہ سین لایا گیا مطلب یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صاحب عشق ہیں یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل بیان کئے گئے ہیں سبحان اللہ حضرت بلال کا اسہد سین کے ساتھ تو سنا تھا گو وہ بھی بالکل بے اصل ہے ان بزرگوار نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی شین نکال سکنے سے عاری ثابت کر دیا حالانکہ شین عربی حرف ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مادری زبان کا حرف ہے اس کے ادا پر قادر نہ ہونے کے کیا معنی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو افصح العرب والعجم ہیں جب شین بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں نکلتا تو فصاحت کہاں رہی اور شین حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ نکلتا تو سارے قرآن میں نہ نکلتا یہ کیا خرافات ہیں اور ان لغویات کے جواب کوئی کہاں تک دے۔

شہرت کی ترکیبیں

یہ لکھے پڑھے درویشوں کا حال ہے درویشی اس کا نام ہے اور تصوف کی یہ گت بنائی گئی ہے کیا ملغوبہ ہے ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے آج کل درویشی دو پیسہ میں آتی ہے ایک پیسہ کا گیرو لیا اور ایک پیسہ کی تسبیح گیروا کپڑے پہن لئے اور تسبیح گھمانی شروع کی اور درویشی حاصل ہوئی اور اگر زندگی میں بھی ولی نہ ہوئے تو مرنے کے بعد ولی بنا دینا طوائف کے قبضہ میں ہے جس کی قبر پر ایک بار مجرا کر لیا وہ ولی ہو گیا۔

صاحبو! یہ ترکیبیں درویشی کی نہیں ہیں یہ تو شہرت کی ترکیبیں ہیں حضرت وہاں تو لوہے کے چنے ہیں وہاں تو اپنے آپ کو مٹانا اس کے لئے تو بڑے دھکے کھانا پڑتے ہیں ایک ظریف سیاح درویش کی حکایت ہے یہ پیران کلیر کا ذکر ہے) کہ ان کے پاس ایک خان صاحب طالب کیمیا آئے یہ منحوس لوگ خوش عقیدہ بہت ہوتے ہیں کسی نے ان کی نسبت کہہ دیا تھا کہ یہ کیمیا جانتے ہیں پس آئے اور آتے ہی پوچھا کہ آپ کو کیمیا آتی ہے انہوں نے کہا آتی ہے کہنے لگے ہم کو بھی بتلا دو انہوں نے کہا نہیں بتلاتے کہنے لگے کیوں انہوں نے کہا خوشی ہماری کیا ہم تمہارے باوا کے نوکر ہیں۔

اس سخت جواب کو سن کر ڈھیلے ہوئے لوہے کو لوہا کاٹتا ہے امراء ویسے تو کسی سے بھی سیدھی بات بھی نہیں کرتے مگر ایسے آدمی سے ٹھیک ہو جاتے ہیں لگے خوشامد کرنے انہوں نے کہا میاں

پاگل ہوئے ہو کیمیا کہیں یوں آتی ہے جس طرح ہم نے سیکھی ہے اسی طرح تم بھی سیکھو خدمتیں کرو ساتھ رہو کبھی دل میں آوے گا تو بتادیں گے یہ خاموش ہوئے کھانے کا وقت آیا ان سیاح صاحب نے ایک درخت کی پتیاں ابال کر ان کے سامنے رکھیں یہ رئیس آدمی پلاؤ قورمہ کے کھانے والے ان کے منہ میں وہ کیا چلتیں بہت پریشان ہوئے کہا بھائی ابھی تو کیمیا کی پہلی ہی منزل ہے ابھی سے ناک منہ چڑھانے لگے تو تم سے کیا ہونا ہے جاؤ کام کرو کیا خبط سوجھا ہے۔

کیمیائے باطن

حضرت یہ کیمیائے ظاہری ہے جس کا حاصل اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ سونا چاندی حاصل ہو جاوے جب اس کے لئے یہ مصیبتیں اٹھانا پڑتی ہیں تو کیمیائے باطن کے لئے تو کیا کچھ ہونا چاہئے جس کا حاصل یہ ہے کہ خدا مل جاوے وہاں تو یہ کرنا ہوگا ؎

درره منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں　　　شرط اول قدم آن ست کہ مجنوں باشی

(لیلیٰ (محبوب) کی منزل میں جان کو سینکڑوں خطرے ہیں پہلی شرط اس راہ کے لئے مجنون بن جانا ہے)

اور اس راستہ میں وہ گتیں بنیں گی کہ گھبرا گھبرا کر یہ کہنا ہوگا ؎

الا یا ایہا الساقی ادر کاسا وناولہا　　　کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا

(اے ساقی (مرشد) شراب محبت کے جام کا دور شروع کیجئے اور اس کو دیجئے کہ شروع میں عشق آسان معلوم ہوا لیکن پھر بہت مشکلات پیش آئیں)

مگر باوجود اس کے کہ مشکلیں بہت پیش آویں گی پھر بھی اس میں ایک خاصیت عجیب یہ ہے کہ ان مشکلوں کو آدمی گراں بھی نہیں سمجھے گا، بلکہ خوش ہوگا اور کہے گا ؎

خوشا وقت شوریدگان غمش　　　کہ گر ریش بینند وگر مرہمش

دما دم شراب الم در کشند　　　وگر تلخ بینند دم درکشند

(اس کے غم میں پریشان لوگوں کا کیا اچھا وقت ہے خواہ اپنے زخموں کو دیکھیں یا ان زخموں کے مرہم کو دم بدم غم کی شراب پیتے ہیں اگر تلخی پاتے ہیں خاموش ہو جاتے ہیں)

پرخار راہ

اور اس راہ میں حالت یہ ہوگی کہ گھر جائے بار جائے دولت جائے امیر سے فقیر بن جائے مگر ہٹ نہیں سکتا بلکہ خود گھر بار اور مال و دولت ہی سے نفرت ہو جاوے گی۔

گدایا نے از بادشاہی نفور　　بامیدش اندر گدائی صبور

(وہ لوگ ایسے فقیر ہیں جن کو بادشاہی سے نفرت ہے اور اس کی امید میں گدائی پر صبر کئے ہوئے ہیں)

اس اپنی ٹوٹی ہوئی حالت میں ان کو وہ لذت ہے کہ سلطنت میں بھی نہ ہوگی چنانچہ بعض بندگان خدا نے سلطنت چھوڑ کر اس طریق کو اختیار کیا اور کبھی اس کی طرف نظر بھی پھر نہیں اٹھائی کوئی بات تو ایسی پائی جس کے سامنے سلطنت کوئی چیز نہیں غرض یہ حالت ہے اس راستہ کی اسی واسطے مشورہ دیتے ہیں۔

اگر مرد عشقی کم خویش گیر　　وگرنہ رہ عافیت پیش گیر

(اگر عاشق ہے تو محبت کے عشق میں اپنے آپ کو فنا کر، ورنہ اپنی آسائش کی راہ اختیار کر)

یہ قضیہ شرطیہ ہے معنی یہ ہیں کہ اگر اس راہ میں قدم رکھنا ہے تو سمجھ لو کہ مٹنا پڑے گا اگر اس کے لئے پکے نہیں ہو تو اس سے الگ ہی رہو اور طریق عافیت اختیار کرو اور اس جھگڑے میں مت پڑو مگر ان دونوں میں سے یعنی راہ عشق اور راہ عافیت میں اختیار کس کو کرنا چاہئے اس کی نسبت پھر خود یہ مشورہ دیتے ہیں۔

مترس از محبت کہ خاکت کند　　کہ باقی شوی چوں ہلاکت کند

یعنی اس راہ میں خاک تو ہونا پڑے گا مگر ہمت نہ ہارنا چاہئے اور قدم رکھنا ہی چاہئے کیونکہ انجام اس کا بقا ہے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ یہ راہ آسان نہیں ہے اور گو نتیجہ اور ثمرہ اس کا ایسا ہے کہ اس کی امید میں آدمی ان سب مشکلوں کو جھیلنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے مگر تاہم مشکلیں پیش ضرور آتی ہیں قدم قدم پر مصیبت اور آفت کا سامنا ہوتا ہے علمی غلطیاں ہوتی ہیں اور حالی غلطیاں ہوتی ہیں اس راہ کی تو بالکل حالت یہ ہے۔

سنبھل کے رکھنا قدم دشت خار میں مجنوں

یہ راہ واقعی پر خار ہے بہت سنبھل کر چلنے کی ضرورت ہے اور بڑا سنبھلنا یہ ہے کہ اس کو اکیلے قطع نہ کرے دوسرے کی رہبری کی ضرورت ہے ورنہ بھٹکتا ہی پھرے گا۔

بے رفیقے ہر کہ شد در راہ عشق | عمر بگذشت و نشد آگاہ عشق
یار باید راہ را تنہا مرو | بے قلاوز اندریں صحرا مرو
ہر کہ تنہا نادر ایں راہ را برید | ہم بعون ہمت مرداں رسید

(بغیر رہبر اور مرشد کے جس نے اس راہ میں قدم رکھا وہ ساری عمر اس میں گم ہو کر رہ گیا اور کامیاب نہ ہوا راہ سلوک میں مددگار ہونا چاہئے اس میں تنہا قدم نہ رکھو اتفاقاً جس شخص نے اس راہ سلوک کو اکیلے خود طے کیا ہے وہ بھی اللہ والوں کی توجہ سے کیا ہے) یہ حقیقت ہے اس راہ کی جس کی ہوا بھی ان مدعیوں کو نہیں لگی جب تو ایسی مہمل باتیں بناتے ہیں کہیں نماز اڑا دی کہیں روزہ حذف کر دیا اور نام باطن کا یہ تو اس باطن کا بیان تھا جس کو فقراء نے اعمال شرعی میں تجویز کیا ہے۔

جدید تعلیم یافتہ حضرات کے نئے خیالات

اور ایک باطن وہ ہے جو امراء نے تجویز کیا ہے میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ یہاں امراء سے مراد نئے تعلیم یافتہ اصحاب ہیں اور پرانے امراء اول تو اس خیال کے نہ تھے کہ دین میں اختراع کریں اگر گناہ کرتے تھے تو اپنے آپ کو گنہگار سمجھتے تھے دین کو نہیں بگاڑتے تھے اور اگر کچھ لوگ ایسے تھے بھی تو وہ شاہ صاحبوں کے ہم خیال تھے ان نئے تعلیم یافتہ اصحاب کے خیالات بھی نئے ہیں انہوں نے دین کا خلاصہ ایک نئے طریق سے کیا ہے یہ دعویٰ تو ان میں اور فقراء میں دونوں میں مشترک ہے کہ دین کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور مقصود اعظم باطن ہے ظاہر کی چنداں ضرورت نہیں اور آگے اس بات میں دونوں متمائز ہیں کہ وہ باطن کیا ہے سو فقراء نے تو ہر عمل کا باطن الگ نکالا ہے نماز کا الگ روزہ کا الگ اور حج و زکوٰۃ کا الگ جیسا کہ بیان کیا گیا اور ان امراء نے اس سے بھی زیادہ اختصار کیا گویا ان کی صنعت بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہے انہوں نے ست کا بھی ست نکالا یہ مولویوں اور فقراء کو سب کو فضول سمجھتے ہیں انہوں نے کل دین کا خلاصہ ایک ہی چیز نکالی ہے وہ کیا ہے تہذیب اخلاق پس تمام اعمال تو دین کے لئے ظاہر ہیں

اور باطن دین کا اور حقیقت اس کی تہذیب اخلاق ہے اور کھلے الفاظ میں کہتے ہیں کہ اٹھک بیٹھک اور مال کا خرچ کرنا اور پیٹ کا ٹنا اور جس جس عمل کو عبادت کہا جاتا ہے وہ سب بانی اسلام (علیہ السلام) نے صرف اسی واسطے تجویز فرمائی تھی کہ تہذیب اخلاق حاصل ہو ملک عرب وحشی ملک تھا اور وہاں بہیمیت بہت زیادہ تھی ان کی اصلاح بلا اس سخت گیری کے ہو نہیں سکتی تھی اس واسطے یہ احکام تجویز کئے گئے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بڑے رفارمر تھے ان کی اصلاح کے لئے ایسی صحیح تدبیریں تجویز فرمائیں کہ ان سے بہتر ہو ہی نہیں سکتی تھیں اور ہم کو وہ بات بدوں نماز روزہ کے حاصل ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود اصلی تھا یعنی تہذیب اخلاق کیونکہ ہم تعلیم یافتہ ہیں اور بہیمیت عرب کی سی ہم میں نہیں ہے تو ہمارے واسطے اس سخت گیری کی کیا ضرورت ہے اور یہ بڑی نادانی ہے کہ متکلم کی اصل غرض کو نہ سمجھا جاوے اور صرف الفاظ پر رہا جاوے جیسا کہ خشک مولوی کر رہے ہیں کیوں صاحب کیا دلیل ہے اس بات کی کہ تمام احکام سے مقصود اصلی حضرت شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کا صرف تہذیب اخلاق ہے کوئی دلیل اس پر ہونی چاہئے اور میں دور کی بات کہے دیتا ہوں کہ اول تو دلائل قطعیہ سے اس کا احتمال بھی منفی ہے لیکن بفرض محال اگر اس کا احتمال بھی ہو کہ شاید یہی مقصود ہو تو صرف احتمال پر اس دعوے کی بناء ہوئی دلیل پر تو بنا نہ ہوئی تو کیوں صاحب ایک دین ہی آپ کے نزدیک ایسی چیز ہے جس میں اپنے مطلب کے لئے احتمال ہی بنا کر کے اس سے تسلی کر لی جاتی ہے کبھی دنیا کے بھی کسی کام کی بنا آپ یا کوئی عقل مند صرف احتمال پر کیا کرتا ہے مثلاً ایک بہت بڑا مہاجن ہو جس کے یہاں بہت دولت ہو اور وہ مر جاوے تو آپ اس کے یہاں جا کر کہیں کہ اس میں سے مجھے بھی حصہ ملنا چاہئے کیونکہ میں اس کا بیٹا ہوں اور کوئی کہے کہ تم بیٹے کس طرح ہو تو جواب دیجئے کہ احتمال تو ہے کہ میں اس کا بیٹا ہوں اور جب احتمال ہے تو میں دعویٰ کرتا ہوں کہ میں بیٹا ہوں لہٰذا میراث ملنی چاہئے۔

کیوں صاحبو! کیا یہ بات چل جاوے گی اور کیا اس کو سن کر کوئی پاگل نہ کہے گا یا مثلاً جو آپ کا بیٹا ہے اس کو آپ میراث سے محروم کرنا چاہتے ہیں اس طرح کہ گو اس کو بیٹا کہا جاتا ہے مگر احتمال تو ہے کہ بیٹا نہ ہو لہٰذا اسی شق کو ترجیح دی جاتی ہے کہ بیٹا نہیں ہے اور میراث سے محروم ہونا چاہئے تو کیا یہ بات مان لی جاوے گی۔

دین کو غیر ضرورت سمجھنے کے نتائج

صاحبو! تعجب ہے کہ دنیا کے تو کسی معمولی کام کی بنا بھی احتمال پر نہیں کرتے اور دین کے بڑے بڑے کاموں میں ایسی جرأت کرتے ہیں اور تغیر تبدل کر ڈالتے ہیں دنیا میں تو یہ حالت ہے کہ احتمال کے موقع پر ہمیشہ احتیاط کا پہلو اختیار کیا جاتا ہے مثلاً کسی دوا میں شک ہو جاوے کہ یہ دوا فلانی ہے یا کوئی تیزاب ہے تو اس کو کوئی بھی نہیں پیئے گا بلکہ اسی کو پسند کریں گے کہ اس کو تلف کر دیا جائے گو کتنی ہی لاگت اس میں ضائع ہوئی ہو اور اس کو مکان میں بھی رکھنا گوارا نہ کریں گے اسی احتمال کی وجہ سے کہ کوئی پی نہ جاوے اور نقصان ہو جاوے گا یا اللہ کا دین ہی کیا ایسی سستی اور بے کار چیز ہے کہ اس کے بالکل سر پیر سے اڑا دینے کے لئے صرف احتمال کافی ہے تمام ارکان دین کو بدل ڈالا صرف اس احتمال پر کہ شاید مقصود ان سب سے تہذیب اخلاق ہو اور لطف یہ ہے کہ یہ احتمال بھی مرجوح بلکہ غلط اور اپنا تراشا ہوا اور زبردستی کا احتمال ہے کیونکہ احتمال تو وہاں ہو سکتا ہے جہاں متکلم کی طرف سے کوئی بیان نہ ہو یہاں تو صاحب شرع کی طرف سے صاف صاف بیان موجود ہیں ہر ہر عبادت کی کیفیت اور اس کے کرنے کی ضرورت اور اس پر ثواب اور ترک پر وعیدیں بیان فرمائی ہیں پھر یہ احتمال بھی کہاں رہا کہ شاید مقصود تہذیب اخلاق ہی ہو یہ تو کھلی ہوئی توجیہ القول بما لا یرضی بہ قائلہ (قائل کے قول کی ایسی توجیہ کرنا کہ قائل اس کو ناپسند کرتا ہے) ہے اور یہ تو بالکل ایسا ہے جیسے ایک نوکر سے کہیں کہ انگور لے آ وہ آٹا لے آوے اور کہے کہ مقصود تو کھانے سے تغذیہ بدن ہوتا ہے وہ انگور میں اتنا نہیں ہے جتنا آٹے میں ہے کیا یہ حرکت اس کی نافرمانی نہیں ہے حالانکہ وہ ایک معقول وجہ بیان کرتا ہے مگر جواب میں اس کے یہی کہا جاوے گا کہ تو اپنی طرف سے غرض اور مقصود کو تراشنے والا کون ہے کیا دلیل ہے اس بات کی کہ اس وقت ہم کو مقصود تغذیہ بدن ہے ممکن ہے کہ تفکہ مقصود ہو جس کے لئے انگور موضوع ہے نہ آٹا خصوصاً اگر یہ صورت ہو کہ کوئی قرینہ بھی ایسا موجود ہو جس سے اس پر کچھ دلالت ہوتی ہو کہ تغذیہ مقصود نہیں مثلاً کھانے کا وقت نہ ہو یا ابھی کھانا کھا چکے ہوں یا گھر میں کوئی بیمار موجود ہو جس کو طبیب نے انگور کھانے کے لئے کہا ہو تو اس صورت میں اس کا آٹا لے آنا اور زیادہ سخت بیوقوفی اور

بدتمیزی بلکہ گستاخی اور تعنت سمجھا جاوے گا حالانکہ اس قرینہ کے رہتے ہوئے بھی وہ احتمال باقی ضرور رہتا ہے لیکن ایسے نوکر کو کان پکڑ کر نکال دیا جائے گا۔

امور دین میں عدم احتیاط

پس یہی قصہ دین کا سمجھو کہ جب دین میں قرائن اس بات کے موجود ہیں کہ خود اعمال بھی مقصود ہیں تو اپنی طرف سے ایک احتمال نکال کر ان کو بدلنا کیسے جائز ہوگا اور یہ قرائن اگر معمولی بھی ہوتے تب بھی اس اختراع کی گنجائش نہ تھی چہ جائیکہ تصریحات قولی موجود ہیں اس وقت میں تو اس اختراع کی مثال بالکل یہ ہوگی کہ نوکر سے کہیں انگور لے آ اور وہ جواب میں کہے جی ہاں میں سمجھ گیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ انگور نہ لانا بلکہ آ ٹالا نا اے اللہ عقلیں کہاں چلی گئیں یا عقل اسی واسطے ہے کہ دنیا کے کام اس سے بنائے جائیں اور دین کا نام آتے ہی اس کو بالائے طاق رکھ دیا جاوے اور دین کے کاموں کو جان جان کر بگاڑا جاوے دنیا کے کاموں میں تو ذرا سا احتمال جو غیر ناشی عن دلیل (دلیل سے نہ پیدا ہونے والا) بھی ہو پیدا ہو جاوے تو احتیاط کا پہلو اختیار کیا جاوے اور دین کے کاموں میں ایک غلط احتمال اپنی طرف سے تراش کر اس پر عمل کر لیا جاوے۔

اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ دین کو صرف ایک غیر ضروری چیز سمجھا ہے جس کا مقتضا یہ ہے کہ یوں کر لیا تو کیا اور یوں کر لیا تو کیا ورنہ اگر ذرا بھی وقعت دین کی قلب میں ہوتی اور اس کی کچھ بھی ضرورت سمجھی جاتی اور درجہ وہم میں بھی یہ بات ہوتی کہ قیامت آنے والی ہے اور باز پرس ہوگی اور وہاں ایسی ایسی ہولناک تکلیفیں اور عذاب ہیں تو اول تو یہ احتمال پیدا ہی نہ ہوتا اور پیدا بھی ہوتا تو پہلو احتیاط ہی کا اختیار کیا جاتا اور یوں کرتے کہ اگرچہ یہ ممکن ہے کہ اعمال کا یہ خاص باطن (یعنی تہذیب اخلاق) ہی مقصود ہو (گو یہ ان کا خود تراشیدہ ہے) مگر بہتر یہی ہے کہ احتیاط کا پہلو اختیار کیا جاوے اور ظاہر کو بھی ترک نہ کیا جاوے کیونکہ اگر وہ احتمال غلط نکلا تو قیامت میں کیا جواب ہوگا۔

دیکھئے مال گذاری کے داخل کرنے کو تحصیل میں جاتے ہیں اور فرض کیجئے کہ بیس روپے مال گذاری کے داخل کرنے میں لیکن اگر شک پڑ گیا کہ کچھ آنہ پائی اس رقم کے اوپر

اور بھی ہیں تو اس صورت میں جیب میں پچیس ہی روپے ڈال کر چلیں گے اس خیال سے کہ کچھ تو کسر مال گذاری میں ہے جس کی مقدار معلوم نہیں اور شاید کوئی روپیہ کھوٹا بتا دیا جاوے یا عملہ والوں کو کوئی روپیہ حق ناحق کا دینا پڑے تو احتیاط یہی ہے کہ پانچ روپے زائد لے چلیں اگر خرچ نہ ہوئے تو واپس آ جاویں گے اور اگر نہ لے چلے اور وہاں کمی پڑ گئی تو ذرا سی بات کے لئے آبرو پر بن جاوے گی ایسے موقعوں پر دنیا میں بیوقوف سے بیوقوف بھی احتیاط کا ہی پہلو اختیار کرتا ہے پھر تعجب ہے کہ دین میں وہ لوگ بھی جو اہل عقل ہونے کے اور تعلیم یافتہ اور مہذب ہونے کے مدعی ہیں احتیاط کا پہلو اختیار نہیں کرتے بلکہ ایک من گھڑت احتمال پر قطعی حکم کر دیتے ہیں اور ایسے بےفکر ہو جاتے ہیں کہ دوسری جانب کا (جو درحقیقت راجح اور یقینی ہے اور اس کے مقابلہ میں یہ محتمل جانب مرجوح بلکہ غلط ہے) ان کو احتمال ہی نہیں ہوتا اس کی وجہ صرف دین کا غیر ضروری سمجھنا ہے۔

بس اس کا آخر جواب ہمارے پاس یہی ہے کہ آنکھ میچنے پر معلوم ہو جاوے گا کہ کس دھوکہ میں رہے اور اس وقت اس کا تدارک کچھ بھی نہ ہو سکے گا غرض اس امراء کے فرقہ نے بھی دین کا ایک ست نکالا ہے اور یہ ست اس ست سے بڑھا ہوا ہے جو فقراء نے نکالا تھا کیونکہ فقراء نے جو ست نکالا ہے وہ ایک دین کی چیز تو ہے اور انہوں نے ست بھی دنیا ہی کی ایک منفعت نکالی پس وہ ست تھا اور یہ روح ہے آج کل ہر چیز کی روح نکالی گئی ہے گلاب کی روح ہے، چمبیلی کی روح ہے، خس کی روح ہے انہوں نے یہ دین کی روح نکالی ہے (روح کیا نکالی کہ دین کی روح ہی نکال دی) تمام دین کی روح ایک ذرا سی نکال لی جس کا نام تہذیب اخلاق رکھا ہے اس کو (اور وہ بھی اپنے ہی نزدیک) حاصل کر لیا ہے بس اب کسی عمل کی ضرورت نہیں اگر کوئی عمل کبھی کیا تو دنیا کے فائدہ کے لئے مثلاً نماز پڑھی تو اس فائدہ کی بنا پر کہ ان حرکات سے جسم کی ریاضت ہو جاتی ہے اس واسطے کبھی اٹھک بیٹھک کر لیتے ہیں اور اگر کبھی اور طرح ریاضت ہوگئی مثلاً گھوڑے کی سواری کر لی یا کرکٹ اور فٹ بال کھیل لی تو اب ریاضت کی ضرورت نہیں رہی بس نماز حذف۔

نئے خیالات

یا ایک نماز کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے واسطے وضو کیا جاتا ہے جس سے صفائی ستھرائی ہو جاتی ہے اور صفائی اچھی چیز ہے اور تہذیب میں داخل ہے اور اگر صبح اٹھ کر غسل کر لیا یا صابن سے منہ ہاتھ دھو لیا ہے اور بنگلے اور کوٹھیوں میں رہتے ہیں گرد و غبار کا وہاں دخل نہیں ہے تو اس صورت میں نماز کے واسطے وضو کی کیا ضرورت ہے چنانچہ ایک صاحب ایسا ہی کرتے تھے کہ بے وضو نماز پڑھ لیتے تھے اور اگر کسی نے کہا کہ بے وضو نماز نہیں ہوتی تو کہتے یہ دقیانوسی مولویوں کے خیالات ہیں یہ لوگ غور نہیں کرتے اور دین کی تہہ کو نہیں پہنچتے عرب میں جب اسلام شروع ہوا تو افلاس بہت تھا لوگ محنت مزدوری سے پیٹ بھرتے تھے اور میلے کچیلے رہتے تھے اس واسطے اس وقت کے لئے بانی اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے یہ قید لگا دی تھی کہ جب نماز پڑھو تو منہ ہاتھ دھو لیا کرو اب زمانہ وہ نہیں ہے اب مال کی افراط ہے محنت مزدوری کی ضرورت نہیں ہم آئینہ دار بنگلوں میں رہتے ہیں روز صبح کو صابن مل کر غسل کرتے ہیں گرد و غبار کا یہاں تک گذر نہیں بتاؤ ہمارے بدن پر کیا لگ رہا ہے جس کے واسطے بار بار دھوویں (کوئی پوچھے کہ ہر روز صبح کو کیا لگ جاتا ہے جس کے واسطے روز نہاتے ہو مگر یہ کام تو استاد نے بتایا ہے جس کے حکم میں چون و چرا کی گنجائش نہیں یعنی فیشن نے)

خود یہ بات بھی نہایت تعجب خیز ہے کہ عرب عموماً میلے کچیلے رہتے تھے یہ تاریخی بات ہے ان کے یہاں تاریخ کو بڑا دخل ہے اور اس پر بڑی جلدی ایمان لاتے ہیں تاریخ میں یہ مل گیا کہ عرب میں افلاس تھا آگے عموم اپنی رائے سے تجویز کر لیا کیا تاریخ میں کہیں یہ بھی ہے کہ اہل عرب سب ایسے ہی غریب اور مفلس تھے کیا ان میں متعم اور صاحب ثروت نہ تھے عرب میں تو وہ لوگ بھی تھے جن کے یہاں سو سو غلام تھے تو اگر وضو کی بناء غربت اور افلاس پر تھی تو ان لوگوں کو تو مستثنیٰ کر دیا جاتا اور صرف غریبوں کے لئے وضو کا حکم ہوتا نیز صحابہؓ کے حالات ابتداء میں بے شک ایسے ہی تھے مگر پھر حق تعالیٰ نے فتوحات دیئے اور والی ملک ہوئے اور یہ حالت تھی کہ بدن پر بجائے عطر کے مشک ملا کرتے تھے مگر تاریخ میں کہیں ہے کہ انہوں نے وضو کرنا چھوڑ دیا تھا بس زمانہ آزادی کا ہے جو چاہو کرو جو چاہو کہو کوئی پوچھنے والا نہیں چنانچہ وہ صاحب پانچوں وقت نماز بے وضو اڑاتے تھے۔

صلح کل

ایک صاحب نے اور زیادہ ترقی کی کہ نماز بھی ندارد کر دی کیونکہ مقصود بدوں اس کے حاصل تھا یعنی ریاضت جیسے گھوڑے کی سواری وغیرہ ایک اور صاحب کا قصہ ہے کہ وہ ایک جگہ مدعو تھے اور بڑے معزز شخص تھے ان کے ساتھ اور بہت سے اشخاص بھی مدعو تھے گویا تمام جلسہ انہی کی وجہ سے مدعو تھا اور سالار قافلہ یہی تھے نماز کا وقت ہوا تو سب لوگ اٹھے مگر یہ نہ اٹھے کسی نے کہا آپ بھی نماز کو چلیں تو کہا میں نماز کو لغو سمجھتا ہوں لوگوں نے کہا جناب نماز تو اسلام کی چیز ہے آپ ایسا کیونکہتے ہیں تو آپ جواب میں (توبہ توبہ) کیا کہتے ہیں کہ میں اسلام ہی کو لغو سمجھتا ہوں۔

صاحبو! یہ نوبت ہے ان لوگوں کی جو سربرآوردہ کہلاتے ہیں اور جن کی عزت کو لوگ اسلام کی عزت سمجھتے ہیں اس پر اگر کوئی مولوی کچھ کہے تو کہا جاتا ہے کہ مولویوں کو تو بس فتویٰ لگانا آتا ہے مسلمانوں کے کسی ایک فرد کو تو مشکل سے ترقی ہوتی ہے اسی کے یہ لوگ پیچھے پڑ جاتے ہیں بس ترقی قومی دیکھ ہی نہیں سکتے۔

صاحبو! کیا یہ اسلام ترقی ہے اب سنئے کہ اس شخص کے لئے اہل جلسہ میں سے بعض لوگوں نے یہ تجویز کیا کہ اس شخص نے ایسا بے ہودہ کلمہ بکا ہے اس واسطے اس سے بائیکاٹ کرنا چاہئے اور اس سے قطع تعلق کر دینا چاہئے تو دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ ہم کیوں اختلاف ڈالیں اس نے اللہ میاں کی شان میں گستاخی کی ہے اللہ میاں آپ نپٹ لیں گے سبحان اللہ یہ صاحب صلح کل ہوں گے مگر کیا صلح کل ہے ذرا سلطنت کے باغی سے تو دوستی کرکے دیکھو دیکھیں صلح کل کے مذاق کو کیسا نباہتے ہو مگر یہاں اہل جلسہ کو بھی تامل ہے کہ ایسے بے ہودہ سے بائیکاٹ بھی کرنا چاہئے یا نہیں افسوس روڑ کی میں ایک کمیٹی ہوئی تھی جس میں اس پر بحث تھی کہ نکاح کی پخر کیوں لگائی گئی ہے نکاح کی روح اور حقیقت تو تراضی ہے جہاں تراضی پائی جاوے نکاح ہی کا حکم ہونا چاہئے عورت و مرد کا ایک کے ساتھ مقید ہو جانا سمجھ میں نہیں آیا ہاں جبر نہیں چاہئے رضامندی سے کسی مرد اور کسی عورت کے مل جانے میں کیا حرج ہے مگر یہ کیا ضرور ہے ایک بیوی اور ایک میاں ہو یہ مسلمانوں میں کمیٹی ہوئی تھی

اس سے بڑھ کر ایک اور لطیفہ ہے (لطیفہ کیا ہے کثیفہ ہے) لکھنؤ میں ایک محلّہ ہے خیالی گنج وہاں کے ایک صاحب مجھ سے ملنے آیا کرتے تھے ایک روز ذرا دیر میں آئے تو پوچھنے پر بیان کیا کہ آج وہاں ایک کمیٹی ہوئی تھی جس میں اس پر بحث ہوئی کہ مسلمانوں کے تنزل کی اصل وجہ کیا ہے بہت گفتگو کے بعد جو اخیر بات طے ہوئی وہ یہ ہے کہ ان کا اصلی اور اخیر سبب تنزل کا اسلام ہے جب تک اس کو نہیں چھوڑا جاوے گا ترقی نہیں ہوگی اور یہ بات پاس ہوگئی لعنت ہے اس پاس ہونے پر اے صاحبو! خیال تو فرمایئے کہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے پھر اس پر اپنے کو مسلمان کہتے ہیں کہ ٹھیٹ مسلمان ہیں ٹھیٹ نہیں بلکہ تمہارے اسلام کی آنکھ میں ٹینٹ نکل آیا ہے جس نے بالکل بے کار کر دیا اور جس کا علاج سوائے نشتر کے کچھ نہیں اور نشتر بھی کون سا نائی کا پھر وہ نشتر نہیں جس سے آنکھ بن جائے بلکہ وہ جس سے اور پھوٹ جاوے اور کاٹ کر نکال ڈالی جائے کیونکہ اس میں قابلیت ہی بننے کی نہیں ہے۔

صریح کفر

یہ تو نوبت ہے اگر اس پر کوئی حکم شرعی سنایا جاوے تو کہتے ہیں کہ بس مولویوں کو فتویٰ لگانا آتا ہے اور غصہ ان کی ناک پر رکھا ہوتا ہے اور ذرا میں برا مان جاتے ہیں اگر ان کی ماں کو کوئی گالی دے تب دیکھیں یہ برا نہیں مانتے اور اس شخص سے ان کی دوستی قائم رہتی ہے یا نہیں اس وقت تو یہ بھی ایسا خشک برتاؤ کریں گے کہ مولوی بھی مخالف کے ساتھ ایسا نہ کریں بات یہ ہے کہ جس سے جس کو تعلق ہوتا ہے اس کو برا کہنے سے غصہ آتا ہے سو آپ کو اپنی ماں سے تعلق ہے اس واسطے ماں کو گالی دینے سے غصہ آ گیا اور ایسا ہونا ہی چاہئے اگر ایسا نہ ہو تو فطرت سلیمہ کے خلاف ہے اور ہم کو اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو گالیاں دی جاویں گی تو ہم کو کیسے غصہ نہ آوے گا اور کیوں ہم برا نہ مانیں گے اور کس طرح ایسے بے ہودہ سے دوستی رکھیں گے۔

ایک اور ایل ایل بی صاحب کا قصہ ہے (اتنا بڑا تو پاس کیا مگر بی ہی رہے) کہ انہوں نے مجمع میں کہا کہ رسالت صرف ایک مذہبی خیال ہے جو بضرورت مذہب مان لیا جاتا ہے ورنہ واقع میں اس کی کوئی اصل نہیں اور لطف یہ ہے کہ اس کے ساتھ یہ بھی پھر فرماتے ہیں کہ کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ آپ کی توہین کرتا ہوں ایسا نہیں بلکہ میں بڑی قدر کی نگاہ سے

دیکھتا ہوں محمد صاحب کو (صلی اللہ علیہ وسلم) کہ آپ بڑے رفارمر تھے اور آپ نے بڑی اصلاح کی لیکن رسالت صرف ایک مذہبی خیال ہے۔

کیوں صاحبو! کیا ان پر بھی کوئی فتویٰ لگانا چاہئے کیا یہ صریح کفر نہیں ہے افسوس یہ ہے کہ ان کے تحت میں ایک مسلمان دیندار لڑکی ہے اور جھڑا جھڑ بچے ہو رہے ہیں اگر لڑکی کے گھر والوں سے کہیں کہ یہ نکاح باقی نہیں اور لڑکی کو اس سے الگ کر لینا چاہئے تو ابھی ناصح پر تلوار کھینچ لی جاوے کہ ہم کو گالی دیتے ہیں صاحبو آج کل تو اس کی بھی ضرورت ہے اور میں بطور نصیحت اور خیر خواہی کہتا ہوں کہ جہاں دولہا کی صحت اور نسب اور حیثیت وغیرہ دیکھتے ہو اللہ کے واسطے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے اس کا اسلام بھی دیکھ لیا کرو وہ زمانہ گیا کہ دولہا کے صرف افعال دیکھے جاتے تھے کہ نماز اور پرہیزگار بھی ہے یا نہیں اب تو وہ زمانہ ہے کہ اگر یہی دیکھ لیا کرو تو بہت ہے کہ وہ مسلمان بھی ہے یا نہیں اور لڑکی مسلمان کے گھر جارہی ہے یا کافر کے گھر آج کل کے تعلیم یافتہ ایسے آزاد ہوئے ہیں کہ بہت سوں کا ایمان اور اسلام ہی باقی نہیں یقیناً کافر ہیں ان سے نکاح صحیح ہو ہی نہیں سکتا ان کو بیٹی دینے سے چکلے میں بٹھا دینا بہتر ہے کیوں نام نکاح کا کیا بعضوں کو تو اس قدر اجنبیت ہوتی ہے اسلام سے کہ نام بھی مسلمان کا سا پسند نہیں کرتے اور اس کو ذلت سمجھتے ہیں اہل یورپ کے سے نام رکھتے ہیں اور ایسوں کو لوگ قومی لیڈر کہتے ہیں اور ان کی تعریفیں کرتے ہیں کہ بڑے ہمدرد اور باحمیت ہیں مسلمانوں کے اوپر انہوں نے جان و مال فدا کر رکھا ہے آج کل کے لیڈروں میں حمیت تو ہے مگر صرف قومی حمیت ہے حمیت مذہبی نہیں یہ کوشش بے شک کرتے ہیں کہ ایک جماعت قائم رہے جن کو اہل اسلام کہا جاوے قطع نظر اس سے کہ وہ مسلمان ہوں بھی یا نہیں بلکہ یہ لوگ مذہبی حمیت کو جنون کہتے ہیں لیڈران قوم کے قصے آپ نے سن لئے اگر ایسے لوگ بھی مسلمان ہیں تو دنیا میں کوئی بھی کافر نہیں ان سے وہ کافر بدرجہا اچھے ہیں جو کھلم کھلا اپنے آپ کو دوسری قوم میں شمار کرتے ہیں ان سے اتنا ضرر مسلمانوں کو نہیں پہنچتا کیونکہ مسلمان جانتے ہیں کہ یہ ہمارے مخالف ہیں اور ان لوگوں کو اپنا موافق سمجھتے ہیں اور حقیقت میں ان کو اسلام سے کوئی علاقہ نہیں تو یہ دشمن بصورت دوست ہیں ان سے مسلمان ہر وقت دھوکہ کھا سکتے ہیں ان سے وہ نقصان پہنچتا ہے جیسے ایک رئیس کو ریچھ سے پہنچا۔

ہمدردانِ اسلام کی خدمتِ دین کی عجیب مثال

ایک رئیس نے ریچھ پالا تھا اور تعلیم اس کو یہ دی تھی کہ یہ سویا کرتے تھے اور وہ کھیاں اڑایا کرتا تھا ایک مرتبہ آقا صاحب لیٹے تھے اور بے خبر سو رہے تھے اور آغا صاحب محافظ تھے اور اپنے معمول کے موافق کھیاں اڑا رہے تھے بعض مکھی ضدن ہوتی ہے جہاں سے اڑایا جاوے وہیں لوٹ لوٹ کر آتی ہے ایک مکھی نے اسی طرح ان محافظ صاحب کو دق کیا یہ اڑا اڑا دیتے تھے اور وہ لوٹ لوٹ کر پھر منہ پر آ بیٹھتی تھی پس ان کو غصہ آ گیا جیسے ایک افیونی کا قصہ ہے کہ ان کی ناک پر ایک مکھی بار بار آ کر بیٹھتی تھی انہیں غصہ آ گیا اور لے کر استرہ اپنی ناک کو اڑا دیا کہ لے حرام زادی وہ اڈا ہی نہیں رہا اب بیٹھ کہاں بیٹھے گی حالانکہ جب تو ایک ہی مکھی تھی اب تو اس کی ساری برادری خون پر آوے گی غرض اس ریچھ کو غصہ آ گیا اور ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر لایا اور منتظر رہا کہ اب کے مکھی آوے تو اس کو پتھر سے ماروں گا چنانچہ وہ مکھی آقا صاحب کے منہ پر حسب دستور آ کر بیٹھی انہوں نے پوری قوت سے اور نشانہ صحیح کر کے اس کے پتھر مارا مکھی تو اڑ کر الگ گئی اور آقا صاحب کا سر پاش پاش ہو گیا صاحبو یہ ریچھ بھی خیر خواہ ہی تھا قرائن تو یہ اس بات کی شہادت میں موجود ہیں کہ اس نے اس فعل میں کوئی بدنیتی نہیں کی اپنے نزدیک تو آقا کی خیر خواہی اور خدمت ہی کی مگر ایسی خدمت سے خدا بچاوے اس کا تو کام ہی تمام ہو گیا ایسی خیر خواہی آج کل اسلام کی ہو رہی ہے کہ ہمدردانِ اسلام اور خیر خواہانِ قوم وہ تجویز کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو ترقی ہو خواہ اسلام کا گلا ہی گھٹ جاوے۔

لیڈرانِ قوم کی عقل کا حال

ایک اخبار میں چھپا تھا کہ اسلام ایسا مذہب ہے جس کی طرف بہت لوگوں کو رجحان ہے مگر اس میں نماز کی ایسی پخ لگا رکھی ہے کہ اس کی وجہ سے بہت لوگ اس میں آنے سے رکتے ہیں اگر علماء نماز کو اس میں سے نکال دیں تو ہزاروں آدمی مشرف باسلام ہو جاویں اور مسلمانوں کی جماعت میں معقول اضافہ ہو جاوے اور بہت زیادہ ترقی اسلام کی ہو کیوں صاحب بلا نماز کے وہ اسلام بھی ہو گا میں اس سے بھی سہل ترکیب بتاؤں وہ یہ ہے کہ سب قوموں کا نام مسلمان رکھ دیا جاوے خواہ وہ اس کو پسند کریں یا نہ کریں پس آج ہی کروڑوں کی تعداد کا اضافہ ہو جاوے گا دنیا میں کوئی قوم اور رہے گی ہی نہیں سب مسلمان ہی مسلمان ہوں گے۔

صاحبو! یہ لیڈران قوم اور عقلاء کی رائیں ہیں نہ معلوم عقل ان لوگوں کی کون لے گیا
ایک چیز کی ذاتیات اور ارکان موجود نہیں اور اس چیز کو موجود سمجھتے ہیں کسی چیز پر حیوان اور
ناطق تو صادق آتے نہیں اور انسان کو اس پر صادق سمجھتے ہیں یا کسی کا سرکاٹ کر الگ پھینک دیا
گیا پاؤں الگ پھینک دیئے گئے اور تمام جسم کی بوٹی بوٹی الگ پھینک دی گئی مگر اس کل کو
یہاں حی قائم سمجھ رہے ہیں نہ معلوم یہ کونسی معقول کا مسئلہ ہے کہ وجود عدم کے ساتھ جمع ہوسکتا
ہے دین کی ہر ہر چیز کو تو حذف کر ڈالا اور دین موجود اور مسلمان ہونے کے مدعی ہیں
مامورات میں سے کوئی چیز مامور بہ نہیں مانتے نماز کی ضرورت نہیں اس کی حقیقت جسمانی
ریاضت ہے وہ اور طریق سے کرلی جاتی ہے روزہ بہیمیت توڑنے کے لئے تھا وہ اس زمانے
میں رہی نہیں کیونکہ تعلیم کا زمانہ ہے اسی طرح حج زکوٰۃ وغیرہ سب کو کتر بیونت کرکے ندارد کر
دیا اور محرمات میں سے کسی چیز کو ممنوع نہیں سمجھتے سود کی حرمت اڑا ہی دی اس کا تو آج کل اتنا
زور شور ہے اور اس مسئلہ میں ایسی قابلیتیں دکھائی گئی ہیں کہ حلال ہی کرکے چھوڑا ہے غرض
اجزاء دین کو سب کو الگ کردیا ہے اور منافیات دین کو دین میں داخل کرلیا ہے اور خوش ہیں کہ
ہم دیندار اور پکے مسلمان ہیں یہ تو ایسا ہوا جیسے کوئی اپنے کنبہ والوں کو اور دوستوں کو تو اپنے گھر
میں سے نکال باہر کرے اور غیروں کو اور اپنے جانی دشمنوں کو گھر میں داخل کرلے اور دیکھ دیکھ
کر خوش ہو رہا ہو اور خوشی خوشی لوگوں کو دکھا رہا ہو کہ دیکھو ہمارا گھر کیسا آباد ہے ابھی تھوڑی دیر
میں معلوم ہوجاوے گا کہ کیسا آباد ہے جب کہ وہ تیری تکا بوٹی کریں گے۔

لیڈران قوم کی خیر خواہی اسلامی کی عجیب مثال

آج کل لیڈران قوم نے دین میں وہ تصرفات کیے ہیں اور ایسی خیر خواہی اس کے ساتھ
کی ہے جیسے کسی بوڑھیا نے ایک شاہی باز کے ساتھ کی تھی حکایت اس کی اس طرح ہے کہ ایک
شاہی باز اڑ کر ایک بڑھیا کے یہاں جا بیٹھا بڑھیا نے اس کو پکڑ لیا اور اس کی چونچ اور پنجوں کو
دیکھ کر بڑا رحم آیا دیکھا چونچ ٹیڑھی ہے ناخن کس قدر بڑھے ہوئے ہیں اور ٹیڑھے بھی ہیں اور
اس کو گود میں لے کر رونا شروع کیا کہ ہائے بچے تو کیسے زمین پر بیٹھتا ہوگا تیری انگلیاں ٹیڑھی
ہیں ناخن اتنے بڑھ گئے ہیں اور کھاتا کیسے ہوگا کیونکہ چونچ بھی ٹیڑھی ہے معلوم ہوتا ہے کہ تو
بے ماں باپ کا ہے کوئی تیری غور کرنے والا نہیں ہے جو ناخن کاٹتا اور چونچ کو درست کرتا ہے اور

رحم وشفقت نے ایسا زور کیا کہ قینچی لے کر اس کے ناخن سب کاٹ دیئے اور چونچ بھی تراش دی اپنے نزدیک تو بڑھیا نے اس کی بڑی خیر خواہی اور ہمدردی کی مگر خدا بچاوے ایسی ہمدردی سے کہ اس کو برباد ہی کر دیا نہ وہ شکار پکڑنے کے کام کا رہا اور نہ کھانے کے۔

یہی خیر خواہی اسلام کے ساتھ آج کل کے ہمدردان اسلام کرتے ہیں کہ یہ بھی فضول اور وہ بھی فضول نماز بھی زائد ہے روزہ بھی زائد ہے زکوٰۃ کی حاجت نہیں، حج بھی فضول ہے اور پھر مسلمان ہونے کے مدعی معلوم نہیں اسلام کس چیز کا نام ہے کوٹ کا نام ہے یا پتلون کا نام ہے جب اسلام کا ہر جز فضول ہے تو کل بھی فضول ہے اس کا نام ہی کیوں لگا رکھا ہے اور ہم تو جانیں تم بھی فضول ہو جو ایسی فضول باتیں کرتے ہو سچ یہی ہے کہ درحقیقت یہی لوگ فضول ہیں ایک پیسہ کا سنکھیا کھا کر مرجاتے تو دنیا ایسی ناپاک وجود سے پاک ہو جاتی۔

اصل عمل ظاہر ہے اور باطن اس کے تابع

غرض اس گروہ نے (یعنی امراء نے) عجیب گت بنائی ہے دین کی درحقیقت تو یہ دین سے بالکل الگ ہیں مگر نام نہاد کے لئے اور دل کو سمجھانے کے لئے دین کا ایک خلاصہ نکال لیا ہے اور اس کو دین کا لب لباب سمجھ کر خاموش ہیں کہ وہ ہمارے پاس موجود ہے لہٰذا ہم دیندار ہیں وہ خلاصہ تہذیب اخلاق ہے اس کو دین کا باطن کہتے ہیں اور خیال ہے کہ باطن ہی مقصود اعظم ہے ظاہر کی کیا ضرورت ہے انہوں نے اس طرح دین کا باطن نکالا اور درویشوں نے اور طرح نکالا تھا جس کو میں بیان کر چکا ہوں غرض ان دونوں جماعتوں نے ظاہر کی ضرورت نہیں رکھی پس یہ حدیث اس پر رد کر رہی ہے اور بتا رہی ہے کہ ظاہر بھی مقصود اعظم ہے کیونکہ حضور قلب کو شرط کیا دعاء کے لئے چنانچہ فرماتے ہیں ان اللّٰہ لا یستجیب الدعاء عن قلب لاہ یعنی اللہ تعالیٰ بلا حضور قلب کے دعاء کو قبول نہیں کرتا یہاں دعاء عمل ہے اور اس کے لئے شرط ٹھہرایا ہے حضور قلب کو اور ظاہر ہے (جیسا کہ میں اوپر بھی کہہ چکا ہوں) کہ شرط من حیث الشرط تابع ہوتی ہے پس معلوم ہوا کہ اصل عمل دعاء ہے اور حضور قلب اس کے تابع اس کو دوسرے لفظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اصل مقصود عمل ظاہری ہے اور باطن اس کے لئے شرط ور اس کا تابع ہے اس سے ان دونوں جماعتوں کے اس خیال پر رد ہو گیا کہ اصل مقصود باطن ہے یہ تحقیق تو نسبت بین الظاہر والباطن کی حدیث سے ہوئی۔

ایک فلسفیانہ راز

اب عقلی طور پر سمجھئے کہ اس میں ایک فلسفیانہ راز ہے وہ یہ کہ ہر چیز کی ترقی عمل سے ہوتی ہے یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اس کو آج کل کے لوگ تو تہہ دل سے مانتے ہیں کیونکہ ترقی کا مدار اسی پر ہے اور ترقی ہی ترقی کا آج کل ہر چہار طرف غل ہے سو سب کو معلوم ہے کہ خیال باطن ہے اور عمل ظاہر اور ترقی صرف خیال سے نہیں ہوتی چنانچہ لکچروں میں برابر کہا جاتا ہے کہ ترقی کے لئے ہاتھ پیر کو ہلاؤ صرف خیال سے کچھ نہ ہوگا عمل کر کے دکھاؤ عملی حالت کو بدلو تب تم پستی سے نکل کر ترقی کے میدان میں آؤ گے اس کی بناء اسی بات پر تو ہوئی کہ ترقی عمل سے ہوتی ہے صرف خیال اس کے لئے کافی نہیں گو یہ ضرور ہے کہ عمل اس خیال ہی سے پیدا ہوتا ہے اور خیال کا وجود عمل سے پہلے ضروری ہے کیونکہ اعضاء تابع ہوتے ہیں قلب کے جب قلب میں ایک بات ایک مرتبہ خیال میں پیدا ہوتی ہے تو اس کے بعد اس کا ظہور مرتبہ فعل میں اعضاء سے ہوتا ہے کہاں ہیں مدعیان سائنس اور مدعیان تعلیم ذرا اپنے سائنس ہی کے مسئلہ میں غور کریں کہ ہر فعل کے وجود کے لئے دونوں باتوں کی ضرورت ثابت ہوئی خیال کی بھی جس کو دوسرے لفظ میں باطن کہہ سکتے ہیں اور عمل کی بھی جس کو دوسرے لفظ میں ظاہر کہا جا سکتا ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ ان دونوں میں سے کار آمد اور اصل چیز جس سے ثمرہ مرتب ہوتا ہے وہ عمل ہے یعنی ظاہر نہ کہ خیال یعنی باطن گو بلا باطن کے وجود ظاہر کا نہ ہوسکتا ہو اس کی مثال پھل اور گٹھلی کی ہے مثلاً آم ہے کہ مقصود آم کا پھل ہے نہ گٹھلی گو وجود پھل کا موقوف ہے گٹھلی پر تو جس کو آم کھانا ہو اس کی گٹھلی سے بھی گریز نہیں ہوسکتا بلکہ اول کام گٹھلی ہی سے پڑے گا لیکن مقصود بالذات اور کام کی چیز پھل ہی ہے جیسا کہ سب جانتے ہیں۔

باطن کو مقصود اعظم کہنے والوں کی مثال

تو ان لوگوں کی مثال جو محض باطن کو مقصود اعظم قرار دیتے ہیں اور ظاہر کی ضرورت نہیں سمجھتے ایسی ہوگی کہ ایک شخص نے گٹھلیاں ٹوکرہ بھر جمع کر لی ہوں اور خوش ہو کہ ہمارے پاس آم ہیں اور ہم آم کھاتے ہیں اور جب کوئی اس پر اعتراض کرتا ہو تو جواب دیتا ہو کہ

میاں اصل چیز تو یہی ہے اس کے بغیر تو پھل کا وجود ہی نہیں ہو سکتا صاحبو یہ دلیل تو ٹھیک ہے مگر کیا کوئی ان کو اس دلیل کی رو سے آم کھانے والا کہہ سکتا ہے حاشا وکلا آم کی ان کو خوشبو بھی نہیں آئی اور بوجھوں مرے مفت تو اصل یہی ٹھہری کہ بڑا مقصود ظاہر ہی ہوا گو وہ وجود میں موقوف ہو باطن پر اور یہ بعینہ سائنس کا وہی مسئلہ ہے کہ ترقی کا مدار عمل پر ہے نرا خیال کافی نہیں گو عمل کا وجود خیال ہی سے ہوتا ہے ورنہ نرا خیال تو شیخ چلی نے بھی پکایا تھا اگر خیال سے ترقی ہو سکتی تو شیخ چلی کو بڑی ترقی ہوتی اور اگر یہی ترقی ہے تو ایسی ترقی تو بہت سہل ہے ہر شخص بے محنت ومشقت گھر میں بیٹھے حسب دلخواہ کر سکتا ہے۔

وہ قصہ یہ ہے کہ ایک شیخ چلی تھے انہوں نے ایک پیسہ کی مزدوری کی ایک گھڑا شیرہ کا سر پر اٹھا کر لے چلے راستہ میں سوچا کہ اب ہمیں ایک پیسہ ملے گا تو ہم اس کا ایک انڈا خریدیں گے اور اس کو کسی مرغی کے نیچے رکھ دیں گے تو بچہ نکل آوے گا اور وہ بچہ مادین ہوگا اور بڑا ہو کر پوری مرغی ہو جاوے گی اور انڈے دے گی تو ان انڈوں میں سے پھر بچے نکلوائیں گے اور اسی طرح اس کی نسل بڑھ جاوے گی تو سب کو بیچ کر ایک گائے خریدیں گے اور اس کی نسل بڑھاویں گے یہاں تک کہ ان کی تجارت کریں گے اور بہت روپیہ ہو جاوے گا پھر گھوڑوں کی تجارت شروع کریں گے اس میں بہت نفع ہوگا اور مال بڑھ جاوے گا پھر ہاتھیوں کی تجارت کریں گے اور اس سے روپیہ خاطر خواہ کما کر ایک بڑے رئیس بن جاویں گے اور وزیر زادی سے نکاح کا پیغام دیں گے اور نکاح ہو جاوے گا (جو کچھ منصوبے یہ گانٹھتے جاتے ہیں وہ ساتھ کے ساتھ پورے بھی ہوتے چلے جاتے ہیں) پھر ہمارے ایک بچہ پیدا ہوگا (پہلے تو مرغی کے بچے تھے اب مرغے کے ہوں گے) پھر وہ بچہ بڑا ہوگا اور ہمارے ساتھ پھرا کرے گا پھر وہ ہم سے پیسہ مانگے گا تو ہم کہیں گے ہشت۔

یہ جو کہا تو اس خیال میں سر بھی ہل گیا اور شیرے کا مٹکا گر گیا اور تمام شیرہ بہہ گیا مالک ناراض ہوا اور کہا ابے یہ کیا کیا ایک پیسہ کی تو مزدوری کی اور میرا کئی روپے کا نقصان کر دیا انہوں نے کہا جاؤ کام بھی کرو تمہیں ایک شیرہ کی پڑی ہے یہاں تمام مال و دولت اور کنبہ بیوی بچے سب غارت ہو گئے۔

صاحبو خیالی ترقی یہ ہے کہ اگر خیال ہی کافی ہے اور عمل کی ضرورت نہیں تو شیخ چلی نے بڑی ترقی کی ایسی ترقی آپ بھی کرلیا کیجئے اور بکھیڑے کاہے کے لئے پھیلا رکھے ہیں۔

خیالی ترقی کی مثال

اسی طرح ایک طالب علم کا قصہ ہے کہ ان کو شہر کی شہزادی سے نکاح کرنے کی ہوس تھی اور مدت تک اس فکر میں رہے کسی نے پوچھا کہ میاں کچھ کامیابی کی بھی امید ہے کہاں ہاں آدھا سامان تو ہو گیا ہے آدھا باقی ہے یعنی میں تو راضی ہوں وہ راضی نہیں خیال نکاح یہاں موجود ہے مگر کیا نکاح ہو گیا صاحبو نرا خیال تو ایسا ہے اگر نرے باطن کی کچھ وقعت ہے اور اس سے کام ہو سکتا ہے تو شیخ چلی کو ترقی ہو جاتی ایسے قصوں پر تو لوگ ہنستے ہیں اور سن کر تعجب کرتے ہیں کہ ایسا بھی بیوقوف کوئی ہوا ہوگا جس کی یہ حالت ہو اور خود اپنے اندر وہی حالت موجود ہے اس پر نہیں ہنستے اور نہیں تعجب کرتے بلکہ اس سے زیادہ خراب حالت ہے کیونکہ شیخ چلی کی تو یہ خیالی بندش سب دنیا کے بارہ میں تھی اور آپ کی آخرت کے بارہ میں ہے دنیا میں اگر کنبہ غارت ہو گیا تو کیا اور رہا تو کیا ایک دن سب دنیا ختم ہو جاوے گی مگر آخرت کبھی ختم نہ ہوگی اگر وہاں کا کام بگڑ گیا تو ہمیشہ ہمیشہ کی مصیبت ہوگی مگر اس کے بارہ میں کیسے بھولے بن گئے ہیں کہ شیخ چلی سے بھی بڑھ چڑھ کر خیالی بندشیں کر رکھی ہیں اور پھر دعوے رکھتے ہیں اہل عقل ہونے کا اور ریفارمر ہونے کا اور غلطی پر متنبہ کرنے والوں کو خشک مغز کہتے ہیں۔

اصل کار آمد کا عمل ہے

صاحبو نرے باطن کی یہ حقیقت ہے اسی کو کہا ہے۔

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال   صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

یعنی صرف رونے سے اگر وصال محبوب ہو جایا کرتا تو یہ تو بہت سہل تھا سو برس رو لیا کرتے مطلب یہ ہے کہ کوشش سے کام ہوتا ہے رونے سے کچھ نہیں ہوتا رونا خیال کے مرتبہ میں ہوتا اور کوشش عمل ہے۔

حاصل یہ کہ کار آمد عمل ہے نہ کہ خیال اور کہا گیا ہے (یہ حضرت علیؓ کی طرف منسوب ہے خدا جانے کہاں تک سچ ہے)۔

لو كان هذا العلم يدرك بالمنىٰ ما كان يبقى في البرية جاهل
فاجهد ولا تكسل ولا تك غافلاً فندامة العقبى لمن يتكاسل

یعنی علم وہ معرفت اگر صرف تمنا اور خیال سے حاصل ہو جایا کرتا تو دنیا میں کوئی بھی اس سے محروم نہ رہتا مگر ایسا نہیں ہے اس دھوکہ میں مت رہو اور کوشش کرو اور عمل کرو اور جو کوئی سستی کرتا ہے اس کو انجام کار پچھتانا پڑے گا صاحبو خوب سمجھ لیجئے کہ کوئی مقصود بلا مشقت اور بلا ہاتھ پیر ہلائے حاصل نہیں ہو سکتا دنیا کا نہ آخرت کا اس مشقت ہی کا نام عمل ہے اور اسی کا نام ظاہر ہے اور باطن نام صرف خیال کا ہے اگر ظاہر کو اڑا دیا تو رہا کیا صرف خیال جو کچھ بھی کارآمد نہیں جیسا کہ آپ کا سائنس بھی اس کو ثابت کرتا ہے اور آپ خود بھی مانتے ہیں کہ ترقی عمل سے ہوتی ہے نہ صرف ارادوں اور ڈھکوسلوں سے۔

اصلاح کی ضرورت پر نصوص موجود ہیں

پھر یہ بات کہاں تک صحیح ہے کہ نرا باطن کافی ہے اور ظاہر کی ضرورت نہیں یہ عقلی ثبوت بھی ہو گیا ظاہر کی ضرورت کا اور اس کے مقصود ہونے کا اور حدیث سے پہلے ثابت ہو چکا اور اس حدیث کے علاوہ دوسرے نصوص بھی بکثرت موجود ہیں جو اس بات میں بالکل صریح ہیں اور وہ نصوص اس قدر ہیں کہ دنیا بھی ان کو جانتی ہے اور ہمارے مخاطبین کو بھی معلوم ہے مگر انہوں نے ان میں ایک اور ترکیب چلی ہے وہ یہ کہ ان کے معنی بدلے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کے وہ معنی نہیں ہیں جو مولوی لوگوں نے سمجھ رکھے ہیں اور اپنے مذاق کے موافق کھینچ کھانچ کر معنی بیان کرتے ہیں اس وقت ان کی تفصیل کا موقع نہیں اجمالاً یہ کہنا کافی ہے کہ آیا معنی وہ صحیح ہوں گے جو لاکھوں اور کروڑوں مسلمانوں اور اہل علم نے سمجھے ہیں یا وہ جو کسی ایک دو نے اختراع کر لئے۔

اب یہ دیکھ لیجئے کہ جب سے شریعت مقدسہ آئی اس وقت سے ان نصوص کے معنے کیا سمجھے گئے اور تمام امت نے ظاہر کو ضروری سمجھا یا نہیں تمام کتابیں بھری پڑی ہیں اعمال کی ضرورت سے اور ایک ایک عمل کی کیفیت اور اس کے اجزاء ضروری اور غیر ضروری اور متممات و محسنات اور اس کے مفسدات و مکروہات سب تفصیل کے ساتھ مدون ہیں پھر اس بکھیڑے کی کیا ضرورت تھی اگر عمل کی ضرورت نہیں تھی کیا اس سب امت کی امت نے غلط معنے سمجھے ظاہر ہے کہ ایک کے سمجھے ہوئے معنے غلط ہو سکتے ہیں نہ کروڑوں کے سمجھے ہوئے خوب سمجھ لیجئے کہ یہ الحاد

ہے اور دہریت ہے اور زندقہ ہے شریعت کا انکار جو اس کا مرتکب ہے وہ بے شک باطل پر ہے
خواہ وہ اپنے زعم میں تعلیم یافتہ ہو اور دیندار ہو اور مقتداء ہو اور عقلمند ہو اور کچھ بھی ہو اور یہ اعمال کا
ترک تعطل ہے اور یہ نفس کا دھوکہ ہے اور انجام اس کا حسرت ہوگا جس کے اعمال صحیح نہیں وہ کسی
شمار میں بھی نہیں اور یقین کے ساتھ سمجھ لیجئے کہ نہ کفر کے ساتھ خدا تک رسائی ہوسکتی ہے نہ فسق
کے ساتھ خدا تک تو رسائی طاعت کے ساتھ ہوتی ہے اور طاعت نام ہے عمل کا جس میں باطن
کے ساتھ ظاہر بھی آ گیا جس میں عمل نہیں وہ خدا رسیدہ کبھی نہیں ہوسکتا اور میں تو زیادہ ترقی کر کے
کہتا ہوں کہ خدا تک رسائی دور ہے دنیا تک بھی رسائی کفر و فسق کے ساتھ نہیں ہوتی اور یہ بات گو
نئی سی معلوم ہوئی ہوگی اور اس پر یہ شبہ قلوب میں پیدا ہوا ہوگا کہ دنیا تو زیادہ تر کفار اور فساق و فجار
ہی کے ہاتھ میں ہے پھر یہ کہنا کیسے صحیح ہوگا کہ دنیا تک بھی رسائی بدوں طاعت کے نہیں ہوتی۔

ہر چیز کی صورت وحقیقت

اس کا جواب یہ ہے کہ ہر چیز کی ایک صورت ہوتی ہے اور ایک حقیقت جو کفار و فسق دنیا
میں عیش و آرام و تنعم میں دیکھے جاتے ہیں ان کو صرف صورت تنعم اور عیش کی حاصل ہے باقی
تنعم و عیش کی جو حقیقت ہے یعنی راحت و آرام اور چین اور اطمینان قلب اور سکون وہ ہرگز ان
کو حاصل نہیں مال و دولت اور مکان اور نوکر چاکر سب کچھ حاصل ہیں مگر غور کرنے کی بات یہ
ہے کہ یہ سب چیزیں آیا مقصود بالذات ہیں یا مقصود بالذات اور کوئی چیز ہے اور یہ سب
چیزیں اس کے ذرائع ہیں سو اگر آپ غور کریں گے تو یہی ثابت ہوگا کہ یہ سب سامان محض
ذرائع ہیں اور باقی مقصود بالذات اور ہی چیز ہے اور وہ چیز راحت اور سکون قلب ہے لیکن یہ
چیزیں چونکہ بنا بر عادت اکثر یہ اس کے ذرائع ہیں اس واسطے ان کو بھی ایک درجہ میں طلب کیا
جاتا ہے چنانچہ اگر کہیں عادت اکثر یہ کے خلاف ذریعہ اطمینان قلب بننے کی صفت ان میں نہ
رہے تو اس وقت ان کو کوئی بھی طلب نہیں کرتا مثلاً ایک بہت بڑا مالدار شخص ہے اور اس کے گھر
میں خزانہ لوٹنے کے لئے چور اور ڈاکو گھس آویں وراس کے قتل کے درپے ہو جاویں تو اس
وقت اس کی حالت یہ ہوگی کہ تمنا کرے گا کہ کاش میں مالدار نہ ہوتا کہ آج میری جان تو نہ
جاتی اور اس کی کھلی ہوئی دلیل یہ ہے کہ اگر چور اس بات پر راضی ہوں کہ ہم کو کل خزانہ دے
دیں تو ہم تیری جان چھوڑ دیں تو اس کو وہ بخوشی منظور کر لے گا دیکھئے اس وقت وہ روپیہ جس کو

تمام عمر بڑی کوشش سے جان کھپا کھپا کر حاصل کیا تھا مطلوب نہیں رہا اس سے صاف ثابت ہے کہ روپیہ مقصود بالذات نہ تھا بلکہ آرام وراحت کے لئے مطلوب تھا آج چونکہ وہ اس آرام وراحت کی ضد کا سبب بن گیا لہٰذا اس کے ساتھ معاملہ بھی بدل گیا بجائے اس کو سینت سینت کرر کھنے کے اپنے ہاتھوں نکال دیا گیا علیٰ ہذا اولاد مکان خدم حشم ان سب کی بھی یہی حالت ہے کہ یہ بھی اسی وقت تک مطلوب ہیں جب تک کہ اطمینان قلب کے ذریعے ہیں (یہ غلطی ہے اہل دنیا کی کہ اس میں امتیاز نہیں کرتے کہ یہ چیزیں بروقت مطلوب ہونے کے مطلوب بالذات ہیں یا دوسری چیز کی وجہ سے مطلوب ہیں) اور جب ان سے خالی ہو جاتے ہیں تو مطلوب نہیں رہتے دیکھا ہوگا کہ اپنی صلبی اولاد اگر کسی وجہ سے باپ کے خلاف ہو جاتی ہے تو خود باپ ہی ان کی محبت چھوڑ دیتا ہے بلکہ اپنی جان کی حفاظت کے لئے ان کی جان کا دشمن ہو جاتا ہے اور ایسے واقعات ہوئے ہیں کہ باپ نے ایسی صورتوں میں اولاد کو قتل کرا دیا یا خدم حشم جب مخالف ہو جاتے ہیں مثلاً بادشاہ سے فوج بگڑ جاتی ہے تو وہ بادشاہ ہی ان کو قتل کرا دیتا ہے اس صورت میں ان چیزوں کی مطلوبیت کہاں گئی معلوم ہوا کہ اصل مطلوب اور تھا اور یہ اس کے ذرائع ہونے کی وجہ سے مطلوب تھے جب تک یہ اس مطلوب کے ذریعے رہے اس وقت تک یہ بھی مطلوب تھے اور جب اس کے ذرائع نہ رہے ان سے کچھ تعلق نہ رہا اور وہ اصل مطلوب راحت قلب ہے جو تشویش کی ضد ہے پس ہر شخص ہر چیز کی طلب کے وقت صرف یہ چاہتا ہے کہ مجھے چین نصیب ہو اور تشویش نہ ہو تو جس چیز کو وہ اپنے نزدیک ذریعہ چین کا سمجھتا ہے اسی کو اختیار کرتا ہے اور اسی کا طالب ہوتا ہے کوئی مال کو چین کا ذریعہ سمجھتا ہے اس کا طالب ہے کوئی اولاد کو کوئی خدم حشم کو اسی طرح ان کا طالب ہوتا ہے اور مطلوب درحقیقت سب کا ایک ہے جس کا نام ہے راحت واطمینان۔

راحت کا نام ذریعہ صرف ذکر اللہ ہے

اب میں دعویٰ کرتا ہوں کہ کفار وفساق خواہ کیسے ہی تنعم میں ہوں مگر ان کو تنعم کی صرف صورت جو کہ راحت کے ذرائع میں سے ہے حاصل ہے اور حقیقت تنعم کی ہرگز حاصل نہیں بلکہ ان کا قلب کسی وقت تشویش سے خالی نہیں اور جس کو اطمینان قلب اور سکون کہتے ہیں اس سے وہ بہت دور ہیں میں قسم کھا کر دعویٰ کرتا ہوں کہ ان ذرائع سے حقیقی راحت کبھی

نصیب نہیں ہوتی بس راحت کا اگر کوئی ذریعہ ہے تو وہ صرف ذکر اللہ ہے اور بلا اس کے راحت کہیں بھی نصیب نہیں ہوتی۔

اس کا امتحان کہ ذکر اللہ ہی ذریعہ راحت ہے

اور یہ بات میں آپ کو زبردستی نہیں منواتا بلکہ میں ایک اس کا امتحان بتاتا ہوں اس کے بعد آپ کو کوئی رائے قائم کرنے کا اختیار ہوگا اور وہ امتحان بہت سہل ہے جو شخص چاہے کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک ایسا شخص تلاش کیجئے جو بڑا متنعم اور خوش عیش ہو اور ہر قسم کا سامان اس کو میسر ہو مال و دولت اولاد خدم حشم سب ہی کچھ ہو مگر اس کو خدا سے علاقہ نہ ہو میں دعویٰ کرتا ہوں کہ اگر غور و انصاف سے کام لیں گے اور اس کے اندرونی حالات کی تفتیش کریں گے تو بالضرور یہی ثابت ہوگا کہ اطمینان قلب اس کو میسر نہیں اور کسی نہ کسی پریشانی میں ضرور مبتلا ہے اور ایک وہ شخص تلاش کیجئے جو اہل اللہ میں سے ہو اور خدا سے علاقہ رکھتا ہو اور خوش عیش نہ ہو بلکہ مبتلائے مصیبت ہو پھر اس کے اندرونی حالات کی تفتیش کیجئے دلائل سے صاف معلوم ہو جائے گا کہ اس کے قلب کو اطمینان ہوگا خدا جانتا ہے کہ دونوں کی حالتوں میں موت و حیات اور ظلمت و نور کا سا فرق ثابت ہوگا اس وقت آپ کو تصدیق ہو جاوے گی اس آیت کی مَنْ عَمِلَ صَالِحاً مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً (جو شخص نیک عمل کرے مرد ہو یا عورت تو ہم اس کو پاکیزہ زندگی عطا کریں گے)

حیات طیبہ کی حقیقت

حیات طیبہ یہ ہے جس میں مال و دولت اور تمام دنیا کا مقصود اصلی حاصل ہے یعنی راحت و اطمینان اور وہ کیا زندگی ہے جس میں ظاہر اذرائع سب جمع ہیں مگر مقصود ندارد اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے دو شخص سفر میں ہیں اور ایک ایسے جنگل میں ہیں جہاں کھانے پینے کو کچھ نہیں ملتا ہے اور فرض کیجئے کہ ایک کے پاس ایک اشرفی ہے یا بہت سی اشرفیاں ہیں یعنی مالدار ہے اور دوسرے کے پاس مال نہیں ہے مگر ناشتہ ساتھ ہے جس وقت کھانے کا وقت آیا تو یہ اپنا کھانا لے کر بیٹھ گئے اور خوب فراغت سے کھا لیا اور وہ اشرفی لئے پھرتے ہیں اور کھانے کو کچھ نہیں ملتا تو وہ اشرفی کچھ کام نہیں آ سکتی اور اس مالداری سے وہ غربت اچھی ہے۔

حاصل اس مثال کا یہ ہے کہ ذریعہ فی نفسہٖ مقصود نہیں ہوتا جب وہ ذریعہ نہ رہے تو اس کا ہونا نہ ہونا دونوں برابر ہیں مقصود حاصل ہونا چاہئے جس طریق سے بھی حاصل ہو اور جس کو صرف مقصود حاصل ہو وہ اس سے بدرجہا اچھا ہے جس کو صرف ذرائع حاصل ہوں سو اہل اللہ کو تو زندگی کا مقصود حاصل ہے یعنی راحت واطمینان گو ان کے پاس مال ودولت نہ ہو تو ان کی زندگی ان سے اچھی ہے جن کو کہنے کے لئے سب کچھ حاصل ہے مگر مقصود حاصل نہیں یہ بہت ہی موٹی بات ہے یہ ایسی ترکیب امتحان کی میں نے بتادی ہے جس کو ہر شخص کر سکتا ہے پس اب میرے قول کی تصدیق ہوگئی کہ بدوں طاقت کے دنیا تک بھی رسائی نہیں ہوسکتی اور دنیا کی زندگی بھی اگر پُر لطف ہوسکتی ہے تو خدا کا نام لینے ہی سے اور اطاعت کرنے ہی سے ہوسکتی ہے۔

اہل اللہ کے پُرجوش الفاظ

اور اگر امتحان کی فرصت نہ ہو جن کی زندگی پُر لطف ہوتی ہے ان کے اقوال ہی دیکھ لو جو کہ اپنے اثر سے اس دعوے کا یقین دلا رہے ہیں ایک صاحب کہتے ہیں۔

زیر بار اندر درختاں کہ ثمر ہا دارند   اے خوشا سرو کہ از غم آزاد آمد

(پھل دار درخت زیر بار ہیں سرو بہت اچھا ہے ہر غم سے آزاد ہے)

تعلق والی زندگی اور بے تعلق زندگی کا فرق بتاتے ہیں کہ جو تعلقات میں مبتلا ہیں وہ ہر وقت ایک بار میں دبے ہوئے ہیں یہ اہل دنیا کی زندگی ہے اور جو بے تعلق ہیں وہ آزاد ہیں کوئی بار ان کے اوپر نہیں یہ اہل اللہ کی زندگی ہے اس کی قدر اہل دنیا کو معلوم نہیں ہے ورنہ سب چھوڑ چھاڑ کر یہ حالت بنا لیتے۔

لنگکے زیرو لنگکے بالا   نے غم دزد نے غم کالا

(ایک لنگی نیچے ایک لنگی اوپر نہ چور کا کھٹکا نہ مال ومتاع کا غم)

ایک اہل اللہ بے حس یا اہل تصنع ہیں

چنانچہ ایسا تو بارہا ہوا ہے کہ ایک شخص عیش وآرام میں تھا اور صاحب ثروت بلکہ صاحب سلطنت تھا مگر کس طرح اس کی نظر اہل اللہ کی زندگی پر پڑ گئی بس وہ سلطنت اور دولت وثروت سب چھوڑ کر ان ہی جیسا بن گیا ایسے واقعات بکثرت ہوئے ہیں مگر ایسا واقعہ

ایک بھی نکلنا مشکل ہے کہ ایک لنگی باندھنے والا اور فاقوں سے مرنے والا اور مصیبتیں اٹھانے والا باخدا اس زندگی کو چھوڑ کر اہلِ دنیا کی طرف آیا ہو آخر کچھ تو بات ہے جس کے سبب ادھر سے تو ادھر جاتے ہیں اور ادھر سے ادھر نہیں آتے ایک صاحب فرماتے ہیں۔

ما ہیچ نداریم و غم ہیچ نداریم   دستار نداریم و غم پیچ نداریم

(ہم کچھ نہیں رکھتے اور کچھ نہ ہونے کا غم ہم کو نہیں ہے دستار ہمارے پاس نہیں ہے اور پیچ کا بھی ہم کو غم نہیں ہے)

یہ اپنی ناداری پر فخر کرتے ہیں جس سے لوگ پناہ مانگتے ہیں آخر کیا بات ہے کیا یہ لوگ بے حس ہیں کہ ان کو تکلیف معلوم ہی نہیں ہوتی مگر ان کے دوسرے حالات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ بے حس تو نہیں ہیں بلکہ ان کا حس اہل دنیا کے حس سے بہت زیادہ ہوتا ہے لہٰذا یہ شق تو باطل ہے اب ایک شق اور باقی رہی وہ یہ کہ اہل تصنع ہیں کہ فاقوں سے تو مرجاتے ہیں مگر اکھڑ پنا وہی ہے جیسے بعض فقیر ہوتے ہیں کہ پیٹ میں آگ لگی ہوئی ہے اور بھوک کے مارے آنکھیں بند ہوئی جاتی ہیں مگر سیدھے منہ کسی سے بات نہیں کرتے اور گالیاں دیتے ہیں اور اس سے غرض یہ ہوتی ہے کہ اور اعتقاد لوگوں کا بڑھے اور دکانداری کو ترقی ہو تو شاید یہ لوگ بھی ایسے ہی ہوں اور دکانداری بڑھانے کے لئے یہ اینٹھ مروڑ دکھائی ہو۔

اہل اللہ میں تصنع نہیں ہوتا

سو یہ شق بھی غلط ہے اس واسطے کہ ان لوگوں کے دوسرے حالات صاف شہادت دے رہے ہیں کہ تصنع کی ان لوگوں میں بو باس تک بھی نہیں ہے انہوں نے تو اپنے آپ کو اتنا مٹایا ہے کہ عزت اور ذلت میں ان کی نظر میں کچھ فرق ہی نہیں رہا بلکہ عزت کو چھوڑ چھوڑ کر ذلت اختیار کی ہے پھر تصنع سے ان کو کیا علاقہ کیونکہ تصنع تو عزت حاصل کرنے کے لئے کیا جاتا ہے علاوہ بریں تصنع چھپا نہیں رہتا یہ فقیر جو گالیاں دیتے پھرتے ہیں اور مست بنتے ہیں اول وہلہ میں کچھ جہلاء ان کے معتقد ہوجاتے ہیں لیکن بہت ہی تھوڑے زمانہ میں حقیقت حال کھل جاتی ہے اور وہی لوگ سب سے زیادہ ان کو برا کہتے ہیں اور ان لوگوں کی حالت اس کے برعکس ہے کہ جوں جوں زمانہ گذرتا جاتا ہے ان کے الفاظ کا اثر اور گہرا ہوتا جاتا ہے اور ان

کے الفاظ سے سراسر صدق ٹپکتا ہے اوران کے مضامین دلوں پر قبضہ کئے لیتے ہیں بات یہی ہے کہ یہ الفاظ تصنع سے نہیں نکلتے بلکہ ان کی واقعی حالت یہی ہے کہ کسی سے ان کو تعلق نہیں رہا سوائے ایک ذات کے کہ اس کے عشق میں محو ہیں جس کی یہ شان ہے۔

ہر کرا جامہ زعشقے چاک شد　　　اوز حرص و عیب کلی پاک شد

شاد باش اے عشق خوش سودائی ما　　　اے طبیب جملہ علتہائے ما

اے دوائے نخوت ناموس ما　　　اے تو افلاطون و جالینوس ما

(یعنی جس کو محبوب حقیقی کا عشق ہو جائے وہ حرص اور تمام نقائص اور اخلاق ذمیمہ سے پاک ہو جاتا ہے، اے عشق تو ایسا ہے کہ تیری بدولت خیالات درست ہو جاتے ہیں اور تجھ سے سب امراض کا علاج ہو جاتا ہے، اے عشق تو ایسا ہے کہ تجھ سے نخوت و ناموس کا دفعیہ ہو جاتا ہے تو ہمارے لئے افلاطون اور جالینوس ہے)

یہ تو گذشتہ ان لوگوں کے حالات ہیں جن کو پر لطف زندگی میسر ہوئی ہے اور جس کا جی چاہے امتحان بھی کر لے رہ گئے اہل دنیا سو ان کو جو کچھ عیش و آرام میسر ہے وہ صرف صوری اور ظاہری ہے ان دونوں میں ایسا فرق ہے جیسے اصلی قدرتی پھول میں اور کاغذ کے پھول میں گو کہ کیسی ہی صناعی سے کام لیا گیا ہو مگر کاغذ کا پھول اصلی کے برابر نہیں ہو سکتا گو ایک وقت اس میں آب و تاب اور رنگ اصلی سے بھی زیادہ نظر آتا ہے جس سے اوپری نظر سے دیکھنے والا ممکن ہے کہ ایک دفعہ اس کو ترجیح دے دے لیکن جب غور سے دیکھے گا تو معلوم ہوگا کہ وہ پھول ہی نہیں ہے وہ تو صرف نقل ہے پھول کی حقیقت پھول کی اس میں موجود نہیں اور اس وجہ سے اگر یہ بھی کہا جاوے کہ وہ پھول نہیں ہے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔

اہل اللہ ہی کی زندگی پُرلطف ہوتی ہے

علیٰ ہذا جب کہ جو حقیقت ہے عیش و آرام کی وہ اہل اللہ ہی کی زندگی میں ہے تو اسی کو پُرلطف زندگی کہہ سکتے ہیں اور اہل دنیا کی زندگی میں اس کا نشان نہیں اس واسطے باوجود صورت عیش و آرام کے موجود ہونے کے اگر یہ کہا جاوے کہ وہ عیش و آرام ہی نہیں ہے بلکہ یوں بھی کہا جاوے کہ وہ زندگی ہی نہیں ہے تو کچھ بے جا نہیں۔

اب آپ کی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ میں یہ بات آپ کو زبردستی نہیں منواتا کہ آرام اور لطف کی زندگی اہل اللہ ہی کی ہے بلکہ دلیل سے اور شواہد سے میں اس کا ثبوت بھی رکھتا ہوں اب تو اس بات میں کچھ استبعاد نہ رہا ہوگا کہ بدوں طاعت کے دنیا تک بھی رسائی نہیں ہوسکتی اور بدوں طاعت کے دنیا کی بھی حلاوت میسر نہیں ہوسکتی اگر تم کو دنیا ہی چاہیے تب بھی اللہ یہ کے ہوجاؤ دنیا کا چین بھی جب ہی میسر ہوگا۔

اہل اللہ کی زندگی پُر لطف ہونے کا راز

اور اس میں ایک راز ہے وہ یہ ہے کہ راحت کی کنجیاں حق تعالیٰ کے پاس ہیں یہ ایسی موٹی بات ہے کہ جو خدا کا قائل ہے وہ اس سے انکار کر ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ ہر چیز کا مالک خدا تعالیٰ کو مانے گا اور کنجی والے سے قفل کے اندر کی چیز لینے کا طریقہ عقلاً یہی ہے کہ اس کو راضی کیا جاوے اگر کوئی کہے کہ کبھی کنجی چھین کر بھی تو اندر کی چیز لی جاسکتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جب ہوسکتا ہے جب کہ کنجی والا اس سے کمزور ہو اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کسی سے کمزور نہیں تو حق تعالیٰ سے اگر کنجی کے اندر کی چیز مل سکتی ہے تو رضا ہی سے مل سکتی ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی راحت کا طالب ہو اور وہ خدا کو بلا راضی کیے راحت کو حاصل کر لے یہ الٹی چال سائنس کے بھی خلاف ہے اور عقل کے بھی خلاف کہاں گئی عقل جب طاعت ہی سعادات دنیویہ واخرویہ کی شرط ٹھہری اور اطاعت نام ہے عمل کا جس کا بڑا حصہ اعمال ظاہری ہیں تو ظاہر کا ضروری ہونا صاف واضح ہوگیا اور اس باب میں نصوص اس قدر ہیں کہ ان کا احصاء نہیں ہوسکتا پس نصوص کا اگر انکار ہے تو کفر صریح ہے اور اگر تاویل ہے تو بلا عمل کے کوئی عقلمند بنتا ہو یا تعلیم یافتہ یا دیندار یا مقتدا بنتا ہو کسی شمار میں بھی نہیں اور وہ غلطی میں مبتلا ہے اور نفس نے اس کو دھوکہ میں ڈال رکھا ہے ان نصوص میں ایسی من گھڑت تاویلیں کرنا بمقابلہ تمام اُمت سلف اور خلف کے غیر مقبول اور الحاد اور زندقہ ہے غرض نصوص سے بھی ظاہر کی ضرورت ثابت ہے ادھر سائنس سے بھی اوپر ثابت ہو چکا کہ نرے خیالات کسی کام کے لیے کافی نہیں بلکہ ان خیالات کو درجۂ عمل میں آنے کی ضرورت ہے اور بلا اس کے کوئی ترقی نہیں ہوسکتی تو دین کے لیے نرے باطن کی ضرورت کا قائل ہونا کیسے صحیح ہوگا اور ظاہر کیسے اڑ جاوے گا مدعیان تعلیم ذرا غور کریں۔

ظاہر کی ضرورت کی ایک زبردست مثال

میں ظاہر کی ضرورت کی ایک ایسی مثال دیتا ہوں جس سے قلم ٹوٹ جاویں گے معترضین کے وہ مثال یہ ہے کہ ایک خوشنویس سے کسی طالب نے کہا کہ جیم لکھنا بتادو اب وہ جیم لکھے گا اور اس کے باریک اور موٹے ہونے کا موقع محل اور اجزاء کا تناسب اور پیمائش سب کچھ بتادے گا اور خوب سمجھادے گا اور اپنے قلم سے لکھ کر بھی دکھادے گا اور شاگرد کے خیال میں خوب اس کا نقشہ جمادے گا یہ مرتبہ خیال کا ہے اگر یہ خوشنویس بننے کے لئے کافی ہے تو مہربانی کر کے جیم جیسا اس نے بتایا ہے لکھ تو دیجئے مگر دعویٰ کیا جاتا ہے کہ کبھی اس پر قدرت نہ ہوگی اور کوئی صورت اس قدرت حاصل کرنے کی سوائے اس کے نہیں ہے کہ مدتوں مشق کرو اور لاکھ دو لاکھ جیم لکھو کاغذ پر اور قلم گھٹے کے گٹھے خراب کرو اور استاد کی جوتیاں اٹھاؤ خیال میں تو نقشہ اس کا اول دن جم گیا مگر پھر بھی مدتوں یہ قصہ رہے گا کہ جب بھی اس خیال کو فعل میں لاکر جیم بناؤ گے تو استاد کہے گا غلط ہے یہ ویسا نہیں ہوا جیسا بتایا تھا۔

پس ثابت ہوا کہ صرف خیال تو کیا کافی ہوتا دو چار دفعہ بلکہ دس بیس دفعہ بالکل سو دو سو دفعہ عمل بھی کافی نہیں ہوتا کسی کمال کے حاصل کرنے کے لئے بات یہی ہے کہ کوئی کمال بلا مشقت حاصل نہیں ہوسکتا۔

کہاں ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ باطنی اصلاح ہوسکتی ہے بلا اعمال ظاہرہ کے صاحبو! بالکلیہ عمل نہ ہونے کی صورت میں کیا ہوتی ایک دو دفعہ بلکہ بمقتضائے مثال مذکور سو پچاس دفعہ میں بھی نہیں ہوسکتی ہے مدتوں محنت کیجئے تب شاید کچھ ہو جاوے مثلاً رذیلہ غضب نفس میں ہے اور کسی کے نفس میں بہت زیادہ ہے تو حیرت کی بات ہے کہ وہ صرف اس خیال پر اکتفاء کرلے کہ یہ بری چیز ہے اور سمجھ لے کہ بس اس کی اصلاح کے لئے یہ خیال ہی کافی ہے یہ ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی جیم کی صورت دیکھ کر سمجھ لے کہ اس کا لکھنا ہم کو آ گیا جب لکھنے بیٹھے گا تو معلوم ہوگا کیسا آ گیا ہے ایسے ہی جس وقت موقع پر اس رذیلہ کا جوش ہوگا اور غصہ آوے گا تب دیکھیں گے ان کی یہ خیالی اصلاح کہاں تک کارآمد ہوگی صاحبو مرۃ بعد مرۃ (بہت مرتبہ) مشق کرنے سے اور استاد سے اصلاح لینے سے بھی غصہ

قابو میں آجاوے تو غنیمت سمجھے معلوم نہیں عقل کو لوگوں نے کتنی دور چھوڑا ہے کہ ایسی موٹی باتیں بھی سمجھ میں نہیں آتیں اور اچھے اچھے تعلیم یافتہ اور عقلاء اس کے قائل ہو جاتے ہیں کہ باطن کی اصلاح بلا اعمال ظاہرہ کے صرف خیال سے ہو سکتی ہے یہاں ایک اور ضروری بات بھی سننے کے قابل ہے وہ یہ کہ اس مضمون کو صرف شخصی ہی اصلاح کے متعلق نہ سمجھے بلکہ جن جن لوگوں پر کسی کا اثر ہے اس کے ذمہ ان سب کی بھی اصلاح ہے بعض لوگ محض اپنی حالت درست کر کے دوسروں سے بے فکر ہو جاتے ہیں غرض اپنی نگرانی کے ساتھ دوسرے متعلقین کی بھی نگرانی رکھنا چاہئے اور نگرانی سے مطلب میرا یہ نہیں ہے کہ کوئی محکمہ احتساب کا قائم ہو کیونکہ یہ کام سلطنت کا ہے اور سلطنت آزاد ہے تو احتساب عام تو کوئی کر نہیں سکتا بلکہ نگرانی کی صورت یہ ہے کہ اس طرح امر بالمعروف کریں کہ جو جس کے زیر اثر ہو وہ اس کو تعلیم کرے اور اس کی اصلاح کی کوشش کرے اور تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ صرف اصلاح قولی کافی نہیں اس لئے اصلاح کی پہلی سیڑھی یہ ہے کہ خود عمل کریں کیونکہ فعل کا اثر زیادہ ہوتا ہے قول سے اور اگر امر بالمعروف کرنے والا خود منکرات میں مبتلا ہو تو اس کے کہنے کا مطلق اثر نہیں ہوتا بلکہ وہ دل کھول کر قوت سے امر بالمعروف بھی نہیں کر سکتا اس کو جرأت ہی نہیں ہو سکتی کیونکہ ہر شخص اس کا منہ بند کرنے کو تیار ہوگا کہ خود کرتے نہیں دوسروں کو تعلیم کرتے پھرتے ہیں۔

امر بالمعروف کا مؤثر طریقہ

صحیح اور مؤثر طریقہ امر بالمعروف کا یہی ہے کہ آدمی اول خود عامل ہو خصوصاً اگر ذی اثر اشخاص خود عامل ہوں تو ان کا فعل ہی امر کا کام دیتا ہے اور عوام کو خواہ مخواہ عمل کی طرف رغبت ہوتی ہے پھر اس کے ساتھ اگر امر بالمعروف بھی ہو تو کیا کہنا ہے سو زیادہ تر بار اصلاح کا ذی اثر اشخاص پر ہے ان کو اس کا خاص اہتمام چاہئے کہ خود بھی عمل کریں اور اپنے ذی اثر لوگوں کو عمل پر آمادہ کریں اور اسی طرح سے ساری قوم کی پھر قومی ترقی سے مذہبی ترقی ہو سکتی ہے۔لیکن آج کل خود ان ذی اثر اصحاب کی حالت یہ ہے کہ دوسروں کو تو عامل کیا بنائیں گے خود ہی عامل نہیں بنتے بلکہ عمل کی ضرورت ہی کے قائل نہیں اور انہی

میں سے بعض نے یہ بہانہ نکالا ہے کہ جو کچھ ہے باطن ہے اور ہم کو وہ حاصل ہے اور اس دعوے کا بطلان اس قدر ظاہر ہے کہ محتاج بیان نہیں ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص علم تاریخ میں مہارت پیدا کرنا چاہے تو اس کے لئے بھی بار بار مطالعہ کی اور زبان سے رٹنے کی ضرورت ہے اور یہ ظاہر کا مرتبہ ہے جس پر باطن یعنی تاریخ کا علم موقوف ہے جو لوگ باطن باطن پکارتے ہیں وہ تاریخ ہی کو بے رٹے حاصل کر کے دکھا دیں اور مجھے تو سخت حیرت ہے کہ باطن بلا ظاہر کے انہوں نے معنی کیا لئے ہیں۔

ظاہر ہمیشہ تابع باطن کے ہوتا ہے

اجی اصلاح باطن کے معنی تو یہی ہیں کہ ہمارے باطن میں جمیع اخلاق فاضلہ پیدا ہو گئے ہیں تو خوب سمجھ لو کہ ظاہر ہمیشہ تابع باطن کے ہوتا ہے مثلاً قلب میں اگر غصہ ہے تو ضرور ظاہر پر اس کے آثار نمایاں ہوتے ہیں اگر خوشی ہے اس کے آثار ظاہر ہوتے ہیں جب یہ بات ہے تو باطن میں جو ملکات فاضلہ ہیں جب اس کے آثار جوارح پر ظاہر نہ ہوئے تو اس سے تو معلوم ہوگا کہ باطن خالی ہے ایک محبت ہی ہے سو اگر باطن میں محبت حق تعالیٰ کی ہوگی تو زبان سے بلا خدا کا نام لئے چین کیسے آوے گا محبت قلبی تو وہ چیز ہے کہ وہ بغیر اعضاء سے ٹپکے رہ ہی نہیں سکتی اور ایک عضو سے نہیں بلکہ از سرتا پا ہر ہر عضو سے ظاہر ہونے لگتی ہے اور یہ بہت ہی موٹی بات ہے اس واسطے کہ قلب سب سے افضل اور اشرف ہے یہ متبوع ہے اور تمام اعضاء تابع ہیں پس جو کیفیت قلب میں ہو اس کا اثر بال بال میں آنا چاہئے دیکھئے بخار اس حرارت کا نام ہے جو قلب میں پیدا ہوتی ہے اس کا اثر بال بال میں ہوتا ہے اور یہ نہیں ہوسکتا کہ صرف قلب میں ہو یا بعض اعضاء تک محدود رہے۔

محبت کی خاصیت

اسی طرح یہ ممکن نہیں کہ قلب میں محبت کی آگ ہو اور تمام بدن اس سے بھڑک نہ اٹھے یہ محبت کیسی ہے کہ دل میں ہے اور سجدہ میں نہیں جھکتا پیر مسجد کی طرف نہیں چلتے زبان پر نام خدا کا نہیں آتا حضرت محبت کی تو یہ خاصیت ہے کہ اعضاء خواہ مخواہ اسی کے آثار میں مشغول ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ ابونواس شاعر کہتا ہے۔

الا فاسقنی خمرا وقل لی ھی الخمر　　　ولا تسقنی سرا متی امکن الجھر

(مجھے شراب محبت پلا اور مجھ سے کہو کہ یہ شراب ہے اور مجھے پوشیدہ مت پلا جب تک ظاہر کرنا ممکن ہو)

اور یہ حالت ہوتی ہے کہ باوجودیکہ محبت سامنے ہے مگر اس سے عاشق کو کفایت نہیں ہوتی اور یہ چاہتا ہے کہ کان میں بھی اس کا نام پڑے اور آنکھیں بھی اس کو دیکھیں آنکھیں دیدار سے لذت پارہی ہیں تو کان اس کے نام سننے سے حظ حاصل کر رہا ہے۔

آثار محبت

اس حالت کا اندازہ جب ہوسکتا ہے کہ خدانخواستہ کسی سے آپ کو تعشق ہو جاوے (اور اس جلسہ میں بھی ایسے لوگ ہوں گے جو اس بلا میں گرفتار ہوں گے یا کبھی گرفتار ہوئے ہوں گے) عاشق مزاج لوگ جانتے ہیں کہ محبوب کی نری محبت پر عاشق سے بس نہیں ہوتی بلکہ اس کا نام بھی لیتا ہے اور آتش شوق کی بھڑک سے نام کے ساتھ ہائے ستمگر اور ہائے ظالم بھی لگاتا ہے یہ القاب آگ کو اور تیز کرتے ہیں اور اس آگ سے اس کی لذت اور بڑھتی جاتی ہے۔

آثار عشق حقیقی

جب دنیا کے ایک ادنیٰ محبوب کے ساتھ تعلق کا یہ اثر ہوتا ہے تو عشق حقیقی کی کیا حالت ہوگی کہ اس محبت کے ہوتے ہوئے کیسے بے عبادت ظاہری کے رہا جاوے گا ہم دیکھتے ہیں کہ عاشق کی یہ حالت ہوتی ہے کہ محبوب سامنے بھی بیٹھا ہے تب بھی کہتا ہے کہ ہائے فلانے اوئے فلانے اس کا نام لے لے کر خطاب کرتا ہے اور پکارتا ہے گویا وہ غائب ہے وجہ کیا ہے کہ اس کے نام لینے سے زبان لذت پاتی ہے اور سننے سے کان لذت پاتے ہیں اور وصل میسر ہے مگر کہتا ہے کیا کروں دل میں بٹھالوں آنکھوں میں جگہ دوں کبھی ہاتھ چومتا ہے کبھی اس کا منہ دیکھتا ہے اس سب کی بنا اس پر ہے کہ کوئی مرتبہ وصل کا ایسا نہیں جس پر عاشق کو سیری ہو جاوے سب طرح وصل میسر ہے اور اس سے آگے کوئی مرتبہ اس کے ذہن میں بھی نہیں مگر طبیعت کو سیری نہیں اور اس سے زیادہ قرب کو چاہتی ہے اسی حیرانی میں ایسے کلمات

کہتا ہے عشق تو یہ ہے اور نہ معلوم یہ عشق کیسا ہے جس میں صرف خیال ہی پر سیری ہو گئی ہے اور جو مرتبہ قرب سب سے ادنیٰ ہے یعنی ذکر لسانی اس کی طرف بھی طبیعت نہیں چلتی کچھ صرف دھوکہ ہے جب کہ ایک محبوب مجازی کے عشق کی یہ حالت ہے تو عشق حقیقی کی تو کیا حالت ہو اس سے زیادہ ہی ہونا چاہئے۔

عشق مولےٰ کے کم از لیلیٰ بود　　　　گوئے گشتن بہر او اولی بود

(مولائے حقیقی کا عشق لیلیٰ کے عشق سے کیا کم ہو اس کیلئے کوچہ گردی کرنا اولیٰ ہے) مجنوں کی حکایت آپ نے سنی ہوگی پھر سنئے۔

دید مجنوں را یکے صحرا نورد　　　　در بیابان غمش بنشستہ فرد

مجنوں کو کسی نے ایک جنگل بیابان میں دیکھا کہ اکیلا بیٹھا ہے اور یہ مشغلہ ہے۔

ریگ کاغذ بود و انگشتاں قلم　　　　می نمودے بہر کس نامہ رقم

انگلیوں سے ریتے پر کچھ لکھ رہا ہے کسی نے پوچھا یہ کیا کر رہے ہو۔

گفت اے مجنون شیدا چیست ایں　　　　می نویسی نامہ بہر کیست ایں

یہ کس کو خط لکھ رہے ہو؟ جواب دیا۔

گفت مشق نام لیلیٰ می کنم　　　　خاطر خود را تسلّی می دہم

لیلےٰ لیلےٰ لکھ رہا ہوں اور دل ٹھنڈا کر رہا ہوں۔

دیکھئے مجنوں کو صرف لیلیٰ کی یاد کافی نہ ہوئی بلکہ زبانی ذکر بھی کافی نہ ہوا بلکہ جوش عشق نے اس پر مجبور کیا کہ ہاتھ سے بھی لیلیٰ لیلیٰ لکھے ہاتھ کیوں خالی رہیں شاید کوئی خشک مغز کہے کہ اس سے کیا فائدہ تھا کہ لیلیٰ لیلیٰ ریتے پر لکھ رہے ہیں یہ سوائے خبط اور تضییع وقت کے اور کیا ہے اس سے کچھ وصل میں بھی تو مدد نہیں ملتی پھر کیا فائدہ تم ویسے ہی ہو جاؤ تو معلوم ہو کہ اس سے کیا فائدہ ہے فائدہ تو ہے ہاں قاعدہ نہیں عاشق کے افعال قاعدہ اور ضابطہ کے نہیں ہوتے اور ان پر اعتراض جب ہی تک کئے جاتے ہیں جب تک کہ آپ عاشق نہیں ہیں عاشق ہو جایئے تو پھر خود آپ کے افعال بھی ایسے ہی ہو جاویں گے۔

پرسید یکے کہ عاشقی چیست　　　　گفتم کہ چوں ما شوی بدانی

(ایک شخص نے دریافت کیا کہ عاشقی کیا ہے میں نے جواب دیا کہ جب ہماری طرح ہو جاؤ گے تو تم کو اس کی حقیقت معلوم ہو جائے گی)

دعویٰ محبت

عشق ایسی ہی چیز ہے جس سے کوئی قاعدہ قانون باقی نہیں رہتا بلکہ کوئی چیز بھی باقی نہیں رہتی سوائے محبوب کے خلاصہ یہ کہ لیلےٰ کے عشق میں جب یہ حالت تھی تو حق تعالیٰ کے عشق میں کیا حالت ہونا چاہئے یہ کیسی خدا کی محبت ہے جس میں زبانی یاد بھی نہیں کیسے چین آیا کذاب ہے وہ شخص جو دعویٰ کرتا ہے محبت کا اور سجدہ میں گردن نہیں جھکتی پس ثابت ہو گیا کہ جو لوگ بدوں ظاہر کے باطن کا دعویٰ کرتے ہیں وہ باطن سے بھی خالی ہیں۔

اب میں وہ دعویٰ کرتا ہوں جو بالکل وعظ کے ابتداء میں تھا کہ ان لوگوں کے پاس باطن بھی نہیں تو یہ لوگ ظاہر اور باطن دونوں سے کورے ہیں بیان اس کا یہ ہے کہ ان لوگوں سے ایک غلطی ہوئی ہے وہ یہ کہ جس چیز کو انہوں نے باطن سمجھا ہے وہ باطن ہے ہی نہیں مثلاً نماز کا باطن ذکر کو سمجھا ہے اس میں ایک کوتاہی ہوئی ہے ؏

سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجاست

(دوست غلطی یہی ہے کہ تم سخن شناس نہیں ہو)

حقیقت ذکر

اور وہ غلطی اور کوتاہی یہ ہے کہ ذکر جس کے معنے یاد کے ہیں اور جس کو یہ لوگ نماز کا باطن اور نماز کی روح کہتے ہیں وہ دو طرح کا ہے ایک وہ جو مقرون بہ ہیئت صلوٰۃ ہو اور ایک وہ جو بدوں اس ہیئت کے پس ان لوگوں نے یہ سمجھا کہ نماز کی روح صرف یاد ہے سو یہ غلطی ہے حقیقت میں نماز کی روح خاص وہ یاد ہے جو ہیئت صلوٰۃ میں ہو اور دلیل اس کی فرضیت اس ہیئت کی ہے پس جب ظاہر صلوٰۃ نہ پایا گیا تو اس صلوٰۃ کا جو باطن تھا وہ بھی نہیں پایا گیا تو یہ دونوں سے کورے رہ گئے۔

جملہ عبادات ظاہر و باطن کی جامع ہیں

اب ایک یہ بات اور باقی رہ گئی کہ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ نرا ظاہر تو بدوں باطن کے کسی قدر کار آمد بھی ہے اور اس کا عکس یعنی نرا باطن بدوں ظاہر کے کچھ بھی کار آمد نہیں اس کا بیان یہ

ہے کہ جس کو یہ لوگ ظاہر محض کہتے ہیں اور جس پر باطن محض کو ترجیح دیتے ہیں مثلاً نماز و روزہ سو وہ صرف ظاہر نہیں ہوتا بلکہ مجموعہ ہوتا ہے ظاہر اور باطن کا کیونکہ نماز اور اسی طرح جمیع عبادات میں نیت شرط ہے اور وہ باطن ہے تو وہ نماز مجموعہ ہوا ظاہر و باطن کا اور ظاہر ہے کہ یہ مجموعہ حسب قاعدہ **الکل اعظم من الجزو** (کل سے جز بڑا ہوتا ہے) صرف باطن سے بڑا اور زیادہ ہی ہوگا تو میرا مدعا عقلاً ثابت ہوگیا ہاں اس پر یہ سوال ہوسکتا ہے کہ نیت فعل باطن تو ہے مگر وہ صرف عمل کے ایک ہی حصہ میں ہے یعنی شروع میں تو پوری نماز مجموعہ ظاہر و باطن کا کہاں ہوا اس کا جواب یہ ہے کہ یہ خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اتنے جزو کو تمام عمل میں پھیلا دیا اور ہر ہر جزو عمل کے لئے علیحدہ نیت کی ضرورت نہیں بتلائی شروع کی نیت تمام اجزائے عمل کے لئے کافی ہوگئی اور اس قصد کا اثر ہم افعال حسیہ میں بھی دیکھتے ہیں دیکھئے چلنا ایک فعل اختیار ہے جس کے لئے قصد شرط ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ چلنے کے ہر جزو کے ساتھ قصد مستقل متعلق نہیں ہوتا صرف اول بار کے چند قدم اٹھانے کے ساتھ قصد کا ہونا تمام اجزاء کے صدور کے لئے کافی ہوگیا بس اسی طرح سے اول کی نیت تمام اجزاء صلوٰۃ کے ساتھ متعلق ہونے سے یہ بات محفوظ رہی کہ نماز نام ہے مجموعہ ظاہر و باطن کا پس وہ دعویٰ ثابت ہو گیا کہ جس کو صرف ظاہر کہا جاتا ہے وہ بہ نسبت باطن محض کے زیادہ کار آمد ہے۔

ظاہر کو فضول سمجھنا خطرناک ہے

اب ایک طرف اس شخص کو رکھئے جو صرف ظاہری نماز پڑھتا ہے اور ایک طرف اس شخص کو رکھئے جو نماز روزہ کچھ نہیں کرتا اور اس زعم میں ہے کہ مجھ کو باطن حاصل ہے دلیل بتلاتی ہے کہ شخص اول کے پاس ظاہر اور باطن دونوں ہیں اور اس دوسرے کے پاس نہ ظاہر ہے نہ باطن جیسا اوپر مفصل بیان ہوا اور یہ مسلک ایک دوسرے طریق پر بھی نہایت خطرناک ہے کہ ظاہر کی ضرورت نہ سمجھی جاوے اور ظاہر کو فضول اور بے کار سمجھا جاوے اور خطرہ اس میں یہ ہے کہ اس میں شریعت کا مقابلہ لازم آتا ہے کہ شریعت نے تو ظاہر کی تعلیم کی اور اعمال مقرر فرمائے اور ہر ہر عمل کے اجزاء تفصیل کے ساتھ بیان کئے اور انہوں نے سب کو فضول قرار دیدیا اس کے تو معنی یہ ہوئے کہ شریعت نے یہ سب فعل لایعنی کیا سو یاد رکھئے کہ کوئی ادنیٰ سی عقل والا بھی فعل لایعنی

نہیں کیا کرتا چہ جائیکہ اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم جنہوں نے یہ سب احکام مقرر فرمائے کیا کوئی مسلمان کہہ سکتا ہے کہ اللہ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سب بکھیڑے فضول پھیلائے ہیں یہ کلمہ تو ایسا ہے جس کے تصور سے بھی مسلمان کانپ اٹھے زبان سے کہنا تو کیسا مگر تعجب ہے کہ بہت مسلمان ایسے ہیں کہ اگر قالاً اس میں مبتلا نہیں مگر حالاً مبتلا ہیں زبان سے ایسا کلمہ نہ کہیں مگر عملدرآمد ان کا یہی ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ تعلیمات بالکل فضول ہیں چنانچہ ظاہر پر بالکل عمل نہ کرنا اس کی دلیل ہے اور اس طرح کے لوگ بہت ہیں اور ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو زبان سے بھی یہ کلمہ کہتے ہیں بعینہ یہ لفظ نہ سہی مگر اس کے مرادف دوسرے لفظ استعمال کرتے ہیں یہ اس زمانہ کے مدعیان مشیخت ہیں جو کہتے ہیں اصل چیز باطن ہے اس کے ہوتے ظاہر ہو یا نہ ہو چنداں حرج نہیں اس جملہ کے معنی بجنسہٖ وہی ہیں گو لفظ بدلے ہوئے ہیں سو خدا تعالیٰ کی نظر حقائق پر ہے عنوانات اور الفاظ پر نہیں ہے جب اس کلام کی وہی حقیقت ہے تو اسی درجہ میں یہ بھی قبیح ہے اور حیرت درحیرت یہ ہے کہ باوجود اس بطلان صریح کے بہت لوگ ان کے معتقد ہو جاتے ہیں محض فقیری کا نام لگ جانے سے یا کوئی شعبدہ دیکھ لینے سے یا لمبی چوڑی باتیں سن لینے سے۔

جاہل فقراء کے معتقدوں کا حال

اور میں ڈرتا ہوں کہ ایسے لوگ جو ذرا بات میں فقیروں کے معتقد ہو جاتے ہیں اندیشہ ہے کہ وہ دجال کے زیادہ معتقد ہوں گے کیونکہ دجال کی حالت بھی ایسی ہوگی کہ مجذوب سا بنا ہوگا ایسے لوگ اس کو بھی کامل سمجھیں گے اور اس کے دعوؤں کو منصور کے اناالحق کی طرح کہیں گے اور شعبدوں اور خرق عادت کا اس کے ساتھ کیا ٹھکانا ہے جو کسی سے نہ ہوا ہو وہ کرے گا احیاء موتے تک اس کے ساتھ سے ہوگا پھر یہ لوگ کیسے اس کے متبع نہ ہوں گے جن کی حالت یہ ہے کہ

لختے برد از دل گذر دہر کہ بہ پیشم

(میرے سامنے ج (حسین) گذرتا ہے وہ دل کا ایک ٹکرا لے جاتا ہے)

جس نے ذرا عجیب بات دکھا دی اسی کے معتقد ہیں حتیٰ کہ بہت سے لوگ جوگیوں کے معتقد ہیں اور صرف عوام نہیں بلکہ بہت سے خواص اس خبط میں مبتلا ہیں کہ ایک چٹکلہ کسی جوگی سے دیکھ لیا اور اس کو کامل کہنے لگے اور اس کے پیچھے ہو گئے حضرات یہ بڑا فتنہ ہے بعض وقت

ایمان تک اس سے کھویا جاتا ہے مسلمان کو عجائب پرست نہ ہونا چاہئے خوب سمجھ لینا چاہئے کہ جان و دل خدا کا ہے ان پر کسی کو سوائے خدا کے قبضہ دینا نہیں چاہئے۔ ع ”دل بدہ الا بمہر سر خوشاں“ (دل دو مگر سرخوشوں یعنی اولیاء کی محبت میں) البتہ یہ خدا تعالیٰ کی اجازت ہے کہ جو ہمارا ہے اسے جان و دل دیدو تو اہل اللہ کو جان و دل دینا تو ایسا ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کو دینا کیونکہ ان کے حکم سے ہے البتہ اسی کے لئے تحقیق کی ضرورت ہے کہ اہل اللہ کون ہیں پوری چھان بین کے بعد کسی سے تعلق کرنا چاہئے کیونکہ یہ معاملہ درحقیقت حق تعالیٰ کے ساتھ کرنا ہے اگر اس میں غلطی ہوئی تو خدا کے پہچاننے میں غلطی ہوگی جو شخص خود باطل پر ہے وہ باطل ہی کی طرف تو لے جائے گا خدا تک کہاں پہنچاوے گا اس واسطے جس سے تعلق کرنا ہو یہ دیکھ لینا چاہئے کہ وہ خود حق پر ہے یا نہیں اور اس کا معیار محض فقیری کا نام لگ جانا یا شعبدے دکھانا یا لمبی چوڑی باتیں کرنا تو نہیں ہیں کیونکہ بہت موٹی بات ہے کہ یہ باتیں ہر فرقہ میں موجود ہیں تو لازم آتا ہے کہ سب حق پر ہوں حالانکہ یہ بداہتہً باطل ہے حق تو ایک ہی ہوسکتا ہے تو حق کا معیار دلیل صحیح ہے پس جس کو عامل علی الشریعت نہ پاؤ چاہے وہ لاکھ شعبدے دکھاوے اور فقیر اور شاہ صاحب بنا ہوا ہو اس کے تو پاس بھی مت پھٹکو اور جو شریعت پر تو عامل ہو مگر صاف باطن نہ ہو اس کا قرب و تعلق تو مضر نہیں مگر وہ قابل دل دینے کے لئے بھی نہیں ہے۔

باطن کا حال معلوم کرنے کا طریقہ

اب یہ بات رہ گئی کہ باطن کی حالت کیسے معلوم ہو سو باطن کسی کا دل چیرنے سے نہیں معلوم ہوتا بلکہ افعال و آثار سے معلوم ہو جاتا ہے اسی کو مولانا کہتے ہیں۔

جملہ دانایاں ہمیں گفتا ہمیں	ہست دانا رحمۃ اللعالمین
گر انارے میخری خنداں بجز	کہ دہد خندہ زدانہ او خبر

شراح نے کہا ہے کہ ”ہست دانا رحمۃ العالمین“۔

عارفین کا وجود بہت بڑی نعمت ہے

مقولہ ہے گفتا کا مطلب یہ ہوگا کہ تمام عارفین نے کہا ہے کہ عارف کو رحمت خدا سمجھو اور میں کہتا ہوں کہ ہست دانا رحمۃ اللعالمین جملہ معترضہ ہے اور مقولہ گفتا کا دوسرا شعر ہے گر انارے می

خری خنداں بجز اب مطلب یہ ہوگا کہ عارفین کا قول ہے اور درمیان میں عارف کی مدح کر دی کہ عارف کا وجود بھی بڑی نعمت ہے اور وہ مقولہ یہ ہے کہ انار خرید و تو کھلا ہوا خرید و کیونکہ اس کے کھلے ہوئے ہونے سے اندر کے حال کا پتہ چل جاوے گا اور اگر بند انار خرید لو گے تو ممکن ہے کہ بالکل سڑا ہوا نکل جاوے پس اسی طرح جس سے ایسا تعلق پیدا کرنا چاہو اول اس کے افعال و آثار دیکھ لو آگے اس کے مقابلہ کے آثار و افعال کو دلیل خبث باطن قرار دے کر فرماتے ہیں۔

نا مبارک خندہ آں لالہ بود　　　　کہ زخندہ او سواد دل نمود

یعنی لالہ کا پھول جب تک کہ کلی کی صورت میں تھا سرخ رنگ اور خوبصورت تھا اور اچھا معلوم ہوتا تھا ممکن ہے کہ اس کی خوب صورتی سے کوئی راغب ہو جاوے مگر جب کھلا تو اندر سیاہی تھی تو کسی چیز کو بلا اندرونی حالت معلوم کئے لینا نہ چاہئے مطلب یہ ہے کہ کسی سے تعلق پیدا کرو تو اچھی طرح اس کو پرکھ لو اور پرکھنا یہ ہے کہ اس کے افعال محمود ہوں اور اگر اس کے افعال ظاہری خراب ہیں تو سمجھ لو کہ اس کی ہنسی لالہ کی سی ہنسی ہوگی جب کبھی باطن کھلے گا تو سیاہی اور ظلمت ہی نکلے گی۔

اب میں بیان کو ختم کر چکا اور کوئی پہلو اس تعلیم کا باقی نہیں رہا ان کی ضرورت کا بیان پرسوں کے وعظ میں ہو چکا تھا اور ظاہر کے متعلق تمام پہلوؤں کا بیان آج ہو گیا خلاصہ یہ کہ اس دن کے بیان میں حاصل یہ تھا کہ نرے ظاہر پر نہ رہو بلکہ باطن کو بھی لو اور اس کا حاصل یہ ہے کہ نرے باطن پر نہ رہو بلکہ ظاہر کو بھی لو ان کا لطف یہ ہے کہ باطن کو بھی اس سے معمور کرو اور ظاہر کو بھی آراستہ کرو جس سے یہ مضمون ظاہر ہو جاوے کہ۔

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ میدارد　　　　برنگ اصحاب صورت بو ارباب معنی را

(اس کے عالم حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل و جان کو رنگ سے اور حقیقت پرستوں کے دل و جان کو بو سے تازہ رکھتی ہے۔

وعظ کا نام

چونکہ آج کے بیان میں ظاہر کی بحث ہے اس واسطے اس کا نام الظاہر رکھا جاتا ہے جیسے اس سے پہلے وعظ کا الباطن رکھا گیا ہے ہاں ظاہر کی ضرورت کا ایک اور راز بیان کرتا ہوں دو منٹ کے لئے وعدہ خلافی تو ہوتی ہے مگر لوگ خوش ہوں گے اسی وعدہ خلافی سے کیونکہ یہ وعدہ خلافی ایسی ہے جیسے کسی سے وعدہ کریں دو روپے دینے کا اور دے دیں تین روپے کہ یہ بھی تو

وعدہ خلافی ہے مگر مفید مطلب ہونے کی وجہ سے ناگوار نہیں ایسی وعدہ خلافی تو ہر شخص چاہتا ہے
راز کیا ہے اس کا کہ ظاہر و باطن ان دونوں کی اصلاح کی ضرورت ہے یہ بیان تبرعاً کیا جاتا ہے
کیونکہ اس پر کوئی مدعا موقوف نہیں مگر پھر بھی وہ راز تبرعاً اس لئے بیان کیا جاتا ہے کہ مدعیوں کو
معلوم ہو جاوے کہ طالب علموں کے پاس ہر قسم کا ذخیرہ ہے مگر ان کو شور مچانے کا شوق نہیں اس
واسطے ان کے ذخیرے ظاہر نہیں ہوتے یہ ملانے جتنا اللہ نے ان کو بتایا ہے جانتے سب ہیں مگر
اس کو ظاہر نہیں کرتے بعض تو اس وجہ سے ٹال دیتے ہیں کہ مخاطب اہل نہیں اس کے سمجھنے کا اور
بعض وقت اس وجہ سے مخاطب اس کے بیان کو ان کے ذمہ سمجھتا ہے حالانکہ ان کے ذمہ نہیں
ہے کیونکہ یہ کسی کے محکوم نہیں ہیں کسی سے کچھ خواستگار نہیں کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے
پھر کسی کا ان پر زور کیا ہے تو وہ اس کے ابطال کے لئے بھی بعض وقت اعراض کرتے ہیں غرض
یہ بعض مصلحتوں سے چپ ہیں نہ کہ بے خبری سے بقول حافظ رحمہ اللہ

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ۔۔۔ ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(مصلحت نہیں ہے کہ راز آشکارا ہو جائے ورنہ رندوں کی مجلس میں کوئی ایسی چیز نہیں
کہ معلوم نہ ہو)

حقیقت عبادت

ہاں کبھی تبرعاً بیان بھی کر دیتے ہیں گو ان کے ذمہ ضروری نہیں آخر نفل بھی تو پڑھتے
ہیں (اگر چہ طلبہ نفل کم پڑھتے ہیں مگر کبھی تو پڑھ ہی لیتے ہیں) اور وہ راز یہ ہے اس میں اول
ایک مقدمہ کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ عبادت کی حقیقت کیا ہے عبادت کی حقیقت ہے اسماء
وصفات کے حقوق ادا کرنا اسماء وصفات کے کچھ حقوق ہوتے ہیں ان حقوق کے معنی یہ ہیں
کہ وہ بات اختیار کرنا جس سے ان کا ظہور ہو مثلاً حاکم کی صفت کا مقتضےٰ اور حق یہ ہے کہ
اس کے احکام کی اطاعت کی جاوے یا معطی کہ اس کا حق یہ ہے کہ اس سے مانگا جاوے یا
باپ ہونا کہ اس کا مقتضےٰ یہ ہے کہ بیٹا اس کی اطاعت کرے یا بیٹا ہونا کہ اس کا مقتضےٰ یہ ہے
کہ باپ اس پر شفقت کرے یہ مقدمہ بہت ہی ظاہر اور مسلم ہے اور یہ کوئی تصوف کا باریک
مسئلہ نہیں ہے جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو جان لیجئے کہ حق تعالیٰ کے بہت اسماء وصفات
ہیں تو عبادت الٰہی کے معنی یہ ہوں گے کہ ان کے حقوق کو ادا کیا جاوے کہ اس کا حق یہ ہے کہ

اس کی عبادت کی جاوے یا رحمٰن کہ اس کا حق یہ ہے کہ اس سے تحصیل رحمت کی جاوے وعلیٰ ہذا القیاس غرض عبادت کی حقیقت اسماء الٰہی کے حقوق ادا کرنا ہے اور یہاں سے ایک بات اور یہ بھی معلوم ہوئی وہ یہ کہ اسماء وصفات باری تعالیٰ کے لامتناہی ہیں تو ظاہر ہے کہ ان کے حقوق بھی غیر متناہی ہوں گے اور غیر متناہی کے ادا پر قدرت محال ہے تو اس سے ثابت ہوا کہ حق تعالیٰ کی پوری عبادت ادا کرنے پر کوئی قادر نہیں ہوسکتا اسی واسطے کہا ہے ۔

بندہ ہماں بہ کہ زتقصیر خویش　　　عذر بدرگاہ خدا آورد

(بندہ وہی بہتر ہے جو اپنی کوتاہی کا عذر دربار خداوندی میں لائے)۔

ورنہ سزاوار خداوندیش　　　کس نتواند کہ بجا آورد

(یعنی ورنہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ اس کی خداوندی کی عظمت کے لائق کوئی طاعت بجالاؤ)

جبکہ عبادت پوری ادا نہیں ہوسکتی تو بندہ کو چاہئے کہ جہاں تک امکان ہے اتنی تو ادا کرے اور یہاں سے اس کا بھی نکتہ نکل آیا کہ کافر کو خلود فی النار (دوزخ میں ہمیشگی) کیوں ہوگا بعض لوگ یہ اشکال کیا کرتے ہیں کہ کافر نے جرم کفر ایک مدت متناہی تک تو کیا ہے لہٰذا اس کی سزا بھی متناہی مدت تک ہونی چاہئے اس کی کیا وجہ کہ جرم کی مدت تو متناہی ہو اور سزا کی مدت غیر متناہی ہو نکتہ یہ نکلا کہ کافر نے حق تعالیٰ کی عبادت سے انکار کیا تو اس نے اسماء غیر متناہیہ کے حقوق کو ضائع کیا کیونکہ عبادت کی حقیقت اداء حقوق اسماء تھی تو اس کی ضد اضاعت حقوق اسماء ہوئی اور اسماء لامتناہی ہیں تو اس کا جرم لامتناہی ہوا تو اس پر سزا بھی لامتناہی ہونی چاہئے تو اس کا خلود عقل کے موافق ہوا نہ کہ خلاف عقل ۔ خیر یہ لطائف تو جملہ معترضہ تھے اصل مضمون یہ تھا کہ عبادت کرنا ہی حقوق اسماء وصفات کا ادا کرنا ہے اور منجملہ اسماء الٰہی کے ظاہر اور باطن کا بھی ہے ان کے حقوق بھی ادا کرنا چاہئیں ظاہر کے حقوق اعمال ظاہرہ کا ادا کرنا ہے اور باطن کے حقوق باطن کی اصلاح کرنا بھی ہے پس جس شخص نے ایک میں بھی کوتاہی کی اس نے اس اسم کے حق کو ضائع کیا پس شرعاً اور عقلاً اور عرفاً سب طرح جس مطلوب کا دعویٰ کیا گیا تھا وہ بحمداللہ ثابت ہوگیا اب دعاء کیجئے کہ حق تعالیٰ ہر قسم کی اصلاح کی توفیق اور ہمت عطا فرمادیں۔

ادب الاعلام

۲۱ صفر ۱۳۳۵ ہجری کو دوران سفر ریاست مجھولی ضلع گورکھپور کے قصبہ برھل ہاتھی پر جاتے ہوئے راستہ میں گفتگو شروع ہوئی اور ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریر حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کیمپ زہرپور ضلع گورکھپور مورخہ ۲۱ صفر ۱۳۳۵ھ روز دوشنبہ شروع سات بج کر ۳۲ منٹ صبح وختم پونے نو بجے درراہ بڑھل گنج مطابق ۱۸ دسمبر ۱۹۱۶ء کل وقت ایک گھنٹہ ۱۳ منٹ ماہ صفر ۱۳۳۵ھ میں حضرت والا کا سفر بغرض تبدیل آب وہوا اور ملاقات اپنے بھائی صاحب منشی اکبر علی صاحب (مرحوم) منیجر ریاست مجھولی ضلع گورکھپور کے ہوا چونکہ منشی اکبر علی صاحب دورہ پر تھے اور مقام زہرپور میں قیام تھا اس واسطے حضرت والا وہیں تشریف لے گئے وہاں سے ایک قصبہ بڑھل گنج قریب میل ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر ہے وہاں کے لوگوں کے اشتیاق ظاہر کرنے کی وجہ سے یہ تجویز ہوئی کہ صبح کو وقت ہواخوری اسی طرف تشریف لے چلیں چنانچہ منیجر صاحب نے ہاتھی کھچوا دیا اور حضرت والا مع چار خدام کے بڑھل گنج کو روانہ ہوئے ہاتھی پر گھنٹہ بھی تھا راستہ میں اسی پر گفتگو شروع ہوئی اور اس تقریر کو ایسا امتداد ہوا کہ بڑھل گنج پہنچ کر مسجد میں بھی دیر تک منقطع نہ ہوئی اور ڈیڑھ گھنٹہ تک سلسلہ جاری رہا چونکہ مضمون نہایت معنی خیز تھا اس واسطے دل چاہا کہ یہ تقریر علیحدہ دیگر مواعظ کی طرح ضبط ہو جائے اور احقر نے حضرت سے عرض کیا کہ اس کا نام بھی علیحدہ تجویز فرما دیا جاوے۔ چنانچہ حضرت نے مجموعہ مضامین پر خیال فرما کر ادب الاعلام تجویز فرما دیا جس کی مناسبت مطالعہ تحریر اہذا سے بخوبی واضح ہو جائے گی اور بمناسبت بڑھل گنج لقب اس کا کنز نامی تجویز فرمایا۔

گھنٹہ کے جواز کا حکم

فرمایا اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ گھنٹہ جائز ہے یا ناجائز ترجیح اس کو دی ہے کہ جائز ہے احقر نے عرض کیا حدیث میں تو اس کی ممانعت آئی ہے فرمایا اس میں اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ کسی نے اس کو معلل بعلت سمجھا اور کسی نے غیر معلل مجوزین نے علت اس کی تفاخر قرار دی ہے جہاں یہ علت نہ ہو وہاں حکم منع بھی نہ رہے گا چنانچہ فقہا نے لکھا ہے کہ راستہ والوں کو خبر کرنے کے لئے یا جانور کو نشاط میں لانے کے لئے درست ہے ہاں جہاں

کوئی فائدہ نہ ہوا اور صرف تفاخر رہ جائے تو درست نہیں جیسے امراء اکثر صرف نمود اور رفع شان کے لئے لگاتے ہیں معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس کی ایجاد تو غرض صحیح کے لئے تھی پھر اس میں نمود اور تفاخر شامل ہو گیا اور اب تک بھی غرض صحیح اس میں موجود ہے چنانچہ میں نے ایک گاڑی بان سے پوچھا کہ تم لوگ گھنٹہ اور ٹالیں کیوں لگاتے ہو کہا تجربہ ہے کہ اس سے بیل چلتے زیادہ ہیں اور ہاتھی کے گھنٹہ سے راستہ والوں کی اطلاع کے علاوہ یہ بھی فائدہ کہ آبادی میں کو جاوے تو وہ عورتیں پردہ کر لیں جس کے مکانوں کی دیواریں پست ہیں محدثین نے اس کی علت صرف یہ سمجھی ہے کہ جرس سے اس واسطے منع فرمایا گیا تھا کہ دشمن کو خبر نہ ہو جائے یہ علت سوائے جہاد کے اور کہیں نہیں پائی جاتی اس واسطے سوائے مجاہدین کے قافلہ کے اور کہیں ان کے نزدیک منع نہ ہوگا اور فقہاء نے علت تفاخر کو سمجھا لہٰذا جس جگہ بھی یہ علت ہو منع ہوگا تو فتویٰ محدثین کا اس بارہ میں اوسع ہے فقہاء سے محدثین کا مطمح نظر روایت ہوتی ہے اور فقہاء درایت سے کام لیتے ہیں جیسے غنا محدثین کے نزدیک بلا مزامیر جائز ہے کیونکہ حدیث میں لفظ معازف کا آیا ہے اور فقہاء کے نزدیک بلا مزامیر بھی جائز نہیں کیونکہ وہ علت کو سمجھتے ہیں اور وہ خوف فتنہ ہے وہ جیسے مزامیر میں ہے غنائے صرف میں بھی موجود ہے محدثین موقع نص سے تجاوز نہیں کرتے اور فقہاء اصل منشا حکم کو معلوم کر کے دیگر مواقع تک حکم کو متعدی کرتے ہیں۔

محقق کی نظر وسیع ہوتی ہے

پھر ایک مضمون کے سلسلہ میں محققین کا ذکر ہوا اس پر فرمایا محقق کی نظر بہت وسیع ہوتی ہے وہ حقیقت کا جویاں ہوتا ہے لایعنی باتوں میں پڑنا نہیں چاہتا صحابہؓ کی شان بھی یہی تھی ان کے آپس کے اختلافات دیکھ کر شبہ ہو سکتا ہے کہ ان کے کیسے اخلاق تھے چنانچہ بعض جاہل ان حضرات پر اعتراض کرتے ہیں لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ جہاں موقعہ اتحاد کا ہوتا تھا وہاں ایسے ایک جان دو قالب ہوتے تھے کہ کہیں دنیا میں اس کی نظیر ملنی مشکل ہے یہ دونوں باتیں کیسے جمع کہ اخلاق ایسے خراب ہوں کہ ایسی ایسی منازعتیں ان میں ہوں اور دوسرے وقت وہی حضرات

ایسے ایک دل ہو جائیں گویا منازعت کا ان میں مادہ ہی نہیں ضرور ہے کہ وہ منازعت فساد و اخلاق پر مبنی نہ تھی بلکہ تحقیق پر مبنی تھا دو محقق جو انتہا درجہ کے محقق ہوں بہت کم ایک بات پر متفق ہو سکتے ہیں یہ بات ظاہراً بعید ہی معلوم ہوتی ہوگی لیکن بالکل صحیح ہے اور یہ کچھ دین ہی پر موقوف نہیں دنیا کی باتوں میں بھی دیکھ لیجئے کسی فن کو اٹھا کر دیکھئے دو محقق کی رائے کبھی موافق نہ ہوگی طبی مسائل میں جالینوس کی تحقیق اور ہے اور شیخ کی اور ہے اور بقراط کی اور ہے یہ اختلاف کیوں ہے ظاہر ہے کہ یہ سب ائمہ فن تھے اور ان کو طب کی ترقی کی کوشش تھی طب کے ساتھ ان کو عداوت نہ تھی پھر ان کے اختلاف کے کیا معنے انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ اختلاف اسی اصول پر مبنی ہے کہ دو محقق کی رائے متفق نہیں ہوتی محققین کی شان ہمیشہ یہی ہوتی ہے کہ حقیقت کو سمجھنا چاہتے ہیں اور حقیقت کے بہت سے پہلو ہوتے ہیں اور احاطہ سب پہلوؤں کا یہ خدا کا کام ہے تو ایک ایک پہلو پر نظر جاتی ہے اس لئے ایک دوسرے سے اتفاق نہیں کرتا وسیع النظر اتنا ہوتا ہے کہ دوسرے محقق کی نسبت کوئی برا لفظ بھی کہنا پسند نہیں کرتا ائمہ و مجتہدین کا اختلاف بھی اسی قسم کا ہے کہ آپ میں اتنا اختلاف ہے کہ ایک صاحب ایک چیز کو فرض کہتے ہیں اور دوسرے اسی کو حرام کہتے ہیں یہ کتنا بڑا اختلاف ہے مگر ساتھ ہی اس کے یہ حالت بھی انہیں کی ہے کہ امام شافعی کا ادب امام ابوحنیفہ کے ساتھ مشہور ہے دیکھئے اتنا اختلاف اور اتنا اتحاد اس اختلاف کی وجہ سوائے غنایت درجہ کے محقق ہونے کے کچھ نہیں ہے اور محقق ہمیشہ وسیع النظر ہوتا ہے اور ایک شان محقق کی یہ ہوتی ہے کہ فضول مباحثہ سے بچتا ہے اور غیر محقق اور غبی سے گفتگو نہیں کرتا بلکہ اگر غبی سے گفتگو ہو تو ذرا میں خاموش ہو جاتا ہے جس کو عوام ہار جانا سمجھتے ہیں اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ اس کے پاس دلیل نہیں اور یہ کہ وہ واقع میں ہار گیا بلکہ وجہ یہ ہوتی ہے کہ نا حقیقت شناس کو سمجھانا وہ مشکل سمجھتا ہے اور ہار مان جانے کو سہل سمجھتا ہے اس کی مثال یہ ہے کہ ایک سوانکھا شخص آفتاب کو دیکھ رہا ہے اور ایک مادر زاد اندھا آفتاب کا انکار کر رہا ہے اگر وہ اندھا اس سوانکھے سے الجھے کہ آفتاب کے ہونے کا کوئی ثبوت لاؤ تو وہ کیا ثبوت دے سکتا ہے اس کو یہ کہنا سہل ہے کہ میں ہارا اور تو جیتا آفتاب کا وجود نہ سہی تو اپنے خیال میں خوش رہ میں اپنے خیال میں خوش ہوں اب بتایئے کہ یہ سوانکھا شخص ہارا ہوا ہے یا جیتا ہوا آج کل بعضے لوگ کہتے ہیں کہ ہم حق کے متلاشی ہیں اور یہ لوگ ائمہ کے ساتھ اختلاف مسائل میں بے

ادبی کرتے ہیں اور اس اختلاف کی بناء احادیث کی مخالفت بتلاتے ہیں اگر ان کی بات کو دیکھئے تو صاف ظاہر ہو جاوے کہ تحقیق کا تو پتہ بھی نہیں نہ تحقیق کے لائق علم اور نہ تحقیق کا ارادہ صرف اس مخالفت کی بناء ہوائے نفسانی پر ہے کس درجہ سب وشتم صالحین کے بارہ میں کرتے ہیں۔

ائمہ کے اختلاف کا حکم

ائمہ کا اختلاف تو بلاشبہ اختلاف امتی رحمۃ میں داخل تھا اور ان لوگوں کا اختلاف (ویتبع غیر سبیل المؤمنین) کی جنس سے ہے بس آج کل خیریت ہے تو سلف کے اتباع ہی میں ہے اور رائے کو دخل دینے میں مفاسد ہی مفاسد ہیں تجربہ ہے کہ اتباع سے نکل کر آدمی بڑی دور پہنچتا ہے حتیٰ کہ بعض اوقات اسلام سے نکل جاتا ہے دیکھئے رائے پر عمل کرنے سے بڑے بڑوں سے ایسی غلطی ہوتی ہے کہ امام رازی نے حدیث[1] لم یکذب ابراھیم الاثلث کذبات سے انکار کر دیا اس وجہ سے کہ کذب انبیاء علیہم السلام سے محال ہے اور جمہور نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس کذب میں تاویلیں کی ہیں امام رازیؒ نے تو اپنے نزدیک بڑا کام کیا کہ تاویل کی ضرورت ہی نہیں رکھی لیکن کس قدر فاحشہ غلطی کی کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر ایک ایسی حدیث کو جو سند صحیح سے ثابت ہے ایسے اشکالوں کی وجہ سے رد کر دیا جاوے تو اس کا باب مفتوح ہوتا ہے کہ ہر شخص کو مجاز ہوگا کہ جس حدیث میں اپنے نزدیک کوئی اشکال پائے اس کو رد کر دے اس سے تمام دین کی اساس ہی منہدم ہوتی ہے ایسے امام سے یہ غلطی کس وجہ سے ہوئی صرف اتباع رائے سے۔

حضرت حکیم الامتؒ کا ایک خواب

میرا ایک خواب ہے جو موافقت قواعد صحیحہ کی وجہ سے میرے نزدیک خوب ہے اور اس سے اچھا فوٹو اس مبحث کا شاید ہی ملے میرے دل میں کھٹک پیدا ہوئی اور یہ زمانہ طالب علمی دیوبند کا ذکر ہے کہ غیر مقلد اپنے ہر مدعا پر حدیث پیش کرتے ہیں جو ہمارے امام کے خلاف ہوتی ہے شاید ان ہی کا طریق حق ہو خواب دیکھا کہ میں دہلی میں ایک محدث میاں صاحب کے مکان پر ہوں دیکھا کہ وہاں چھاچھ تقسیم ہو رہی ہے مجھے چھاچھ کا شوق ہے انہوں نے

---

[1] مسند الإمام أحمد ۲:۱۷۷، الترغيب والترهيب للمنذري ۲: ۴۹۱ بلفظ: لا يستجيب لعبد دعاه عن ظهر قلب غافل

مجھ کو بھی دی مگر میں نے نہیں لی۔ بس آنکھ کھل گئی معاً تعبیر ذہن میں آئی کہ علم کی صورت رؤیا میں لبن ہے جیسا کہ حدیث میں موجود ہے اور چھاچھ کی صورت تو دودھ کی ہے مگر حقیقت بالکل مغائر ہے معنی اور مغز اس میں نہیں پس یہ سمجھ میں آیا کہ ان کا طریقہ صورت دین تو ہے مگر اس میں معنی دین بالکل ندارد ہے یہ لوگ امام صاحب پر خلاف حدیث کا اعتراض کرتے ہیں۔ امام صاحب نے بھی حدیث کے خلاف کوئی بات نہیں کہی مگر معنی اور مغز کو لے کر اور یہ لوگ صرف صورت سے شبہ کرتے ہیں تو یہ معارضہ معارضہ حدیث نہ ہوا بلکہ معارضہ معنی وصورت حدیث ہوا اور ایسا ممکن ہے جیسا کہ میں چند نظیروں میں دکھاتا ہوں۔ مثلاً حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے باوجود امر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس غلام پر حد جاری نہ کی اس سے کوئی ظاہر بین کہہ سکتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حدیث کی مخالفت کی جیسا کہ یہ لوگ ہر بات میں امام صاحب کو طعنہ دیتے ہیں کہ حدیث کی مخالفت کرتے ہیں لیکن معنی فہیم آدمی سمجھ سکتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے گو ظاہر حدیث کی مخالفت کی لیکن حقیقت میں مخالفت نہیں کی اور ان کو یہی کرنا چاہئے تھا چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد میں اسی کی تصویب فرمائی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ مسئلہ معلوم تھا کہ از روئے کتاب وسنت غیر زانی پر حد نہیں ہو سکتی جبکہ وہ غلام مقطوع الذکر تھا تو اس سے زنا ممکن ہی نہیں تھا پھر حد کیسی انصاف سے کہئے کہ تعمیل حدیث یہ ہے یا وہ ہوتی۔

حضرت امام اعظمؒ کے اقوال مغز حدیث پر مبنی ہیں

اسی طرح امام صاحب کے اقوال ہیں کہ وہ مغز حدیث پر مبنی ہیں اور ان لوگوں کے اقوال صرف صورت حدیث پر مغز کا نام بھی نہیں اور وہ بھی دو چار مسئلوں میں میں نے قنوج میں ایک مرتبہ وعظ کہا اور کچھ رسوم مروجہ کے متعلق گفتگو کی منصف غیر مقلدوں نے کہا کہ آج معلوم ہوا کہ متبع سنت ہم بھی نہیں صرف دو چار سنن پر عمل کر رکھا ہے۔

اتباع رائے کے باوجود دعویٰ عمل بالحدیث

اسی طرح ایک غیر مقلد گندھی نے کہا کہ ہم لوگوں میں احتیاط بالکل نہیں ہے ہمارا عمل بالحدیث صرف آمین بالجہر اور رفع یدین میں ہے اس کے سوا کسی عمل کی طرف ہمارا ذہن ہی

نہیں جاتا چنانچہ میں عطر میں تیل ملا کر بیچتا ہوں اور واقعی متقی جس کو کہتے ہیں وہ ان میں ایک بھی نہیں الا ماشاء اللہ یہ کیسی گہری بات ہے اس میں سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیوں ان میں متقی نہیں ہوتے جبکہ ہر بات میں عمل بالحدیث کا دعویٰ ہے وجہ یہ بھی ہے کہ کسی ایک کے پابند نہیں ہیں ذرا کوئی بات پیش آئی سوچ کر کسی ایک روایت پر عمل کر لیا اور روایتوں میں سے انتخاب کرنے کے لئے اپنی رائے کو کافی سمجھا پس اس کو صورۃً تو چاہے کوئی اتباع حدیث کہہ لے مگر جب اس کا منشا رائے پر ہے تو واقع میں اتباع رائے ہی تو ہوا۔ اتباع ہونے سے بچنا جب ہی ہوتا ہے جب ایک سے بندھ جائے ورنہ نرے دعوے ہی دعوے ہیں مقلدین میں بہت سے لوگوں کی حالت اچھی نکلے گی بخلاف غیر مقلدین کے کہ کوئی شاذ و نادر متقی نکل آئے تو نکل آئے ورنہ بہت سے حیلہ جو اور نفس پرور ہیں ابوحنیفہ سے بندھتا ہے نفس ورنہ چھچھوندر کی طرح یہ ہانڈی جا سونگھی وہ ہانڈی جا سونگھی یوں کوئی محتاط بھی نکل آئے لیکن حکم اکثر پر ہوتا ہے اچھے اچھوں کے حالات ٹٹول کر دیکھ لئے ہیں اتقاء ایک میں بھی نہ پایا الا ماشاء اللہ اس کا اقرار خود ان کے گروہ کو بھی ہے ہاں اگر کوئی احتیاط کرے اور مختلف اقوال میں سے احوط پر عمل کرے تو اس کو اتباع نفس و ہوی نہ کہیں گے اور اس میں فی نفسہ کوئی حرج بھی نہیں لیکن اول تو ایسا کرتا کون ہے اور یہ بہت مشکل ہے کوئی کر کے دیکھے تو معلوم ہو کہ کس قدر دشواریاں پیش آئیں گی اور ایسے محتاط کو بھی اجازت اس واسطے نہ دیں گے کہ دوسروں پر اثر برا پڑتا ہے۔ اس کی احتیاط کی تقلید تو کوئی نہ کرے گا ہاں اس کی عدم تقلید کی تقلید کر لیں گے اور پھر وہی اتباع ہوی باقی رہ جائے گا ہاں اگر یہ شخص گمنام جگہ ہو اور اطمینان ہو کہ دوسروں پر اثر نہ پڑے گا تو اس کا معاملہ اللہ پر ہے اگر اس کی نیت سچی ہے اور خوف خدا سے احوط کو اختیار کرتا ہے تو کچھ حرج نہیں۔ لیکن ایسی نظیر شاید ایک بھی ملنا مشکل ہے یہ صرف توسیع عقلی ہے۔

عامی کو ہر صورت میں مجتہد کی تقلید واجب ہے

مفتی صاحب نے پوچھا کہ اگر عامی شخص کو کسی مسئلہ میں ثابت ہو جائے کہ مجتہد کا قول حدیث کے خلاف ہے تو اس وقت میں حدیث پر عمل کیوں جائز نہ ہوگا ورنہ حدیث پر قول

مجتہد کی ترجیح لازم آتی ہے فرمایا یہ صرف فرضی صورت ہے عامی کو یہ کہنے کا منصب ہی کہاں ہے کہ مجتہد کا قول حدیث کے معارض ہے اس کو حدیث کا علم مجتہد کے برابر کب ہے نیز وہ تعارض اور تطبیق کو مجتہد کے برابر کیسے جان سکتا ہے تو اول تو یہ صورت فرضی ہے کہ قول مجتہد حدیث کے معارض ہو پھر میں تنزل کر کے کہتا ہوں کہ اگر اس عامی شخص کا قلب گواہی دیتا ہو کہ اس مسئلہ میں مجتہد کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے تو اس صورت میں بھی ترک تقلید جائز نہیں اس کی نظیر یہ ہے کہ طبیب سے نسخہ لکھواتے ہیں تو اس نسخہ کو غلط کہنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے عامی تو عامی کوئی دوسرا طبیب بھی اس نسخہ کو غلط نہیں کہہ سکتا دوسرا نسخہ دوسرا طبیب تجویز کر دے لیکن اس نسخہ کو غلط کہنے کا مجاز نہیں اس وقت تک کہ اس نسخہ کو بالکل صریح غلط نہ ثابت کر سکے دوسری تجویز کے بہت سے وجوہ ہو سکتے ہیں حتیٰ کہ یہ بھی ایک وجہ ہوتی ہے کہ ایک دہلی کا تعلیم یافتہ ہے دوسرا لکھنؤ کا لکھنؤ کا طرز مطب اور ہے اور دہلی کا اور اور اوزان ادویہ تک میں فرق ہے تو ایک دہلی کے تعلیم یافتہ کو لکھنؤ کے نسخہ کو صرف اس وجہ سے غلط کہہ دینا کہ اس کے اوزان میں فرق ہے کیسے درست ہو سکتا ہے علیٰ ہذا مجتہدین کے اختلاف کے وجوہ بھی بہت ہیں بعض وقت برائے کا اختلاف موضع کے اختلاف سے بھی ہو جاتا ہے۔

حضرت امام شافعیؒ کے مختلف اقوال کا سبب

چنانچہ امام شافعی صاحبؒ کا فقہ جدید اور ہے قدیم کے منضبط کرنے کے بعد انہوں نے مصر کا سفر کیا تو بہت سے اقوال میں تغیر کرنا پڑا جیسا فقہ کے جاننے والوں سے پوشیدہ نہیں اس کی یہ وجہ نہیں کہ سفر کرنے سے دلیلیں بدل گئیں بلکہ وجہ یہ ہے کہ سفر سے لوگوں کے حالات کا تجربہ مزید حاصل ہوا۔ جس سے بہت سے مواقع جرح کے معلوم ہوئے جو پہلے معلوم نہ تھے پہلے حکم اور تھا اور جرح معلوم ہونے کے بعد ظاہر ہے کہ وہ حکم بدلنا ضرور ہوا اسی طرح بہت سی رایوں میں اختلاف ہوا غرض وجوہ اختلاف کا احصاء مشکل ہے لوگوں نے اس کے واسطے قواعد منضبط ضرور کیے ہیں (جن کو اصول فقہ کہتے ہیں) لیکن وہ قواعد خود محیط نہیں اس کی مثال علم نحو کی ہے جس میں کلام کی ترکیب کے قواعد منضبط کئے گئے ہیں اور یہ علم بہت مفید ہے لیکن تاہم اس کے انضباط کا مقصود یہ نہیں کہ اہل زبان اس کے پابند ہوں اور

اس لئے اس کا احاطہ پورا کیا گیا ہو بلکہ محض غیر اہل زبان کے واسطے اہل زبان کا کلام سمجھنے اوران کے ساتھ مکالمت کرنے کا آلہ ہے پس اگر اہل زبان سے کوئی کلام ایسا ثابت ہو جائے جس میں قواعد نحو جاری نہ ہوسکیں تو یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ اہل زبان نے غلطی کی بلکہ یہ کہا جاوے گا کہ علم نحو میں اتنا نقصان تھا کہ یہ قاعدہ ضبط سے رہ گیا۔

مجتہد کا قول بغیر دلیل کے نہیں ہوتا

اسی طرح مجتہد کو اصول فقہ سے الزام دینا صحیح نہیں ہوسکتا بلکہ ایسے موقع پر جہاں مجتہد کا قول اصول پر منطبق نہ ہوتا ہو یہ کہنا چاہئے کہ علم اصول ناقص رہا اس تقریر کے بعد یہ کہنا ذرا مشکل ہے کہ مجتہد کے پاس اس کے قول کی کوئی دلیل نہیں اس واسطے یہ کہا جاتا ہے کہ اگر قلب ذرا بھی گواہی دے کہ مجتہد کے پاس اپنے قول کی دلیل ہوگی تو ترک تقلید جائز نہ ہوگا۔ اگرچہ درجہ امکان عقلی میں یہ بھی ہے کہ مجتہد کے پاس دلیل نہ ہو یا اس نے غلطی کی ہو جیسے کہ درجہ امکان میں یہ بھی ہے کہ طبیب کیسا ہی بڑا ماہر کیوں نہ ہو غلطی کرسکتا ہے لیکن اگر ایسی فرضی صورتوں سے مجتہد کا اتباع چھوڑ دیا جائے تو کارخانہ دین درہم برہم ہو جائے جیسا کہ اسی کی نظیر یعنی امر معالجہ میں یہ فرضی صورت جاری کرنے سے کہ طبیب معصوم نہیں ہے غلطی کرسکتا ہے اور اس کا اتباع چھوڑ دینے سے امر معالجہ درہم برہم ہوتا ہے وہاں تو امر معالجہ کا نظام قائم رکھنے کے لئے یہ بات عام طور سے مان لی گئی ہے کہ طبیب زہر بھی کھلائے تو چوں و چرا نہ کرنا چاہئے حالانکہ یہ عقل کے خلاف ہے جب ایک چیز کو زہر کہا تو زہر کے معنے قاتل نفس ہے۔ پھر اس کے کھانے کے جواز کے کیا معنی مگر اس جملہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ زہر جو طبیب کھلاتا ہے اس کو نہ اس واسطے کھالینا چاہئے کہ وہ زہر ہے بلکہ اس واسطے کہ گو وہ صورۃً زہر ہے مگر حقیقت میں زہر نہیں طبیب پر اطمینان ہے کہ وہ قاتل نفس شئے نہ کھلائے گا اسی طرح جب ایک شخص کو مجتہد مانا گیا تو (لفظ تو برا ہے) مگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ تو اس کے زعم میں خلاف دلیل بات بھی بتلائے تو کرلی جائے جیسا کہ کہا گیا ہے کہ طبیب زہر بھی کھلائے تو کھالینا چاہئے جو تاویل وہاں تھی وہی یہاں بھی ہے کہ طبیب زہر نہیں کھلائے گا ایسا ہی مجتہد خلاف دلیل بات نہ بتلائے گا۔ پھر یہ کہنا بڑا مشکل ہے کہ مجتہد کے پاس اپنے قول کی دلیل نہ ہوگی۔ اسی وجہ سے میں نے یہ کہا اگر قلب ذرا بھی گواہی دے کہ مجتہد کے پاس کوئی نہ کوئی دلیل ضرور ہوگی تو ترک تقلید جائز نہیں البتہ کوئی متبحر عالم اگر کسی مسئلہ کو خلاف دلیل سمجھے تو اس کا سمجھنا معتبر ہوگا۔

مجتہد کسے کہتے ہیں

اس پر مفتی صاحب نے پوچھا کہ مجتہد کس کو کہتے ہیں جبکہ ایک شخص کو مسئلہ کا علم دلیل سے ہے تو اس مسئلہ کا یہ بھی مجتہد ہے پھر یہ کیسے کہا جائے گا کہ ایک مجتہد کو دوسرے مجتہد کی تقلید لازم نہیں جواب دیا کہ لغۃً تو ہر شخص کچھ نہ کچھ مجتہد ہے اس بناء پر تو تقلید سے آزاد کرنے کا انجام یہ ہی ہے کہ تقلید بالکل نہ رہے حالانکہ یہ بلانکیر جاری ہے اس کی ایک مثال ہے کہ مال دار ہمارے عرف میں کس کو کہتے ہیں کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص مال دار ہے میں پوچھتا ہوں ایسا کون شخص ہے جو مالدار نہیں لغۃً تو مال دار وہ شخص بھی ہے جس کے پاس ایک پیسہ جھوٹی کوڑی بھی ہو تو جو احکام مالداروں کے ساتھ متعلق ہیں دنیا کے ہوں یا دین کے ہر ہر شخص پر جاری ہونے چاہئیں زکوٰۃ کا مطالبہ بھی ہونا چاہئے اور خراج اور محصول بھی بادشاہ کو ہر شخص سے لینا چاہئے **فما هو جوابكم فهو** جوابنا اسی طرح لغۃً مجتہد ہر شخص سہی لیکن وہ مجتہد جس پر احکام اجتہاد جاری ہوسکیں اس کے واسطے کچھ شرائط ہیں جن کا حاصل ایک ذوق خاص شریعت کے ساتھ حاصل ہو جاتا ہے جس سے وہ معلل اور غیر معلل کو جانچ سکے اور وجوہ دلالت یا وجوہ ترجیح کو سمجھ سکے اور یہ اجتہاد ختم ہو گیا پس ایک مسئلہ کی دلیل جان لینے سے اس مسئلہ کا وہ محقق تو نہیں ہو گیا پھر محقق کے اتباع کو وہ کیسے چھوڑے گا جیسے کہ محدث درجہ عبور میں ہر شخص ہوسکتا ہے لیکن کمال اس کا بعض افراد پر ختم ہو گیا اب کوئی محدث موجود نہیں۔ **ذالک فضل الله یوتیه من یشاء** (یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔)

مجتہدین نے ہی حقیقت دین کو سمجھا ہے

آج کل جو لوگ اجتہاد کے مدعی ہیں ان سے ایسی فاحش غلطیاں ہوتی ہیں کہ ہر شخص کا قلب ان کے غلطی ہونے کو تسلیم کر لیتا ہے جیسے کہ آج کل کوئی کچھ سندیں بنا کر محدث بننا چاہے تو اس کی محدثیت تسلیم نہیں کی جاتی آج کل تو سلامتی اسی میں ہے کہ اجتہاد کی اجازت نہ دی جائے نظم دین جو کچھ ہو گیا اس سے اس میں بڑا خلل پڑتا ہے میں تو کہتا ہوں کہ آج

کل وہ زمانہ ہے کہ اگر کسی کام کو درجہ الویت پر کرتے ہیں عوام کے فساد کا احتمال ہو تو اس وقت خلاف اولیٰ کرنے والا مثاب ہوگا نظیر اس کی قصہ حطیم ہے جو حدیث میں موجود ہے یہ میری تقریر ایسی ہے جس سے تقلید کی حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ائمہ مجتہدین ہی نے دین کی حقیقت کو سمجھا ہے۔

ضرورت تقلید

پس جو لوگ تارک تقلید ہیں وہ کہنے کو تو ائمہ کے خلاف ہیں مگر درحقیقت دین کے خلاف ہیں اس کی بناء صرف خود رائے پر ہے اور اتباع ہوئی اور اعجاب سب جانتے ہیں مہلک چیزیں ہیں جس کا جی چاہے تجربہ کر کے دیکھ لے کہ تارکین تقلید میں اکثر یہ دونوں مرض رگ و پے میں گھسے ہوئے ہوتے ہیں ہمارا علم کچھ بھی نہیں ہم سے بڑوں نے اور ان لوگوں نے جن کو علم مسلم ہے کیوں تقلید کو اختیار کیا معلوم ہے کہ ہماری رائے غلط اور متہم ہے تقلید شخصی چھوڑ کر گنجائشیں نکالی جاویں تو نتیجہ اس کا بہت ہی جلد آزادی نفس پیدا ہو جاتا ہے ان میں سے بعض نفس کے نزدیک اجتہاد ہی کوئی چیز نہیں بدوں نص کے ان کے نزدیک کوئی حکم ہی ثابت نہیں۔

حضرت فاروق اعظمؓ کا ذوق اجتہادی

حالانکہ احادیث میں اس کے ثبوت بہت ملتے ہیں دیکھئے حضرت عمر فاروقؓ کا ذوق اجتہادی ہے تو جس پر ایسا اطمینان ہوا کہ حضرت ابوہریرہ کو بشارت سے روک دیا اور یہ روکنا عنداللہ مقبول رہا حالانکہ حضرت عمرؓ کی رائے کو قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور نص پر کسی طرح ترجیح نہیں ہوسکتی مگر ان کے ذوق اجتہادی ہی نے بتا دیا تھا کہ یہ بشارت نظم دین میں مخل ہوگی اور باوجود ابوہریرہؓ کے دلیل پیش کرنے کے اس شد و مد سے تردید کی کہ ان کو دھکا دے کر گرا بھی دیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ سارا قصہ پیش ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عمرؓ مجرم کیوں نہ ہوئے اس قصہ سے اجتہاد کا بدیہی ثبوت ملتا ہے یہ کوئی کچا محل نہیں ہے دین کی اہل اجتہاد نے من گھڑت باتوں پر بنا نہیں رکھی ہے ان کے یہاں تو خود رائی کا تو کام ہی نہیں جیسے کہ مجتہدین دوسروں کو پابند بناتے ہیں خود بھی پابند ہیں کوئی

بات بلا قرآن وحدیث کے نہیں کہتے تو ان کی تقلید قرآن وحدیث ہوئی نام اس کا چاہے کچھ رکھ لو جیسا صرف ونحو پڑھنے والا اولاً تو مقلد ہے اخفش اور سیبویہ کا لیکن اخفش وسیبویہ خود موجد زبان نہیں بلکہ مقلد ہیں اہل زبان کے واسطے صرف ونحو پڑھنے والا در حقیقت مقلد ہوا اہل زبان کا یہ کیسی غلطی ہے کہ مقلد فقہاء کو تو تارک قرآن وحدیث کہا جاوے اور مقلد اخفش وسیبویہ کو تارک زبان نہ کہا جاوے یہ مضامین یاد رکھنے کے ہیں ہر وقت ذہن میں نہیں آتے ابن تیمیہ کی ایک کتاب ہے دفع الملام عن الائمۃ الاعلام اس میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ وجوہ دلالت کے اس قدر کثیر ہیں کہ کسی مجتہد پر یہ الزام صحیح نہیں ہوسکتا کہ اس نے حدیث کا انکار کیا یہ کتاب دیکھنے کے قابل ہے۔ ابن تیمیہ اور ابن القیم استاد شاگرد ہیں دونوں بڑے عالم ہیں بعض افاضل کا ان کے بارہ میں قول ہے کہ علمہما اکثر من عقلہما یہ دونوں حنبلی مشہور ہیں مگر ہیں نہیں حنبلی ان کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے خود مجتہد ہونے کے مدعی ہیں ایسا محقق کسی بات میں ائمہ مجتہدین کا خلاف کرے تو مضائقہ بھی نہیں۔

آزادی کے نتائج

اور یہ تھوڑا ہے کہ بولنے تک کی تمیز نہیں اور ائمہ کے منہ آنے لگے ایک شخص کہتا تھا کہ بلا قرأت فاتحہ نماز کیسے ہوسکتی ہے حدیث میں تو ہے کھداج (خداج خداج) ایسے بیہودوں سے تو کلام بھی کرنے کو دل نہیں چاہتا ایک صاحب کیدہ میں ملے اور پوچھا کہ ترک فاتحہ پر کیا دلیل ہے مجھے معلوم ہوا کہ یہ بھی ایسی ہی لیاقت رکھتے ہیں جیسے کھداج والا تھا مجھے سخت گراں گذرا کہ ان کے ساتھ کیا مغز ماروں میں نے کہا پہلے یہ بتایئے کہ یہ مسئلہ اصول میں سے ہے یا فروع میں سے کہا فروع میں سے ہے میں نے کہا آپ کے سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو دین کی تحقیق کی طرف خاص توجہ ہے جب کہ ایک فرعی مسئلہ کی طرف اس قدر توجہ ہے تو اصول کی طرف اور زیادہ ہوگی۔ اصول کی تو آپ شاید پوری تحقیق کر چکے ہوں گے اور اب فروع کی طرف متوجہ ہوئے ہیں پس اصل الاصول توحید ہے اس کو آپ ضرور دلیل سے تحقیق کر چکے ہوں گے اگر ایسا ہے تو میں چند شبہات توحید پر پیش کرتا ہوں ذرا ان کا حل تو کر دیجئے اور اگر ایسا نہیں ہے بلکہ توحید کو کسی کی تقلید سے مان لیا ہے تو آپ دلیل سے تحقیق نہیں

کر سکتے تو بڑے تعجب کی بات ہے کہ اصول میں تو تقلید کی اور فروع میں تقلید نہیں کرتے حالانکہ اصول زیادہ اہم ہیں تقلید سے خلع عنان کرنا اول تو مجتہدین کی سب وشتم کی طرف مفضی ہوتا ہے پھر صحابہ کے سب وشتم کی طرف پھر سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھر حق تعالیٰ پر بھی کبھی نوبت پہنچتی ہے اور مولانا فتح محمد صاحب بیان کرتے تھے کہ ایک غیر مقلد حدیث پڑھا رہے تھے اور جہاں حدیث کی تاویل نہ بن آتی تو کہتے تھے تعجب ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کہیں کچھ فرما دیتے ہیں کہیں کچھ فرما دیتے ہیں یہ کیا فرما دیا یہ نتائج ہیں آزادی کے۔

اس سے عار آتی ہے کہ ہم کسی کے محکوم کہے جاویں خیر صاحب انہیں مجتہدین کی محکومیت سے عار ہوگی ہمیں تو بہت سوں کے حکومت میں رہنا پسند ہے ابوحنیفہؒ کی بھی حکومت ہے ماں باپ کی بھی حکومت ہے شیخ طریقت کی بھی حکومت ہے یہ بات نفس کے چاہے خلاف ہو مگر یہ کتنا بڑا فائدہ ہے کہ ہمارے اتنے مصلح ہیں نفس وشیطان ہمارا کچھ بھی نہیں کرسکتا بخلاف ان کے کہ ائمہ کی حکومت میں سے تو نکل گئے اور شیطان کی حکومت میں آ گئے ہم جن کے محکوم ہیں وہ سب ہمارے خیر خواہ ہیں اور یہ جس کی حکومت میں گئے وہ عدو مبین ہے اپنی اصلاح کے لئے اپنے اوپر کسی کو بھی اعتماد نہ چاہئے۔ دیکھو حضرت عمرؓ جیسے مبصر نے اس شخص سے کیا کہا جس نے کہا تھا کہ اگر تم بگڑو تو ہم اس تلوار سے تم کو سیدھا کریں گے تو فرمایا تھا کہ الحمدللہ میں ایسی قوم میں ہوں جس میں میرے محافظ بہت سے موجود ہیں۔

بیعت مروجہ کی مصلحت

بیعت مروجہ میں یہی مصلحت ہے کہ جانبین کو خیال ہو جاتا ہے دونوں کو ایک دوسرے سے اعانت کی امید ہوتی ہے۔ ایک دیہاتی آدمی مجھ سے بیعت ہوا میں نے پوچھا بیعت کی تمہارے نزدیک کیا ضرورت ثابت ہوئی نماز روزہ تو بلا اس کے بھی کیا جا سکتا ہے۔ کہا میں بیعت اس واسطے ہوا ہوں کہ دیسے تو ذرا سستی بھی نماز روزہ میں ہو جاتی ہے بیعت سے ذرا خیال ہو جاتا ہے کیا کام کی بات ہے۔

تقریر ادب الاعلام ختم ہوئی

اسی سفر میں اس تیسرے دن یعنی بتاریخ ۲۳ ر صفر ۱۳۳۵ھ روز بدھ اسی مقام بڑہل گنج میں ایک مختصر سی تقریر اور ہوئی جس میں تقلید کی بحث ہے وہ بھی یہاں درج کی جاتی ہے۔

استیلاء کافر موجب ملک ہے

سوال۔ محکمہ تعلیم کے مصارف محکمہ چنگی سے پورے ہوتے ہیں تو محکمہ کی تعلیم تنخواہ حلال ہے یا نہیں۔ فرمایا استیلاء کافر موجب ملک ہے امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہاں بھی مسئلہ امام ابوحنیفہؒ ہی کا کام آتا ہے۔ ایک انگریز نے لکھا ہے کہ سلطنت کے فقہ پر نہیں چل سکتی بوائے فقہ حنفی کے ایک سیاسی شخص کا یہ کہنا ضرور بڑے تجربے کی خبر دیتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کی عجیب نظر ہے دیکھئے امام صاحب کا قول ہے کہ آلات لہو کا توڑ ڈالنا واعظ کو یا کسی کو جائز نہیں اگر کوئی توڑ ڈالے تو ضمان لازم آئے گا یہ کام سلطنت کا ہے وہ احتساب کرے اور توڑ پھوڑے اور سزا دے جو چاہے کرے دیکھئے اس میں کتنا امن ہے سوائے سلطان کے اور کسی کے احتساب کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ کام بند تو ہوتا نہیں جنگ وجدل وفتنہ ہو جاتا ہے اور باہمی منازعات بڑی دور تک پہنچ جاتے ہیں۔

علیٰ ہذا اقامت حدود سلطان ہی کے ساتھ ہیں فقہ بڑی مشکل چیز ہے فقیہ کو جامع ہونا چاہئے فقیہ بھی ہو محدث بھی ہو متکلم بھی ہو سیاسی دماغ بھی رکھتا ہو بلکہ کہیں کہیں طب کی بھی ضرورت ہے بعضے امور میں تشریح کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ فقہ مشکل چیز ہے مگر آج کل بعض لوگوں نے اس کی کیا قدر کی ہے کہ فقہاء پر سب وشتم کرتے ہیں یہ گروہ نہایت درجہ مفسد ہے یہ لوگ جان جان کر فساد کرتے ہیں اور اشتعال دلاتے ہیں بعض وقت تو ذرا سی بات میں بڑا فتنہ ہو جاتا ہے۔

غیر مقلدین کی آمین

ایک شخص نے کہا حضور ہاں ایک جگہ مقلدین کی جماعت میں ایک غیر مقلد آ گیا اور آمین زور سے کہی تو اس پر بڑا فساد ہوا اور پولیس تک نوبت پہنچی اور مقدمہ کو بڑا طول ہوا فرمایا حضرت والا نے اس پر جنگ وجدل کرنا ہے تو زیادتی لیکن تجربہ سے ثابت ہے کہ عمل کچھ ہو مگر جس نیت سے کیا جاوے اس کا اثر ضرور ہوتا ہے اگر اس نے خلوص سے اور عمل بالسنّت کی نیت سے کیا ہوتا تو یہ نوبت نہ آتی غیر مقلدین کی آمین اکثر صرف شورش اور مقلدین کے چڑانے کے لئے ہوتی ہے میرے بھائی محمد مظہر نے قنوج میں غیر مقلدین کی آمین سن کر کہا

آمین تو دعا ہے اس میں خشوع کی شان ہونی چاہئے اور ان لوگوں کے لہجہ میں خشوع کی شان نہیں ہے خود سننے سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کسی کو چھیڑتے ہوں اس نے عرض کیا کہ یہ واقعی بات ہے مقدمہ مذکور جب پولیس میں پہنچا تو ایک ہندو تھانیدار اس کی تحقیقات پر تعینات ہوا وہ بہت سمجھ دار تھا اس نے فساد کا الزام غیر مقلد ہی پر رکھا اور رپورٹ میں لکھا کہ یہ لوگ شورش پسند ہیں اور بلاوجہ اشتعال دلاتے ہیں اور آمین صرف فساد اٹھانے کے لئے کہتے ہیں اس پر غیر مقلدین نے بڑا غل مچایا اور کہا کہ آمین مکہ مکرمہ میں بھی ہوتی ہے داروغہ نے کہا کہ مکہ مکرمہ میں آمین خدا کی یاد کے لئے ہوتی ہوگی دنگے کے لئے نہ ہوتی ہوگی یہاں دنگے کے لئے ہے فرمایا میرا شریک حجرہ ایک لڑکا بیان کرتا تھا کہ ایسے ہی ہے۔

آمین کی تین قسمیں

ایک موقع پر ایک انگریز نے تحقیقات کی اور آخیر میں گویا تمام واقعہ کا فوٹو کھینچ دیا اور کہا آمین تین قسم کی ہیں۔ ایک آمین بالجہر اور اہل اسلام کے ایک فرقہ کا وہ مذہب ہے اور حدیثیں بھی اس کے ثبوت میں موجود ہیں اور ایک آمین بالسر ہے اور وہ بھی ایک فرقہ کا مذہب ہے اور حدیثوں میں موجود ہے اور تیسرے آمین بالشر ہے جو آج کل کے لوگ کہتے ہیں۔

حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا عمل بالحدیث

اس شخص نے بیان کیا کہ ہندو داروغہ کے سامنے غیر مقلدوں نے امام ابو حنیفہؒ پر اعتراض کیا کہ امام صاحب قائل ہیں کہ اگر کوئی محرم عورت سے نکاح کرے اور وطی کرے تو اس پر حد واجب نہیں یہ کیسی غلطی ہے۔ فرمایا حضرت والا نے اسی مسئلہ میں امام صاحب پر فدا ہو جانا چاہئے اس کے بیان کے لئے دو مقدموں کی ضرورت ہے ایک یہ کہ حدیث میں ادرؤ الحدود بالشبہات ایک مقدمہ یہ ہوا اور دوسرا یہ کہ شبہ کس کو کہتے ہیں مشابہ حقیقت کو اور مشابہت کے لئے کوئی وجہ شبہ ہوتی ہے اور اس کے مراتب مختلف ہیں کبھی مشابہت قوی ہوتی ہے اور کبھی ضعیف امام صاحب نے حدود کے ساقط کرنے کے لئے ادنیٰ درجہ کی مشابہت کو بھی معتبر مانا ہے اور صرف نکاح کی صورت پیدا ہو جانے سے کہ باوجود حقیقت نکاح نہ ہونے کے مشابہ تو نکاح کی ہے حد کو ساقط کر دیا انصاف کرنا چاہئے کہ یہ کس درجہ عمل

بالحدیث ہے بات یہ ہے کہ ایک صحیح معنی کو برے اور مہیب الفاظ کی صورت پہنا دی گئی ہے
اس فتوے کی حقیقت تو غایت درجہ کا اتباع حدیث ہے لیکن اس کو بیان اس طرح کیا جاتا ہے
جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ امام صاحب نے نکاح بالمحرمات کو چنداں برا نہیں سمجھا
اس کے سوا اور بھی چند مسائل اسی طرح بری صورت سے بیان کر کے اعتراض کئے جاتے
ہیں مسئلہ مذکور پر اعتراض جب تھا کہ اس پر امام صاحب کوئی زجر و احتساب تجویز نہ کرتے
ایسے موقعوں پر جہاں حد کو فقہا ساقط کرتے ہیں تعزیر کا حکم دیتے ہیں ایسے مواقع تمام ائمہ
کے نزدیک بہت سے ہیں کہ شبہ سے حد ساقط ہوگئی آخر حدیث[1] ادرؤا الحدود
بالشبہات کی تعمیل کہیں تو ہوگی اور کوئی موقع تو ہوگا جہاں اس کو کر کے دکھایا جاوے کیا
غضب ہے جو شخص حدیث ضعیف کو بھی قیاس پر مقدم رکھے وہ کس قدر عامل بالحدیث ہے
فدا ہو جانا ایسے شخص پر تعجب ہے کہ امام مالک صاحب خبر واحد پر بھی قیاس کو مقدم رکھتے ہیں
اور ان کو لوگ عامل بالحدیث کہتے ہیں اور امام صاحب حدیث ضعیف پر بھی قیاس کو مقدم
نہیں رکھتے اور ان کو تارک حدیث کہا جاتا ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب للعالمین.

---

[1] انظر تخریج الحدیث تحت الرقم: ۳۲

ادب العشیر

۲۷۔صفر ۱۳۳۵ ہجری کو دوران سفر اسٹیشن انڈرارا جنکشن پر ویٹنگ روم میں بیان فرمایا جہاں تقریباً ۴۰ افراد اکٹھے ہوگئے تھے۔ وعظ مغرب کے بعد ۳۱ منٹ تک جاری رہا۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حامداً ومصلیاً:۔تقریر حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مسمی بہ ادب العشیر بتاریخ ۲۷رصفر ۱۳۳۵ھ روز یکشنبہ بعد مغرب وقت تخمیناً ۳۱ رمنٹ مطابق ۲۴ ردسمبر ۱۹۱۶ء۔

یہ تقریر سفر گورکھپور میں ہوئی اس وقت کہ حضرت والا گورکھپور سے بجانب مؤ روانہ ہوئے راستہ میں اسٹیشن انڈرارا جنکشن پر گاڑی تبدیل کرنے کے لئے اترنا ہوا گاڑی میں کچھ وقفہ تھا لوگوں نے ویٹنگ روم میں بٹھا دیا اس وقت تیس چالیس زائرین کا مجمع ہو گیا وہاں یہ تقریر ہوئی۔

رسومات کی خرابیاں

فرمایا ایک شخص نے جو پانی پت کے قریب کے رہنے والے تھے پندرہ روپے تھانہ بھون کے مدرسہ میں دیئے میرا دل کھٹکا اس سے پوچھا تم اس مدرسہ میں یہ رقم کیوں دیتے ہو کہا کارخیر سمجھ کر میں نے کہا کارخیر سمجھ کر دینا تھا تو کسی اپنے قریب کے مدرسہ میں جیسے پانی پت میں کیوں نہیں دیا مجھ کو یہ شبہ ہے کہ تھانہ بھون کے مدرسہ کو ترجیح دینے کی وجہ یہ ہے کہ مجھے بھی خوش کرنا منظور ہے اس نے اس کا اقرار کیا میں نے کہا یہ نیت کس قدر فاسد ہے کہ کارخیر میں شرک کی نیت کیسی میں ایسی رقم نہیں لیتا۔

لوگ ظاہر صورت عمل کی دیکھ لیتے ہیں کہ کارخیر ہے اور اس کی اصل اور حقیقت پر نظر نہیں کرتے یہ کیا کارخیر ہوا جس میں مصلحت سے زیادہ مفسدے ہیں آج کل عام طور سے یہ خیال ہو گیا ہے کہ نیک جگہ خرچ کرنا ہر حال میں اچھا ہے اور لینے والوں کو یہ خیال ہو گیا ہے کہ لے لینا کسی حال میں برا نہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔

بعض جگہ لینے میں مفاسد بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ الہ آباد میں مجھ سے ایک شخص بیعت ہوا اور بعد میں ایک روپیہ نذر دیا میں نے لینے سے انکار کیا اس نے کہا میں خلوص سے دیتا ہوں، میں نے کہا مانا تم خلوص سے دیتے ہو اور اس وجہ سے مجھ کو واپس بھی نہ کرنا چاہئے لیکن اس میں ایک بڑا مفسدہ ہے وہ یہ کہ جن کے پاس روپیہ دینے کو نہیں ہے وہ بیعت نہ

ہوسکیں گے تو غریب آدمیوں کے لئے بیعت کا سلسلہ مسدود ہی ہو جائے گا تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ خدائے تعالیٰ کا راستہ بھی روپے ہی سے مل سکتا ہے۔

میرے نزدیک بیعت کے بعد دینے کی رسم یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ میں داخل ہے یہ بات اس شخص کی سمجھ میں نہ آئی مگر طوعاً و کرہاً اس نے روپیہ رکھ لیا تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ اسی مجمع میں سے ایک غریب آدمی کھڑا ہوا اور بیعت کی درخواست کی اور کہا میں بہت دیر سے اس تمنا میں تھا مگر دینے کو کچھ پاس نہ تھا اس وجہ سے ہمت نہ پڑتی تھی میں نے اس شخص سے کہا دیکھ لیجئے اسی وقت حق تعالیٰ نے دکھا دیا اب آپ بتائیے کہ یہ روپیہ میں لے لیتا تو اس سے کس قدر لوگوں کو ضرر ہوتا۔

حضرات رسوم میں یہی خرابیاں ہیں کہ ان کی بدولت حقائق بالکل مٹ گئے ہیں جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ رسمیں اہل بدعت کی نکالی ہوئی ہیں اور بدعت کا خاصہ یہ ہے کہ اس سے نور قلب اور نور عرفان ندارد ہو جاتا ہے اور آدمی ایسے مغالطوں میں پڑ جاتا ہے چنانچہ اہل بدعت کے جتنے استدلال آپ دیکھیں گے سب ایسے ہی ہوں گے کہ ان سے اپنا دل خوش کر لیتے ہیں لیکن جس کے قلب کو حقیقت شناسی سے ذرا بھی مس ہو وہ اس کو کبھی قبول نہیں کرتا حتیٰ کہ اگر اس کے خلاف پر دلیل بھی اس کے پاس اس وقت نہ ہو مگر قلب ہے کہ انکار کئے جاتا ہے۔ پھر یہ کہ رسوم اگر امور دنیا میں ہی ہوتے تب بھی اتنا مضائقہ نہ تھا مصیبت تو یہ ہے کہ دین میں بھی رسوم شامل کر لئے ہیں سو ان رسوم میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ ان کو آدمی ہمیشہ دین ہی سمجھتا رہتا ہے اور تمام عمر اس پر متنبہ نہیں ہوتا اور غیر دین کو دین سمجھے جاتا ہے دنیاوی رسوم میں تو کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کی کوئی دنیوی خرابی وقوع میں آ جاتی ہے تو متنبہ ہو سکتا ہے مثلاً شادی بیاہ کے رسوم کہ ان کے نتائج تباہی و بربادی ظاہر ہو جاتے ہیں تو لوگوں کو تنبہ ہو جاتی ہے اور مضر دین سمجھ کر نہ سہی مضر دنیا سمجھ کر تو چھوڑ سکتے ہیں بخلاف رسوم دین کے کہ ان پر تنبہ ہونے کا کون باعث ہو سکتا ہے بلکہ بالعکس ان میں عدم تنبہ کا ایک داعی موجود ہوتا ہے وہ یہ کہ ان رسوم میں چٹک مٹک بہت ہوتی ہے جس میں دل خوب لگتا ہے پھر آدمی ان کو چھوڑے تو کیونکر اور ہم نے تو ایسے لوگوں کی صحبت پائی ہے جن میں رسمیں بالکل نہ تھیں سادہ

زندگی بسر کرنے والے تھے ان کی معیشت دیکھ کر ہم کو تو یہ بات بخوبی ثابت ہوگئی ہے کہ آسائش کی زندگی بھی وہی ہے جس میں تصنع اور تکلف اور بناوٹ نہ ہو۔

حکایت حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلویؒ

ہماری طرف کاندھلہ ایک قصبہ ہے وہاں کے رہنے والے ایک بزرگ مولوی مظفر حسین صاحب تھے ان کے یہاں جب کوئی مہمان آتا تو پوچھ لیتے کہ کھانا کھا کر آئے ہو یا یہاں کھاؤ گے۔ اگر اس نے کہا یہاں کھاؤں گا تو پوچھتے کہ تازہ پکوایا جائے یا رکھا ہوا کھالو گے اگر اس نے کہا تازہ کھاؤں گا تو پوچھ لیتے کہ کونسی شئے مرغوب ہے جو چیز مرغوب ہوتی وہی پکوا دیتے یہ کس قدر آرام دہ بات ہے۔

انہیں بزرگ کا قصہ ہے کہ انہوں نے مولانا مملوک علی صاحب نانوتویؒ سے فرمایا جن کا قیام دہلی رہتا تھا کہ مولانا جب آپ وطن جایا کریں تو راستہ میں مجھ سے مل کر جایا کریں مولانا نے کہا اچھا لیکن میری منزل میں حرج نہ ہوا کرے انہوں نے کہا نہیں جیسا آپ فرماتے ہیں ویسا ہی ہوگا ایک دفعہ کا قصہ ہے کہ مولانا دہلی سے نانوتہ جارہے تھے راستے میں مولوی ظفر حسین صاحب سے ملنے کے لئے ٹھہرے مولوی مظفر حسین صاحب نے حسب معمول پوچھا کھانا کھا لیا ہے یا کھاؤ گے۔ انہوں نے کہا کھائیں گے۔ مولوی صاحب نے کہا تازہ تیار کراؤں یا جو رکھا ہوا ہو وہی لے آؤں، انہوں نے کہا جو رکھا ہوا ہو وہی لے آیئے۔ مولوی صاحب ایک مٹی کے برتن میں کھچڑی کی کھرچن لے آئے اور کہا کہ رکھا ہوا تو یہ ہے بس وہ اس کو کھا کر رخصت ہوگئے۔ بتایئے اس میں آرام ہے یا ان رسوم میں جس کے آج کل لوگ پابند ہیں اور جس کو تہذیب و خاطر داری کہا جاتا ہے۔ ان حضرات کا خود بھی معمول یہی تھا۔ مولوی مظفر حسین صاحب جہاں جاتے فوراً کہہ دیتے میں تمہارا مہمان ہوں ایک دن ٹھہروں گا یا دو دن۔ ایک دفعہ یہ بزرگ مولانا گنگوہی قدس سرہ کے مہمان ہوئے صبح کو مولانا نے ناشتہ کے لئے کہا آپ رامپور جانے والے تھے اس لئے آپ نے کہا کہ کھانا تیار ہونے میں دیر لگے گی میری منزل کھوٹی ہوگی ہاں اگر رات کا رکھا ہوا ہو تو لا دو مولانا نے ماش کی دال اور باسی روٹی لا دی آپ نے دال روٹی پر الٹ کر

پلے میں باندھ لی اور رخصت ہو گئے جب رامپور پہنچے تو حکیم ضیاء الدین صاحبؒ سے کہا کہ مولوی رشید احمد صاحبؒ بڑے اچھے آدمی ہیں حکیم صاحب نے کہا ہاں بڑے بزرگ ہیں۔ فرمایا میں ان کے بزرگ ہونے کی تعریف نہیں کر رہا ہوں میں تو کہہ رہا ہوں کہ وہ بہت اچھے آدمی ہیں اگر خود نہیں سمجھتے ہو تو پوچھ ہی لو، انہوں نے کہا اچھا حضرت فرمائیے آپ نے کہا دیکھو کیسے اچھے آدمی ہیں انہوں نے مجھے کھانے کے لئے کہا مگر میرے کہنے پر جو کھانا رکھا ہوا تھا بلا تکلف لا دیا میں اس واسطے کہہ رہا ہوں کہ وہ بڑے اچھے آدمی ہیں۔

حکیم معین الدین صاحبؒ کی سادگی

ایک دفعہ حضرت مولانا گنگوہی مولانا محمد یعقوب صاحب کے صاحب زادہ حکیم معین الدین صاحب کے یہاں مہمان ہوئے یہ صاحب بہت ہی بے تکلف ہیں اتفاق سے ان کے یہاں اس روز کھانے کو کچھ بھی نہ تھا مولانا سے عرض کیا کہ ہمارے یہاں تو آج فاقہ ہے لیکن اکثر احباب آپ کی دعوت کیا کرتے ہیں اگر آپ فرمائیں تو میں ان کی دعوت منظور کر لوں فرمایا میں تو تمہارا مہمان ہوں جو حال تمہارا ہے وہی میرا بس فاقہ ہی سے بیٹھ رہے خدا کی قدرت شام کے قریب ایک جگہ سے گیارہ روپے آئے وہ خوش خوش مولانا کے پاس آئے کہ لیجئے آپ کی برکت سے گیارہ روپے آ گئے اب تو خوب بڑھیا دعوت کریں گے مولانا نے فرمایا نہیں معمولی کھانا پکوالو کہا اب ہم معمولی کیوں پکوائیں گے۔ اب تو جس طرح جی چاہے گا دعوت کریں گے۔ تو جب ہم نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے پھر ہماری نظروں میں آج کل کی خاطر داری کیا آ سکتی ہے۔ جس کی حقیقت سوائے تصنع اور دکھلاوے کے کچھ بھی نہیں اور جس میں مفاسد ہی مفاسد ہیں اگر دنیا دار بھی نمائش چھوڑ کر یہی طریقہ اختیار کریں تو قطع نظر گناہوں سے بچنے کے دنیا میں بھی تو تباہ نہ ہوں دیکھئے کیسی کیسی ریاستیں ان تکلفات میں تباہ ہو گئیں اور لطف یہ ہے کہ خود سب کے سب ان رسوم کے شاکی ہیں مگر چھوڑتے نہیں آدمی کو چاہئے اتنے پاؤں پھیلائے جتنی گنجائش ہو اور ان تکلفات میں اس کا خیال ہو ہی نہیں سکتا سب کو چاہئے کہ ایک دم ان رسوم کو الگ کریں سادہ زندگی عجیب چیز ہے اور حلال کی کمائی میں تو سوائے سادہ زندگی کے کچھ ہو ہی نہیں سکتا یہ چٹک مٹک جب ہی ہو سکتی ہے جب کمائی حرام کی ہوتی ہے۔

بچوں کو تنعم کی عادت ڈالنا مناسب نہیں

میرے ایک دوست ہیں مولوی ظہور الحسن صاحب سب رجسٹرار ان کو اپنے ایک بھائی کے مقدمہ میں الہ آباد جانا پڑتا تھا۔ الہ آباد میں ایک وکیل تھے مولوی محمد نام (مولوی جزو علم ہے لقب نہیں ہے) انہوں نے ان کو وکیل کیا تو یہ جب الہ آباد جاتے انہیں کے یہاں ٹھہرتے۔ ایک دفعہ کا قصہ ہے کہ یہ ان کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے انہوں نے ان کے بچوں کو سنا یہ کہتے پھرتے تھے کہ آج ہمارے یہاں شیخ جی آئے ہیں یہ سمجھے کہ کوئی اور مہمان ہوں گے مگر اس روز وقت پر کھانا نہیں آیا انہوں نے خیال کیا کہ آج شیخ جی جو آئے ہوئے ہیں ان کے لئے پُر تکلف کھانے پکے ہوں گے اس وجہ سے دیر ہو گئی ہے۔ جب بہت ہی دیر ہو گئی تو انہوں نے ایک نوکر سے پوچھا کہ وہ شیخ جی جو ان کے یہاں آئے ہوئے نظر نہیں آئے وہ کہاں ہیں نوکر یہ سن کر بہت ہنسا اور کہا کہ ان کے یہاں کی اصطلاح ہے کہ شیخ جی فاقہ کو کہتے ہیں آج ان کے یہاں فاقہ ہے دیکھئے سادگی اس کا نام ہے کہ پاس ہوا تو خود بھی کھا لیا اور مہمان کو بھی کھلا دیا اور نہ ہوا تو قرض نہ کیا اور تربیت دیکھئے کتنی اچھی ہے کہ اولاد کو بچپن ہی سے تنعم کے خلاف کا عادی بنا دیا آج کل تنعم اس قدر ہو گیا ہے کہ ایسی باتوں کو ذلت کی تعلیم سمجھتے ہیں اپنے آپ کو کھنچا بڑا سمجھنا کسی کے سامنے نہ لچنا آج کل کی یہی تہذیب ہے اور نوکر کو تو آدمی ہی نہیں سمجھتے ہر کام میں وہ بات اختیار کی جاتی ہے جس میں ترفع تکبر بناوٹ ضرور ہو نئی نئی وضع سے نئے نئے فیشن بنائے جاتے ہیں اور ان میں جو کچھ ایجادیں اور اضافے ہوتے ہیں ان سب کی بنا تکبر ہی پر ہوتی ہے پھر اسی کی عادت بچوں کو ڈالتے ہیں حتیٰ کہ یہ معاشرت طبعی ہو جاتی ہے بول چال میں کھانے پینے میں اٹھنے بیٹھنے میں چلنے پھرنے میں غرض تمام حرکات سکنات تکلف سے خالی نہیں ایک دفعہ ایک شخص میرے پاس آئے اور نہایت انکساری سے کہا میں خادم ہونا چاہتا ہوں بعد تفتیش کے معلوم ہوا ان کی مراد اس سے بیعت کی درخواست تھی۔ کوئی آ کر کہتا ہے دامن میں لے لو کوئی کہتا ہے غلام بنا لو یہ کیا تکلفات ہیں۔

رسمی تعظیم

ایک صاحب تشریف لائے اور سلام کر کے کھڑے ہو گئے۔ بہت دیر ہو گئی میں نے کہا بیٹھتے کیوں نہیں کہنے لگے بلا اجازت کیسے بیٹھوں میں نے کہا اچھا ایک ہفتہ تک اجازت

نہیں بس فوراً بیٹھ گئے۔ میں نے کہا یہ کیا واہیات ہے یا تو بلا امر بیٹھتے نہ تھے یا اب باوجود نہی کے بیٹھ گئے اور رواج یہ ہے کہ جب رخصت ہوں گے تو الٹے پاؤں چلیں گے پشت کرنا بے ادبی سمجھتے ہیں ظاہری برتاؤ کو اس قدر اچھا مگر اطاعت کا نام نہیں ہاں رسمی تعظیم وتکریم بہت ہے، ہم لوگوں کی طبیعتیں ہی بدل گئی۔

حضرات صحابہؓ میں رسمی تعظیم نہ تھی

صحابہؓ رسمی تعظیم بہت نہ کرتے تھے مگر مطیع اس قدر تھے کہ دنیا کو معلوم ہے صحابہ کو جو تعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا وہ تعشق کا مرتبہ ایسا رکھتا ہے کہ دنیا میں کسی محبّ اور محبوب میں اس کی نظیر ملنا مشکل ہے لیکن حالت یہ تھی کہ اس کے بھی پابند نہ تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آتے دیکھ کر کھڑے ہی ہو جایا کریں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کو اس سے منع فرما رکھا تھا۔ لباس میں وضع میں بیٹھنے کی جگہ میں کسی بات میں دوسروں سے امتیاز نہ رکھتے تھے۔ اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم چلنے میں اس کے بھی پابند نہ تھے کہ سب سے آگے رہیں بلکہ کبھی برابر ہو کر چلتے تھے کبھی پیچھے ہو جاتے تھے آج کل کی تہذیب تو یہ کہتی ہے کہ سب سے آگے حضور صلی اللہ علیہ وسلم رہا کرتے سو غور سے دیکھئے کہ آج کل کے لوگ اپنے بزرگوں کے زیادہ جان نثار ہیں یا صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زیادہ جان نثار تھے۔ تجربہ تو یہ بتلاتا ہے کہ جہاں ظاہری بناوٹ ہوتی ہے وہاں حقیقت نہیں ہوتی۔ جس کو بات بات میں جھکتا اور تسلیم اور آداب عرض کرتے دیکھے سمجھ لیجئے کہ دل میں اس کے آپ کی وقعت ذرا بھی نہیں ہے زیادہ تعظیم وتکریم میں علاوہ اس کے کہ بے معنی چیز ہے یہ بھی بڑی خرابی ہے کہ دوسرے کو ضرر ہوتا ہے اس میں رعونت پیدا ہو جاتی ہے اسی واسطے حدیث میں مدح فی الوجہ سے ممانعت آئی ہے اسی حدیث سے تعظیم وتکریم کی ممانعت بھی بدرجہ اولیٰ ثابت ہوتی ہے کیونکہ مدح کی دو قسمیں ہیں قالی اور حالی تعظیم مدح حالی ہے جب قالی سے ممانعت ہے تو حالی سے بدرجہ اولے ہوگی نیز بہت زیادہ تکلف کرنے کا ادنیٰ اثر یہ ہے کہ اس سے دل نہیں ملتا اور بعض لوگوں کی اس سے یہ غرض ہوتی ہے کہ دوسرے کو اپنی طرف مائل کریں سو اس کی تدبیر بھی یہ نہیں ہے بلکہ اس کی تدبیر بھی یہی ہے کہ زیادہ تکلف نہ کیا جاوے۔ دیکھئے غور کے قابل بات ہے بعض بزرگوں کا برتاؤ مہمان کے ساتھ

میں سنا تا ہوں کہ وہ ظاہراً تو بدتمیزی ہے اور آج کل کی تہذیب کے خلاف ہے مگر درحقیقت بہت گہری بات اور عاقلانہ اور کریمانہ برتاؤ ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے کھانا منگایا اور مہمانوں کے اور اپنے سب کے سامنے چنا گیا بس پہلے اپنے آپ کھانا شروع کر دیا تا کہ مہمان سمجھ لے کہ یہاں تکلف نہیں اور دل کھول کر کھاوے پھر وہ کھانا کھاتے میں مہمان کی طرف دیکھتے بھی نہیں اور ایسے بن جاتے ہیں کہ گویا ان کو کھانا کھلانے کا سلیقہ ہی نہیں اور درحقیقت اس پر نظر رکھتے ہیں کہ کھانا دستر خوان پر ہے یا نہیں بلکہ خدمت گار کو تعلیم ہے کہ ذرا کسی کے سامنے کھانا کم ہو فوراً لاؤ اس طریقہ سے مہمان کس قدر انبساط اور آزادی سے کھا سکتا ہے مگر آج کل کی تہذیب یہ ہے کہ میزبان مہمان پر مسلط ہو جاتا ہے۔ قبلہ یہ کھایئے قبلہ وہ کھایئے اس سے مہمان بالکل منقبض ہو جاتا ہے ممکن ہے کہ اس کا جی اس وقت ایک چیز کو چاہتا ہو دوسری کو نہ چاہتا ہو اور اس جبر سے وہ کھالے تو انبساط نہ ہو اور بعض وقت متعدد کھانے اس طرح سے کھلائے گئے کہ مقدار میں بڑھ گئے اور ہضم نہ ہوئے آپ کی تو خاطر داری ہوئی اور مہمان کو تکلیف ہوئی یہ کیا خاطر داری ہے۔

حکایت میزبانی حضرت امیر معاویہؓ

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا دستر خوان نہایت وسیع ہوتا تھا۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ آپ کے دستر خوان پر ایک اعرابی بھی تھا وہ ذرا بڑے بڑے لقمے کھاتا تھا آپ نے اس سے کہا کہ بھائی بڑے بڑے لقمے مت کھاؤ اس سے نقصان پہنچنا محتمل ہے وہ اعرابی فوراً کھڑا ہو گیا اور کہا کہ وہ شخص کریم نہیں جس کی نظر مہمانوں کے لقموں پر ہو تمہیں کھلانے کا سلیقہ نہیں تمہارا کھانا نہ کھانا چاہیے۔ انہوں نے بہت کچھ عذر کیا کہ اس میں یہ مصلحت تھی مگر اس نے ایک نہ سنی خفا ہوتا ہوا چل دیا۔

مہمان کا اکرام

امام مالک صاحبؒ کے یہاں امام شافعی صاحبؒ مہمان ہوئے جب کھانے کا وقت آیا تو خادم نے پہلے امام شافعیؒ صاحب کے سامنے کھانا رکھا امام مالک صاحب نے اس کو منع کیا اور پہلے اپنے سامنے رکھوایا ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ مہمان کو اپنے سے کم سمجھا چنانچہ اگر آج کل

کوئی ایسا کرے تو ضرور یہی سمجھا جائے کہ مہمان سے اپنے آپ کو بڑا سمجھا اور عجب نہیں کہ مہمان خفا ہو کر اٹھ جائیں اور بعض مواقع میں یہ بات بے اصل بھی نہ ہوگی آج کل ہم لوگوں میں تکبر ہے ہی وہ لوگ بے نفس تھے اور اخلاق شرعی ان کے لئے عادت بن گئے تھے ان کا یہ فعل ہرگز از راہ تکبر نہ تھا بلکہ اس واسطے تھا کہ مہمان کو انقباض نہ ہو دیکھئے کتنی باریک نظر ہے اور چونکہ اس میں خلوص تھا اس واسطے مہمان پر بھی برا اثر نہ ہوا یہاں سے اور یہ بات بھی سمجھ میں آگئی ہوگی کہ آج کل ایسا کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ سمجھانا مشکل ہے کہ ہم نے کس واسطے ایسا کیا یہاں اس میں سلامتی ہے کہ اکرام کی صورت کو باقی رکھا جائے۔

تکلفات کی مثال

کیا کیا جائے کہ یہاں تکلفات عادت ہو گئے ہیں جن کو طبیعت ثانیہ کہا جا سکتا ہے یہاں تو تکلفات کی وہ مثال ہو گئی ہے جیسے ہمارے یہاں تھانہ بھون میں ایک شخص تھے کہ گالی بکنے کے بہت عادی تھی کسی سے بے گالی بات نہ کرتے گو ان کا گالی بکنا از راہ تکبر نہ ہوتا تھا صرف عادت تھی لیکن سننے والوں کو تو بری بات گوارا نہیں ہو سکتی اس پر کون نظر کرتا کہ اس کا منشاء کیا ہے لوگ ان کی فکر میں تھے یہ تو سب کو ذلیل کرتا ہی ہے کسی موقع پر اس کو بھی ذلیل کرنا چاہئے۔ چنانچہ ان کے یہاں ایک شادی کا موقع ہوا سب لوگوں نے یہ اتفاق کر لیا آج اس کے یہاں کوئی مت جاؤ اب یہ بہت پریشان ہوئے اور برادری کی خوشامد درآمد کرنا شروع کی مگر لوگوں نے کہا کہ ہم یوں نہ مانیں گے گالیاں بکنے سے توبہ کرو اور توبہ بھی شاہ ولایت صاحب کے مزار پر چل کر اور قبر پر ہاتھ رکھ کر کرو مجبور ہو کر گئے اور قبر پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ شاہ صاحب میں نے ان لوگوں کو بہت گالیاں دی ہیں آج میں توبہ کرتا ہوں کہ ان کی ماں کو یوں توں نہ کروں کبھی گالی نہ دوں گا لوگ ہنس پڑے اور کہا یہ شخص معذور ہے اس کی خطا معاف کر دو۔ وہی حالت ہمارے تکلفات کی ہو گئی ہے کہ سمجھا دیا جائے اور بتلا دیا جائے اور جزئیات ایک ایک بیان کر دی جائیں اور ان کی زبان سے سب کو دہروا دیا جائے مگر جب کوئی کام کریں تو وہ ہو گا تکلف ہی کا اصل یہ ہے کہ تعلیم پر عادت غالب ہوتی ہے۔

طبع غالب ہونے کی حکایت

جیسے ایک بادشاہ کا قصہ ہے کہ اس نے وزیر سے دریافت کیا کہ طبع غالب ہوتی ہے یا تعلیم اس نے کہا طبع غالب ہوتی ہے بادشاہ نے کہا کہ ایسا نہیں ہے تعلیم وہ چیز ہے کہ حیوان کو بھی مہذب بنا دیتی ہے۔ دیکھو یہ ہماری بلی ہے اپنے سر پر شمع لے کر برابر کھڑی رہتی ہے بتلایئے طبیعت غالب ہوئی یا تعلیم وزیر اس وقت تو خاموش ہوگیا اگلے دن ایک چوہا پکڑ کر ساتھ لے گیا اور بادشاہ کے سامنے ہی اس بلی کے آگے وہ چوہا چھوڑ دیا بس تعلیم وتہذیب سب ندارد ہوگئی اور بلی شمع کو پٹک کر چوہے کے پیچھے دوڑی وزیر نے کہا حضور اب بتلائیں وہ تعلیم کہاں گئی۔ بات یہی ہے کہ تعلیم طبیعت پر کبھی غالب نہیں ہوسکتی۔ جب تک کوئی غرض مزاحم نہ ہو اس وقت تک بناوٹ کی تہذیب رہتی ہے مگر کوئی غرض غالب ہوجاوے تو طبیعت اصلیہ کا ظہور ہونے لگتا ہے۔

تعظیم وتکریم میں اعتدال مناسب ہے

بس اب ریل آ گئی اور یہ تقریر ختم ہوئی لیکن اسی سفر میں اور کئی موقعوں پر بھی اسی موضوع پر تقریریں ہوئیں جن کا الحاق خود حضرت والا نے اسی کے ساتھ مناسب سمجھا لہٰذا وہ بھی یہیں درج کی جاتی ہیں۔ ازاں جملہ وہ تقریر ہے جو سرائے میر کے اسٹیشن پر شب ۲۸ رصفر ۳۹ھ شب دوشنبہ ایک بجے شب ہوئی جبکہ لوگوں نے مصافحہ میں بہت تنگ کیا اسٹیشن پر یہ حالت تھی کہ پلیٹ فارم پہنچنا مشکل ہوگیا اور دن بھر قصبہ سرائے میر میں بھی یہی ہوا تھا کہ ہر نقل وحرکت کے بعد جدید مصافحہ کرتے تھے حتیٰ کہ استنجے کو جاتے وقت بھی مصافحہ کرتے اور بیت الخلاء سے نکلنے کے بعد پھر مصافحہ اور منع کرنے پر بھی نہ مانتے اور کپڑے اور ہاتھ پکڑ پکڑ کر مصافحہ کے لئے کھینچتے اسٹیشن پر فرمایا تھا کہ تھانہ بھون کی ایک حکایت سن لو ایک وقت میں چند شریر لڑکوں کی ایک کمیٹی قائم تھی وہ شہر کے انتظامات میں بھی دخل دیتے تھے اتفاق سے تھانہ بھون میں ایک میانجی تشریف لائے جو کہ بہت دیندار شخص تھے ان کے آنے سے پہلے ایک میانجی تھے ان کو یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھ پر لوگ انہیں ترجیح دیں اس لئے انہوں نے ان لڑکوں کو ایک عرضی لکھی کہ ان میانجی کے رہنے سے مجھے اپنے نقصان کا

اندیشہ ہے ان کے یہاں سے نکالنے کا انتظام کر دیا جائے جب وہ عرضی پہنچی تو ایک لڑکے نے کہا کہ اس کا انتظام میں کر دوں گا پس وہ لڑکا اپنے گھر آیا اور اپنی ماں سے کہا کہ میرے لئے دو روغنی روٹیاں پکا دو آج میں دو پہر میں نہیں آؤں گا مجھے کچھ کام ہے بس آپ روٹیوں کو باندھ کر وہیں پہنچے جہاں وہ نئے میانجی تھے وہ بیچارے اشراق کی نماز پڑھ رہے تھے جب وہ نماز سے فارغ ہو کر چلے تو آپ نے ان کے سامنے جا کر سلام کیا انہوں نے جواب دیا آپ نے دو قدم کے بعد سلام کیا انہوں نے دوبارہ بھی جواب دیا چار قدم کے بعد پھر تیسری مرتبہ سلام کیا اب وہ متغیر ہوئے کہ یہ قدم قدم پر سلام کیسا اس نے جب دیکھا کہ یہ چڑنے لگے پھر تو سلام کا تار باندھ دیا اب وہ بے چارے بہت گھبرائے ارادہ کیا کہ جس مکان میں ٹھہرے ہوئے تھے وہاں چلے جائیں اس نے ہاتھ پکڑ لیا کہ کہاں چلے میں تو سنت ادا کرتا ہوں اور آپ واجب کے ادا کرنے میں بھی سستی کرتے ہیں بس زبردستی گھر میں جانے سے روک لیا جب کھانے کا وقت آیا اور انہوں نے اس وقت جانا چاہا اس نے روٹیاں سامنے رکھ دیں کہ کھانا یہاں کھا لیجئے دو پہر میں سنت ادا کریں گے وہ بے چارے ایسے گھبرائے کہ بستی چھوڑ کر بھاگ گئے مسکرا کر فرمایا یہ بار بار مصافحہ کرنا ان میانجی کی طرح سے میرے بھی نکالنے کی ترکیب ہے۔ صاحبو! میں ویسے ہی نکل جاؤں گا ترکیبوں کی کیا ضرورت ہے۔

مصافحہ متمم سلام ہے

پھر فرمایا حدیث میں آیا ہے انّ[1] من تمام تحیاتکم المصافحة جس کا مطلب یہ ہے کہ مصافحہ متمم سلام ہے اور سلام کے لئے کچھ قواعد مقرر ہیں تو مصافحہ کے لئے جو کہ اس کا تابع ہے بطریق اولیٰ ہوں گے مثلاً لکھا ہے کہ اذان کے وقت سلام نہ کرو کھانا کھاتے وقت سلام نہ کرو اور بھی مواقع ہیں جن کا ماحصل یہ ہے کہ مشغولی کے وقت سلام نہیں کرنا چاہئے اس سے معلوم ہوا کہ مشغولی کے وقت مصافحہ بھی نہیں کرنا چاہئے بہت سے علماء تو وداعی مصافحہ کو بھی بدعت کہتے ہیں مگر خیر ہمارے علماء جائز کہتے ہیں چونکہ وداع کے وقت سلام تو نصوص سے ثابت ہے اور مصافحہ متمم سلام ہے تو مصافحہ بھی درست ہوا مگر ہر چیز کی حد ہوتی ہے۔

---

[1] مسند الإمام أحمد ۲:۳۰۳، مشکوة المصابیح: ۴۶۷۵، کنز العمال: ۲۵۲۹۵

آج کل کے مصافحہ کا غلو

یہاں مصافحہ کی کوئی حد ہی نہیں ہے استنجے کے بعد بھی مصافحہ اٹھنے کے بعد بھی مصافحہ بیٹھنے کے بعد بھی مصافحہ اسی واسطے میں نے یہ ترکیب کی تھی کہ کمرہ میں بیٹھ کر کواڑ بند کر لیتا تھا اس سے بہتوں کی دل شکنی ہوئی ہوگی مگر کیا کیا جائے اپنا تحمل بھی تو دیکھنا چاہئے میری طبیعت کسل مند ہے یہ سفر میں نے بغرض آسائش کیا ہے اور جب یہ بھرمار مصافحہ کی ہوگی تو پھر آسائش کہاں نیز تعلیم کی بھی ضرورت ہے کبھی کسی کے کان میں یہ پڑا ہی نہیں کہ ایسا مصافحہ نہ چاہیے مصیبت یہ ہے کہ آج کل کے مشائخ بجائے اس کے کہ اس سے منع کریں اور اس کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ اس سے ان کی گرم بازاری ہوتی ہے اس واسطے میں نے اس دل شکنی کو گوارا کیا کہ یہ بات یاد تو رہے گی۔ سنا ہے مدینہ طیبہ میں رجبی کے دن خطیب معراج شریف کا بیان کرتا ہے بعد ختم بیان کے لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اس کے بدن کو ہاتھ لگانا موجب برکت ہے مجمع بہت ہوتا ہے خطیب تنگ آجاتا ہے اس کے لئے پہلے ہی سے کپڑے کا ایک مقصورہ بنایا جاتا ہے پس وہ اٹھ کر اس میں چلا جاتا ہے اور پھر اس کے چاروں طرف پہرہ ہو جاتا ہے تب نجات ملتی ہے اور واقعی بات یہ ہے کہ ہر وقت کا مصافحہ مصیبت ہے ہر چیز موقع کی اچھی ہوتی ہے۔

محبت کی حد

محبت کی بھی تو حد ہونی چاہئے یہ نہیں کہ اپنا شوق پورا کرنے کے لئے دوسرے کی تکلیف کا بھی خیال نہ کیا جائے متنبی کہتا ہے۔

واسکت کنی مالایکون جواب یعنی میں خاموش رہتا ہوں تاکہ محبوب کو جواب دینے کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ مصیبت یہ ہے کہ دین صرف نماز روزہ کا نام سمجھ لیا ہے دین کا ایک جزو یہ بھی تو ہے جو حدیث میں وا**حب لاخیک المسلم ماتحب لنفسک تکن مسلما**[1] یعنی دوسرے مسلمان کے لئے وہی بات پسند کرو جو اپنے واسطے

---

[1] سنن الترمذی: ۱۴۲۴، السنن الکبری للبیھقی ۸: ۲۳۸، المستدرک للحاکم ۴: ۳۸۴، مشکوۃ المصابیح: ۳۵۷۰، کنز العمال: ۱۴۹۷

کرتے ہوتب مسلمان ہوگے جب اپنی تکلیف گوارا نہیں ہوتی ہے تو دوسرے کی تکلیف کیوں گوارا کی جائے اس کی تعلیم سے حدیثیں بھری پڑی ہیں کہ اپنے کسی فعل سے بھی دوسرے کو تکلیف نہ دی جائے نہ قولاً نہ فعلاً مسلم میں حدیث ہے مقداد بن اسود اس کے راوی ہیں یہ اپنا قصہ بیان کرتے ہیں کہ ہم تیرہ آدمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں مہمان ہوئے صحابہ کی عادت تھی کہ مہمانوں کو تقسیم کرلیا کرتے تھے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی تقسیم کردیا چند آدمی اپنے حصے میں رکھے ان میں یہ بھی تھے۔ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کے بعد تشریف لاتے اور ہم لیٹے ہوتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح سلام کرتے کہ جاگتا آدمی تو سن لے اور سوتا آدمی جاگ نہ جائے۔ دیکھئے تہذیب یہ ہے کہ دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے اس کی رعایت ہر شخص کے ساتھ چاہئے اور حدیث بقیع عرقد میں حضرت عائشہ فرماتی ہیں قام[1] رویدا او انطلق رویدا یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم آہستہ آہستہ اٹھے اور آہستہ آہستہ تشریف لے گئے تاکہ حضرت عائشہ کی نیند میں خلل نہ آئے اپنے سے چھوٹوں کی بھی یہ رعایت ہے آج کل بڑوں کے سامنے بھی دبنا نہیں چاہتے۔ اب لوگ تہجد کو اٹھتے ہیں تو ڈھیلے پھوڑتے ہیں کھٹ کھٹ چلتے ہیں گویا بتلانا چاہتے ہیں کہ ہم تہجد کو اٹھے تہذیب تو کہیں باقی ہی نہیں رہی ادب کے معنے لوگوں نے بار بار جھکنے کھڑے ہونے اور آداب وتسلیمات لے لئے ہیں حقیقت میں مؤدب تھے تو صحابہ تھے مگر نہ ان میں بار بار اٹھنا تھا نہ بار بار جھکنا تھا نہ چبا چبا کر باتیں کرنا تھا لیکن موقع پر دیکھئے کہ جان دینے میں بھی تامل نہ تھا زیادہ صورت تعظیم وتکریم کو اختیار کرنا اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ یہ شخص وقت پر کچھ بھی کام نہ دے گا نیز ایسی تعظیم سے دوسرے شخص کا ضرر ہوتا ہے کہ اس کے اندر عجب پیدا ہو جاتا ہے حدیث میں جو آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب چلتے تو کچھ آدمیوں کو آگے اور کچھ کو پیچھے کر لیتے جب اس پر عمل کر کے دیکھا جاتا ہے تب اس کی قدر ہوتی ہے کہ اس میں جانبین کی کس قدر منفعت ہے مگر ان باتوں کا خیال تو کیا ان کا داخل شریعت ہونا بھی اب معلوم نہیں رہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح بیٹھتے کہ کوئی امتیاز نہ

[1] میزان الإعتدال: ۹۵۳۸، علل الحدیث لأبی حاتم الرازی: ۲۲۴۳

ہوتا۔ عرب میں اب بھی یہ رسم ہے کہ سب یکساں بیٹھتے ہیں۔ ایک مرتبہ مکہ معظمہ میں پاشا نے حجاج کو محمد حسین سندھی مطوف کے مکان پر جمع کیا سب لوگ وقت سے پہلے پہنچ گئے پاشا اپنے وقت پر آئے، لوگ ان کی تعظیم کے لئے کھڑے ہوگئے مگر وہ ایک کونے میں بیٹھ گئے جہاں پہلے ایک معمولی آدمی بیٹھتا تھا اور مجمع میں کسی نے اونچی جگہ بیٹھنے کی تواضع بھی نہ کی بتایئے اس میں کیا حرج ہوگیا تکلفات کے رواج ڈال لینے سے ایک خرابی یہی پیدا ہوتی ہے کہ اگر پھر تکلف نہ کیا جائے تو برا ماننے کی نوبت آتی ہے اور جب تکلفات کا رواج ہی نہیں تو برا ماننے کا موقع بھی نہ ہوگا۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ادب

حدیث میں آیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم مجمع میں اس طرح بیٹھتے کہ کوئی ناواقف آتا تو اس کو پوچھنا پڑتا من[1] محمد فیکم صحابہ کہتے هذا لا بیض المتكئی متکے کے معنی ٹیک لگانے والے کے ہیں کسی وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھ ٹیکے بیٹھے ہوں گے اس وقت یہ لفظ کہا گیا ہے اور اس کے یہ معنی نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تکیئے پر بیٹھے تھے۔ کیونکہ عربی زبان میں اتکا کے معنے مطلب ٹیک لگانے کے ہیں اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تکیہ اور مسند پر بیٹھا کرتے تو آنے والا شناخت ہی نہ کر لیتا کیونکہ ظاہر ہے کہ مجلس میں جو تکیہ پر بیٹھا ہوتا ہے وہی بڑا ہوتا ہے۔ اور ہجرت کے واقعہ میں ہے کہ جب مسجد قبا میں آنے والے حضرت صدیق اکبرؓ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دھوکہ میں مصافحہ کرتے رہے جب دھوپ چڑھ آئی تو حضرت صدیقؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر چادر تان کر کھڑے ہوگئے تب معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہیں۔ سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر سادگی سے رہتے تھے اب یہاں قابل لحاظ یہ بات ہے کہ معلوم ہونے پر دوبارہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے مصافحہ نہیں کیا نیز یہ کہ حضرت صدیقؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف سے بچانے کے لئے خود ہی سب سے مصافحہ کیا کہئے کیا ادب ہے حقیقی ادب اس کو کہتے ہیں کس جاں نثاری سے لوگ آئے تھے اور ان کے لئے مصافحہ کس درجہ نعمت غیر مترقبہ تھی مگر اپنی خواہش پوری کرنے کے مقابلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تکلیف کا زیادہ پاس

---

[1] مسند الإمام أحمد ۴:۷۰، إتحاف السادة المتقين ۸:۱۶۰

کیا آج کل کا مصافحہ نہ تھا۔ آج کل تو لوگ غضب ہی کرتے ہیں ایک مرتبہ میں گردن جھکائے وظیفہ پڑھتا تھا ایک شخص آئے اور مصافحہ کے لئے کھڑے رہے میں نے آنکھیں بند کرلیں تاکہ وہ چلے جائیں مگر وہ اس پر بھی نہ گئے اور پکار کر کہا کہ مصافحہ میں نے بھی کہہ دیا کہ وظیفہ اور بعض لوگ کندھا پکڑ پکڑ کر کھینچتے ہیں کہ مصافحہ کر لیجئے مصافحہ کیا ہوا کہ بلائے جان ہو گیا اور پھر کتنا ہی کہیے کوئی سنتا نہیں ابھی ایک شخص کو منع کیا اور دوسرا اسی طرح مصافحہ کرنے کو تیار فرمایا اور یہ رسم بھی قابل اصلاح ہے کہ مسافر چلتے وقت جبکہ اسباب باندھتا ہوتا ہے اس وقت اس کو گھیرتے ہیں اس وقت اس کو مخلی بالطبع چھوڑ دینا چاہئے جب تک اسباب باندھے اس سے ہٹ کر ایک طرف بیٹھ جانا چاہئے ہاں اس کی اعانت کے واسطے اگر ایک دو آدمی پاس رہیں جن سے بے تکلفی ہو تو خیر جب تہیہ سفر کر چکے تو اطمینان سے مل لیں فقط۔

عدل بین النساء

سرائے میر کے اسٹیشن کی تقریر ختم ہوئی پھر ایک تقریر اسی موضوع پر ریل میں مابین الہ آباد و کانپور ہوئی بتاریخ یکم ربیع الاول ۱۳۳۵ھ شب پنج شنبہ وہ بھی حسب ایمان حضرت والا کے ادب العشیر کے ساتھ ملحق کی جاتی ہے وہ یہ کہ عدل بین النساء کا ذکر ہوا خواجہ صاحب نے کہا عدل کیا مشکل ہے کیونکہ فعل اعضاء ہے دونوں کو ہر بات میں برابر رکھا کسی بات میں ایک کو ترجیح نہ دی یہ مشکل کیا ہے فرمایا یہ عنوان تو بہت مختصر ہے آپ نے تو وہ مثال کر دی کہ کسی نے ایک شعر لکھا تھا جس کا ایک مصرعہ بہت چھوٹا اور ایک بہت بڑا تھا کسی شاعر نے اعتراض کیا کہ میاں مصرعے برابر نہیں فرمایا ضرورت شعری میں ایسا ہوتا ہی ہے مولانا جامی کے کلام میں بھی موجود ہے۔ الٰہی غنچہ امید بکشا (اس کو ٹھیرا ٹھرا کر پڑھا) گلے از روضہ جاوید بنما۔ اس کو جلدی سے ادا کر دیا اور اس طرح ثابت کر دیا کہ مصرعے چھوٹے بڑے ہیں۔ ایسے ہی آپ نے مختصر عنوان لے لیا اور جلدی سے کہہ کر ثابت کر دیا کہ عدل کچھ بڑا کام نہیں ذرا سی بات ہے فعل اعضاء ہی تو ہے اول تو خود فعل اعضاء بھی کہنے ہی میں ذرا سا ہے مگر کرنے میں ذرا سا نہیں کیونکہ یہاں ایک بلی کی میاؤں بھی ہے کہ اس عدل کی مانع ہو جاتی ہے۔ آپ نے اس کا قصہ سنا ہوگا کہ چوہوں نے بلی کو زیر کرنے کی تجویزیں سوچیں کسی نے کہا میں کان پکڑوں گا اور کسی نے کہا میں گلا دباؤں گا اور کسی نے کہا میں دم کاٹ لوں گا۔

ایک پرانا تجربہ کار چوہا بولا کہ ایک چیز اور رہ گئی وہ کون پکڑے گا جس وقت وہ میاں کرے گی اس کو کون پکڑے گا۔ تو حضرت ایک میاؤں بھی ہے کہ اس کے سامنے آپ کا مختصر عنوان کام نہیں دیتا وہ یہ ہے کہ عورت کجی کرے گی اور سمجھانے سے جب وہ راضی نہ ہوگی تو مرد کیا کرے گا بہت سے بہت آپ یہ کہیں گے کہ اس کا کہنا نہ مانے اور عدل پر قائم رہے جو فعل اعضاء ہے مگر قلب کو رنج تو ضرور ہوگا اور دل اس میں مشغول ہو جاوے گا پھر وہ رنج لے کر دوسری کے پاس جاوے گا اس سے بھی بے لطفی ہوگی عجب نہیں کہ اس رنج کی وجہ سے اس کی بھی کوئی بات ناگوار ہو اور اس سے بھی ناچاقی ہو جاوے اور ایک میاؤں کی جگہ دو میاں ہو جاویں بتایئے اس کی کیا ترکیب ہے سخت مصیبت کا سامنا ہے مگر یہ جب ہے کہ مرد سلیم القلب ہو رنج اور خوشی کا احساس اس کو ہوتا ہو ایسے شخص کی تو اس صورت میں واقعی زندگی تلخ ہوگی اور جس کو احساس ہی نہ ہو تو اس کا ذکر ہی نہیں وہ تو آدمیت سے ہی خارج ہے مگر وہ عدل ہی کیا کرے گا۔ بس یہ کام تو صابر کا ہے یا سخت مزاج کا کہ رنج والم سہا کرے اور عدل کو ہاتھ سے نہ جانے دے یا ڈنڈے مار کر سیدھا کر لے مار کے سامنے سب سیدھے ہو جاتے ہیں یا عدل کا لفظ ہی اٹھا دے بس ایک طرف کا ہو جاوے دوسرے کو کالمعلقہ کر دے اور اپنی زندگی آسائش سے بسر کرے مگر یہ شخص وہاں کی زندگی تلخ پاوے گا جس کی تلخی اس زندگی کی تلخی سے اشد ہے آپ نے کہہ تو دیا کہ عدل کیا مشکل ہے مگر میں ایک مثال میں پوچھتا ہوں کہ ایک کپڑا آوے اور دونوں بیبیاں اس کی خواہش کریں اور عورتوں کی ہٹ آپ جانتے ہیں اس وقت بتلایئے مرد کیا کرے گا۔ ایک کو دے تو عدل کے خلاف اور مصیبت کا سامنا اور دونوں کو نہ دے تو دونوں ناراض بس یہ ہو سکتا ہے کہ دو ٹکڑے کر دے مگر اس صورت میں کپڑا بے بیونت ہو کر ایک کے بھی کام کا نہ رہے گا اور پھر تو سب کا ناک منہ چڑھے گا پھر آخر یہ شخص کہاں تک ان امور کا تحمل کرے گا کہہ دینا تو سہل ہے کر کے دکھایئے بس تخالف نہ ہونے کی صورت ایک یہی ہو سکتی ہے کہ دونوں عورتیں سلیم الطبع ہوں اور خود ہی باہم تخالف نہ کریں جیسا کہ بعض جگہ موجود ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمدللّٰہ رب العالمین۔